# کمانڈو



یہ کتنا بڑا المیہ ہے، کہ:

■ "مشرقی پاکستان" کی شکست کے داغوں کو مندمل کرنے کے لیے ہم نے محض ندامت کے آنسوؤں کا سہارا لیا ــــــ اور اسی پر ہی اکتفا نہیں کیا! بلکہ ہم اب

■ اُن شہیدوں کو بھی بھلانے کی فکر کر رہے ہیں، جنہوں نے مادرِ وطن کی پکار پر ــــ لبیک کہتے ہوئے! اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے میں کبھی بخل سے کام نہ لیا تھا۔

"کمانڈو"

دراصل مشرقی پاکستان کے اُس باب کی نقاب کشائی کرتی ہے جسے ہم بھلا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

■ یہ ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔

■ ہمت و استقلال کی وہ عظیم داستان جسے زندہ قومیں خون کی روشنائی سے تحریر کرتی ہیں اور آنے والی نسلیں جنہیں پڑھ پڑھ کر پروان چڑھتی ہیں۔

"کمانڈو"

ماضی کے اُن دریچوں سے پردہ سرکاتی ہے، جب ــــــ

■ پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا عمل شروع ہو چکا تھا جب

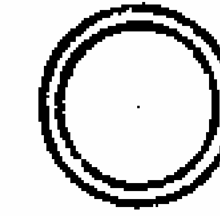
■ ایک بھائی نے دوسرے کو پہچاننے سے انکار کرتے ہوئے تیسرے فریق کی قیادت قبول کر لی تھی ــــــــــ اور

ــــ طارق اسمٰعیل ساگر نے اُسی سازش کو اس طرح کریدا ہے کہ قدم قدم پر اس قلمکار کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

محمد احسن

# کمانڈو

مصنّف ـــــ طارق اسمٰعیل ساگر
ناشر ـــــ قومی کتب خانہ ۔ لاہور
طابع ـــــ محمد محسن ہمایوں
مطبع ـــــ تعمیر پرنٹنگ پریس، لاہور
تعداد ـــــ ۲۰۰۰ (دو ہزار)
قیمت ـــــ ایک سو دس روپے (۱۱۰ روپے)



ایڈیشن ۱۹۹۶ء : ماہ اگست

قومی کتب خانہ، ۱۹ فیروز پور روڈ ـــــ لاہور

# فہرس

# پیش لفظ

جب مَیں بھارت میں قیدی تھا۔
——— دورانِ تفتیش، بھارتی انٹیلی جنس کے ایک ایس۔پی نے کہا تھا:
"تم پاکستان شاید اسی جنم میں چلے جاؤ! لیکن ——— تمہارا جسم تمہیں کئی جنم تک، یہ یاد دلاتا رہے گا کہ ——— تم نے بھارتی تفتیش کاٹی ہے۔"
ظالم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔
——— آج جب وطن واپس آئے ہوئے مجھے تقریباً آٹھ برس ہو گئے ہیں "کبھی کبھی بے اختیار، جسمانی اور روحانی گھاؤ پر نظر جاتی ہے ——— تو میرا ہر زخم خود بخود اُس ایس۔پی کے کہے الفاظ کی صداقت کی گواہی دینے لگتا ہے۔
دشمن کے بخشے اُسی درد و کرب نے "مَیں ایک جاسوس تھا" کی شکل اختیار کی۔
اور یہی درداب "کمانڈو" میں سمٹ آیا ہے۔
کمانڈو!
"مشرقی پاکستان" کے زخموں سے چُور چُور، وہ لہو رنگ کہانی ہے جس کو ہم مسلسل وقت کی گرد میں دبائے چلے جا رہے ہیں اور ——— شہیدوں کی حکایاتِ خونچکاں ہمارے لئے ماضی کی بھولی بسری یاد بن کر رہ گئی ہیں۔
کیا یہ ہماری نیتوں کا فتور نہیں کہ ——— ہم نے صرف دس بارہ سال کی قلیل مدّت میں اِس "سانحے" کو ذہن سے یوں جھٹک دیا۔ جیسے یہ ہم پر گزرا ہی نہ تھا؟
——— جیسے ہمیں اپنے ازلی دشمن کا سُراغ ہی نہیں مل سکا، اُس مارِ آستین کا جس نے اِن آندھیوں اور طوفانوں کی ہمیشہ بھرپور پشت پناہی کی۔ جو مملکتِ خُداداد

پاکستان کو لخت لخت کرنے کے لیے اُٹھتے رہے۔

—— کیا؛

- ہم اس بات کو بھلا بیٹھے ہیں کہ، قیامِ پاکستان کے فوراً بعد —— اس برہمنی ذہنیت نے، جو کبھی بھی "تقسیمِ ملک" کی متحمل نہیں ہو سکی، ہزاروں لاکھوں مہاجرین کے قافلے اس نوزائیدہ مملکت میں بھیج کر ہماری معاشی تباہی کا سامان پیدا کیا؟
- اور جب ہم نے دشمن کا یہ وار سہہ لیا، تو ستمبر ۱۹۶۵ء میں اُس نے پاکستان پر رات کی تاریکی میں حملہ کر کے اپنے خون کی پیاس بجھانے کا اہتمام بھی کیا تھا؟
- پھر جب، اُس کی "بہادر سینا" اپنے گھناؤنے مقاصد کو بروئے کار لانے میں ناکام رہی تو اُس نے —— اِس "زرخیز" زمین کو منتخب کیا جسے ہم کبھی "مشرقی پاکستان" کہتے تھے۔
- یہاں پہنچ کر اُس نے صوبائی عصبیت کے بیج بوئے —— اور —— اُن کی خوب خوب آبیاری کی۔
- اور جب یہ فصل پک کر تیار ہو گئی تو مکتی باہنی کا روپ دھار کر میدانِ عمل میں نکل آئی۔ لیکن جب —— یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی۔
- تو ایک مضبوط فوج لے کر براہِ راست مداخلت کی اور ہمارے اس بازو کو مفلوج کر دیا

"کمانڈو" کی شکل میں مَیں آپ کے لیے تاریخ کے بے رحم ہاتھوں سے کچھ دلخراش اوراق چھین کر لے آیا ہوں۔

—— یہ وہ آہیں ہیں جو میرے سینے میں ایک مدت سے جنم لے رہی تھیں۔

—— یہ وہ چیخیں ہیں جو میرے اندر اٹھتی اور دم توڑتی رہیں۔ ماضی کی یہ کربناک یادیں مجھے پورلو پاکستان لے جاتیں جہاں کالی دیوی کے پجاریوں نے نفرتوں کی دیواریں کھڑی کر کے —— ایک بھائی کو دوسرے سے جُدا کر دیا!

اب جو نظر اپنے "ملکِ عزیز" پر جاتی ہے تو مَیں سوچنے لگتا ہوں:

"اکھنڈ بھارت" کا خواب دیکھنے والے کہیں یہاں بھی —— اس بچے کھچے پاکستان میں نفرتوں کے ویسے ہی بیج نہ بو دیں۔

اور

زبان، ثقافت اور صوبائیت کے زہریلے نعروں کی یہاں بھی پرورش شروع نہ کر دیں۔

اے کاش! ہم آج اپنی آنکھیں کھول سکتے —— اور یہ دیکھ سکتے:

- دشمن پھر اسلحے کا انبار لگا رہا ہے ——
- کھلاڑی بھی وہی ہے۔ داؤ پیچ بھی وہی ہیں صرف میدان بدل گیا ہے۔

کمانڈو

دراصل ایک قندیل ہے! ایک روشن ستارہ ہے جو
ہمیں راہوں کے پُرپیچ خارزاروں سے بھی آگاہ کرے گا اور
تاریخ کے اُس ورق پر بھی نظر رکھنے کی کوشش کرے گا
جو
قوموں کو شاہراؤں کا پتہ بھی دے سکتا ہے اور وادیوں
میں گم ہونے کی نشاندہی بھی کر سکتا ہے۔

مَیں جناب احسن صاحب کا شکرگزار ہوں جن کی مسلسل حوصلہ افزائی، مہربانہ مشورے اور خلوص میرے لیے مشعلِ راہ بنے رہے۔

طارق اسمٰعیل ساگر

بحوالہ INSIDE RAW - مصنف اشوک رینا

# "ساقی نامہ"

شراب کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اُڑا
مری خاک جگنو بنا کر اُڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا اُستاد کر
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مصطفےٰؐ سوزِ صدیقؓ دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر
تمنا کو سینوں میں بیدار کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

اقبالؒ

# آتش فشاں

کراچی سے ڈھاکہ تک ڈھائی گھنٹے کا سفر جیسے چند لمحوں میں کٹ گیا ـــــــ میں چونکا اس وقت جب ایئرہوسٹس نے مسافروں کو اپنی جانب متوجہ ہونے کی درخواست کرتے ہوئے کہا: "سیفٹی بیلٹ باندھ لیں کیونکہ جہاز ڈھاکہ ایئرپورٹ پر لینڈ کرنے والا ہے۔"

سارے راستے میں اپنے ذہن میں مشرقی پاکستان کی مختلف تصویریں ترتیب دیتا آیا تھا۔ سنہرے ریشے والی، بھیگے ماجھیوں کی یہ دھرتی پچھلے تین ماہ سے میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی ـــــ علاحدگی پسند عناصر کے ذہنوں میں جو لاوا اندر ہی اندر نہ جانے کب سے پک رہا تھا وہ اب پھٹنے کو تیار تھا اور ہمیں فوجی تربیت دے کر وہاں بھیجا جا رہا تھا کہ ہم اس کی ممکنہ تباہ کاریوں سے اسے بچائے رکھیں یا کسی حد تک اس کا سدِّباب کر سکیں ـــــــ میرے اسپیشل کورس کے انسٹرکٹر نے مجھے آخری مرتبہ کہا تھا۔

"بوائے! میں تمھیں کسی خوش فہمی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا ـــــــ بدقسمتی سے حالات ہمارے اندازوں سے زیادہ سنگین نوعیت اختیار کر چکے ہیں، تمھیں دشمن ہی سے نہیں، آستین کے سانپوں سے بھی نمٹنا ہے۔ عملی میدان میں حالات یوں بھی تربیت کے مطابق پیش نہیں آتے۔ کسی بھی لمحے کسی بھی صورتِ حال کا سامنا ممکن ہے۔ اپنے سائے سے بھی ہوشیار رہنا سب مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے کہ وہاں ہر جھاڑی کے پیچھے ایک سانپ پھن اُٹھائے تمھارا منتظر ہے۔"

میرے والد فوج کے ریٹائرڈ صوبیدار تھے سن ۶۵ء کی جنگ نے اُن کا ایک بازو چھین لیا تھا، لیکن بہادر فوجیوں کی طرح انھوں نے کبھی ہمیں اپنی معذوری کا احساس نہ ہونے دیا۔ وہ اپنی آنکھوں میں کبھی نہ مٹنے والی چمک لیے صبح سے شام تک کھیتی باڑی میں جُتے رہتے۔ انھوں نے ہم سے کبھی کچھ نہ مانگا صرف ایک خواہش کی کہ ان کا بیٹا ان کی جگہ سنبھال لے! جس روز آئی۔ ایس۔ ایس۔ بی سے میری کامیابی کا پروانہ آیا تو ان کی حالت دیدنی تھی سارا گاؤں میرے والد کو مبارک باد دینے اُمڈا چلا آیا تھا۔

اکیڈمی سے ٹریننگ مکمل کرنے اور پاسنگ آؤٹ پریڈ کے بعد مَیں ان سے ملا تو ان کی آنکھوں کی چمک دوچند ہو گئی۔ بے اختیار مجھے گلے لگاتے ہوئے بولے: "بیٹا میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم میرا ادھورا مشن پورا کرو گے"

ہم اکٹھے ہی گاؤں آئے تھے جہاں تپتی دوپہر میں ہمارے قصبے کے چھوٹے سے اسٹیشن کے ایک کونے میں رکھی لوہے کی بینچ پر میری ماں برگد کی ٹھنڈی چھایا بنی بیٹھی تھی۔ گاؤں کے اور لوگ بھی آئے تھے۔ ٹرین سے اترتے ہی بے اختیار میرے قدم ماں کی طرف اُٹھے اور جب میں ماں کے ممتا بھرے سینے سے لگا تو ٹریننگ کی ساری سختیاں بھول گیا۔ سفر کی ساری کلفت مٹ گئی۔ "میرا شیر" کہہ کر امی نے میرے ماتھے پر بوسہ دیا اور ہم جلوس کی شکل میں گاؤں واپس آ گئے۔

بیس دن تو دور و نزدیک دیہات میں رہنے والے رشتے داروں کے ہاں دعوتیں کھانے میں کٹ گئے پھر مجھے "خاص کورس" کے لیے جانا پڑا۔ جس کی تکمیل کے فوراً بعد ہی مجھے مشرقی پاکستان جانے کے احکامات مل گئے! جہاز میں سوار ہونے تک میرے انسٹرکٹر میرے ساتھ رہے اور جب جہاز کی روانگی کا اعلان ہوا تو انھوں نے گرمجوشی سے بغل گیر ہو کر میرے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور میری طرف دیکھے بغیر واپس چلے گئے۔ دورانِ تربیت استاد اور شاگرد کا رشتہ کچھ ایسا جذباتی سا ہو جاتا ہے کہ ایک دوسرے سے الگ ہونے کے بعد کچھ عرصے تک دونوں اپنے



اندر ایک خلا سا محسوس کرتے ہیں اور مَیں جس مشن پر جا رہا تھا وہاں سے میری واپسی کے امکانات بھی بہت تھوڑے تھے ——— اپنے ہاتھوں اپنے بیٹوں کی طرح عزیز شاگرد کو موت کی شاہراہ پر گامزن کرنے کے بعد ان کے احساسات کیا ہوں گے اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ان راہوں پر ایک دوسرے کے سنگ سنگ چلے ہوں۔

ڈھاکہ ایئرپورٹ پر ہلکی ہلکی پھوار نے میرا استقبال کیا ———
جہاز سے اُترتے ہی سنہرے دیس کی ہریالی آنکھوں میں دَر آئی اور ایک تراوٹ اور
تازگی کا احساس جسم کے روئیں روئیں میں سما گیا ———
مَیں نے اپنے آپ کو سمیٹا، میری رجمنٹ کا ایک آفیسر میرے استقبال کو موجود تھا۔
ہم اپنے ہیڈکوارٹر کی طرف روانہ ہو گئے۔
——— کچھ دیر حالاتِ حاضرہ کو زیرِ بحث لانے کے بعد، مَیں اردلی کی معیت میں اپنے
کمرے میں آیا اور بستر پر گر کر اپنے گاؤں میں جا پہنچا۔
——— اُس گاؤں میں جس کے ایک کونے میں ہمارا چھوٹا سا پیارا سا گھر تھا۔ جہاں
میرا شفیق باپ اور پیاری ماں رہتی تھے اور جہاں میرے ہزاروں چاؤ کرنے والی میری لاڈلی
بہن بھی میری راہیں تکتی رہتی تھی —

اور پھر.....
——— پھر مَیں گاؤں کے چھوٹے سے اسٹیشن پر آ گیا جہاں اُن سب لوگوں نے مجھے
الوداع کہی جو میرے گھر والوں کے ساتھ وہاں آ جمع ہوئے تھے! ان سب کی ایک ہی آرزو تھی:
کہ ——— جیسے بھی ممکن ہو، مَیں اُن کے پورے پاکستان کو دشمن کے ہر شر سے محفوظ رکھوں۔
——— سنہرے دیش کی دھرتی کو ہر صورت میلی نظروں سے بچائے رکھوں اور ابھی
مَیں اُن سب کے گلے مِل بھی نہ سکا تھا کہ گاڑی چل دی ——— وہ سب دیکھتے ہی رہ گئے
اور مَیں اَن دیکھی منزلوں کی طرف روانہ ہو گیا۔

لگے ہی روز میں نئے اسپیشل یونٹ سے منسلک ہوگیا۔

——— میں روزانہ انٹیلی جنس کی تازہ رپورٹیں دیکھا کرتا اور ہر نئی فائل میرے سامنے ایسے حقائق کا انکشاف کرتی کہ کلیجہ منہ کو آنے لگتا! ابھی تک ہمیں چھاؤنیوں سے باہر نکلنے کا حکم نہیں ملا تھا، لیکن، میں اپنے طور پر RECONNAISSANCE کے لیے نکل جاتا ——— اس طرح اور بھی قریب سے حالات کا جائزہ لینے کا موقع مل جاتا۔

اُن دنوں انتخاب کی تیاریاں بڑے زوروں پر تھیں ——— سیاسی ہلڑ بازی اپنے عروج پر تھی اور سیاسی اجتماعات میں ایسے ایسے نعرے سنائی دیتے تھے جو کبھی ہمارے وہم گمان میں بھی نہ تھے ——— یہ سُن سُن کر، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جب میں مشرقی پاکستان پہنچا تو دشمن کا وار چل چکا تھا۔

——— قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک دشمن نے جس جانفشانی اور تندہی کے ساتھ بنگالی مسلمانوں کے ذہنوں میں نفرت کے بیج بوئے تھے اب اس کی فصل بالکل پک چکی تھی اور نفرت کی یہ فصل ہم اپنے ہاتھوں کاٹ رہے تھے۔

——— کتنے بدنصیب تھے ہم! کیا بھیانک مذاق کیا تھا قدرت نے ہمارے ساتھ، کتنی کڑی سزا ملی تھی ہمیں اپنے گناہوں کی۔

مَیں دن رات سوچتا رہتا اور جب کوئی راہ دکھائی نہ دیتی تو سنہری دیس کی سنہری لڑیوں میں اپنے آپ کو پرو لیتا ——— میرے شب و روز اسی طرح گزر رہے تھے۔

ایک روز جب میں رات کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں پہنچا تو کرنل صاحب نے مجھے میٹنگ روم میں حاضر ہونے کا حکم دیا ——— ایسے احکام، ایمرجنسی میں اکثر موصول ہوتے رہتے تھے، اسی لیے مَیں نے اُسے بھی معمول کی عام کارروائی سمجھا۔

لیکن میٹنگ روم میں پہنچنے کے بعد پتہ چلا کہ انٹیلی جنس کی اطلاع کے مطابق ڈھاکہ سے کچھ



فاصلے پر ایک گاؤں میں تخریب کاروں نے ایک اڈہ قائم کر رکھا تھا اور وہ اتنی طاقت حاصل کر چکے تھے کہ جلد ہی فوج سے ٹکر لینے والے تھے! کرنل صاحب نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ جب ہمیں یہ اطلاع ملی تو ہم نے شام ہی کو ایک کمپنی اُس گاؤں سے قریباً پانچ میل دُور ایک مقام پر روانہ کردی، لیکن ——— ابھی تک ہمیں اُس بارے میں مزید کوئی اطلاعات موصول نہیں ہوئیں!

انہوں نے دیوار پر لگے نقشے کے ذریعے ہمیں اُس گاؤں اور گرد و نواح کے علاقے کا محل وقوع بھی سمجھایا اور فوری طور پر ایک اور کمپنی میری کمانڈ میں دے کر ہمیں روانگی کا حکم دیا۔

اس سے قبل فوج ابھی تک کھُل کر سامنے نہیں آئی تھی اور ہماری حتی الوسع کوشش بھی یہی رہی تھی کہ فوج کو عوام سے دُور رکھا جائے، حالانکہ بعد میں اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا! اس لیے کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ حفاظتی اقدامات کے پیشِ نظر مَیں نے علی الصباح یہ آپریشن کرنے کا فیصلہ کیا ——— میرا خیال تھا اس طرح ہم دشمن کے ہوشیار ہونے سے پہلے اس پر قابو پا لیں گے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فوجی اصطلاح میں ہم رہائشی BUILD - UP ایریا میں جا رہے تھے جہاں مقابلے کا خطرہ مول لینا ٹھیک نہیں تھا۔ اس طرح بے گناہ شہریوں کے مارے جانے کا اندیشہ تھا۔

آدھی رات کے بعد مَیں نے تین ٹرکوں میں سوار اپنے جوانوں کو روانگی کا حکم دیا۔ سب سے آگے جیپ میں مَیں ان کی کمانڈ کر رہا تھا، ہم لوگ فجر کے وقت آپریشنل ایریا کے نزدیک پہنچ گئے۔

اب بڑی سڑک سے اتر کر ہمیں ایک ذیلی سڑک کی طرف مُڑنا تھا۔ اس سڑک کے دونوں اطراف کھیت تھے۔ ابھی ہم بمشکل آدھ میل ہی چل پائے تھے کہ اچانک ایک راکٹ میری جیپ کے قریب پھٹا۔ مَیں نے بڑی پھُرتی سے چھلانگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی ہم پر گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ راکٹ لانچر کی آواز ان میں نمایاں تھی۔ جوان بڑی پھُرتی سے چھلانگیں لگا کر نیچے آ گئے تھے اور ایک ٹرک کی آڑ میں لیٹے اگلے حکم کے منتظر تھے۔ فائرنگ کرنے والوں کا کہیں کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا تھا جب کہ فائرنگ ہم پر مسلسل ہو رہی تھی۔ سب سے پہلے میری نظر جیپ پر پڑی۔

ڈرائیور اسٹیرنگ پر جھکا ہوا تھا۔ جیپ کا اگلا حصہ اُڑ چکا تھا اور پیچھے بیٹھے دونوں جوان بھی شہید ہو چکے تھے۔

فائرنگ اتنی شدید تھی کہ جیپ کے نزدیک پھٹکنے کا تصور بھی محال تھا۔ راکٹ لانچر سے فائرنگ کا یہ مطلب تھا کہ دشمن کے پاس واقعی اچھے خاصے ہتھیار موجود ہیں اور وہ ہمارے نزدیک موجود ہے۔ مَیں کھیت کے اندر ہی اندر بھاگتا ہوا اپنے محفوظ ساتھیوں تک پہنچا اور انھیں ہدایات دے کر پوزیشن سنبھالنے کا حکم دیا۔ ابھی تک ہم نے اپنے دفاع میں ایک گولی بھی نہیں چلائی تھی کیونکہ حملہ آور دکھائی نہیں دے رہے تھے اور ہم خواہ مخواہ گولہ بارود پھونکنے کی عیاشی کے متحمّل نہیں ہو سکتے تھے۔

تقریباً دس منٹ تک یہی صورتِ حال رہی پھر INTERMITTENT فائر آنے لگا ـــــ رُک رُک کر گولہ باری سے مَیں نے یہی سمجھا کہ اب دشمن اس کی آڑ میں بھاگنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ میرے تین جوانوں کی شہادت نے میرے ہی نہیں تمام دستے کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ ہماری فوج کا مزاج ذرا مختلف قسم کا ہے ـــــ اپنے جوانوں کی شہادت یا اچانک حملہ ہونے پر ان کی دھڑکنیں رُکا نہیں کرتیں، البتہ ان کے خون میں انگارے ضرور بھر جاتے ہیں۔

تمام جوانوں کے جذبات کا مجھے احساس تھا لیکن جنگ میں سب سے بڑی چیز حکمتِ عملی ہوتی ہے۔ مَیں نے اپنے کمپنی ہیڈ کوارٹر کو مطلع کرنے اور ان سے مدد مانگنے کی بجائے اپنے معمولی اسلحے کے ساتھ دشمن سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا ـــــ مشرقی پاکستان میں آتے ہی مجھے اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ جنگ "مورال" سے لڑی جائے گی اور ہماری انفرادی شجاعت ہی حالات کا رُخ بدل سکتی ہے خواہ مخواہ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے مُنہ اٹھا کر ہیڈ کوارٹر کی طرف دیکھنا غلط تھا۔

مَیں نے جوانوں کو اکٹھا کر کے تین دستے ترتیب دیئے ہمارے پاس صرف تین مشین گنیں تھیں باقی اسلحہ عام قسم کا ہی تھا ہر دستے کو ایک مشین گن دے کر مَیں نے دو دستوں کو دونوں پہلوؤں سے



گاؤں کے گرد گھیرا ڈالنے کا حکم دیا اور تیسرے دستے کی کمان خود سنبھال کر دشمن پر براہِ راست حملہ کرنے کے ارادے سے آگے بڑھنے لگا۔

ہم نے چوتھی سمت میں اپنی گاڑیاں کھڑی رہنے دیں اس طرح دشمن ہماری تعداد کے متعلق دھوکا کھا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے اپنے محاصرے میں آجانے کا احساس بھی رہتا۔ گاڑیوں کی حفاظت کے لیے ایک حوالدار کے زیرِ کمان چار جوانوں کو مَیں نے اردگرد چھپا دیا۔ یہ راستہ کیونکہ بڑی سڑک یعنی شہر کی طرف جاتا تھا اس لیے اس طرف سے دشمن کے فرار ہونے کے امکانات کم ہی دکھائی دیتے تھے۔ اگر کوئی بدبخت اس طرف آ بھی جاتا تو گھات میں بیٹھے جوانوں سے بچ نکلنا ناممکن تھا۔

جلد ہی ہم نے نیم دائرے کی شکل اختیار کر لی۔ ایک دستہ تو لمبا چکر کاٹ کر گاؤں کے پچھلی طرف پہنچ گیا اور دوسرا کچھ فاصلے سے دائیں طرف جب کہ مَیں نے بائیں سمت سے دشمن کے قریب رہتے ہوئے اسے اپنی طرف اُلجھائے رکھا تا کہ باقی جوان ترتیب میں آجائیں۔ اپنی اپنی جگہ پہنچ کر ہم نے "ملاپ" کیا اور مَیں نے فائرنگ کا حکم دے دیا۔ اس دوران ہم نے اپنے ٹارگیٹ نوٹ کر لیے تھے۔ حملہ آور زیادہ تربیت یافتہ نظر نہیں آ رہے تھے کیونکہ انھوں نے گاؤں کے ایک کونے میں بنے دو تین مکانات پر ہی مورچے جما رکھے تھے۔ اگر وہ سارے گاؤں میں پھیلے ہوتے تو انھیں کنٹرول کرنا دشوار ہو جاتا۔

فائرنگ کی آواز اور لڑنے والوں کے نعروں نے گاؤں کے لوگوں کو خاصا خوفزدہ کر دیا تھا اور وہ گھروں سے نکل کر کھیتوں کی سمت بھاگ رہے تھے۔ اس طرح افراتفری کی حالت میں چند دیہاتی تخریب کاروں کا نشانہ بھی بن گئے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر مَیں نے اپنے صوبیدار اور چند جوانوں کو گاؤں میں داخل ہونے کا حکم دیا تا کہ وہ لوگوں کو منظّم شکل میں محفوظ مقامات پر پہنچا دیں صوبیدار صاحب کی کمان میں یہ جوان اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر آگ میں کُود گئے۔ انھوں نے چلاّ چلاّ کر لوگوں کو ہدایات دیں اور گاؤں کی اس سمت سے جو ابھی تک تخریب کاروں سے محفوظ تھی، لوگوں کو باہر

نکالنا شروع کر دیا۔

یہ بڑا اندوہناک منظر تھا۔ چیختی چلاتی عورتیں، جن کے بچے پیچھے رہ گئے تھے، فریاد کرتیں تو دل دہل جاتا، میرے جوان بچوں کو خود گود میں اٹھا اٹھا کر ان تک پہنچا رہے تھے۔ تخریب کاروں کے پاس اسلحہ اور گولہ بارود کی کوئی کمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اب تک میں نے "چارج" نہیں کیا تھا۔ اور انھیں اپنی طرف الجھائے رکھنے کی حد تک ہی ہم ان پر فائرنگ کر رہے تھے۔

اب پو پھٹنے لگی تھی جانے کس طرح ان لوگوں کی نظر اس سمت چلی گئی جدھر سے میرے جوان دیہاتیوں کو محفوظ مقام کی طرف لے جا رہے تھے۔ انھوں نے ایک لائٹ مشین گن کا منہ اس طرف پھیر دیا اور چند ہی سیکنڈ بعد پانچ، چھ دیہاتی خون میں نہاتے دکھائی دیئے۔

"یہ کیسے حریت پسند ہیں جو اپنے ہی لوگوں کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں؟"

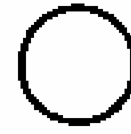
——— میری آنکھوں میں خون اُتر آیا! بے گناہ سویلین ہماری آنکھوں کے سامنے موت کے گھاٹ اتارے جا رہے تھے۔ میں نے تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر پچھلے اور بائیں سمت والے دستوں کو فائرنگ تیز کرنے کا حکم دیا اور اپنے جوانوں کے ساتھ خود بھی "چارج" کر دیا میرے دستے کی واحد مشین گن جو کسی حد تک محفوظ جگہ نصب تھی، ہمیں ایک طرح سے COVERING FIRE مہیا کر رہی تھی جب کہ جوان میرے دائیں بائیں کرالنگ کرتے اس سمت سے آگے بڑھ رہے تھے جدھر سے ہم نے دیہاتیوں کو باہر نکالا تھا۔

صوبیدار صاحب نے موقعے کی نزاکت کو خوب سنبھالا۔ دو جوانوں نے لوگوں کو دیواروں کی اوٹ میں بٹھا کر ان کے سامنے مورچہ جما لیا۔ خود صوبیدار صاحب باقی جوانوں کے ساتھ مکانوں کی چھتوں اور منڈیروں سے تخریب کاروں پر فائرنگ کرنے لگے۔ میرے ساتھی میرے پیچھے پیچھے گاؤں کے کچے پکے مکانات کی آڑ لیتے تخریب کاروں کی سمت بڑھ رہے تھے اور وہ لوگ اونچائی پر ہونے کی وجہ سے ہم سے بہتر پوزیشن میں تو تھے لیکن ہم نے حکمتِ عملی ہی ایسی اختیار کی تھی کہ وہ اُس ADVANTAGE کا کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے۔ میں نے اپنے جوانوں کو بکھرنے اور محفوظ آڑ کے



ساتھ آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ تقریباً آدھ گھنٹے کی خونریز جنگ کے بعد تخریب کاروں کے پچاس، ساٹھ آدمی کھیت رہے اور اسی کے قریب ہم نے گرفتار کر لیے۔

بھارتی پروپیگنڈے نے فضا مسموم کر رکھی تھی۔ خصوصاً فوج سے عوام کی نفرت کے مظاہرے تو اکثر دیکھنے کو ملا کرتے تھے، لیکن یہاں صورتِ حال بالکل برعکس تھی ——— دیہاتیوں نے تخریب کاروں کی بربریت کا مظاہرہ دیکھ لیا تھا اور یہ بھی وہ دیکھ چکے تھے کہ ہم نے انھیں بچانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ میرے چھ جوان زخمی تھے اور ایک معرکے میں شہید ہو چکا تھا۔ یہ جوان ایک بچے کو فائرنگ رینج سے بچانے کے لیے لپکا تھا کہ تخریب کاروں کی ایک گولی اس کے عین دل پر لگی اور وہ زندہ جاوید ہو گیا۔ لوگ تخریب کاروں کی تکا بوٹی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ بڑی مشکل سے ہم نے بپھرے ہوئے ہجوم سے گرفتار شدگان کو نکالا اور اپنے شہید اور زخمی ساتھیوں کے ہمراہ ٹرکوں کی طرف جانے لگے۔



ابھی ہم گاڑیوں تک پہنچے ہی تھے کہ میرے سیکنڈ ان کمانڈ نے جلدی سے دوربین میرے ہاتھ میں پکڑا کر ایک سمت اشارہ کیا، میں نے دوربین آنکھوں سے لگائی ——— گاؤں سے کچھ فاصلے پر ندی بہتی تھی اس کے کنارے کنارے میں نے فوجی وردی میں کسی کو لڑکھڑاتے ہوئے اپنی سمت بڑھتے دیکھا۔ میں سوچنے لگا کہ کون ہو سکتا ہے؟ میرے ذہن میں کل شام روانہ ہونے والی پارٹی ضرور تھی جو کمپنی ہیڈ کوارٹر سے ہماری روانگی تک واپس نہیں آئی تھی۔ لیکن امید تھی کہ ہمارے جاتے ہی وہ لوگ آ گئے ہوں گے یا ممکن ہے گرفتار شدگان کے ساتھ انھوں نے رات کو سفر کرنا مناسب نہ سمجھا ہو اور صبح آنے کا ارادہ کیا ہو۔ پھر یہ کون تھا؟ مختلف خیال اور وسوسے میرے دماغ میں سر اٹھانے لگے۔ میں نے خود آگے بڑھ کر حالات جاننے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے ہمراہ تین جوان تھے ہم لوگ بھاگتے ہوئے اس کی سمت بڑھے کسی ممکنہ خطرے کے پیشِ نظر ہماری انگلیاں ٹریگرز پر تھیں، آہستہ آہستہ آنے والے کے نقوش واضح ہونے لگے: یہ پاکستانی فوج کا جوان تھا اور اس

پارٹی سے متعلق تھا جو کل شام تخریب کاروں کی سرکوبی کو روانہ ہوئی تھی۔

ہمیں دیکھتے ہی وہ رک گیا۔ اس کی وردی خون آلود اور بھیگی ہوئی تھی۔ وہ اتنا زخمی تھا کہ ٹھیک طرح چل بھی نہیں سکتا تھا۔ صورت کچھ جانی پہچانی دکھائی دی۔ پھر اچانک جیسے میرے ذہن کو زوردار جھٹکا لگا —— میرے سامنے منیر کھڑا تھا۔

منیر میرے ساتھ کے گاؤں کا رہنے والا نائیک تھا اور شادی سے صرف پانچ روز قبل اسے ہنگامی حکم موصول ہوا تھا کہ اپنی کمپنی کے ساتھ مشرقی پاکستان پہنچے۔ اس کا چہرہ دھول سے اٹا ہوا تھا وہ یکبارگی لڑکھڑایا.... اور گر پڑا۔

"منیر! منیر!!" میں نے بے اختیار نیچے جھک کر اُسے اٹھانا چاہا اور اس اثنا میں دوسرے جوان نے اپنی چھاگل اس کے منہ سے لگا دی۔ منیر نے مجھے پہچان کر کچھ کہنے کا ارادہ کیا لیکن ہم دونوں ڈسپلن کے پابند تھے۔ فوجی تھے نا! اس نے میرے کندھوں پر لگے اسٹار دیکھ کر بجائے میرا نام لینے کے مجھے "سر" سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سر ہم گھیرے میں آچکے ہیں۔ سیٹ کام نہیں کر رہا۔ میں بڑی مشکل سے....،" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اس میں بولنے کی سکت بھی باقی نہیں رہی تھی۔

مشرقی پاکستان ندی نالوں، جنگلوں، دلدلوں اور کھائیوں کا دیس ہے۔ یہاں قدم قدم پر رابطے کی ضرورت رہتی ہے۔ علاقے کے متعلق معلومات رکھنے والے چند گوریلے علاقے سے ناواقف سینکڑوں فوجیوں کو گھیر کر مار سکتے ہیں —— یہ پارٹی بھی کسی میدان جنگ میں نہیں بلکہ ہماری طرح اطلاع ملنے پر تخریب کاروں کو گرفتار کرنے گئی تھی مگر خلافِ توقع دشمن کی طاقت ان کے اندازے سے زیادہ نکلی۔ میں نے فوراً اپنے ساتھی کو ہدایات دے کر پیچھے روانہ کیا اور خود زمین پر بیٹھ کر منیر کے سینے پر لگے گہرے گھاؤ کا جائزہ لینے لگا۔ اتنے گہرے زخم کے ساتھ اس کا یہاں تک پہنچ جانا کسی معجزے سے ہرگز کم نہیں تھا۔ میں نے اپنی فیلڈ پٹی کھول کر اس کے سینے پر باندھنی چاہی تو نائیک منیر نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔



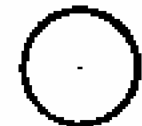
"دیر ہو گئی سر! خدا کا شکر ہے میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ ادھر گاؤں میں سب کو میرا سلام پہنچا دینا۔ میری ماں سے کہنا اس کے بیٹے نے پیٹھ نہیں دکھائی اور میری منگیتر صغراں سے....،"

مگر وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ اس سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

"ہوش کرو منیر" کہتے ہوئے میں نے جھک کر اس کے سینے کے گرد پٹی لپیٹنی چاہی لیکن اس نے سچ کہا تھا، دیر ہو چکی تھی۔ اسے تو قدرت نے صرف اپنا فرض پورا کرنے کے لیے زندہ رکھا تھا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ اس نے اپنا مشن پورا کر لیا ہے اور پیغام آگے پہنچ چکا ہے تو جان جانِ آفریں کو سونپ دی۔ آخری لمحات میں وہ آہستہ آہستہ شاید کلمہ شریف کا ورد کر رہا تھا۔ بے اختیار میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ میں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اپنے ماتحتوں کے سامنے افسر بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا کرتے۔

مجھے رہ رہ کر ایک ہی بات کا غم کھائے جا رہا تھا کہ اسے آخری بات مکمل کرنے کی مہلت نہ مل سکی جب اس کے گھر والے مجھ سے اس کی شہادت کی داستان سُنیں گے تو مجھے اس کے ایک ایک لمحے کی کہانی انھیں سنانا پڑے گی۔ اگر کبھی زندگی میں صغراں کا سامنا ہو گیا تو اسے منیر کا ادھورا پیغام کیسے دوں گا؟ کیا بتاؤں گا اسے؟

منیر کی لاش دیکھ کر میرے جوانوں کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اس سے پہلے وہ تخریب کاروں کے ہاتھوں نہتے دیہاتیوں کی موت کا منظر دیکھ چکے تھے۔ خود میری بھی حالت اُن سے مختلف نہ تھی۔ میں نے گرفتار شدگان، شہدا اور زخمیوں کو پیچھے لے جانے کا حکم دیا۔ کمپنی ہیڈکوارٹر کو تازہ ترین حالات سے مطلع کیا اور اپنے جوانوں کو لے کر آگے بڑھنے لگا۔



تخریب کاروں نے گھیرے میں آئی ہوئی کمپنی کی ممکنہ امداد کا راستہ روکنے کے لیے گاؤں کے قریب بہنے والی ندی کا پُل اڑا دیا تھا، ہم نے ندی اسلحے سمیت تیر کر عبور کی اور دوڑتے ہوئے اس گاؤں کی طرف بڑھے! کھیتوں میں کام کرنے والے کسان ہمیں دیکھ کر تتر بتر ہو گئے

مجھے یقین تھا کہ ان میں بھی تخریب کاروں کے ساتھی موجود ہوں گے۔

میرے جوان مل کر ایڈوانس کر رہے تھے۔

جس گاؤں کی طرف ہم جا رہے تھے وہ عوامی لیگ کا گڑھ تھا اور یہاں کا ہر فرد دشمن کے بہکانے میں آکر ہمارے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ میری توقعات کے عین مطابق گاؤں کے باہر کھیتوں میں چھپے تخریب کاروں نے اچانک ہم پر فائر کھول دیا، لیکن میں نے پلان کے مطابق صوبیدار صاحب کی کمان میں کچھ جوان یہاں چھوڑے اور باقی ساتھیوں کو نکال کر آگے لے گیا۔ گاؤں کے باہر ہی میدانِ کارزار سے فائرنگ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

میرے جوانوں نے جوشِ غضب سے نعرۂ تکبیر بلند کیا تو گھیرے میں آئے ہوئے جوانوں نے بھی "اللہ اکبر" کے فلک شگاف نعروں سے جواب دیا —— ہماری آمد نے ان کے حوصلے دوچند کر دیئے تھے! ان کی تعداد پندرہ تھی جن میں سے چھ تو جامِ شہادت نوش کر چکے تھے۔ باقی دشمن کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے تھے مگر وہ سب کے سب زخمی تھے۔ جن کے مقابلے میں تخریب کاروں کی تعداد ساٹھ ستّر کے قریب تھی۔

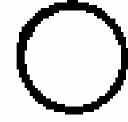
مَیں نے بڑی ہوشیاری سے اپنے جوانوں کو مختلف ٹولیوں میں بانٹ دیا تھا۔ وہ باری باری مختلف اطراف سے نعرے بلند کرتے تا کہ دشمن ان کی تعداد کے متعلق دھوکے میں رہے، مَیں نے MANOEUVRE یعنی حرکت کی فوجی چال اپنائی تھی۔ اس میں ہوشیار کمانڈر اپنے دستوں کو تیزی سے اس طرح حرکت دیتے ہیں کہ دشمن ان کی تعداد کا اندازہ نہیں لگا پاتا —— مجھے اپنے شیروں کی صلاحیتوں پر اعتماد تھا! تینوں لائٹ مشین گنیں پوزیشن بدل بدل کر مختلف مقامات سے آگ اُگل رہی تھیں اور صرف بیس منٹ کے معرکے کے بعد ہم نے گھیرے میں آئے ہوئے زخمی جیالوں کے لیے راستہ بنا لیا —— وہ پیچھے ہٹتے ہوئے ہم سے آملے۔ تخریب کاروں کے حوصلے پست ہو چکے تھے اب وہ بھاگنے کے مواقع تلاش کر رہے تھے مگر میرے جوانوں نے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔



دوسری طرف کمپنی ہیڈ کوارٹر میں میرا پیغام موصول ہوتے ہی ایک تازہ دم دستہ بڑی تیز رفتاری سے ہماری طرف بھیج دیا گیا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹہ کی لڑائی کے بعد جب نئے آنے والے جوانوں نے ہمارے ساتھ مل کر چارج کیا تو بچے کھچے تخریب کاروں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ میری درخواست پر ہیلی کاپٹر کے ذریعے میڈیکل کور بھی وہاں پہنچ چکی تھی، کیونکہ گھیرے میں آنے والے زخمیوں کی حالت خاصی خراب تھی۔ شدید زخمیوں کو ہم نے فیلڈ ہسپتال میں بھیج دیا اور باقی زخمیوں کو اسٹریچروں پر ڈال کر ہم تخریب کاروں کے ہمراہ جلوس کی شکل میں واپس روانہ ہو گئے۔

واپسی کے لیے ہم نے دوسرا راستہ اپنایا، کیونکہ زخمیوں اور تخریب کاروں کے ساتھ ندی عبور کرنا ٹھیک نظر نہیں آتا تھا۔ اس مرتبہ ایک ہیلی کاپٹر بھی ہمارے آگے آگے بطور اوپی (O-P) پرواز کر رہا تھا۔ دوپہر تک ہم ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے۔



یُوں تو مشرقی پاکستان میں تخریب کاری کے واقعات اس سے پہلے ہی شروع ہو چکے تھے —— لیکن، اُس سے قبل وہ یہ حملے چُھپ چُھپ کر انفرادی طور پر کیا کرتے اور کبھی کسی کو کُھل کر سامنے آنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔

مگر مُنظّم طور پر ڈھاکہ کے گرد و نواح میں تخریب کاروں کی پہلی بڑی کارروائی تھی جسے ہم نے کچل کر رکھ دیا تھا؛ تاہم جو قیاس آرائیاں تھیں وہ اب، حقیقت بن کر ہمارے سامنے آنے لگی تھیں —— ہم آتش فشاں کے دہانے پر کھڑے تھے اور وہ اب پھٹنے کو بالکل تیار تھا۔

مَیں نے ہیڈ کوارٹر پہنچتے ہی مکمل "رپورٹ" تیار کر لی اور اپنے کام سے فارغ ہوتے ہی مُنیر کے والدین کو بھی اُس کی شہادت کے بارے میں خط لکھنے بیٹھ گیا —— یہ کوئی ناخوشگوار فرض نہیں تھا۔

اور نہ ہی میں بادلِ ناخواستہ ادا کر رہا تھا! ایک سپاہی کی منزل ایک باوقار شہادت

کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتی ہے ؟

——— وہ خوش نصیب لوگ تھے جو سُرخرو ہو کر اللہ کی عدالت میں جا پہنچے تھے !

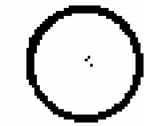
ہم فوجی شہیدوں کی موت پر نوحے نہیں پڑھا کرتے ، نہ ہی تعریف کرتے ہیں ! ہمیں علم ہے وہ ان تمام تکلفات سے بے نیاز ہیں، لیکن ——— وہ جو ایک اَن دیکھا، اَن جانا سا رشتہ ہمیں ایک زنجیر کی شکل میں ایک دوسرے سے وابستہ کر دیتا ہے۔ اس کی صداقت سے بھی تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔

——— جب مجھے منیر کے بچپن کی منگ کا خیال آتا جس نے پانچویں روز سہاگن بننا تھا اور جو سہاگ کی مہندی رچائے آنکھوں میں جانے کیا کیا سپنے سجائے اُس کی منتظر تھی ! تو یہ سوچتے ہی میرا دل بیٹھنے لگتا۔

اپنے مختصر سے خط میں، مَیں نے اُن کے جیالے کی دلیرانہ شہادت کی اطلاع دیتے ہُوئے اُنہیں خوش بخت گردانا اور شہید کے درجات کی بلندی کے لیے کمال انکساری سے دعائیں کیں۔

مَیں نے انھیں یہ بھی لکھا کہ ! وہ ——— میری آنکھوں کے سامنے شہید ہوا ہے اور انھیں مَیں گاؤں آکر اُس کے ملے جلے کی کہانی سناؤں گا۔

شہدا کی لاشیں تابوتوں میں بند کر کے اُن کے سامان سمیت اُن کے گھروں کو روانہ کر دی گئیں ———



اگلے چند روز تو انٹیلی جنس کی رپورٹوں کے مطالعے ہی میں گزر گئے ——— اور آخر ایک شام ——— میرے لیے وہ حکم آ گیا جس کی خصوصی تربیت دے کر مجھے یہاں بھیجا گیا تھا۔

ہماری اطلاع کے مطابق : "جیسور کے نزدیک ایک ایسے فوجی کیمپ کا سُراغ ملا تھا، جہاں سے تخریب کاروں کو ٹریننگ دے کر مشرقی پاکستان میں داخل کیا جاتا تھا !" ——— انٹیلی جنس نے یہ بھی بتایا تھا کہ جس مقام پر انھیں ٹریننگ دی جا رہی ہے، وہاں اُن کے لیے گولا بارود



کے خاصے ذخائر بھی مختص کر دیے گئے ہیں۔

میری خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا ——— درحقیقت میں اپنے صحیح مشن پر اب پہلی بار مامور ہُوا تھا : ——— ایک جہاز مجھے منزل کی طرف لے گیا۔

ہم جیسور کے قریب ایک فوجی اڈے پر اُتر گئے، جہاں سے ایک تیز رفتار جیپ مجھے سرحدی پوسٹ پر لے آئی ! یہاں ——— ایک کرنل اور ایس۔ایس۔جی (کمانڈوز) کے ایک کیپٹن اپنی کمپنی کے جوانوں کے ساتھ میرے منتظر تھے۔

کرنل تو تھوڑی دیر بعد رخصت ہو گئے، لیکن ——— جانے سے پہلے انہوں نے مجھے اور کیپٹن کو ہمارے مشن سے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا ! جاتے جاتے انھوں نے ایک مرتبہ پھر میری طرف بغور دیکھا، کندھے پر ہاتھ رکھا : "گڈ لک مائی بوائے" اور آہستہ سے خدا حافظ کہتے ہُوئے پوسٹ سے باہر نکل گئے۔ رات کے پچھلے پہر ہم لوگ وائیٹ لائین پر پہنچ گئے تھے۔

سرحد پر پہنچ کر کیپٹن صاحب نے ہمیں ہدایات دیں۔ ایک گہری نظر ہم سب پر ڈالی اور MOVE کا حکم دے کر آگے آگے چل دیے۔ ان کے پیچھے تین جوان تھے اور آخر میں مَیں ہم سب اپنی تربیت کے مطابق ایک دوسرے سے فاصلہ رکھ کر اور سیدھی قطار میں چل رہے تھے۔ آرمی کی اصطلاح میں یہ "حساس علاقہ" SENSITIVE AREA تھا۔ سرحدوں کا تصور مٹ چکا تھا۔ روزانہ دونوں اطراف سے درجنوں پارٹیاں ایک دوسرے کے علاقے میں گھات لگانے جایا کرتی تھیں۔

ہر روز بھارتی ایجنٹ اسلحہ اور پلان لے کر مقامی غداروں سے رابطہ قائم کرتے تھے۔ ایسے علاقے جہاں دشمن کے کمانڈوز کا حملہ متوقع ہو عموماً کچھ زیادہ ہی کیموفلاج رکھے جاتے ہیں اس کی ایک وجہ تو شاید جنگی حکمتِ عملی ہو، لیکن زیادہ تر خطرہ پیٹرول پارٹیوں یا اُن کے اٹیک کا ہوتا ہے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق یہاں مختلف مقامات پر دشمن نے زمین دوز مُرنگیں (مائنز) بچھا رکھی تھیں۔

کمانڈوز موت سے نہیں ڈرا کرتے، لیکن مشن ادھورا چھوڑ کر مرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ رات کے اندھیرے میں بے احتیاطی سے مائنز پر پاؤں پڑ جائے تو اپنے ہی پرخچے نہیں اڑتے، اس

کے ساتھ ہی دُور دراز دھماکے سے سویا ہوا دشمن بھی بیدار ہو جاتا ہے اور چند کمانڈوز جو گھیرے میں آ چکے ہوتے ہیں، سوائے اس کے اور کچھ نہیں کر سکتے کہ بہادری سے بے بسی کی موت مر جائیں۔ ہم ہر قدم پھونک پھونک کر رکھ رہے تھے۔ کیپٹن صاحب خاصے تجربہ کار کمانڈر تھے اور اس مہم کی اہمیت کے پیشِ نظر ہی انھیں ہماری کمانڈ سونپی گئی تھی۔ جہاں انھیں شک گزرتا تھا رک جاتے اور ہمیں وہیں ٹھہرنے کا حکم دے کر خود آگے نکل جاتے۔ جب تک وہ تسلی نہ کر لیتے ہم وہیں دبکے رہتے۔

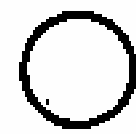
ہم دشمن کے علاقے میں تقریباً تین چار میل گھس چکے تھے۔ چاروں سمت پھیلا پر ہول سناٹا کسی مینڈک کے ٹرانے سے چند لمحوں کے لیے مجروح ہوتا پھر وہی گھمبیر سناٹا چھا جاتا۔ دشمن کے علاقے میں کی جانے والی کسی کارروائی میں، میں پہلی مرتبہ حصہ لے رہا تھا۔ اس سے پہلے ٹریننگ میں ہم نے جانے کتنی بار چھپ چھپ کر گھات لگائی تھی۔ دشمن کے انتظار میں راتیں آنکھوں میں کاٹی تھیں۔ ہماری اسکیم اکثر نمبر ون ہوتی تھی۔ آج مجھے اپنی آزمائش ہی نہیں کرنا تھی، بلکہ اپنے استادوں کی دی ہوئی تربیت کو بھی آزمانا تھا۔ اپنے والد کی سنائی ہوئی تمام کہانیاں ایک ایک کر کے میرے لاشعور میں جاگ رہی تھیں وہ اکثر چھاپہ مار کارروائیوں میں حصہ لے چکے تھے اور بڑے فخر سے ہمیں اپنے کارنامے سنایا کرتے تھے۔

"اپنے سب سے بڑے دوست بھی تم خود ہو اور سب سے بدترین دشمن بھی تم،" ٹریننگ کے دوران انسٹرکٹر کے یہ الفاظ میرے ذہن پر نقش تھے۔ ہمارا ایک ہی ہتھیار تھا، "خود اعتمادی اور اللہ کی نصرت پر ہمارا پکا ایمان"، تربیت کو کسی فوجی کی زندگی میں واقعی ایک اہم مقام حاصل ہے، لیکن آج مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کچھ دوسرے عناصر بھی مجھ پر اثر انداز ہو رہے ہیں: میرا ایمان اور دشمن سے ٹکرا جانے کا عزم! ہم بقا کی جنگ لڑ رہے تھے اور ___ ہمارا واسطہ ایک گھٹیا دشمن سے تھا۔ جس نے ہمیں ختم کرنے کے لیے بڑے گھٹیا اور پست حربے آزمائے تھے۔



ہم ٹارگیٹ کے نزدیک پہنچ چکے تھے یہ علاقہ کیپٹن صاحب کا دیکھا بھالا لگتا تھا۔ وہ ہمیں محفوظ طریقے سے یہاں تک لے آئے تھے۔ اب پلان کے مطابق ہم دو ٹولیوں میں بٹ گئے۔ ایک ٹولی کیپٹن اور ایک جوان پر مشتمل تھی جب کہ دوسری ٹولی میں میرے ساتھ دو جوان تھے۔ ہم ایک خشک نالے میں جو شاید برسات کے دنوں میں پانی کی گزرگاہ رہتا ہوگا، بیٹھے تھے۔ اس کے دونوں کناروں پر بڑے بڑے اور گھنے سرکنڈوں کا سلسلہ دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔

کیپٹن اور میں نالے میں چھوٹا سا نقشہ بچھائے بیٹھے تھے جبکہ جوان سرکنڈوں میں پوزیشن لیے اگلے حکم کے منتظر تھے۔ کیپٹن پنسل ٹارچ کی روشنی میں مجھے جزئیات بتا رہے تھے۔ چند منٹ کے بعد ہم دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُنھوں نے میری پیٹھ تھپک کر مجھے "گڈ لک" کہا اور اپنے ساتھی کے ہمراہ اندھیرے میں رینگ گئے۔ میں اپنے دونوں جوانوں کے ساتھ نشانے کی طرف چل دیا۔ ہم سرکنڈوں اور قدرتی جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپ چھپ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ میری آنکھیں اب اندھیرے میں دُور دُور تک دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں ___ ہمارے سامنے ایک نیم دائرے کی شکل میں اسلحے سے بھرے دشمن کے ٹرک کھڑے تھے اور ان کے قریب دو پہرے دار شاید آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میرا اشارہ پاتے ہی دونوں جوان میرے ساتھ ہی زمین سے چپک گئے اب ہم کہنیوں کے بل رینگتے ہوئے ان کی سمت بڑھ رہے تھے۔ خود رو جھاڑیاں ہماری مددگار تھیں۔ ایک جھاڑی کے نزدیک ہم رُک گئے۔ ایک جوان کو یہاں بیٹھنے کا اشارہ کر کے دوسرے کو میں نے دوسری طرف روانہ کر دیا۔ جھاڑی میں بیٹھے جوان نے دونوں پہرے داروں کو اپنے نشانے پر لے رکھا تھا۔



کمانڈوز کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ کوئی شور شرابہ کیے بغیر اپنا مشن پورا کر لیں، کیونکہ دشمن ہوشیار ہوتا ہے اور خصوصاً ایسے مقامات پر جہاں کمانڈوز کا حملہ متوقع ہو، منتظر رہتا ہے۔

میں پیٹ اور کہنیوں کے بل رینگتا اب اس جگہ پہنچ چکا تھا۔ جہاں سے میرے اندازے کے مطابق پہرے دار کو واپس گھومنا تھا۔ چہرے پر ملی سیاہی کی وجہ سے میں اندھیرے ہی کا ایک حصّہ بن گیا تھا نائلون کی ایک چھوٹی سی رسّی میرے ہاتھ میں تھی۔ انتظار کی شدّت سے میرے اعصاب تڑخنے لگے تھے۔ وہ کم بخت ابھی تک خوش گپیوں میں مصروف تھے، حالانکہ اصول کے مطابق انھیں چلتے رہنا چاہیئے تھا۔ اس بات سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ انھیں اپنے کسی افسر کی اچانک آمد کا خطرہ نہیں، اسی لیے وہ اتنے غیر محتاط تھے۔ تقریباً پانچ منٹ کے اعصاب شکن انتظار کے بعد وہ اپنی اپنی جگہ سے ہلے۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوتی جا رہی تھیں اور رگوں میں انگارے دوڑنے لگے تھے اپنے وجود کی تمام تر قوّت ہاتھوں میں سمیٹے میں چیتے کی طرح زمین سے چپکا اپنے شکار کا گلا دبوچنے کے لیے بیقرار ہوا جاتا تھا۔ اس کے قدموں کی آہٹ اب آہستہ آہستہ میرے قریب آتی جا رہی تھی۔ اپنی رائفل اس نے بے پروائی سے کندھے پر لٹکا رکھی تھی اور خود مدھم سروں میں کچھ گنگناتا آنے والی قیامت سے بے خبر قدم بہ قدم میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی نظریں اپنی دوسری تنصیبات پر گڑی تھیں۔ میرے اور اس کے درمیان ایک چھوٹی سی نہ ہونے کے برابر جھاڑی حائل تھی جس کا میں خود بھی ایک حصّہ بنا ہُوا تھا۔ کمانڈوز کو دورانِ تربیت سب سے زیادہ توجہ سے یہی بات سکھائی جاتی ہے کہ وہ خود کو دوسروں کی نظروں سے کس طرح محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

اچانک میرا دل اچھل کر حلق میں اٹک گیا۔ میری نظریں اس کے قدموں پر جمی تھیں جو میرے سر سے بمشکل تین فٹ کے فاصلے پر آ کر ٹھہر گئے تھے۔ میری ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ رہی تھیں کسی بھی لمحے ہمارا جھاڑی میں چھپا ساتھی اس پر فائر کر سکتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اپنی تربیت کے مطابق وہ آخری لمحوں تک خود پر کنٹرول رکھتا، لیکن بہر حال میں اس کا کمانڈر بھی تھا اور پاکستانی سپاہی کے لیے اپنے کمانڈر کی جان خطرے میں دیکھنا ناممکن ہے۔ اس کی چلائی ہوئی گولی سے میری جان تو وقتی طور پر بچ جاتی لیکن ہمارے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جاتا۔

میں دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ الٰہی یہ کم بخت اپنی جگہ سے ہلے۔ شاید قدرت



کو میری حالت پر رحم آ گیا اور اس کے قدم اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ اب میں اسے مزید مہلت دینے کے لیے تیار نہ تھا جونہی وہ مجھ سے ایک ڈیڑھ گز آگے جا کر واپسی کے لیے گھوما میں نے جست لگا کر نائلون کی ڈوری اس کے گلے میں ڈال دی اور بمشکل بیس پچیس سیکنڈ میں وہ قیدِ حیات سے چھٹکارا پا گیا۔ میں نے انتہائی پھرتی سے اسے زمین بوس ہونے سے پہلے ہی پیٹھ پر لاد کر اس جھاڑی میں پھینک دیا جہاں میں فرشتۂ اجل بن کر چند منٹ پہلے اس کا منتظر تھا۔

اس کے ساتھ ہی میں تیزی سے رینگتا ہوا اس جھاڑی میں پہنچ گیا جہاں ہمارا تیسرا ساتھی ڈیوٹی دے رہا تھا میرا دوسرا ساتھی جسے دوسرے پہرے دار کو جہنّم واصل کرنا تھا اُسے شکار کو شاید بہت تھوڑی مہلت نصیب ہوئی تھی۔

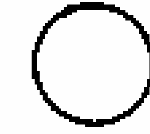
میرا اشارہ پاتے ہی وہ دونوں بھی بجلی کی سی پھُرتی کے ساتھ اپنی جگہ سے نکلے اور ان بڑے بڑے ٹریلروں کے نزدیک پہنچ گئے۔ جن پر ایمونیشن اور گولہ بارود لدا ہُوا تھا۔ میں مشین گن لیے ان پر نظریں گاڑے وہیں بیٹھا رہا۔ تقریباً دو منٹ بعد وہ واپس آئے انھوں نے مخصوص مقامات پر ڈیٹونیٹر لگا دیے تھے اب ہم تینوں جھکتے ہوئے تار اپنے پیچھے بکھیرتے وہاں سے دُور ہٹتے جا رہے تھے۔ ایک محفوظ اور مخصوص جگہ پہنچ کر میں نے تار بیٹری سے منسلک کر دیا۔

ہمارا ایک ساتھی اپنی لائٹ مشین گن زمین پر ٹکائے کچھ فاصلے پر مورچہ جما کر بیٹھ رہا۔ دوسرا ایک لیور پر ہاتھ رکھے میرے اشارے کا منتظر تھا۔ میں نے ایک طرف ہٹ کر اپنی جیب سے ننھا سا ٹرانسمیٹر نکالا تو مجھے احساس تھا کہ ان مورچہ بندیوں کی مخالف سمت میں میرے کیپٹن صاحب کتنی بے قراری سے میرے "کاشن" کے منتظر ہوں گے۔ اس علاقے میں ٹرانسمیٹر پر گفتگو کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ چاروں طرف بھارتی فوج ڈیپلائے تھی اور کوئی فریکوئنسی محفوظ نہیں تھی۔

ٹرانسمیٹر آن کر کے میں نے سلسلہ ملنے پر صرف ایک "کوڈ ورڈ" کہا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد ہماری مخالف سمت سے زوردار دھماکے کی آواز گونجی۔

"ڈاؤن" میں نے جوشِ غضب میں اپنے ساتھی کو حکم دیا۔

اس کالیور والا ہاتھ نیچے جُھکا اور فضا میں زوردار دھماکوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ سیاہ رات ننگی ہوگئی ایمونیشن پھٹنے سے دھماکوں کے ساتھ اتنی تیز چمک پیدا ہوتی کہ اس سمت دیکھنا محال ہو جاتا۔ خیموں میں نیند میں مدہوش سپاہی دیوانہ وار اُٹھ کر باہر بھاگتے اور لقمۂ اجل بن جاتے کیونکہ مخالف سمت کیپٹن صاحب نے بھی یہی کارنامہ انجام دیا تھا۔ میرا جی تو یہی چاہتا تھا کہ وہ آتش و آہن جو دشمن نے ہمیں پھونکنے کے لیے اکٹھا کر رکھا تھا دشمن کو اُس کا ایندھن بنتے دیکھتا رہوں، لیکن حالات کسی اور امر کے متقاضی تھے۔ تقریباً پانچ منٹ تک ہماری لائٹ مشین گن جان بچانے کے لیے بھاگنے والے سپاہیوں کو چاٹتی رہی ——— پھر مَیں نے اپنے جانبازوں کو مراجعت کا حکم دے دیا۔



ہم تیزی سے اپنی سرحدوں کو پلٹ رہے تھے ——— جو لوگ فوجی زندگی کا تجربہ رکھتے ہیں وہی اچھی طرح جان سکتے ہیں کہ واپسی کا سفر، روانگی سے کئی گنا زیادہ خطرناک ہوتا ہے پہلے دشمن کسی حد تک بے خبر تھا لیکن اب اس علاقے کے چپے چپے میں پھیلی ہوئی افواج کو اطلاعات مل چکی تھیں کہ: پاکستانی کمانڈوز ان کے علاقے میں در آئے ہیں! ابھی ہم بمشکل ڈیڑھ دو فرلانگ ہی چل پائے تھے کہ ہمیں ٹھٹک کر رُک جانا پڑا ——— کمانڈوز کی چھٹی حس عام فوجیوں سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ میرے ایک ساتھی نے لیٹ کر اپنا ایک کان زمین سے لگا دیا۔ وہ شاید کوئی سُن گُن لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

چند سیکنڈ کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور ہاتھوں کے مخصوص اشارے سے اس نے قریب ہی دشمن کے دستوں کی نقل و حرکت کی نشان دہی کر دی۔ یقیناً یہ LOCATING FORCE (لوکیٹنگ فورج) کے دستے تھے جو ہمارے تعاقب میں چلے آ رہے تھے۔

ان دستوں کا تعلق بھی فوج کے اسپیشل سروس گروپ ———(ایس۔ ایس۔ جی) سے ہوتا ہے اور انھیں کمانڈوز سے نمٹنے کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔ میرے اندازے کے عین مطابق



دشمن نے "گھیرو اور مار ڈالو" والی چال چلی تھی۔ انھوں نے ہمارے گرد گھیرا ڈال لیا تھا۔ یہاں سے سرحد تک فوج پھیلی ہوئی تھی جواب منصوبہ بندی کے ساتھ ہماری آمد کی منتظر تھی۔ ہماری تمام تر توقعات خدا کی ذات اور اندھیری رات سے وابستہ تھیں۔

رات کو انجام پانے والی مہمات میں سب سے زیادہ خطرہ اس بات کا ہوتا ہے کہ پٹرولنگ پارٹیاں یا حملہ آور پارٹیاں بھٹک کر کہیں دشمن کے علاقے میں نہ پہنچ جائیں۔ لوکیٹنگ فورس عموماً یہ حربہ استعمال کرتی ہیں کہ وہ مشکوک مقامات کے اردگرد جہاں اُنھیں چھاپہ مار کمانڈوز کی موجودگی کا شک گزرے، فائرنگ کرواتے ہیں۔ ان کی حتی المقدور کوشش یہی ہوتی ہے کہ صبح تک چھاپہ مار کمانڈوز کے اردگرد فائرنگ کر کے انھیں اپنے علاقے ہی میں بھگاتے رہیں اور دن نکلنے پر انھیں چوہوں کی طرح پکڑ لیں۔

مَیں نے ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑی میں نصب قطب نما دیکھا اور اپنی صحیح سمت کا تعین کرنے کے بعد دونوں جوانوں کو "اسٹینڈ ٹو" پوزیشن میں آگے بڑھایا۔ ہم تینوں اب پھیل کر آگے کی سمت بڑھ رہے تھے سرحد ابھی کم از کم دو ڈھائی میل دُور تھی اور یہ کوئی معمولی فاصلہ نہیں تھا۔ خصوصاً ان حالات میں تو کسی بھی بات کی توقع کی جا سکتی تھی۔ ہم جُھکی ہُوئی پوزیشن میں تیزی سے بغیر آواز پیدا کیے چل رہے تھے اچانک زمین نے جیسے میرے پاؤں پکڑ لیے ——— میری دائیں سمت سے روشنی کا ایک طوفان اُمڈ رہا تھا جو آسمان کی وسعتوں میں پھیلتا جا رہا تھا۔ شاید دشمن نے اس علاقے میں "سرچنگ ایکوپمنٹ" چھپا رکھے تھے اور زمین کے سینے میں دفن کسی دھات کے آلے نے ہماری موجودگی کا انکشاف کر دیا تھا:

دشمن "روشنی راؤنڈ" فائر کرنے لگا۔!

میرے دونوں ساتھی منجھے ہوئے کمانڈوز تھے اور ۶۵ء کی جنگ میں بھی کئی کارنامے سرانجام دے چکے تھے۔ ان کے لیے یہ صورتحال نئی نہیں تھی اور نہ ہی ہم لوگ ایسی باتوں سے گھبرایا کرتے ہیں۔ ہم تینوں نے ایک دوسرے سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ایک ساتھ قریبی کھائی میں

پھلانگیں لگا دیں: ایسے چھوٹے چھوٹے ندی نالے، ٹیلے اور جھاڑیاں وغیرہ کسی بھی کمانڈو کے لیے قدرت کا بہترین عطیہ ہوتے ہیں۔

خیریت گزری کہ ابھی تک ہم روشنی کی زد میں نہیں آئے تھے! ہم نے اسی کھائی کو مورچہ بنالیا۔ میرے دونوں ساتھیوں نے وہاں لائٹ مشین گن چند ہی سیکنڈ میں نصب کرلی۔ مَیں نے ابھی تک فائرنگ کا حکم نہیں دیا تھا، کیونکہ خواہ مخواہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے ہم قائل نہیں ہوتے۔ ہمارا تعاقب کرنے والے قریب سے قریب تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ہم دونوں کے پاس اسٹین گنیں تھیں یا پھر دستی بم جن کی حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی۔

"سر، گن ڈیوٹی والے جوان نے سرگوشی کی۔

اور اُس کے اس طرح آواز دینے کا مطلب تو مَیں بخوبی سمجھتا تھا، لیکن ——— اُسے کیا جواب دیتا؟ ——— دائیں سمت سے دشمن کا شور صاف سُنائی دے رہا تھا! وہ اگرچہ ابھی تک اسٹین گن کی رینج میں نہ آئے تھے ———

"موت ہمارے دروازے پر دستک دینے لگی ہے!" مَیں نے جُھرجُھری لی۔

"معاملہ یقیناً اب ایسا رُخ اختیار کر گیا ہے کہ ——— ایک جان کی قربانی دیئے بغیر، باقی دو جانیں کسی صورت نہیں بچائی جاسکتیں!"

خیالات کا ایک سمندر میرے سینے میں کروٹیں لینے لگا۔

مجھے اپنے استاد کی باتیں یاد آنے لگیں، "فوجی زندگی میں جذباتی مرحلے تو اَن گنت آتے ہیں، لیکن ایک اچھے کمانڈر کی خوبی یہ ہے کہ وہ عقل اور ہوش کے دامن کو کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتا! اُس کے نزدیک ایک جوان کی شہادت کا دُکھ بھی، کسی طرح کمپنی کی موت سے کم نہیں ہوتا!"

○

——— لیکن، یہ سب کچھ ایک ڈسپلن کی حد تک ہے! وگرنہ، اصل میں وہ سب لوگ



ایک کنبے کی طرح ہی آپس میں مل جُل کر رہتے ہیں......

"سر!"

مشین گن والے جوان نے میرے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا: "اب آپ کو یہاں سے چلے جانا چاہیئے۔"

مَیں نے اُس کی جانب دیکھا: اُس کی اُنگلی ٹریگر پر رکھی تھی اور ——— اُس کی ملتجی نگاہیں ہماری طرف تھیں!

"میرا جوان مجھ سے موت کے مُنہ میں کُودنے کی اجازت مانگ رہا ہے!" مَیں سوچنے لگا: ——— "مَیں اُسے کیوں مرنے دُوں؟"

مَیں چند لمحات کے لیے جذباتی ہُوا چاہتا تھا لیکن ——— دوسرے ہی لمحے مَیں پاکستانی فوج کا آفیسر بن چکا تھا!!

"وِش یُو گڈ لک۔ خدا حافظ۔" مَیں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

"رب راکھا گرائیں۔" میرے دوسرے ساتھی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

ابھی ہم بمشکل پندرہ بیس گز ہی چلنے پائے تھے کہ اچانک فضا میں "اللہ اکبر" کی گُونج سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی ریٹ.... ٹٹ.... ٹٹ کا شور ——— دشمن غالباً بہت نزدیک آگیا تھا! ہمارے ساتھی کے دلیرانہ اقدام نے ہمارے تعاقب میں بڑھتے ہُوئے فوج کے قدم روک دیئے!! نعرے کی للکار سنتے ہی میرا ہمراہی ٹھٹک کر رُک گیا۔ غالباً اس کی غیرت نے اپنے سنگی کو اکیلا چھوڑنا گوارا نہیں کیا تھا۔ یہ لمحہ جذباتی ہونے کا نہیں تھا۔ ہوش میں آنے کا تھا مَیں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا اور اپنے ساتھ ہی بھگانے لگا۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ نیم دلی سے بھاگ رہا ہے۔

اچانک فضا زوردار دھماکوں سے لرزنے لگی۔ یہاں کہیں قریب ہی کوئی فیلڈ رجمنٹ ڈیپلائے تھی جس نے ہم پر ہاوٹزروں (HOWITZERS) سے گولہ باری شروع کر دی۔ مجھے

دشمن کی بزدلی پر طیش آنے لگا۔ ہم کوئی ٹینک لے کر تو اس پر نہیں چڑھ دوڑے تھے نہ ہی ہماری
تعداد سینکڑوں میں تھی۔ نہ جانے کم بختوں کے پاس پھونکنے کے لیے اتنا اسلحہ کہاں سے آگیا تھا؟
ہاؤٹزر تقریباً پچیس پونڈ کا گولہ فائر کرتی ہے، مگر اس سے یہ ایک سہولت ہمیں مل گئی
کہ اس کا گولہ چونکہ فضا میں اُونچی مار کرتا ہے۔ اس لیے ہم کسی حد تک محفوظ بھی تھے شاید قریب
ہی کہیں ان کی کوئی بیٹری ڈیپلائے تھی اور کسی بوکھلائے ہوئے آفیسر نے اس کو لڑائی میں جھونکنے
کا فیصلہ کر لیا تھا، ہم دونوں سانس روکے ایک کھڈ میں بیٹھے تھے چند منٹ بعد یہ بلا ٹل گئی۔
شاید دشمن کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہو گیا تھا یا پھر سرحد قریب ہونے کی وجہ سے اس نے
ہیوی فائرنگ کے جواب میں ہونے والے ردِعمل سے بچنے کے لیے ایسا کیا تھا۔
ہم دونوں تیزی سے باہر نکل آئے۔ اب ہلکے اسلحے کی فائرنگ سنائی دے رہی تھی۔ پھر وہ
بھی خاموش ہو گئی۔

ہمارا شیر امر ہو گیا!!

میں نے تقریباً بھاگنے کی رفتار اپنالی تھی ایک فرلانگ چلنے کے بعد ہم پھر زمین سے
چپک گئے۔ ایک مرتبہ پھر بائیں سمت سے روشنی کا ایک طوفان اٹھا —— میں نے اس بات کا
اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم بھارتی فوج کی پوزیشنوں کے درمیان سے گزر رہے ہیں۔ لیٹے لیٹے سر اٹھا
کر میں نے چاروں سمت کا جائزہ لینا چاہا تو خون کی گردش رکتی محسوس ہونے لگی۔ مجھ سے بمشکل
پندرہ بیس گز کے فاصلے پر ایک بنکر سے ایک میڈیم گن کی نال باہر جھانکتی دکھائی دے رہی تھی۔
"کم آن" میں نے اپنے ساتھ لیٹے جوان کو حکم دیا اور کہنیوں کے بل پیچھے ہٹنا شروع کیا۔
میں تقریباً پانچ چھ گز پیچھے ہٹ آیا، لیکن وہ جوان بدستور وہیں رہا۔ مجھے کچھ غصہ بھی آیا دوبارہ اس
کے قریب پہنچ کر میں نے اس کے کندھے کو جھنجھوڑا۔

"کم آن۔ موو۔"

جوان نے میری طرف گردن موڑی۔ اس کی آنکھوں میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔



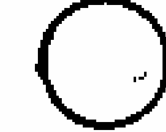
"سر ہم کو معاف کرنا ہم واپس نہیں جائے گا۔" جانے اس کے لہجے میں کیا چھپا تھا کہ سرد سی
ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ میں نے حیرت اور غصے کے ملے جلے تاثرات سے اس کی
طرف دیکھا۔

"صاب فور دل میرا گرائیں تھا! ہم فوج میں اکٹھا بھرتی ہوا صاب! ٹریننگ بھی ایک ساتھ کیا۔
کبڈی بھی اکٹھا کھیلا زندگی بھر اکٹھا رہا اے سر! اب وہ اگلا جہان میں اکیلا کیسے جائے گا صاب!
ہم کل خدا کی عدالت میں اسکو کیا منہ دکھائیں گے صاب! ہم اپنا سنگی کو موت کے راہ پر اکیلا نہیں جانے
دے گا سر! خدارا ہمیں معاف کر دینا۔ ادھر ہمارا گاؤں کے لوگوں کو بولو، ہم نے یاری نبھا دیا۔" وہ
بول رہا تھا اور میری سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے تک رہا
تھا۔ اس نے ٹھوس دلیل دی تھی، لیکن اس کا فلسفہ مجھے کیسے ہضم ہوتا۔
اس سے پہلے کہ میں اسے خدا حافظ کہتا اس نے معذرت طلب نگاہوں سے میری سمت دیکھا
"خدا حافظ سر!" پھر وہ اندھیرے میں رینگ گیا۔
میں بے حس و حرکت اپنی جگہ لیٹا رہا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا رواں رواں مفلوج ہو چکا
ہے میری آنکھوں کے سامنے میرا جوان موت کے منہ میں جا رہا تھا اور میں اسے آواز دے کر منع بھی
نہیں کر سکتا تھا۔ تیزی سے رینگتا وہ اس گن کی نال کے نزدیک جا پہنچا۔ رُک کر اُس نے ایک نظر
پیچھے ڈالی شاید زندگی کے آخری لمحات میں بھی اسے افسر کی حکم عدولی کا احساس ستا رہا تھا۔ اپنے
پوچ سے اس نے ہینڈ گرنیڈ نکالا۔ اس کی پن نکال کر کھڑا ہو گیا۔
"اللہ اکبر" اس کی للکار گونجی اور پھر اس نے اُچھل کر گرنیڈ بنکر میں پھینک دیا زوردار دھماکہ
ہوا گن کے ساتھ گنرز کے بھی پرخچے اڑ گئے اور آسمان بھی روشن ہو گیا۔ وہ تین مورچوں کے درمیان
سٹین گن تھامے یلغار کر رہا تھا۔ میرے بدن میں یکدم انگارے دوڑنے لگے میں بجلی کی سی تیزی
سے اٹھا اور گرنیڈ پھینکنے لگا میرے ہاتھ مشینی انداز میں کام کر رہے تھے۔ اتنے تیز گرنیڈ پھینکنے کا مظاہرہ
زندگی میں اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں کیا تھا۔

تینوں مورچوں سے آگ اُگلتی گنز خاموش ہو چکی تھیں، لیکن میرا جوان موت کی شاہراہ کا مسافر بھی اپنی منزل پا گیا وہ اپنے سنگی سے شرمسار ہونا گوارا نہیں کرتا تھا۔ خدا کے حضور کیوں شرمندہ ہوتا۔ اللہ نے بھی اس کی لاج رکھ لی۔

خطرے کے احساس نے میری نس نس میں بجلیاں بھر دی تھیں۔ میں تیزی سے کرالنگ کرتا وہاں سے دُور ہی دُور ہٹتا چلا جا رہا تھا۔ نزدیک تو فی الحال کوئی مورچہ نہیں تھا، البتہ مجھ پر دُور سے کراس فائر آنے لگا تھا۔ دشمن نے اپنی تمام تر سوجھ بوجھ کے مطابق زمین کے چپے چپے پر آگ کا جال بچھا دیا تھا۔ لیکن رسم خلیلی نبھانے والے آتش دا آہن کے طوفان کب خاطر میں لاتے ہیں۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد ہی میں اپنا قطب نما دیکھ لیتا۔ میرے پیچھے بدستور فائرنگ جاری تھی! اب میں نے سیدھے ہو کر چلنا شروع کر دیا تھا۔ بڑے بوجھل قدموں اور دُکھی دل سے واپس آ رہا تھا مجھے اپنے زندہ بچ جانے پر شرم آ رہی تھی۔ زندگی میں کبھی کبھی ایسے مواقع بھی آ جاتے ہیں، جب ہمیں اپنے زندہ رہنے پر افسوس ہوتا ہے اور ہم اپنے ساتھیوں کی موت پر نعرۂ تحسین بلند کرتے ہیں ــــــ اس وقت کچھ ایسے ہی جذبات تھے میرے!! میں نے دل ہی دل میں جُدا ہونے والے ساتھیوں کے لیے فاتحہ پڑھی اور اپنے سفر پر چلتا گیا۔



صبح کے قریب جب میں اپنی پوسٹ پر پہنچا تو کیپٹن صاحب اپنے ساتھی کے ہمراہ مجھ سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔ کرنل صاحب اُن سے کچھ فاصلے پر میرے منتظر تھے۔

مجھے اکیلے دیکھ کر انھوں نے صورت حال کا اندازہ لگا لیا ہو گا، لیکن ان کے چہرے سے کسی بات کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ انھیں دیکھ کر میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا ــــــ میری آنکھیں چھلک جانے کو بے تاب تھیں، لیکن میں نے اپنے آنسو روک لیے تھے۔

"ویل ڈن" کرنل صاحب نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے میرے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ مضبوطی سے جماتے ہوئے کہا۔ انھوں نے میری جذباتی کیفیت کا بھی اندازہ کر لیا تھا۔ اس طرح



شاید مجھے نفسیاتی طور سے وہ اسٹینڈ STAND دینا چاہتے تھے۔ کیپٹن صاحب اور دوسرا جوان وہاں سے پرے ہٹ گئے۔ وہ بھی اسی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے جس سے میں گزر رہا تھا، لیکن کرنل صاحب کا چہرہ سپاٹ تھا ــــــ جذبات سے قطعاً عاری! مجھے بعد میں اپنی اس کمزوری پر غصّہ بھی آیا: نہ جانے کیوں ان کے سامنے لاکھ کوشش کے باوجود میں صبر و ضبط نہ کر سکا۔ سارے بندھن ٹوٹ گئے اور میں سسک پڑا۔

"حوصلہ کرو! میرے بچے" کرنل صاحب نے انگریزی میں فقرہ کہہ کر میری طرف پیٹھ کر لی۔

وہ دوبارہ میری جانب پلٹے تو ان کی آنکھوں میں قہر جاگ رہا تھا۔

"لواۓ کمانڈو زندہ رہنے کے لیے نہیں جایا کرتا۔ جوانوں نے اپنا مشن پورا کیا؟" ان کی آواز میں بجلی کڑک رہی تھی۔

"یس سر" میں نے مستعد ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"او کے۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے۔" یہ کہہ کر کرنل صاحب تیزی سے واپس پلٹ گئے ــــــ کیپٹن صاحب کو میں نے رومال جیب میں واپس رکھتے ضرور دیکھ لیا تھا۔

"ویل ڈن آفیسر" انھوں نے میری پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہمارا تیسرا ساتھی مجھ سے نظریں ملائے بغیر ہی واپس پلٹ گیا۔ شاید وہ اپنی کمپنی کو "سُرخروئی" کا پیغام دینے گیا تھا، کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد جب پوسٹ کے ایک کونے سے خداوند تعالیٰ کی حقانیت کا اعلان ہوا اور فلاح کا راستہ بتا کر مولوی صاحب نے نماز پڑھائی تو انھوں نے قرآن کی وہی آیات پڑھیں جن میں شہیدوں کے کبھی نہ مرنے کی منادی کی گئی ہے!! جب ہم نے سلام پھیر کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو وہاں موجود ہر شخص کی آنکھیں نم تھیں ــــــ یہ تھا وہ نذرانۂ عقیدت جو وہ اپنے عظیم المرتبت ساتھیوں کے حضور پیش کر رہے تھے۔

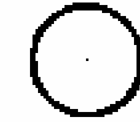
میں نے کیپٹن کی معیت میں ناشتہ کیا۔

ــــــ اس دوران وہ بڑے مؤدب ہو کر اپنے جیالوں کی شہادت کا بیان سُنتے رہے!

یہ بڑا عجیب منظر ہوتا ہے؛ یہاں کوئی بھی ان کا رشتہ دار نہ تھا ـــــــ وہ سب مختلف علاقوں کے رہنے والے تھے، مختلف بولیاں بولتے تھے لیکن اِس سب کے باوجود وہ ایک ایسے رشتے میں بندھے ہُوئے تھے کہ جیسے ایک ہی جسم کے مختلف حصّے ہوں ـــــــ جیسے اُن سب کے دُکھ سُکھ ایک ہی تھے۔

اور پھر، اُسی روز ـــــــ دوپہر کے بعد۔

ـــــــ مَیں اُس فوجی جہاز میں اپنے کمپنی ہیڈکوارٹر واپس جا رہا تھا جو جیسور کے نزدیک ایک فوجی اڈے پر کتنی دیر سے میری راہ تک رہا تھا۔



میرے ساتھی بڑی شدّت سے میرے مُنتظر تھے۔

ـــــــ مَیں اگلے مورچوں سے واپس آیا تھا، وہ میری زبانی وہاں کا آنکھوں دیکھا حال سُننے کے لیے سخت بے قرار تھے: مختلف لوگ مختلف نوعیت کے سوالات کر رہے تھے ـــــــ وہ میری زبانی اُس ایک ایک لمحے کی روداد سُننے کو بے چین تھے جو ہم نے دشمن کے قلب میں گُزارا تھا! وہ اُن سرفروشوں کے کارنامے جاننے کو بے تاب تھے جنھوں نے دشمن کی سرزمین پر اُن کا مان توڑ ڈالا تھا اور وہ ـــــــ رسمِ شبیّری کے پاسداروں کی ہر حرکت سے آشنا ہونے کے لیے سخت مُضطرب تھے جنھوں نے جان کا نذرانہ پیش کرتے وقت کبھی بُخل سے کام نہ لیا تھا۔

مگر، مَیں انھیں کیا بتاتا؟

ـــــــ کوئی ایک کہانی ہوتی تو سُنا دیتا! کس کس جیالے کا تذکرہ کرتا؟ کس کس جاں نثار کی جاں فشانیوں کا بیان کرتا؟

ـــــــ وہاں تو ہر جیالے سے ایک کہانی وابستہ تھی! ہر جانباز ایک روایت بنا بیٹھا تھا اور یہ سب کہانیاں اور روایات اُنھوں نے اپنے تازہ خون ہی سے تو قلمبند کی تھیں۔

ہیڈکوارٹر پہنچتے ہی گاؤں سے مُنیر کی والدہ کا خط بھی موصول ہو گیا ـــــــ اُس نے بڑی عجیب



عجیب سی باتیں تحریر کی تھیں ـــــــ شہید کی ماں نے لکھا تھا:

ـــــــ میرا بیٹا کتنے دن لڑنے کے بعد شہید ہُوا؟ اُسے گولی کہاں لگی تھی؟ گولی لگنے کے کتنی دیر بعد اس نے شہادت پائی اور ـــــــ

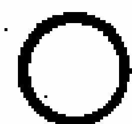
ـــــــ آخری وقت اس نے کس کس کو یاد کیا؟ نزع کا عالم کتنی دیر تک طاری رہا اور میرے بیٹے نے جان جانِ آفریں کو سونپتے وقت کوئی حیل وحجت تو نہیں کی؟

اس کا ایک ایک سوال برچھی کی طرح میرے کلیجے میں اُتر رہا تھا۔ فوجی زندگی کی ابتدا ہی میں قدرت نے مجھے کیسے امتحان میں ڈالا تھا۔ مَیں اس کے سوالوں کا کیا جواب دیتا؟ وہ اپنے جگر گوشے کے آخری لمحات کی کہانی سُننا چاہتی تھی جو اس سے ڈیڑھ ہزار میل دُور اس سے چھِنا تھا جہاں ماؤں کے لال ان کی آنکھوں سے دُور ذبح ہو رہے تھے اور کوئی ان کا پُرسانِ حال نہیں تھا۔

انھی دنوں میرے والد نے بھی اپنے خط میں لکھا بیٹا! مُنیر پہل کر گیا۔ میرے پاس سرخرو ہو کر آنا ورنہ مُنیر کی طرح خدا کی عدالت میں سرخرو ہو جانا۔" آخر میں انھوں نے لکھا "مُنیر کا والد تم سے ملنے کے لیے بے چین ہے وہ اپنی آنکھوں سے وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہے جہاں اس کے لختِ جگر نے شہادت پائی۔ وہ مُنیر کے آخری لمحات کی کہانی تم سے سُننا چاہتا ہے۔"

"اُف میرے خدایا! زندگی ایسے کڑے امتحانوں سے بھی گزرا کرتی ہے۔ مَیں کیسے اس اَلم نصیب کا سامنا کر پاؤں گا۔ ان کی آنکھیں مجھے ڈس نہ لیں گی کیا؟"

پژمُردہ سا اُٹھ کر مَیں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کرب کی ان دُکھی لہروں میں ڈوبتا اُبھرتا باری باری میں ان سرفروشوں کو یاد کرتا رہا ـــــــ وہ میرے پیارے جو میرے سامنے مجھ سے جُدا ہو گئے تھے ـــــــ پھر مجھے جیسے اپنی بزدلی پر طیش آنے لگا۔ مُنیر نے مر کر مجھے جینے کی راہ دکھائی تھی اس نے ایک صغراں کو مایوس کر کے لاکھوں سہاگنوں کی افشاں بھری مانگیں سجا دی تھیں ـــــــ مَیں ایک نیا عزم لے کر اُٹھا۔ اک ولولۂ تازہ کے ساتھ اپنے آپریشن روم کی طرف چل دیا



# آنسو

انتخابات ہو چکے تھے اور حسبِ توقع کامیابی نے علاحدگی پسندوں کے قدم چُومے تھے۔ نفرت کی فصل تیار ہو کر کٹنے کی منتظر تھی۔

"سنگرام۔ سنگرام"

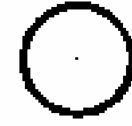
"امارادیش۔ بنگلہ دیش"

"امار نیتا۔ بنگلہ بندھو" اور اسی قسم کے دوسرے سفاکانہ نعروں سے شہر کے در و دیوار لرزنے لگے تھے ——— دلوں کی غلاظتیں آنکھوں میں ڈھل کر شعلوں کا روپ دھار گئیں۔ نفرتوں نے جلا پائی۔ 'باہر کے چودھریوں' نے گڑے مردے اکھاڑ کر مقامیوں کو بتایا: تم تو شروع ہی سے استحصال کے شکنجے میں کسے رہے ہو تمھیں تو لُوٹا جا رہا ہے۔ ارے! بزدل ہو گئے کیا؟ آگے بڑھو اور اپنا حق چھین لو۔

کرودھ کی دیوی ان کے من آنگنوں میں براجمان ہو گئی جب ہمیں زہر چکانیوں کا علم ہُوا تو دشمن وار کر چکا تھا۔ نیند کے ماتے اُٹھے اور اپنے ورغلائے گئے بھائیوں کو جھنجوڑنے لگے کہ بھولے پنچھیو بچ جاؤ، سنبھل جاؤ۔ ہوش کرو، ہم آپس میں اپنے جھگڑے نمٹالیں گے کسی کو سرپنچ بننے کا حق نہ دو۔ بندر کے ہاتھ میں انصاف کا ترازو تھماؤ گے تو کچھ ہاتھ نہ آئے گا، لیکن یہ منوجی کا وار تھا۔ اس کے پیچھے صدیوں کا تجربہ کارفرما تھا۔ اس کی پشت پناہی نسلوں نے کی تھی۔ انتقام کا میٹھا زہر انھوں نے قطرہ قطرہ کر کے بھولے بھالے بنگالیوں کے ذہن میں اتارا تھا۔ وہ کچھوے کی رفتار



ضرور چلے تھے لیکن مستقل مزاج تھے۔ عصبیت کی دوڑ جیت گئے



آج پہلی مرتبہ ہمارے آپریشن روم میں پوری سنجیدگی سے "مکتی باہنی" کا نام گونجا تھا۔ درد بھرے دل تڑپ اٹھے، پُرخلوص آنکھیں خون کے آنسو روئیں۔ خدایا! یہ دن بھی آنا تھا جب ہمیں اپنوں پر گولی چلانا پڑے گی ——— جانے کتنے دلوں سے آہیں نکلیں کتنی پیشانیاں سجدہ ریز ہوئیں پر دعائیں مستجاب نہ ہوئیں۔

"جنٹل مین یونیورسٹی سنبھالو" میرے آفیسر انچارج نے ایک فائل میری طرف بڑھا دی۔ انٹیلی جنس رپورٹ میں آج امن پسندوں کے ایک جلسے میں تخریب کاروں کے ایک حملے کی نشاندہی کی گئی تھی ———

مَیں بوجھل قدموں سے باہر کھڑی جیپ میں بیٹھ گیا۔ "آرمور" ڈیوٹی کی وجہ سے مَیں نے سادہ کپڑے پہن رکھے تھے۔ اب مجھے زیادہ کام اِسی روپ میں کرنا تھا۔ میرے ساتھ والے جوان بھی سویلین کپڑے پہنے ہُوئے تھے۔ پولیس وہاں تعینات ضرور تھی، لیکن اعتماد کس پر کرتے؟
یہ جلسہ یونیورسٹی گراونڈ ہی میں ہو رہا تھا اور محبِ وطن طلبہ تنظیموں نے مل کر کیا تھا۔ جن پر عوامی لیگ کی طلبہ تنظیم کے حملے کا ڈر تھا، کیونکہ یہ لوگ کسی کو بات کرنے کی مہلت دینے کے لیے بھی تیار نہیں۔ یونیورسٹی کے گرد کچھ مجاہد فورس کے جوان موجود تھے، لیکن جس شدت سے تخریب کار سرگرمِ عمل تھے۔ اس کے سامنے یہ لوگ بے بس ہو جاتے۔ عام نوعیت کا سیاسی جلسہ ہوتا تو اور بات تھی۔

مَیں نے جیپ جلسہ گاہ سے دور ہی کھڑی کر دی اور خود پیدل اس طرف روانہ ہو گیا۔ ایک ننھا سا جیبی ٹرانسمیٹر اور پستول میرے پاس تھے۔ جلسہ کرنے والے خاصے پُرجوش دکھائی دیتے تھے۔ مقررین دو تین فقرے کہہ کر تحسین طلب نظروں سے مجمع کی طرف دیکھتے تو نوجوان لڑکے اور لڑکیاں پاکستان اور اسلام کی حمایت میں نعرے بلند کرنے لگتے۔

مجھے وہاں کھڑے ابھی بمشکل پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ جلسہ گاہ کے سامنے بنے ہوئے ہال سے جلوس کی شکل میں مسلح غنڈے نمودار ہوئے۔ ان کی کمان ایک ہندو سرمایہ دار کا بیٹا کر رہا تھا۔ جس کا باپ علاحدگی پسندوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ اور حال ہی میں عوامی لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہُوا تھا۔

نوواردوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جلسہ گاہ پر پل پڑے۔ ان کی تعداد پچاس کے قریب ہوگی زیادہ تر لوگ لوہے کی سلاخوں اور اسی قسم کی دوسری چیزوں سے مسلح تھے۔ انھوں نے وحشیوں کی طرح سلاخوں سے بے گناہ طلبا و طالبات کو پیٹنا شروع کر دیا۔ مجاہد فورس کے جوان ان کی مدد کو آگے بڑھے تو ان کے لیڈروں نے جن میں سے بیشتر نے اسٹین گنیں اُٹھا رکھی تھیں، ان پر فائرنگ شروع کر دی۔

اب مشکل یہ تھی کہ مجاہد فورس کے جوان اگر ان کی فائرنگ کا جواب دیتے تو بے گناہ طلبہ بھی ان کی گولیوں کا نشانہ بنتے وہ بادلِ نخواستہ پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو سگنل دے دیا تھا وہ چند لمحوں ہی میں وہاں پہنچ گئے اور برق رفتاری سے حملہ آوروں پر جھپٹے۔ آرمی کو دیکھ کر تخریب کار حوصلہ ہار گئے۔ میرے جوان تربیت یافتہ تھے اور اس طرح فائرنگ کر رہے تھے کہ گولیاں سوائے حملہ آوروں کے اور کسی کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔

خود میں نے جیپ کی آڑ میں مورچہ قائم کر لیا تھا۔ شاید ایک تخریب کار نے مجھے وہاں چھپے دیکھ لیا وہ اسٹین گن تھامے جیپ کی طرف لپکا اور غصے اور نفرت سے گالیاں بکتا جیپ پر فائرنگ کرنے لگا۔ صورتحال ایسی تھی کہ اگر میں اُس پر گولی نہ چلاتا تو وہ مجھے مار ڈالتا۔ وارننگ کی مہلت بھی خطرناک تھی۔ میں نے جیپ کے نیچے لیٹ کر قلابازی کھائی اور اس کی فائرنگ رینج سے بچنے کے لیے زمین پر لڑھکنیاں لگاتے ہوئے اس پر گولی چلا دی ــــ میں الٹا لٹک کر جھولتے ہوئے بھی نشانہ بازی کی مشق میں اوّل آ چکا تھا۔ گولی اس کا سینہ چیرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں میں نے بالکل غیر متوقع طور پر اسے نشانہ بنایا تھا



اسے تو یہی اُمید تھی کہ اُس نے جو برسٹ مجھ پر پھینکا تھا وہ اپنا کام کر گیا ہوگا، لیکن نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا۔

پھر ایک لمحے کے لیے تو میں بھی سناٹے میں آگیا۔ اس نے زمین بوس ہونے سے پہلے ہی ٹریگر دبا دیا تھا، اگر میری چھٹی حس کام نہ کر جاتی اور میں اچانک ایک طرف جست نہ لگا جاتا تو میرے جسم میں کئی روشن دان اب تک نمودار ہو چکے ہوتے۔ میں نے اسے مزید مہلت دیئے بغیر ہی زمین پر گرتے گرتے نشانہ بنایا اور میری چلائی ہوئی گولی اس کی کھوپڑی میں جا گھسی۔

میں ابھی زمین سے اُٹھ کر کپڑے ہی بمشکل جھاڑ پایا تھا کہ ایک نوجوان لڑکی اور اس کے تعاقب میں خنجر بردار غنڈے کو اپنی طرف بھاگتے پایا۔ وہ بیچاری فوج کی جیپ کو جائے امان سمجھ کر اپنی عزت بچانے اس طرف بھاگ آئی تھی قتل و غارت گری کا شوق تو تھا نہیں ورنہ اسے گولی کا نشانہ بنانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ میں نے تیزی سے ان دونوں کے درمیان جست لگائی اور زمین پر لیٹے لیٹے غنڈے کو جھکائی دے کر اس کی ٹانگوں پر ایسا اڑنگا لگایا کہ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر دُور جا گرا اور وہ زمین پر لڑھکنیاں کھاتا پرے نکل گیا، لیکن حیرت انگیز پھرتی سے دوبارہ اُٹھا، اُٹھتے اُٹھتے اُس نے خنجر اُٹھا لیا اور اب خطرناک ارادے سے میری سمت بڑھا۔

اپنی دانست میں اس نے بڑا خطرناک وار کیا تھا مگر یہ الگ بات کہ میں نے جوڈو کا ایک داؤ لگا کر اُس کے بازو کی ہڈی توڑ ڈالی وہ کراہتا ہُوا زمین پر گرا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ لڑکی اس اثنا میں جیپ سے لگی پھٹی پھٹی نظروں سے یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ میں ہاتھ جھاڑتا ہوا اُس کی طرف بڑھا تو وہ بے ساختہ ڈر کے مارے مجھ سے لپٹ گئی۔ میں چکرا کر رہ گیا۔ لڑکی سسک رہی تھی میں نے اُس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے اُسے خود سے الگ کیا۔

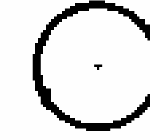
"محترمہ آپ فوج کی حفاظت میں ہیں مطمئن رہیئے۔" بمشکل میں نے یہ فقرہ ادا کیا تھا کیونکہ میرا حلق اچانک خشک ہو گیا تھا۔

لڑکی کے اوسان بحال ہوئے تو اُسے شاید اپنی لاشعوری حرکت کا احساس بھی ہُوا۔ خوف

کی جگہ خفت نے لے لی اور حیا کی پرچھائیوں نے اس کے سنولائے چہرے کو کان کی لوؤں تک سُرخ کر دیا۔ بھاگ دوڑ میں اس کا دوپٹہ بھی کہیں جا گرا تھا وہ کچھ کہنے اور نہ کہنے کے درمیان کہیں اٹکی ہُوئی تھی۔ حیا سے اس کے ہونٹ لرز رہے تھے لیکن بات مُنہ سے نکل نہیں پا رہی تھی۔ کچھ ایسی ہی حالت میری بھی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو جھلملانے لگے۔ مَیں نے اس کی حالت کا احساس کرتے ہُوئے جیپ میں رکھی ایک چادر اس کو تھما دی۔

"شکریہ" اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

"اٹ از آل رائٹ" مَیں نے کہتے ہُوئے اسے جیپ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اس نوجوان کی طرف بڑھا۔



حملہ آور بھاگ گئے تھے لیکن جاتے جاتے جہاں اپنے پانچ ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ گئے وہاں چار طالب علموں کے خون سے بھی ہولی کھیل چکے تھے۔ مجاہد فورس کا ایک جوان زخمی ہُوا تھا کچھ طالب علم بھی زخموں کی شدت سے کراہ رہے تھے۔ مَیں نے تمام زخمیوں کو مجاہد فورس کے جوانوں کی نگرانی میں ہسپتال روانہ کر دیا۔ فساد سے متاثرہ علاقے کے اردگرد اپنے جوانوں کو متعین کیا اور خود جیپ کی طرف واپس آگیا۔

"کہاں جائیں گی آپ"؟ مَیں نے شرم و حیا سے سمٹی اس لڑکی سے پوچھا جس کے چہرے پر ابھی تک خوف کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔

"جی محمد پورہ"۔ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

مجھے علم تھا کہ یہ لڑکی اگر غنڈوں کی "لسٹ" میں آچکی ہے تو وہ باہر بھی اس کے منتظر ہوں گے پھر کوئی طاقت مجھے بھی مجبور کر رہی تھی کہ اسے اکیلا نہ چھوڑوں، لیکن نہ جانے کیوں اس کے نزدیک پہنچ کر مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ میری خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد مجھ سے الگ ہو جائے۔

"ٹھیک ہے مَیں آپ کو چھوڑ آتا ہوں"۔ مَیں نے کسی فیصلے پر پہنچتے ہُوئے اس سے کہا۔ اس



کی لانبی پلکیں اُٹھیں اور مجھ پر فسوں پھونک گئیں شاید آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے میرا شکریہ ادا کیا تھا۔

جیپ اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی مَیں نے کسی اچانک خطرے کے پیشِ نظر لوڈڈ اسٹین گن اس کے اور اپنے درمیان رکھ لی، جیپ ڈھاکہ کی سڑکیں ناپنے لگی اور مجھے اپنا آپ کچھ خالی خالی سا محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی تک مَیں نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا، اپنی نظریں سامنے مرکوز رکھی تھیں ایک چور سا دل میں بیٹھا تھا۔ مَیں اس وقت اس کیفیت کو کوئی نام نہ دے سکا۔ ایک دو دفعہ چور نظروں سے اس کی جانب دیکھا تو اسے بھی اسی عمل میں مصروف پایا۔ شاید وہ بھی اسی بے نام سی کیفیت سے گزر رہی تھی۔

نہ جانے کیوں میرا جی چاہتا تھا کہ ابھی محمد پورہ نہ آئے لیکن اس کا کیا کیجئے کہ اس کا گھر آگیا۔

"کہاں اُتریں گی آپ"؟ مَیں نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"جی بس... یہیں"! اس نے جیپ روکنے کا اشارہ کیا۔

مَیں نے جیپ کھڑی کر دی مُنہ سے کچھ نہ کہا۔ وہ بھی نیچے اُتر کر کھڑی ہو گئی، صرف ایک لمحے کے لیے اس نے میری طرف آنکھ بھر کر دیکھا اور بولی: "آپ نے میری جان بچائی۔ آپ کا بہت شکریہ۔" اس نے نظریں جھکا لیں۔

"یہ ہمارا فرض ہے اس میں ایسی شکریے کی بات تو نہیں۔" مجھ سے رہا نہ گیا۔

"اچھا جی خدا حافظ" کہہ کر وہ چل دی۔

مَیں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ابھی مَیں نے اگنیشن میں چابی گھمائی ہی تھی کہ وہ ٹھٹھک کر رُک گئی۔ دوبارہ مُڑ کر وہ میری سمت آرہی تھی۔

"مَیں آپ کو چادر لوٹانا تو بھول ہی گئی۔" اس نے میرے قریب آکر کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" مَیں نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک مَیں نارمل ہو کر اس سے گفتگو ہی نہیں کر پا رہا تھا اتنے میں اس

گلی کی نکڑ سے جس کے سامنے ہم کھڑے تھے، مَیں نے ایک نوجوان کو نمودار ہوتے دیکھا وہ ہماری ہی طرف آ رہا تھا۔

"بھیا" جیسے ہی لڑکی کی نظر اُس پر پڑی وہ اس سے لپٹ گئی۔

"آلنسہ۔ کیا ہُوا؟ کیا بات ہے؟" نوجوان نے یہ سوال ہم دونوں سے کیا تھا۔

جواب میں تقریباً روتے ہُوئے اُس لڑکی نے اپنے بھائی کو ساری بات بتائی۔ نوجوان کی نظریں احساسِ تشکّر سے جُھکی ہُوئی تھیں۔ اُس نے بیقراری اور گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبا کر شکریہ ادا کیا اور مجھے گھر چلنے کی دعوت دی!

"میرا نام عثمان ہے۔ عثمان بھائی" اس نے اپنا تعارف کروایا۔

"شکریہ عثمان بھائی۔ پھر کبھی انشاء اللہ ملیں گے" مَیں نے اس سے اجازت چاہی۔

وہ لوگ تو مجھے گھر لیجانے پر بضد تھے لیکن میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ ڈیوٹی کے دوران میں کسی سویلین کا مہمان بنوں۔ چادر مَیں نے اس کے پاس ہی رہنے دی۔ اس وقت تو مجھے اپنی یہ حرکت لاشعوری ہی محسوس ہوئی، لیکن بعد میں احساس ہُوا کہ مَیں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسا کیا تھا۔

یہ میری اور آلنسہ کی پہلی ملاقات تھی۔

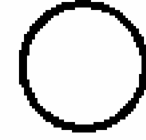
اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا، کہ پہلی ہی ملاقات میں بنگال کا جادو اپنی روایات کے مطابق سر چڑھ کر بولا تھا! ایک بے نام سی خلش نے اندر ہی اندر مجھے کاٹنا شروع کر دیا —— ایک ایسی کیفیت مجھ پر طاری ہو گئی جسے اہلِ دل شاید محبّت کا نام دیتے ہیں۔

مَیں حیران ہو گیا؟

—— محبّت تو میری موجودہ زندگی کے سلیبس کا کوئی مضمون ہی نہ تھا! میری زندگی تو جنگلوں، پہاڑوں اور ندی نالوں میں مُنقسم تھی۔ مجھے تو جینے سے زیادہ مرنے کے آداب سکھائے جاتے تھے! پھر یہ سب آخر کیا تھا——؟

اور پھر —— رات کو، جب بستر پر لیٹنے کے کافی دیر بعد تک بھی میری سوچوں پہ آلنسہ چھائی رہی تو مَیں نے شعور کی تمام تر گہرائیوں سے اس حقیقت کو قبول کر لیا کہ لانبی پلکوں اور گہری آنکھوں والی سالونے رنگ کی اس دھان پان سی لڑکی نے مجھے اندر سے توڑ ڈالا ہے —— میرے نظریات اُس سے متعلق سوچوں کی یلغار کے سامنے ریت کی دیوار بن کر بہہ گئے —— اور یہ سوچتے سوچتے میں نیند کی آغوش میں سما گیا کہ: کیا واقعی میں اُس کی زلفوں کا اسیر ہو چکا ہوں؟





اگلے روز جب شام کو میں معمول کی گشت سے واپس لوٹا تو گیٹ ہی پر مجھے پیغام ملا کہ ایک صاحب دوپہر سے میرے کمرے میں میرے منتظر ہیں۔

"کون ہو سکتا ہے؟" مَیں نے دل ہی دل میں سوچا۔

جیپ سے اُتر کر جب میں کمرے میں داخل ہُوا تو ایک بزرگ میرے پلنگ پر سر جھکائے بیٹھے تھے ان کی پگڑی قریب ہی میز پر رکھی تھی۔ میرے قدموں کی آہٹ پر اُنھوں نے نظریں اٹھائیں تو زمین نے میرے قدم پکڑ لیے۔ بالکل اسی طرح جیسے تماشہ دکھانے والا مداری کبھی جنتر منتر پھونک کر سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کے پاؤں باندھ کر اسے چلنے سے لاچار کر دیتا ہے۔! میرے سامنے چاچا منظور بیٹھا تھا۔ نائیک منیر شہید کا باپ۔ یہ ہجرت کر جانے کا لمحہ تھا۔!

"بھاگ جاؤ" میرے اندر کوئی زور زور سے چلانے لگا لیکن میں سحر زدہ سا کھنچا چلا آیا۔

"چاچا ——" میرے منہ سے آہ نکلی۔

"پُتر۔" وہ کراہا۔

ہم دونوں آپس میں لپٹ گئے۔ نظریں ٹکرائیں تو میری آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی چاچا پُرسکون تھا۔

"پُتر! مَیں رونے نہیں آیا۔ شہیدوں کے ماں باپ رویا نہیں کرتے" خاموش ہو کر اس نے پگڑی اٹھا کر سر پہ رکھ لی۔

مَیں حیرت سے چاچا منظور کے چہرے کو تک رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ یاس والم کے سائے

صاف نظر آ رہے تھے مگر آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ میں ٹکر ٹکر اسکا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ مجھے ہر لحہ یہی توقع تھی کہ یہ دیہاتی بوڑھا بلبلا اُٹھے گا۔ بین کرے گا ابھی اس کی آنکھیں اشکوں کے دریا بہا دیں گی کوئی باپ اپنے بیٹے کی موت پر اتنا صابر نہیں رہتا، لیکن اس کی آنکھوں میں تو طمانیت کا ایک ساگر ہلکورے لے رہا تھا۔ وہاں تو پدرانہ شفقت کی چمک کے سوا اور کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا اور یہ چمک دوچند ہوتی جا رہی تھی۔

اپنی عینک کے شیشے اس نے پگڑی کے پلو سے صاف کیے اور باوقار نظروں سے میری سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ "بچّہ مولا ایسے گبھرو نصیبے والوں کو دیا کرتا ہے جو ملک و قوم کا نام ہی روشن نہیں کرتے ماں باپ کا سر بھی فخر سے بلند کر دیتے ہیں۔ میرا منیر امولا کی امانت تھی میں نے بڑی جانداری سے اس کی رکھوالی کی اس میں خیانت نہیں ہونے دی روزِ قیامت میں مولا سے اپنی خدمت کا صلہ پاؤں گا بچّہ"

چند ثانیے وہ خاموش ہو گئے پھر اپنی پرعزم آنکھیں اوپر اٹھائیں "اک پھانس سی دل میں ضرور تھی بچّہ! جی چاہتا تھا اُس کی جائے شہادت دیکھوں۔ ان سے ملوں جو اس کے سنگی تھے جو اس کے ساتھ موجود تھے میرا گبھرو بڑا جی دار تھا کبڈی میں پورے گاؤں میں اس کا ثانی نہیں تھا۔ اور ہارنا تو اُس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کا ایک ہی بھائی تھا مولا نے بچپن میں اسے لے لیا۔ کوئی کوتاہی ہوئی ہوگی ہم سے اس کی حفاظت میں ۔۔۔!! اب ہمارا سب کچھ ہمارا منیر ہی تھا۔ بچّہ! سانس کی ڈوری عمر ڈھلتے ٹوٹنے لگتی ہے، لیکن یہاں تو دُکھ کے سائے لمبے ہی لمبے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ میں اُس کے ہر ساتھی سے اس کی کہانیاں سننے آیا ہوں میں چاہتا ہوں واپس جاؤں تو اس کی ماں کو سنانے کے لیے بہت کچھ لے کر جاؤں بچّہ! ہمیں کوئی شکوہ نہیں باقی عمر اس کی یادیں سمیٹتے ہی گزر جائے گی۔ بس کبھی کبھی صغراں کا خیال بے چین کیے دیتا ہے۔ جانتے ہو اس نے کیا کیا ہے؟" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

میں منہ سے بولا نہیں صرف استفہامیہ نظروں سے ان کی سمت دیکھا۔

"بچّہ! وہ منیر کی شہادت کے بعد لال جوڑا پہنے ہمارے ہاں چلی آئی ہے وہ کہتی ہے اب ساری زندگی اسی چوکھٹ پہ گزارے گی۔ سارا گاؤں منتیں کر چکا، لیکن کسی کی سنتی ہی نہیں جانے کتنی لمبی عمر ہے اُس کی۔ کیسے گزارے گی؟!!" اک ٹھنڈی آہ بھر کر وہ خاموش ہو گئے۔



میرے اندر آری سی چل رہی تھی ان کا ایک ایک لفظ نشتر بن کر دل میں اتر رہا تھا۔ شام تک منیر کی کمپنی کے جوانوں کو خبر پہنچ گئی وہ سب میرے کمرے میں شہید کے والد سے ملنے چلے آئے۔ ان سب کی آنکھوں میں پنجاب کے اس بوڑھے کے لیے جسے اس کے گاؤں سے باہر شاید کوئی پہچانتا بھی نہ تھا۔ عقیدت و احترام کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

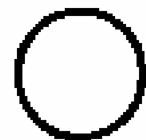
میں انھیں دو جوانوں کے ہمراہ جیپ میں بٹھا کر اس مقام پر لے گیا جہاں ان کا بیٹا امر ہوا تھا۔ چاچا منظور نے جُھک کر اس مٹی کو بوسہ دیا۔ پھر جیب سے ایک پوٹلی نکال کر اس میں مٹی بھر لی۔ اس مٹی کی سوندھی سوندھی باس میں، ان کھیتوں کی مہکتی ہریالی میں اس شہید کے لہو کی آمیزش تھی۔ وہ اسی دھرتی کا سپوت تھا اسی کے لیے کٹ گیا۔ یہ شہید اپنی دھرتی کا سہاگ ہوتے ہیں۔ ان کے لہو کی تمازت ہی اس سہاگ کی سلامتی کی ضامن ہے۔

چاچا منظور نے وہیں دو رکعت نماز ادا کی۔ ہمارے ساتھ وہ کمپنی ہیڈ کوارٹر کے دروازے تک آئے پھر وہیں اتر گئے۔ دروازے کے باہر پرچم لہرا رہا تھا اُنھوں نے احتراماً کھڑے جوانوں پر نظر دوڑائی۔

"بچّہ! اس پرچم کی ہریالی میں میرے جگر کا لہو بھی شامل ہے اس لہو کی لاج رکھنا۔" اتنا کہہ کر وہ واپس پلٹے۔ "چنگا بچّہ! رب راکھا اللہ تم سب کو امان میں رکھے۔"

"چاچا خدا کے لیے ایک رات تو میرے مہمان رہو، کسی اور ناتے بھی تم پر میرا کوئی حق ہے۔" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔

"نہیں بچّہ! میں تمھارا اتنا وقت بھی نہ لیتا لیکن اب میں مطمئن ہو کر واپس جا رہا ہوں۔ تم، تمھارا وقت، تمھاری ایک ایک سانس قوم کی امانت ہے۔" اتنا کہہ کر انھوں نے مجھے گلے لگایا پھر باری باری باقی جوانوں سے گلے ملے اور واپس چلے گئے۔



دوسرے روز جب میں کسی تازہ خبر کا منتظر تھا وائرلیس میں زندگی پیدا ہوئی۔ آپریٹر نے فوراً ایئر فون کانوں پر لگا لیا دوسری سمت سے ملنے والی اطلاع وہ اپنے سامنے رکھے کاغذ پر نوٹ کرتا جا رہا تھا۔

جیسے ہی سلسلہ منقطع ہوا وہ پھرتی سے ایئر فون اتار کر میری طرف بڑھا۔ پیغام کوڈ ورڈز میں آیا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ ایک مقامی ہمدرد کی اطلاع کے مطابق ڈھاکہ کے ایک بازار میں کچھ مشتبہ لوگ ایک مکان میں جمع ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اس نے پُراسرار لوگوں کی آمد و رفت اور کچھ حرکتیں یہاں نوٹ کی تھیں۔

جس جگہ سے متعلق اطلاع ملی تھی وہاں فوج کا پہنچ کر کارروائی کرنا بالکل بے سُود تھا ہم لوگ ظاہر ہے کہ وردیاں پہن کر جاتے اور بازار میں داخل ہوتے ہی پہچانے جاتے جس کے بعد ان لوگوں کا خبردار ہونا یقینی تھا۔ ان تخریب کاروں سے ایک بڑا خطرہ یہ بھی موجود رہتا تھا کہ یہ پُرامن شہریوں کو یرغمال بنا کر بلیک میلنگ شروع کر دیتے تھے۔ اس سے پہلے کچھ واقعات ایسے ہو چکے تھے جس کے بعد سے ہم لوگ خاصے محتاط ہو گئے تھے۔

میں نے فوراً اپنے اسپیشل اسکواڈ کے جوانوں کو بلایا۔ ہمارے صوبے دار صاحب نے ہر علاقہ اچھی طرح دیکھا ہوا تھا۔ جب کہ مجھے اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ صوبیدار صاحب نے جلدی جلدی ایک کاغذ پر لکیریں لگا کر اس کا نقشہ بنایا، اِرد گرد کے محلّوں اور سڑکوں کی نشاندہی کی اور ممکنہ خطرات کی نشاندہی بھی کر دی۔ میں نے چند منٹ کے بعد ہی موقع محل کی مناسبت سے منصوبہ ترتیب دے لیا تمام جوانوں کو میں نے سول کپڑے پہنائے۔ ضروری لیکن ہلکا اسلحہ ان میں چھپا ہوا تھا کہ کافی غور سے دیکھنے پر بھی نظر نہ آسکے۔

اس کے بعد ایک ایک کر کے میں نے تمام جوانوں کو مختلف راستوں سے باہر نکالا اور خود بھی پیدل ہی اس طرف چل دیا۔ ہم نے آپریشنل آفس سویلین ایریا ہی میں بنا رکھا تھا۔ عام لوگوں کی نظروں سے تو پوشیدہ تھا لیکن مجھے یہ امید نہیں تھی کہ مکتی باہنی کو بھی اس کا علم نہ رہا ہو۔

مکتی باہنی جن افراد پر مشتمل تھی ان میں سے بیشتر کا تعلق مسلّح افواج کی ایسٹ بنگال رجمنٹ،



ایسٹ پاکستان رائفل (ای پی آر) اور مشرقی پاکستان کی پولیس سے تھا۔ ان کے افسر زیادہ تر بھارت کی باقاعدہ افواج کے ایس۔ ایس۔ جی کے آفیسر ہوتے تھے جو بنگالیوں کا روپ دھار کر ان میں کام کر رہے تھے۔ ان غیر ملکیوں کا علم سوائے خصوصی لوگوں کے اور کسی کو نہیں ہوتا تھا اور عام طور پر بھگوڑے بنگالی یہی سمجھتے تھے کہ افسروں کا تعلق بھی انہی سے ہے۔

ان بھگوڑے فوجیوں کو جو اسلحے سمیت سرحد پار کر گئے تھے بھارتیوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔

اور ان میں سے خاص خاص لوگوں کو منتخب کر کے اپنی ملٹری اکیڈیمیوں میں خصوصی تربیت دے کر دوبارہ مشرقی پاکستان میں داخل کر دیا تھا۔ عام بھگوڑوں کے لیے سرحد کے نزدیک ہی ٹریننگ سنٹر قائم کر دیے گئے تھے جہاں بھارتی افواج کے اعلیٰ افسران دن رات ان کی تربیت کر رہے تھے۔ شروع شروع میں ان باغیوں کو عام قسم کا اسلحہ مہیا کیا جا رہا تھا پھر دیکھتے دیکھتے بھارتیوں نے انھیں توپخانہ بھی مہیا کر دیا جس میں فیلڈ گنیں بھی تھیں۔

یہ بھارتی اسلحہ بڑے منظم اور خفیہ طریقے سے ان کو پہنچایا جا رہا تھا اس کے لیے بھارتی افواج کی سب سے زیادہ مدد ان ندی نالوں اور جنگلات کے چھوٹے چھوٹے سلسلوں نے کی جو یہاں قدم قدم پر پائے جاتے تھے۔ بھارت کے ساتھ مشرقی پاکستان کی سینکڑوں میل لمبی سرحد ملتی تھی اور ہمارے پاس بہت تھوڑی نفری موجود تھی یا تو ہم اندرونِ ملک ان کی تخریبی کارروائیوں پر کنٹرول کر پاتے یا پھر سرحدوں کے چپّے چپّے پر اپنے جوانوں کو کھڑا کر دیتے۔

سرحد سے مشرقی پاکستان کے تمام شہروں تک دریاؤں اور ندی نالوں کے سلسلے پھیلے ہوئے تھے مکتی باہنی کے تخریب کار سرحدوں پر اسلحہ وصول کر کے ندی نالوں کی کشتیوں کے ذریعے آگے بڑھا دیتے اور مختلف ہاتھوں سے گزر کر وہ بالآخر اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ جاتا یہ کام وہ سیدھے سادے مانجھیوں کا روپ دھار کر کرتے تھے۔ ہم سارے مشرقی پاکستان کے ندی نالوں کی ناکہ بندی نہیں کر سکتے تھے پھر بدقسمتی سے مقامی آبادی اپنی مرضی سے یا خوفزدہ ہو کر بہرحال ان کی مدد کرتی تھی اور انھیں متبادل راستے مہیا کر دیتی تھی۔ اس کے برعکس ہمارے ساتھ عدم تعاون کیا جاتا — اکثر ہمارے ٹروپس کو بہکا کر وہ

لوگ مکتی باہنی کے گھیرے میں لے جاتے اور خود کھسک جاتے، اگر مکتی باہنی کو شک گزرتا کہ کوئی بنگالی ہماری مدد کر رہا ہے تو وہ اسے ہر صورت موت کے گھاٹ اتار دیتے خواہ اس کے لیے انھیں کتنی ہی قربانی کیوں نہ دینی پڑتی۔ اس طرح سے اصل میں وہ لوگوں کو مجبور کر دیتے کہ وہ صرف ان کی مدد کریں اور ان کے اشاروں پر آنکھیں بند کر کے عمل پیرا ہوں۔

مکتی باہنی نے اپنی کاروائیوں کا آغاز بھی محبِ وطن لوگوں پر حملہ کرنے، ان کی املاک لوٹنے اور نذرِ آتش کرنے سے کیا تھا انھوں نے چن چن کر ایسے تمام لوگوں کو قتل کر دیا جن کے متعلق انھیں ذرا سا بھی شک تھا کہ وہ پاکستان سے ہمدردی رکھتے ہیں، لیکن آفرین ہے ان لوگوں پر بھی کہ وہ اتنے ظلم اور زیادتیاں برداشت کرنے کے باوجود صرف پاکستان کا دم بھرتے تھے اور ہمارے سامنے کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے۔ آج بھی جب ان سرفروشوں کی قربانیاں یاد آتی ہیں تو بے اختیار میری پلکیں ہو جاتی ہیں اور سر فرطِ عقیدت سے ان شہیدوں کے حضور جھک جاتا ہے میرا ایمان ہے کہ ان کی قربانیاں ضرور رنگ لائیں گی۔

ایسے ہی محبِ وطن افراد ہماری چوری چھپے مدد کیا کرتے تھے اور خفیہ اطلاعات ہمیں پہنچایا کرتے تھے۔ گو کہ ان کی آڑ میں مکتی باہنی والے اپنا کام دکھا جاتے تھے وہ اپنے آدمیوں کو ہماری ہمدردی کا لبادہ اوڑھا کر ان لوگوں میں داخل کر دیتے اور غلط اطلاعات پہنچا کر ہمارے جوانوں کو ان کے سامنے چارہ بنا کر پیش کرتے۔ کئی مرتبہ ایسی اطلاعات غلط ثابت ہو چکی تھیں، لیکن ہمیں ان پر عمل ضرور کرنا پڑتا تھا کیونکہ اس کے سوا اور چارہ ہی نہیں تھا۔

آج بھی ایسے ہی ایک محبِ وطن کی اطلاع پر ہم یہ کاروائی کرنے جا رہے تھے۔ سب سے میں اور صوبیدار صاحب سویلین کپڑوں میں وہاں پہنچے تھے مطلوبہ مکان کے نزدیک جا کر ہم نے اس چاروں اطراف گھوم پھر کر اس کا جائزہ لیا یہ دو منزلہ مکان تھا جس کی چھت دوسرے مکانات سے ہوئی تھی علاقہ پرانا اور رہائشی قسم کا دکھائی دیتا تھا۔ اپنی دانست میں دشمن نے بڑی چالاکی دکھائی تھی اور اس کے فرار کی تمام راہیں کھلی تھیں ہمیں اس بات کا علم بھی تھا کہ اردگرد کے مکانات میں بھی



کے ہمدرد بھی رہتے ہیں جو وقت آنے پر انھیں ہر قسم کی مدد بہم پہنچائیں گے۔

اب ہمارے جوان بھی ایک ایک دو دو کی شکل میں پہنچنا شروع ہو گئے تھے اور میں انھیں اشارے کنایے سے صورتِ حال بتلا کر ان کے فرائض سے آگاہ بھی کرتا جا رہا تھا قریباً بیس منٹ کے بعد ہی تمام جوان اپنی اپنی جگہ مستعد کھڑے میرے اشارے کے منتظر تھے۔

میرا اشارہ پاتے ہی جوان بجلی کی طرح حرکت میں آئے اور چاروں طرف سے دیواریں پھلانگ کر اردگرد کے دو تین مکانات میں داخل ہو گئے ان کے ذمے وہاں کے مکینوں کو قابو کر کے مکانات کی چھتوں پر قبضہ کرنا تھا تاکہ تخریب کار اوپر آئیں تو انھیں اپنا منتظر پائیں خود میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سیدھا اس مکان میں جا گھسا جہاں تخریب کار موجود تھے۔ ہمارے پاس اسٹین گنیں، کچھ دستی بم اور دھواں پھیلانے والے بم تھے میرے دونوں پہلوؤں پر دو جوان آگے بڑھ رہے تھے ایک طرح سے انھوں نے مجھے دونوں پہلوؤں سے کور (COVER) مہیا کر رکھا تھا ہم بہت تیزی سے بھاگتے ہوئے اندر آئے تھے لیکن اپنی تربیت کے مطابق آہٹ پیدا نہیں ہونے دی تھی۔

مکان کے برآمدے میں ہی ایک کمرہ دکھائی پڑا جو شاید اندر سے بند تھا۔ فوجی تربیت کے مطابق میں اور دوسرا جوان دروازوں کے دونوں پاٹوں کے ساتھ چپک گئے ہم نے اسٹین گنوں کو فائرنگ کی پوزیشن میں بالکل تیار رکھا تھا۔ میرا اشارہ پاتے ہی ہمارے تیسرے ساتھی نے دروازے کو زوردار لات ماری اور خود پرے جا گرا اس کے ساتھ ہی ہم تیزی سے اندر کی سمت گھوم گئے جہاں پانچ آدمی اپنے سامنے شراب کی بوتل رکھے ہکا بکا ہمیں گھور رہے تھے۔

"ہینڈز اپ" میں نے انھیں للکارا۔

وہ تمام کے تمام کسی میکانکی عمل کے تابع اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے ہاتھ کھڑے کر دیے۔

"دیوار کی طرف گھومو" میں نے اگلا حکم دیا۔

انھوں نے تعمیل کی میرے دونوں ساتھیوں نے پھرتی سے ان کی جیبیں ٹٹولیں، پانچوں کی جیبوں سے بھرے ہوئے ریوالور برآمد ہوئے۔ میرے ساتھیوں کو ایسے لوگوں سے نمٹنے کی خصوصی تربیت حاصل

تھی ہم نے بمشکل دو منٹ میں انھیں بے دست و پا کر کے ایک کونے میں ڈھیر کر دیا ابھی آخری آدمی کو باندھ کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ فائرنگ سے مکان کے در و دیوار لرزنے لگے۔ دوسری منزل پر بیٹھے لوگوں کو شک گزرا تھا اور انھوں نے کمروں کی کھڑکیوں میں مورچے سنبھال لیے تھے خیریت گزری کہ مکان کے سامنے کا علاقہ خالی ہو چکا تھا اور لوگ ہماری بھاگم دوڑ سے خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے تھے ورنہ بہت جانی نقصان ہوتا۔

میں نے اپنے دونوں جوانوں کو قیدیوں کی حفاظت کے لیے چھوڑا اور خود ان سیڑھیوں تک جا پہنچا جو دوسری منزل کے اس کمرے کی طرف جا رہی تھیں جہاں وہ لوگ مورچے جمائے بیٹھے تھے۔ ہمارے دوسرے ساتھیوں نے اس اثنا میں بڑی پھرتی اور جانفشانی سے کوئی گولی چلائے بغیر ہی اپنا آپریشن مکمل کر لیا تھا۔ وہ دوسرے مکانات سے ان کی فائرنگ کا جواب دے رہے تھے۔

تخریب کاروں کو انھوں نے اپنی سمت اُلجھا رکھا تھا لیکن وہ نیچے سے بھی غافل نہیں تھے انھیں علم تھا کہ ضرور نیچے ہم موجود ہیں۔ جب فائرنگ کی آواز پر بھی ان کے نچلے ساتھیوں کی طرف سے کوئی ردِّ عمل ظاہر نہ ہوا، تو انھوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ قابو میں آ چکے ہیں اس دوران جس کسی نے چھت کے ذریعے فرار ہونے کی کوشش کی وہ ہمارے دوسرے مکانات کی چھتوں پر موجود ساتھیوں کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔

میں آہستہ آہستہ سرکتا ہوا سیڑھیوں کے ایک کونے تک جا پہنچا، ابھی میں نے صورتحال کا جائزہ لینے کو سر اٹھا کر دیکھنا ہی چاہا تھا کہ اچانک ریٹ ٹٹ کی آواز سنائی دی گولی میرے بالوں کو چھوتی گزر گئی، میں الٹ کر سیڑھیوں کے ساتھ ہی جا گرا اور اس طرح ظاہر کیا جیسے مجھے گولیاں لگ گئی ہیں ایسے مواقع پر جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت ہوتی ہے۔

کمانڈوز کے لیے ان واقعات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اگر وہ اچانک گھیرے میں آ جائیں یا گولیوں کی بارش میں گھر جائیں تو ان کا بلڈ پریشر نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے ہم لوگ ایسی چیزوں کو کھیل تماشے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔



سیڑھیوں میں موجود تخریب کار نے یہی سمجھا کہ میری چھٹی ہو گئی۔ وہ دھڑ دھڑ کرتا تیزی سے نیچے اُترنے لگا اور یہی میں چاہتا تھا، جیسے ہی وہ میرے نزدیک سے گزرا میں پنجوں کے بل اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اور زوردار ہاتھ اس کی گردن پر مارا وہ اپنی تیزی میں سیڑھیوں سے لڑھکا اور سامنے دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کے زمین پر گرنے سے پہلے ہی میں نے اسٹین گن کو گھما کر اُس کے سر پر دے مارا اس کے سر سے خون کا فوارہ اُبلا اور میری بیٹ میں لگنے والی زوردار ضرب سے وہ ڈکراتا ہوا زمین پر آ رہا۔

اس سے نمٹتے ہی میں پھرتی سے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ سامنے وہ دروازہ نیم وا نظر آیا جس کے باہر میرا شکار پہرا دے رہا تھا اور فائرنگ کرنے والوں کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ باہر کیا قیامت گزر گئی ہے۔ وہ اپنے کام میں جتے ہوئے تھے اور سر نیچے جھکائے کھڑکیوں سے اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے میں نے دروازے کو ٹھوکر لگائی اور چند سیکنڈ میں میری اسٹین گن نے وہاں موجود چاروں تخریب کاروں کو چاٹ لیا۔ میں نے اُنھیں سر گھما کر اس طرف دیکھنے کی مہلت بھی نہیں دی تھی یہاں سے فارغ ہو کر نیچے آیا۔ تخریب کاروں کی مزاحمت ختم ہو چکی تھی۔

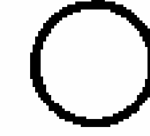
ننھی سہمی ہوئی ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ میں نے اس کی پوزیشن کو مدِنظر رکھا تھا وہ بالکل محفوظ رہی۔ چند لمحوں بعد ہم بقیہ تخریب کاروں کو ہانکتے ہوئے باہر لے آئے۔

میدانِ جنگ میں دشمنوں کے بچے کو بچانے کے لیے کوئی کمانڈر اپنی فوج داؤ پر نہیں لگاتا جب کہ اس بچّی کے والدین بھی انہی لوگوں کے ساتھی تھے لیکن ہم میں موجود انسانیت ابھی زندہ تھی۔ یہ ہماری قوم کی بچّی تھی کیا ہوا اگر آج اس کے والدین اور ہمارے بیچ پرایوں نے نفرت کی ایک دیوار حائل کر دی تھی۔ آخر تھے تو ہم ایک ہی۔ ہمارا خمیر تو ایک مٹی سے اُٹھا تھا۔

مکانوں کی کھڑکیوں سے لگے سہمے ہوئے خوفزدہ لوگ یہ تماشہ دیکھ رہے تھے میں نے بچّی کو محبت سے گود میں اٹھا لیا وہ اتنی دہشت زدہ تھی کہ ابھی تک اس کے منہ سے آواز بھی نکل نہیں پاتی تھی۔ اس دوران اس کے ماں باپ بھی آ گئے پہلے تو اس کی ماں نے آگے بڑھ کر بچّی کو دبوچ لیا پھر اپنے خاوند کو بچی تھما کر وہ اس جوان کی طرف لپکی جس کی جوانمردی نے اس کی جان بچائی تھی اس نے دیوانہ وار اس

کے سراہتے کو چومنا شروع کر دیا وہ اس پر مٹی جا رہی تھی۔

بچی کے باپ کی حالت دیدنی تھی وہ ٹکر ٹکر اپنے محسنوں کو دیکھتا رہا چند منٹ کے بعد ہی ایک ایمبولینس اور ٹرک آ گئے ہم نے زخمیوں کو ایمبولینس میں ڈالا اور خود گرفتار شدگان کے ساتھ ٹرک میں بیٹھ کر اپنے ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہو گئے۔



ہمارے آپریشن روم نے قریباً دس بارہ میل کے فاصلے پر ایک جگہ انٹیلی جینس کو تخریب کاروں کے کسی اڈے کی موجودگی کا شک گزرا۔ اُنھوں نے وہاں نگرانی کے لیے رضاکاروں کی ڈیوٹیاں لگانی شروع کر دیں۔ یہ رضاکار چونکہ مقامی لوگ ہی ہوتے تھے اس لیے وہ تخریب کاروں کی نظروں میں آنے سے بچے رہتے تھے، لیکن ہماری انٹیلی جنس چکرا کر رہ گئی۔ اُنھوں نے اب تک تین رضاکاروں کی یکے بعد دیگرے یہاں ڈیوٹی لگائی تھی لیکن تینوں ہی یکے بعد دیگرے غائب ہو گئے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں زمین کھا جاتی تھی یا آسمان نگل جاتا تھا۔

شام کو جو شخص روانہ ہوتا اگلے روز واپس نہ آتا دو تین روز تک تو اس کا انتظار کیا جاتا، پھر دوسرا رضاکار اُس کی جگہ سنبھال لیتا، لیکن اس کا بھی وہی انجام ہوتا۔ تیسرے رضاکار کی گمشدگی نے تو چکرا کر رکھ دیا۔ میں نے لاکھ سر پٹخا، لیکن کچھ پتے نہ پڑا کہ آخر یہ لوگ جاتے کہاں ہیں۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے خود اس علاقے میں "ریکی" کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں مشتبہ جگہ کے نزدیک سڑک سے ہٹ کر ایک جگہ فقیری لبادہ اُوڑھے دھونی رما کر بیٹھ گیا۔ اپنی شناخت محفوظ رکھنے کے لیے میں نے خود کو وہاں "گونگا پیر" کے نام سے مشہور کروا دیا۔

شہرت کا فریضہ ہمارے دوست عناصر نے انجام دیا۔ اُنھوں نے مقامی آبادی میں یہ بات پھیلا دی کہ پیر جی پہلے چاٹگام کے کسی پہاڑی علاقے میں رہتے تھے، اب اپنے مرشد کے حکم سے لوگوں کو فیض پہنچانے کے لیے یہاں چلے آئے ہیں تو ہم پرستی وہاں عام تھی چار پانچ روز ہی میں میرے گرد لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔



آنے والوں میں بھیس بدلے ہوئے ہمارے دوست بھی ہوتے تھے اور دشمن بھی خصوصاً اس علاقے کے تخریب کاروں کے ساتھی تو روزانہ گھنٹوں میرے پاس رہ کر میرے معمولات کا جائزہ لیتے رہتے، لیکن کیا مجال جو کسی کو کبھی مجھ پر ذرہ برابر بھی شک گزرا ہو مختلف خواتین اور مرد مختلف حاجات لیکر آتے۔ مجھے بنگالی زبان کی بس تھوڑی بہت شُد بُد ہی تھی پلے خاک نہ پڑتا یونہی کسی کو مٹی تھما دیتا کسی کو صابن پر پھونک مار کر دے دیتا۔ اور کسی کو ڈنڈا مار کر بھگا دیتا۔ میرے چیلے چانٹوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ شام سے پیر جی صبح تک مراقبے میں رہیں گے اور دوران عبادت میں اپنے قریب تو کیا دُور دور تک کسی کو برداشت نہیں کرتا تھا۔

اس روز جب شام کو مجھے عقیدت مندوں سے فراغت ملی تو میں نے اگلے روز دکانداری بڑھانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ گوہر مقصود ہاتھ آتا نظر نہ آتا تھا میں خلاف معمول عشا کے بعد اپنی جھونپڑی سے نکلا اور چھپتا چھپاتا قریبی کھیتوں کی طرف چل دیا ـــــــ میرا یہ فعل قطعاً غیر ارادی تھا میں کسی منصوبہ بندی سے اس طرف نہیں آیا تھا۔

ایک کھیت کے بیچوں بیچ میں چلا جا رہا تھا کہ اچانک ٹھٹھک گیا ایک مرد اور عورت کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں، دونوں بنگالی میں گفتگو کر رہے تھے، میں نے چھپ کر ان کی حرکات نوٹ کرنے کا ارادہ کیا۔ قریباً پانچ منٹ تک وہ آپس میں کسی مسئلے پر الجھتے رہے پھر مرد نے لڑکی کو ایک لفافہ تھما دیا اور خود سڑک کی طرف چل دیا۔

میرا ذہن اب عجیب مخمصے میں پھنسا تھا لڑکی کا تعاقب کروں یا پھر اس نوجوان کا؟ بالآخر میں نے لڑکی کے پیچھے جانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ میری دانست میں اُس نے مرد سے کوئی پیغام وصول کیا تھا۔ یہ پیغام کیا تھا؟ کس کے لیے تھا؟ مجھے اس بات کا کھوج لگانا تھا۔ بلی کی طرح دبے قدموں میں بغیر آہٹ پیدا کیے اس کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔

گاؤں کے باہر ہی وہ ایک ویران سی حویلی میں داخل ہو گئی میرے اندازے کے مطابق اس حویلی میں کسی کا قیام نہیں تھا کیونکہ اس کی حالت قدیم کھنڈروں کی سی نظر آ رہی تھی۔ لڑکی کے اندر داخل ہوتے

کے بعد میں بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً دس منٹ اس جان لیوا انتظار کی نذر ہو گئے لیکن اس نے نہ آنا تھا نہ آئی۔ میں نے تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھتے ہوئے خود اس اسرار سے پردہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنے پسینے میں رکھے ریوالور کو تھپتھپا کر میں محتاط قدموں سے اسی سمت چل دیا۔ حویلی سائیں سائیں کر رہی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انسانوں کے بجائے بھوتوں کا مسکن دکھائی دیتی تھی۔

میں دائیں ہاتھ ایک کمرے کی طرف چل دیا۔ جہاں میری چھٹی حس نے کسی کی موجودگی کی نشاندہی کی تھی اور ابھی میں بمشکل وہاں تک پہنچا ہی تھا کہ اچانک تیز روشنی سے میری آنکھیں چندھیا گئیں —— کسی نے طاقتور ٹارچ کی روشنی براہِ راست میری آنکھوں پر ڈالی۔ اس روشنی میں جب میری آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو ٹارچ بردار کے ساتھ ہی ایک ہٹا کٹا بنگالی بھی نظر آیا جس کے کندھے سے لگی اسٹین گن میری طرف تنی ہوئی تھی۔

"بہت چالاک بنتا تھا غنڈا" اسٹین گن والے نے نفرت سے کھولتے ہوئے کہا۔

میں خاموش کھڑا اسے گھورتا رہا۔ اس کا لہجہ اس کے غیر ملکی ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔ ٹارچ والا اس دوران کھڑا چپ چاپ دیکھتا رہا۔

"کون ہو تم" اسٹین گن والا غرایا۔

میں نے اس طرح ظاہر کیا جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ اس دوران میں اس امر کا جائزہ لیتا رہا کہ وہاں ان دونوں کے علاوہ کوئی اور تو نہیں ہے بظاہر تو ایسا ہی نظر آتا تھا لیکن میری چھٹی حس نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا۔ رہ رہ کر ایک ہی سوال میرے ذہن میں ناچتا رہا کہ لڑکی آخر کہاں غائب ہو گئی؟ اگر لڑکی بھی یہیں کہیں ہے تو پھر اور لوگ بھی یہاں ہوں گے؟ لیکن وہ سامنے کیوں نہیں آتے؟ یقیناً اس میں بھی کوئی مصلحت ہو گی۔ میں نے سوچا اور خود کو فی الحال حالات کے رحم و کرم پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

"یوں نہیں بتائے گا غنڈا" ٹارچ والے نے دانت پیستے ہوئے کہا۔



"ٹھیک ہے لے چلو بدمعاش کو" اسٹین گن والا بولا۔

انھوں نے ابھی میری تلاشی لینا بھی مناسب نہیں سمجھا تھا۔ یا تو بے پروا لوگ تھے وہ یا انھیں اپنے انتظامات پر بڑا ہی اعتماد تھا —— بعد میں مجھے پتہ چلا کہ انھوں نے واقعی میرے لیے فرار کی کوئی راہ نہیں چھوڑی تھی۔

"چلو" مسلح شخص نے اسٹین گن سے اس دروازے کی سمت اشارہ کیا۔ جس سے میں گزر کر اس حال کو پہنچا تھا۔ میں بغیر ایک لفظ بولے اسی سمت مڑ گیا۔

ٹارچ والا میرے آگے آگے لیکن ایک طرف ہٹ کر چل رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ ٹارچ جلا کر راستے کی نشاندہی کر دیتا۔ اس کے پاس اسلحہ نہ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شاید دانستہ اس نے ابھی تک دوسرے ہاتھ میں پستول نہیں پکڑا تھا۔ وہ مجھ پر نفسیاتی دباؤ ڈال کر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ان کے نزدیک میری کوئی اہمیت نہیں۔

"اپنا اور اپنے غالب کا فاصلہ آہستہ آہستہ کم کرو۔ اسے نزدیک آنے کا موقع دو کیونکہ تم اپنا کوئی بھی حربہ دور سے اس پر نہیں آزما سکتے" ٹریننگ میں پڑھایا سبق مجھے بخوبی یاد تھا۔ میں نے اس کی بھی مشق کی تھی مگر عملی طور پر آج پہلی مرتبہ آزمانے جا رہا تھا۔ بے شک وہ تعداد میں زیادہ تھے اور مقامی آبادی کی ہمدردیاں بھی انھیں حاصل تھیں لیکن چالاک اور مضبوط ترین دشمن بھی جب اپنے زیردست سے بے پروائی برتے تو اسے بے وقوف ہی سمجھا جاتا ہے۔ اپنی تربیت کے مطابق میں نے اپنی رفتار غیر محسوس طریقے سے کم کر لی تھی اور اسے نزدیک آنے کا موقع دے رہا تھا۔ ٹارچ والا اب بھی ہمارے آگے آگے جا رہا تھا۔ وہ راستے کی نشاندہی کرتا جا رہا تھا یا وہاں چھپے ہوئے اپنے ساتھیوں کو سگنل دے رہا تھا ہم دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ میرے اور اسٹین گن بردار کے درمیان فاصلہ کم ہوتے ہوتے بمشکل دو یا تین فٹ رہ گیا تھا۔ اب صورتحال کچھ یوں تھی کہ ٹارچ والا دروازے سے باہر پہنچ چکا تھا میں دروازے پر اور وہ میرے بالکل قریب۔ ایسے سنہری موقعے سے فائدہ نہ اٹھانا کفرانِ نعمت ہوتا۔ میں کسی میکانکی عمل کی طرح یکدم نیچے جھکا اور بائیں ایڑی پر گھوم گیا۔ اس تیز ترین عمل کا اختتامی لمحہ اس کی

پسلیوں پر قیامت ڈھا گیا۔ میرے بائیں بازو کی کہنی جس قوت سے اس کی پسلیوں میں لگی تھی۔ اس کے سامنے بڑے بڑے ہیوی ویٹ پہلوان بھی نہ ٹھہر پاتے۔ ایک کربناک کراہ اس کے ہونٹوں سے پھسلی اور اسٹین گن ہاتھوں سے اُچھل کر پرے جا گری۔ وہ ڈکراتا ہُوا آگے کی سمت جھکا لیکن زمین بوس ہونے سے پہلے میرا زوردار گھٹنا اس کے زیریں حصے پر لگا۔ اس نے لڑکھڑاتے سنبھلنا چاہا مگر میری دونوں ہتھیلیوں کی ضرب اس قوت سے اس کی کنپٹیوں پر لگی کہ یقیناً اس کی ہڈیاں تڑخ گئی ہوں گی۔

وہ برقی آرے سے کٹ جانے والے درخت کی طرح لہرایا اور زمین چاٹنے لگا۔

یہ سارا عمل چند سیکنڈ ہی میں ظہور پا گیا۔ اس سے پہلے کہ اس کا ساتھی اپنے بکھرے حواس مجتمع کر کے اپنے کپڑوں میں چھپا ہُوا پستول نکال کر مجھ پر پلٹنے میں زقند بھرتا ہُوا اس پر جا گرا۔ جسم کی ساری توانائیاں میرے ہاتھوں میں سمٹ آئیں اور میرے ہاتھوں کے فولادی شکنجے سے اس کی گردن نے تب امان پائی جب اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر اُبل پڑیں اور وہ ایک طرف ڈھلک گئی پھر شاید میرے اس لاشعوری عمل نے جو میں نے اپنی چھٹی حس کے تابع ہو کر انجام دیا تھا، میری جان بچالی ورنہ تو کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ میں مغلوب سے ابھی نمٹ کر اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ میری دائیں سمت آہٹ ہُوئی۔ آنے والا مجھے نظر نہ آیا لیکن میں نے اپنے شکار کے سینے سے اُٹھ کر کھڑا ہونے کی بجائے اس کے بائیں پہلو میں لڑھکنی لگائی اور گولی میرے بالوں کو چھُوتی گزر گئی۔

"بھاگو۔" میرا شعور چلّایا۔

میں اُٹھنے کی بجائے لوٹنیاں لگاتا اسی کھیت میں جا گھُسا جس سے گزر کر اس حویلی میں آیا تھا۔ حملہ آور بھی اب سر پر پہنچ گیا تھا۔ پھر اس کے ہاتھ میں پکڑے ریوالور نے شعلے اُگلنے شروع کر دیئے لیکن اس منظر کو دیکھنے کی سعادت میرے نصیب میں نہ آئی میں دھان کی فصل میں گھُستا اس سے دُور ہی دُور ہٹتا چلا گیا۔

حملہ آور نے چلّا کر بنگالی زبان میں شاید اپنے ساتھیوں کو خبردار کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دو اطراف آتشیں اولے برسنے لگے۔ کھیت کے جس حصے میں میں پہنچ چکا تھا۔ وہاں فصل نسبتاً



نیچی تھی اور میرے کھڑے ہونے پر بمشکل میرے دھڑ تک پہنچتی۔

"اپنے ذہن کو کبھی رخصت نہ دینا۔ حواس مختل نہ ہونے پائیں، پنجے مضبوطی سے زمین پر ٹکیں، جسم کو لچکیلا کر لو۔ دھڑ کو اس سمت میں جھکاؤ جس سمت میں پاؤں ہوں۔ سمت درست رکھو لیکن سیدھے کبھی نہ بھاگو۔ بدمست ہاتھی کی طرح جھومتے ہُوئے چلو لیکن اس شرابی کی مانند نہیں جسے اپنے جسم و ذہن پر اختیار نہیں رہتا۔" میرا خضر صورت انسٹرکٹر میرے سامنے کھڑا ہدایتیں دے رہا تھا۔

چوہے بلی کا یہ کھیل قریباً آٹھ دس منٹ جاری رہا ابھی تک مجھے ایک ایڈوانٹیج حاصل تھا کہ میرے سامنے کی سمت محفوظ تھی اور اسی سمت کو میں گول پوائنٹ سمجھ کر بھاگ رہا تھا۔ یہ راستہ کدھر جاتا ہے مجھے اس کا علم نہیں تھا۔

گھور اندھیارے کھیتوں میں سرسراتی ہوائیں، تعاقب میں آنے والے کف اُڑاتے حملہ آور طل کی گالیاں، فائرنگ کا بے ہنگم شور اور بس تھا یا میری مدد پر خدا کی ذات۔ میں لفظی طور پر نہیں حقیقتاً دیوانہ وار دوڑ رہا تھا۔ اپنی بقا کی جنگ میں میں نے اپنی ساری توانائیاں جھونک دی تھیں۔ اسی محفوظ سمت نے بالآخر مجھے ایک گاؤں کے نزدیک پہنچا دیا۔

میں نے بھاگتے بھاگتے ہی اپنا واحد اثاثہ۔ آٹومیٹک پستول اپنے جھولے سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور میری ہتھیلیاں پسینے میں بھیگنے لگی تھیں۔ انگلی ٹریگر دبانے کو بے قرار تھی، لیکن انھیں داغ دینے کے لیے ابھی تک میں نے ایک فائر بھی نہیں کیا تھا۔ میرے قدم بھی میرے ارادوں کی طرح ابھی تک مضبوط اور توانا تھے۔

گاؤں کے آثار سامنے اُبھرے تو ذہن میں چھپے اندیشے بھی کلبلانے لگے۔ گاؤں والے ان کے حمایتی نکلے تو میرا حشر یقیناً وہی ہوگا جو شکاری کتوں کے قابو آ جانے والے شکار کا ہوتا ہے۔ میں ان کے ایک ساتھی کو مردہ اور دوسرے کو نیم مردہ کر کے پھینک آیا تھا۔ قابو پاتے ہی وہ جوشِ جنون و انتقام میں میری تکا بوٹی کر ڈالتے۔

"سمت بدل لوں؟" میں نے خود سے سوال کیا۔

"ہاں! اور بے بس چوپائے کی طرح ان کے جال میں پھنس جاؤ۔" ذہن نے طنز کیا۔ ٹریننگ کے سبق خفتہ آتش فشانوں کی طرح ذہن کے اندھیاروں میں روشن ہونے لگے۔

"سمت درست رکھو جب تک سامنے سے مزاحمت نہ ہو اس طرف بھاگتے رہو۔" میرے انسٹرکٹر صاحب نے ڈانٹ پلائی۔

"اوکے سر۔" میں مسکرایا۔

گاؤں نزدیک آتا جا رہا تھا۔ میں نے ابھی تک کاشت شدہ CULTIVATED علاقے سے باہر بھاگنے کا رسک نہیں لیا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر میں نے اپنا چولا اتارا اور کھیتوں میں پھینک دیا۔ اپنی دانست میں اس طرح میں نے انھیں ڈاج دینے کی کوشش کی تھی۔

گاؤں کے آثار اب واضح ہو چکے تھے۔ میں نے چاہا تو یہی تھا کہ گاؤں کی ایک سمت سے کترا کر آگے نکل جاؤں لیکن دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ ایک طرف سے ہاتھوں میں لالٹین پکڑے ایک جلوس، "جے بنگلہ دیش" کے نعرے لگاتا نمودار ہو رہا تھا۔ خیریت گزری کہ میں ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں انھیں نظر نہیں آسکتا تھا۔ اس جلوس کے آگے دو تین مسلح غنڈے تھے جنھوں نے ہاتھوں میں خودکار بھارتی رائفلیں تھام رکھی تھیں اور گلا پھاڑ پھاڑ کر لوگوں کو ہدایات دے رہے تھے۔

میں جہاں تھا وہیں جم کے رہ گیا۔ فی الحال ان کی نظروں میں آنا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ میں نے پناہ کے لیے نظریں دوڑائیں اور اپنے نزدیک ہی گاؤں سے کچھ فاصلے پر ایک کمرہ نما کھنڈر کو جائے امان جان کر تعاقب کرنے والوں کی نظروں سے بچتا بچاتا وہیں دبک کر بیٹھ رہا۔ ادھر شاید کسی کی نظر میرے پھینکے ہوئے چیتھڑے پر پڑ گئی تھی کیونکہ وہ لوگ اس جگہ اکٹھے ہو رہے تھے پھر میں نے انھیں ہانکا کرنے والوں کی طرح کھیتوں کے وسیع سلسلے کو گھیرے میں لیتے دیکھا۔ آتشیں اسلحہ تو تھوڑے سے لوگوں کے پاس تھا مگر زیادہ تر لوگ کلہاڑیوں اور لوہے کی سلاخوں سے لیس تھے۔

میں نے ان لمحات کو غنیمت جانا اور اس سے پہلے کہ وہ کھیتوں میں میری تلاش سے مایوس ہو کر گاؤں کو پلٹیں، میں باہر نکل آیا اور تن بہ تقدیر گاؤں کی طرف چل دیا۔ گاؤں کی زندگی آہستہ آہستہ



بیدار ہو رہی تھی۔ مختلف گھروں کی جلتی بجھتی روشنیاں بھی مدِ نظر تھیں، لیکن باہر سے گاؤں بہرحال زیادہ محفوظ تھا۔ ممکن تھا کہ یہاں کچھ لوگ ہمارے حامی بھی ہوں کیونکہ ابھی حالات اتنے بھی نہیں بدلے تھے کہ سارا ملک ہی ہمارا دشمن بن جاتا۔ دوسری امید اپنے لوگوں سے بھی تھی۔ میری خفیہ نگرانی بہرحال کی جا رہی تھی اور مجھے اچانک غائب پا کر میرے ساتھیوں کا تشویش میں مبتلا ہونا بھی ضروری تھا۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی وہ میری تلاش میں نکل پڑتے۔

گاؤں سے باہر کا علاقہ ان کے لیے کھلی شکارگاہ ثابت ہوتا اور وہ کسی بھی لمحے مجھے گھیر کر مار ڈالتے یوں بے بس چوہے کی طرح مر جانا کسی بھی کمانڈو کے شایانِ شان نہیں ہوتا۔

چند لمحوں کے بعد ہی ایک فیصلے پر پہنچ کر میں نے گاؤں کا رُخ کر لیا۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ اگر واسطہ مکتی باہنی کے لوگوں سے پڑا تو انھیں یرغمال بنا کر فرار کی کوئی صورت ممکن تھی یا اگر مرنا ہی مقدر ٹھہرا تو کیوں نہ دو تین کو مار کر مروں۔ یہاں تو میرے ننھے سے پستول کی حیثیت پلاسٹک کے کھلونے سے زیادہ نہیں تھی۔ جس سمت سے میں گاؤں کی طرف بڑھ رہا تھا، وہاں مکانات کی دیواریں کھیتوں سے ملی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک گھر تاکا اور اس کی بیرونی دیوار ایک ہی جست میں عبور کر کے صحن میں پہنچ گیا۔ میرے سامنے ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کی کھڑکی سے لگا میں سُن گُن لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ مکان میں اندھیرا تھا لیکن کمرے سے کسی کے آہستہ آہستہ بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب غور کرنے پر علم ہوا کہ وہ لوگ بہاری لہجے کی بنگالی اور اردو ملا جلا کر بول رہے تھے۔ میں نے گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے اپنا سر اوپر اٹھا دیا۔ اب میں کھڑکی سے باہر آنے والی معمولی آواز بھی سن سکتا تھا۔ کسی نے بنگالی میں کہا۔

"ابھی تک مدد کے آثار نظر نہیں آتے۔"

"شاید وہ لوگ سڑک کے راستے آ رہے ہوں۔" دوسری آواز نے اردو میں تسلی دی۔

"اوہ! خدایا ان کے یہاں پہنچنے تک کیا باقی رہے گا۔" پہلی آواز دوبارہ سنائی دی تشویش لہجے سے عیاں تھی۔

"اللہ پر توکل رکھو۔ وہ لوگ ہم سے زیادہ فکر مند ہوں گے۔" اُردو میں کہا گیا۔

"عثمان بھائی! آدھا گھنٹہ تو ہونے کو آیا ہے کوئی ہزار میل سے تو کسی کو آنے کا نہیں۔" بنگالی لہجے کی اُردو میں کہا گیا۔

"سمی بھائی! صبر!" وہی آواز دوبارہ اُبھری جسے عثمان بھائی کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔

عثمان بھائی کے نام پر میں چونکا۔ محمد لودھ۔ آنسہ عثمان۔ ایک تکون میرے ذہن میں بن گئی۔ اُمید کی ایک کرن نے مایوسی کے گھور اندھیروں میں سر اُبھارا۔ خدا کرے یہ وہی عثمان بھائی ہو! میرے دل سے دعا نکلی پھر میرے ذہن نے مثبت سمت رہنمائی کی اور مجھے احساس ہُوا کہ مدد سے ان کی مراد پاکستانی فوج ہے۔ یہ ہمارے آدمی تھے جنھیں ایمرجنسی تربیت دے کر مشتبہ مقامات پر ہم نے مکتی باہنی کے حمایتیوں کے بھیس میں بھیجا ہُوا تھا اور انہی مہربانوں کے ذریعے ہمیں تخریب کاروں کی آمد کی اطلاع ملا کرتی تھی۔ یہ لوگ جان ہتھیلی پر رکھ کر کام کرتے تھے۔ آج تک ایسے کسی پاکستانی کی لاش مکمل شکل میں نہیں ملی تھی جس پر شک ہو جانے کے بعد ان لوگوں نے اسے موت کے گھاٹ اتارا ہو۔ ان کی درندگی اور بربریت اس درجے انتہا کو پہنچ جاتی تھی کہ وہ ایسے لوگوں کے مختلف اعضا باری باری کاٹ کر انھیں موت کے گھاٹ اتار دیتے اور پھر لاش مسخ کر کے پھینک دیتے۔

میں نے خود آگے بڑھ کر حالات کا جائزہ لینا چاہا لیکن ایسا کرتے ہُوئے معاملے کے منفی پہلو کو میں نے نظر انداز نہیں کیا تھا اور اپنی سوچ کے برعکس پیش آنے والے حالات سے نمٹنے کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار تھا۔ میں نے کھڑکی کے راستے ہی اندر داخل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔

پچھلی راتوں کا چاند آسمان کے ایک کونے سے سرکتا اس کھڑکی کے عین سامنے اپنی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ یوں تو اب میری آنکھیں بھی اندھیرے میں اچھی طرح دیکھنے کے قابل تھیں مگر چاندنی نے منظر خاصا واضح کر دیا تھا۔ میں نے زقند بھری اور ایک ہاتھ کے زور پر ماہر جمناسٹوں کی طرح اُچھل کر کھڑکی کے راستے کمرے کے اندر آ گرا۔ میرے دوسرے ہاتھ میں پکڑے پستول کا رُخ کمرے میں موجود لوگوں کی طرف تھا جو چاندنی میں نہائے میرے سامنے کھڑے تھے۔ میری اچانک آمد نے انھیں

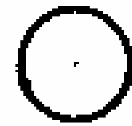


چند لمحوں کے لیے بوکھلا دیا۔

"ہینڈز اَپ!" میں نے سرگوشی کی۔ دونوں نے ہڑبڑا کر ہاتھ اٹھا دیے۔ دونوں کے منہ میری طرف ہُوئے تو بے ساختہ میرے منہ سے "عثمان بھائی" نکلا۔ وہ واقعی آنسہ کا بھائی تھا۔

"آپ!" اس نے نتائج سے بے پروا ہو کر ہاتھ گرا دیے۔

"اوہ معاف کرنا۔" میں نے بھی شرمندہ ہو کر پستول والا ہاتھ جھکا لیا۔



عثمان میرے اندازے کے مطابق ہمارا ہمدرد نکلا۔ وہ ایک محب وطن بنگالی کے گھر اس کے رشتے دار کے بھیس میں قیام پذیر تھا اور چھپ کر تخریب کاروں کی نگرانی کر رہا تھا۔ ان لوگوں نے بتایا کہ گاؤں میں کافی دیر سے ہنگامہ برپا ہے کہ کوئی پاکستانی افسر بھاگ کر اس طرف آ نکلا ہے اور مکتی باہنی والے لوگوں کو یہ کہہ کر ورغلا رہے ہیں کہ اگر اُنھوں نے اس پاکستانی افسر کو زندہ بچ کر جانے دیا تو وہ فوج کی کمک لے کر یہاں آ جائے گا اور سارے گاؤں کو تہس نہس کر کے رکھ دے گا۔ یہاں پر پروپیگنڈا خاصا رواج پا چکا تھا کہ جب پاکستانی فوج کارروائی کرتی ہے تو وہ اچھے بُرے کی تمیز ملحوظ نہیں رکھتی اور گندم کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ بیچارے سیدھے سادے بنگالی ان کے زہریلے پروپیگنڈے کے زیرِ اثر ہی میری تلاش میں گھروں سے باہر نکل آئے تھے اور اپنی بقا کے لیے مجھے گھیر کے مارنے کے چکر میں تھے۔

عثمان کے پاس ایک چھوٹا سا ٹرانسمیٹر تھا جو اس نے گھر کے ایک محفوظ کونے میں چھپا رکھا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اپنے ساتھیوں سے رابطہ قائم کیا جنھوں نے میرے زندہ بچ نکلنے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ انھوں نے بتایا کہ پیغام تو انھیں پہلے ہی مل چکا ہے اور یہ بھی اندازہ تھا کہ مفرور میں ہی ہو سکتا ہوں جس کا تخریب کار تعاقب کر رہے تھے لیکن فضائی امداد ابھی تک اس لیے نہیں بھیجی گئی تھی کہ وہ لوگ پہلے اس علاقے کو اچھی طرح گھیرے میں لے لینا چاہتے تھے اور یہ عمل خاموشی سے وقوع پذیر ہو گیا۔

یہاں دو اسٹین گنیں بھی موجود تھیں جو بوقتِ ضرورت استعمال کرنے کے لیے عثمان اور اس کے ساتھی کو دی گئی تھیں۔ ہم نے مکان کے داخلی دروازے کی کنڈی لگا لی اور خود کمرے کی چھت پر مورچے قائم کر لیے۔ یہ سب کچھ حفاظتی اقدامات کے پیشِ نظر تھا، کیونکہ اس بات کا خطرہ بہرحال موجود تھا کہ مدد آنے سے پہلے کہیں دشمن ہم تک نہ پہنچ جائے۔

میرے اندیشوں نے بالآخر حقیقت کا روپ دھار لیا کھیتوں میں میری تلاش سے مایوس ہو کر وہ لوگ اب گاؤں کی طرف آ رہے تھے۔ شاید اس مجمعے میں کسی نے اس گھر میں موجود "مشتبہ مہمان" کا ذکر کر دیا ہو گا کیونکہ عثمان بہاری تھا اور بہاریوں کو وہ لوگ شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔

پھر کیا تھا ہجوم چیختا چنگھاڑتا اس مکان کی طرف بڑھنے لگا۔ ہمارے بنگالی دوست کا تو خوف کے مارے بُرا حال تھا۔ مجھے ہجوم سے زیادہ اس کی فکر دامن گیر تھی۔ ڈر تھا کہ دہشت سے اس کا ہارٹ ہی نہ فیل ہو جائے۔ عثمان کے حواس البتہ بحال تھے۔ شاید میرے سامنے وہ بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ ایسے نازک حالات میں تو اچھے بھلے جی دار کا پِتّہ پانی ہونے لگتا ہے۔

ہم دونوں نے دہشت زدہ بنگالی کو اپنے درمیان لٹا رکھا تھا اور چھت کے دو اطراف پوزیشنیں سنبھالے بیٹھے تھے ابھی وہ لوگ کچھ دُور ہی تھے کہ میں نے ہوا میں گولیاں چلا کر انھیں خبردار کیا، میرا مقصد کسی کو ہلاک کرنا ہرگز نہ تھا۔ میری تو صرف یہ خواہش تھی کہ کسی طرح مدد آنے تک ان لوگوں کو خود سے دُور رکھوں۔

گولیوں کی آواز سنتے ہی ان کے قدموں کو زمین نے جکڑ لیا۔ بالکل اسی انداز میں وہ واپس بھاگنے لگے پھر ان کے لیڈروں کے چلّانے پر وہ رُک گئے اور دوبارہ آگے بڑھے۔ وہ مسلّح تخریب کار جوان کے لیڈر بنے ہوئے تھے۔ فائرنگ کرتے ان کے آگے آگے چل رہے تھے اور بقیہ لوگ باقاعدہ فوجیوں کی طرح ان کی آڑ میں پیش قدمی کرتے ہماری طرف آ رہے تھے۔

میں نے بادلِ ناخواستہ ان پر براہِ راست فائرنگ شروع کر دی۔ مکان کی پوزیشن ایسی تھی کہ وہ گاؤں سے الگ تھلگ نظر آ رہا تھا۔ پہلے ہی ہلّے میں میں نے دو حملہ آوروں کو جہنّم رسید ہوتے دیکھا



باقی لوگ پیچھے ہٹ گئے اور اب انھوں نے مکان کو تین اطراف سے گھیرے میں لے کر آگے بڑھنا شروع کیا۔ میں نے عثمان کو دوسری طرف سے گولی چلانے کو کہا اور خود پھُرتی سے پوزیشن بدل بدل کر باقی اطراف سے اس طرح باری باری فائرنگ کرنے لگا کہ دشمن کو یہی گمان گزرے کہ وہاں ان کے مقابلے کے لیے کافی لوگ موجود ہیں۔ اس طرح فائرنگ کرنے کی کمانڈوز کو خاص تربیت دی جاتی ہے۔

مجھے خود سے زیادہ ان دونوں کی فکر تھی ــــــ کمانڈوز تو ایسے انجام سے دوچار ہونے کے لیے ہمیشہ ہی تیار رہا کرتے ہیں، لیکن وہ بے چارے بھی میرے ساتھ ہی مارے جاتے۔ ہمارے پاس بمشکل اتنی گولیاں تھیں کہ اسی رفتار سے فائرنگ کرتے ہُوئے ہم مزید دس منٹ تک انھیں خود سے دُور رکھ سکتے تھے۔ اور اس سے کم رفتار سے فائرنگ ممکن نہ تھی۔ ورنہ وہ لوگ کہیں سے بھی "خلا" پا کر ہم پر چڑھ دوڑتے۔ بہرحال کچھ بھی ہو۔ میں نے سوچا ہمیں آخری دم تک بے جگری سے مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اب آہستہ آہستہ گولیوں کا ذخیرہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ حملہ آوروں کو بھی ہمارے اس کمزور پہلو کا علم تھا اور وہ بڑی بے چینی سے اس وقت کے منتظر تھے جب ہمارے پاس گولیاں ختم ہو جائیں اور ہم بے بس چوہوں کی طرح مارے جائیں۔

وقت کی نزاکت کا احساس کرتے ہُوئے میں نے عثمان کو فائرنگ روکنے کا حکم دیا۔ میں اب سوچ سمجھ کر گولیاں استعمال کرنا اور زیادہ سے زیادہ دیر تک انھیں الجھا کر مدد کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔ جس طرف سے وہ لوگ پیش قدمی کی کوشش کرتے میں پھُرتی سے اسی طرف رخ بدل کر فائرنگ کرنے لگتا۔ اب انھوں نے بھی فائرنگ شروع کر دی تھی اور یلغار کرنے کے موڈ میں نظر آتے تھے۔ میں نے عثمان سے کہا: وہ اپنے دوست کے ساتھ کھیتوں کے راستے سے (جو کسی حد تک محفوظ تھا) فرار ہو جائے اس اثنا میں میں ان لوگوں کو اُلجھائے رکھوں گا! لیکن اس باغیرت انسان نے یہ گوارا نہ کیا:

"کیا بات کرتے ہو بھائی۔ ابھی میرا خون اتنا سفید نہیں ہُوا۔ ہمارا جینا مرنا ساتھ ہو گا۔" اُس

نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

مَیں نے ایک نظر اس ایثار کے پتلے پر ڈالی اور دوبارہ اپنے کام میں جُت گیا۔ جس وقت میں اسٹین گن کے میگزین میں آخری گولیاں بھر رہا تھا عین اس لمحے قدرت کو ہماری حالت پر رحم آگیا اور دُور آسمان پر گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ ہم نے پُر اُمید نظروں سے اُس طرف دیکھا تو گن شپ ہیلی کاپٹر کی جلتی بجھتی روشنیوں پر نظر پڑی جنھیں دیکھتے ہی ہمارے ارد گرد پھیلے اندھیرے چھٹ گئے۔ حملہ آوروں نے بھی شاید ہیلی کاپٹر دیکھ لیا تھا، کیونکہ اُنھوں نے فائرنگ تیز کر دی تھی۔ وہ دیوانہ وار گولیاں چلا رہے تھے۔ اب ان کے حملوں میں بلا کی شدت پیدا ہو چکی تھی۔ میں ایک ایک گولی سنبھال کر خرچ کر رہا تھا۔ آخری لمحات میں لڑائی نے بہت شدت اختیار کر لی۔ میرا پستول عثمان نے سنبھال لیا تھا اور وہ نیچے اتر کر داخلی دروازے کے پیچھے چھپ کر ناگہانی حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے پَر تول رہا تھا۔

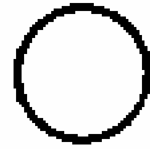
ہیلی کاپٹر کی آواز نے خوفزدہ بنگالی کا حوصلہ بھی بڑھا دیا تھا اس کے زرد چہرے سے نچڑا ہُوا خون آہستہ آہستہ دوبارہ گردش کرنے لگا تھا۔ ہیلی کاپٹر اب ان لوگوں کے سروں پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے نیچے لگی تیز سرچ لائٹس نے دن کا سا سماں پیدا کر دیا تھا۔ پہلے تو ہیلی کاپٹر سے ان لوگوں کو ہتھیار ڈالنے کی وارننگ دی گئی جس کے جواب میں اُنھوں نے گالیاں بکتے ہُوئے اوپر کی سمت فائرنگ شروع کر دی جو بالکل فضول تھی۔ یہ صورتحال دیکھ کر ہیلی کاپٹر نے ان کے سروں پر چکّر کاٹا اور اس کی طاقتور گنوں نے سُرخ شعلے اُگلنے شروع کر دیے۔ جنھوں نے پہلے ہی ہلے میں پانچ حملہ آوروں کو نگل لیا۔ باقی لوگ سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے لیکن اب ان کے فرار کے راستے مسدود تھے، کیونکہ فضائی مدد میں دیر ہی اس لیے ہُوئی تھی کہ ہماری پیدل فوج کے جوان مطلوبہ علاقے کو گھیرے میں لے رہے تھے۔

چند منٹ کے بعد ہی سامنے کا علاقہ یوں صاف ہو گیا جیسے یہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ میری خاص یونٹ کے دو جوان ہیلی کاپٹر سے اُتر کر نیچے آئے اور بھاگتے ہُوئے ہم سے لپٹ



گئے۔ اس طرح گھیرے میں آ کر ہمارا بچ نکلنا یقیناً معجزے سے کم نہیں تھا ہم سب خدا کا شکر بجا لائے۔

پیدل فورس نے اپنا گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا اور اکّا دکّا گولیاں چلنے کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں شاید وہ لوگ معمولی سی مزاحمت کر رہے تھے۔ قریباً آدھ گھنٹے کے بعد یہ "آپریشن" پایۂ تکمیل کو پہنچا اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم لوگ ایک فوجی ٹرک میں اپنے ہیڈکوارٹر کی طرف واپس جا رہے تھے۔



ہیڈکوارٹر پہنچ کر مجھے عثمان کے متعلق مزید معلومات حاصل ہوئیں وہ ہمارا خصوصی مددگار تھا اور اب تک ہمارے لیے بہت سے کارنامے سرانجام دے چکا تھا۔ ہمارے افسران عثمان جیسے محب وطن لوگوں کے تعاون سے رضاکاروں پر مشتمل مجاہد فورس (جس نے آگے چل کر البدر اور الشمس کی شکل اختیار کی) منظم کرنے کیلئے کوشاں تھے اور عثمان اس علاقے میں ہمارے لیے خصوصی خدمات انجام دے رہا تھا۔ وہ ایم اے کا طالب علم تھا لیکن اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر ہمارے لیے کام کر رہا تھا کیونکہ ایسے لوگ جو کھُل کر ہماری حمایت کرتے تھے یا ہمارے ساتھ عملی خدمات انجام دیا کرتے جلد یا بدیر مقامی غدّاروں کی وجہ سے ملک باہنی کے تخریب کاروں کی نظر میں آ جایا کرتے تھے اور اسکے بعد ان کا انجام ہمارے تصوّرات سے بھی زیادہ بھیانک ہوتا تھا۔

فی الحال میں "ریسٹ" پر تھا۔ قریباً گیارہ بجے کے بعد ضابطے کی کارروائیوں سے فارغ ہو کر مَیں اسے اپنے ساتھ جیپ میں بٹھا کر گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔

مَیں اپنے اس فعل کی توجیہہ پیش کرنے سے قاصر ہُوں کہ بنیادی طور پر مَیں ایک "بینڈو" تھا۔ ایک ایسا دیہاتی فوجی جسے زندگی نے جذبات کے بجائے حقائق پرستی کا سبق پڑھایا تھا۔ ہر نوجوان کی طرح روایتی محبت سے مَیں بھی دوچار تھا۔ میرے گھر کے پچھواڑے رضیہ رہتی تھی جب وہ جست کے برتن میں دودھ دوہتی تو اس کی کھنک میری روح کو بالیدگی عطا کرتی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے

سے اس طرح محبت کرتے تھے جس طرح سمندر اپنے پُرانے پانیوں سے کیا کرتا ہے۔ رضیہ اَن پڑھ ضرور تھی لیکن وہ بہت پڑھی لکھی بھی ہوتی تو اس سے کیا فرق پڑتا۔ مدبیلے جذبوں کی چاندنی جب اُس کی آنکھوں میں جھلکتی تو ایک طمانیت سی دھوپ کی طرح میرے اندر پھیل جاتی۔ اس سکون آشنا کیفیت کا اظہار کرنے کے لیے دنیا بھر کے لفظوں کی جھولیاں خالی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ شاعری نہیں جانتی تھی کہ اپنی دلی کیفیت کے اظہار میں کسی تہذیب سے کام لے سکتی لیکن بات کرنے کا جو ڈھنگ اسے آتا تھا وہ کسی شاعر کے دیوان میں نہیں مل سکتا۔

وہ دُودھ مکھن کی پلی بانکی سجیلی نار تھی۔ اس کے انگ انگ پر دیوان لکھے جا سکتے تھے۔ اسے دیکھ کر رُباعیاں تخلیق کی جا سکتی تھیں۔ ہم نے پیتل کی انگوٹھیوں سے لے کر ریشمی رومالوں تک کا سفر اتنی سرعت سے طے کیا تھا کہ روشنی کی رفتار بھی اس کے سامنے ہیچ نظر آتی تھی جب گاؤں کے مکتب میں مولوی صاحب لڑکوں اور لڑکیوں کو دو رویہ قطاروں میں بٹھا کر درس دیا کرتے تھے تو ہمارے لاشعور میں سوہنی صاحبان اور مرزا کی کہانی جاگ پڑتی تھی۔ میں نے جب سے شعور کی آنکھ کھولی خود کو نماز اور قرآن پڑھتے پایا جس روز پہلی دفعہ رضیہ نے ایک کروشیے سے کاڑھا ہُوا رومال کستی خوشبو میں بھگو کر مجھے تھمایا اسی روز مجھے اس سائیں بابا سے عقیدت ہو گئی، جو ہمارے گاؤں کے باہر بوڑھے برگد کے درخت تلے دھُونی رمائے سارا دن چپ چاپ بیٹھا رہتا اور رات کو اس کی پُر سوز بانسری فضاؤں میں ہیر رانجھے کی سچی محبت سموتی رہتی۔

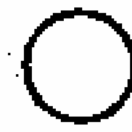
ان کے کھیت ہمارے کھیتوں سے ملحق تھے جب وہ سر پر لسی کا برتن اٹھائے ننگے پاؤں ہری بھری پگڈنڈیوں پر خراماں خراماں اپنے باپ کو روٹی دینے کھیتوں میں جاتی تو میں آنکھوں میں انتظار کی جوت جگائے پہلے سے راستے میں اس کا منتظر ہوا کرتا تھا۔ ہم دونوں جی بھر کے باتیں کرتے لیکن وہ عمومی سی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ہم وہ کچھ کبھی نہ کہہ پاتے جو ہمیں ایک دوسرے کو کہنا ہوتا جب کبھی ایسا موقع آتا۔ ایک سکوت سا ہم دونوں پر طاری ہو جاتا۔ لفظوں کے گلدستے ہاتھوں میں دھرے رہ جاتے اور مفہوم کی خوشبو آگے نکل جاتی۔



کمیشن حاصل کرنے تک اس جذبے کی شدت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اکیڈمی جوائن کرنے کے بعد وہ سرکش موجیں پُرسکون ہونے لگیں لیکن محبت کی وہ قندیل جو میرے من مندر میں رضیہ نے جلائی تھی کبھی بجھ نہ سکی۔ گھر خط لکھتے ہوئے میں "رضیہ کیسی ہے؟" لکھتا تو جواب میں "رضیہ سلام کہتی ہے" موصول ہو جاتا پھر آہستہ آہستہ طغیانیوں میں ٹھیراؤ سا آنے لگا اور میں سمندر کی طرح پُرسکون ہو گیا۔ جب کبھی گاؤں آتا وہ مجھے اپنے ہاتھوں سے میرے لیے بنائی ہوئی کوئی نہ کوئی چیز ضرور کھلاتی تھی۔ ڈھاکہ آنے سے پہلے بھی اس نے مجھ سے کہا تھا "صاحب جی۔ وہاں جا کر اس اَن پڑھ دیہاتن کو نہ بھُلا دینا۔"

"ارے پگلی کہیں کی۔ بھلا کوئی خود کو بھی بھُلا پایا ہے تم میرا حصّہ ہو رجو! تمھارے بغیر میری پہچان کھو جائے گی۔ مجھے اس مقام تک پہنچانے میں میرے ماں باپ کی ریاضتوں کے بعد سب سے زیادہ حصّہ تمھاری دعاؤں کا ہے۔" میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ اس کا ہاتھ اپنے تپتے ہُوئے ہاتھوں میں لے کر اور گرم جوشی سے دبا کر یہ بات کہی تھی۔ میرے جواب نے اس کی آنکھوں میں ایک تمکنت بھری روشنی بھر دی تھی۔

لیکن آنسہ کو دیکھ کر نجانے کیوں وہ سب کچھ ماضی کا حصّہ دکھائی دینے لگا تھا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ محبت زندگی میں صرف ایک بار ہوتی ہے۔ ان کا واسطہ بنگال کے جادو سے نہیں پڑا۔ وہ جادُو تو سر چڑھ کر بولتا ہے۔



گھر کے دروازے پر ہمارا استقبال آنسہ نے کیا۔ عثمان کے ساتھ مجھے دیکھ کر اس کی دروازے سے لگی انگلیوں میں لرزش پیدا ہُوئی، لیکن چند ہی لمحوں میں اس نے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔

"آپ یہاں؟" اس نے میرے سلام کا جواب دے کر خوشی اور حیرت کے ملے جُلے جذبات سے میری طرف دیکھا۔

عثمان اس اثنا میں اپنے دوسرے گھر والوں کو تشفّی دینے زنان خانے میں چلا گیا تھا۔ وہ لوگ

اس کے متعلق تشویش میں مبتلا تھے، کیونکہ پچھلے چار پانچ روز سے وہ بغیر کچھ بتلائے گھر سے غائب رہا تھا۔

"جی ہاں! میں نے سوچا، آج آپ کی مہمان نوازی بھی دیکھ لیں۔" نہ جانے کیسے یہ سب الفاظ میرے ہونٹوں سے پھسل گئے۔

جواب میں آنسہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔ اس کے کنول ہونٹوں کی پتیاں ایک لمحے کو کھلیں پھر سفید موتیوں کی قطار پہ جھک گئیں۔ "آپ کا شکریہ، ہم کسی قابل تو نہیں لیکن ....." اور یہ لیکن ادھوری ہی رہ گئی۔ کمرے میں اس کے والد اور والدہ، عثمان کے ساتھ ہی داخل ہوئے تھے۔

"ابو یہ ہیں میرے وہ محسن جنھوں نے اُس روز میری جان بچائی تھی۔" اس نے میری سمت پلکیں اٹھا کر اپنے والدین سے کہا۔

"بیٹا اس روز تو تم ٹھہرے ہی نہیں۔ کس منہ سے تمھارا شکریہ ادا کروں۔" اس کے معزز والد نے میرے سلام کا جواب دے کر میرے سر پہ دستِ شفقت رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگ تو مجھے شرمندہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے ماحول کی سنجیدگی سے نجات چاہی۔

"جاؤ بیٹی چائے تو لے آؤ۔" آنسہ کے والد نے اس سے کہا اور وہ اپنی خوشبو فضاؤں میں بکھیرتی وہاں سے چلی گئی۔ آنسہ کے والد نے اُس کے جاتے ہی مجھے گھیر لیا۔

"بیٹا کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"کیا نام ہے؟"

"اچھا یہ بتاؤ حالات کب تک ٹھیک ہوں گے؟"

"ہائے بیٹا! تم سے کیا کہوں۔ کیسی کیسی قربانیاں دے کر یہ ملک حاصل کیا تھا۔"

"جانے کس ظالم کی نظر کھا گئی ہماری سنارُدھرتی کو۔"

ان کے پاس پوچھنے اور کہنے کے لیے اس کے علاوہ تھا ہی کیا اور میرے پاس جواب دینے



کے لیے وہی طفل تسلیاں تھیں جو ہم اپنے ہیڈ کوارٹر میں بھی ایک دوسرے کو دیتے رہتے تھے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی نہیں کہہ پاتے تھے۔ اتنا حوصلہ لاتے کہاں سے؟ کیسے اپنی زبان سے بدشگونی کے الفاظ نکالتے؟

میری طرح وہ لوگ بھی جانتے تھے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ میرا دل قبول نہیں کرتا لیکن وہاں سب کی حالت ایسی ہی تھی۔ ہم لوگ اسی طرح ایک دوسرے کو تسلیاں دیا کرتے تھے جیسے کسی کے اکلوتے بچے کی وفات پر اسے "صبر کرو"، "حوصلہ رکھو" کہا جاتا ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ دونوں باتیں ناممکن ہیں۔ ہم سب اُس صورتِ حال کا شکار تھے جب سچائی پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ جب حقیقت پسند انسان بھی جھوٹ کی گود میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

"بیٹا کاش تم نے وہ دور دیکھا ہوتا۔ جب ہم نے آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ خدایا! یہ دن دیکھنے سے پہلے موت کیوں نہ آ گئی۔" بوڑھے بہاری نے آنکھوں پر لگی عینک کے شیشوں کو اپنی دھوتی کے پلو سے صاف کرتے ہوئے آہ بھری۔

میں انھیں کیسے بتاتا کہ میں نے پچھلے وہ دن دیکھے نہیں انھیں محسوس کیا ہے۔ میں ان لوگوں کے بیچ پلا بڑھا ہوں جنھوں نے غلامی سے نجات پانے کے لیے اپنا سب کچھ تج دیا تھا۔ دولت اور جان ہی نہیں آبرو بھی آزادی کی دیوی کی بھینٹ چڑھا دی تھی۔ تب کہیں جا کر یہ خطہ پایا تھا اور آج گردشِ زمانہ نے وہ دن دکھایا تھا کہ جس جذبے سے لوگوں نے آزادی کی جنگ لڑی تھی، اس سے کئی گنا زیادہ نفرت کی آگ میں پھنکتے ہوئے وہ تعصب کا معرکہ سر کرنے کی فکر میں تھے۔ یہ معمولی انقلاب نہیں تھا۔ کیا کیا قیامتیں نہ ٹوٹی ہوں گی ان پر جن کی آنکھوں کے سامنے یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور وہ محض تماشائی بن کر رہ گئے تھے کہ بیچارے بے بس تھے۔

چاچا کی باتوں نے فضا کو خاصا سوگوار کر دیا تھا۔ ہماری گفتگو کا سلسلہ برتنوں کے کھنکنے کی آواز سے ٹوٹا۔ آنسہ ہاتھوں پہ ٹرے سجائے اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کی عام سی ساڑی پہن رکھی تھی، لیکن یوں لگتا تھا جیسے گیلی رات کے پیچھے اندھیرے کا سانولا پن

چھلکنے کو بے تاب ہو رہا ہو۔ اسی لمحے میرے تصور میں رقص کرتی جنگلی کنواریاں آن براجیں جن کے ہونٹ مہوا کی چھال سے رنگے ہوتے اور جن کے سالونے رس بھرے بدن پر کنول کے پھولوں کا برادہ چھڑکا ہوتا ہے۔ میں ان کے آسمانی ناچ کے بھنور میں اتر گیا۔ پرکھوں سے کسی نادیدہ اجنبی کی یاد میں پُرسوز گیت گانے والی دیوداسیاں ناریل کے جھنڈوں میں سے پلکیں جھپکا جھپکا کر مجھے دیکھنے لگیں۔ برتنوں کو ٹرے سے میز پر منتقل کرتے ہُوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نے اس کے ملکوتی حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔

ہمارے سامنے رکھی میز پر برتن جا کر اس نے جُھک کر چائے بنانا شروع کی تو نہ چاہتے ہُوئے بھی میری نگاہیں اس کے گریبان کی لکیر میں اُلجھ کر رہ گئیں۔ میری نگاہوں کی تپش کو اس کی چھٹی حس نے فوراً محسوس کر لیا۔ وہ چائے بناتی بناتی تن کر کھڑی ہو گئی۔ میری خجالت آمیز نگاہیں اس کی آنکھوں میں ڈوبیں تو حیا سے اس کی لویں جلنے لگیں۔ اس نے ساڑی کا پلو جو شانوں سے اچانک ڈھلک گیا تھا، قرینے سے سر پہ ڈال کر گویا میری نظروں کے سامنے حصار باندھ دیا۔

چائے پیتے ہُوئے میں اس سے نظریں ملانے کی جرأت نہیں پاتا تھا۔ اپنی چوری کے اس طرح اچانک پکڑے جانے پر مجھے خاصی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ چائے ختم کرتے ہی دونوں بوڑھے اُٹھ کھڑے ہُوئے۔

”معاف کرنا بیٹا ہمیں محلّے میں ایک چالیسویں میں جانا ہے۔ بیچارے کا ایک بیٹا تھا جسے ظالموں نے ڈس لیا۔“

”اس گھر کو اپنا گھر سمجھنا۔ آتے رہا کرو۔“ جہاندیدہ نگاہوں والی چاچی نے شاید اپنی بیٹی کا محفوظ مستقبل ڈھونڈ لیا تھا یا پھر آلسنہ کی طرح اس نے بھی میری چوری پکڑ لی ہو گی۔

عثمان کے ساتھ وہ بھی بیٹھ گئی اور ہم تینوں مشرقی پاکستان کے درد میں ڈوب گئے۔ عثمان کو افسران نے ہماری اچانک ملاقات ہونے کے بعد میرے ساتھ ہی اٹیچ کر دیا تھا۔ اب ایک طرح سے ہمیں مل کر کام کرنا تھا۔



جس علاقے میں ان لوگوں کا قیام تھا وہ محبِ وطن پاکستانیوں کی آبادی پر مشتمل تھا اور شاذو نادر ہی کوئی ایسا گھر رہا ہو گا جس کا ایک آدھ فرد رضاکار نہیں تھا۔ ان لوگوں کو اسلحہ اور تربیت ہم نے ہی دی تھی اور مختلف کمپنیوں کی شکل دے کر انھیں مختلف یونٹوں سے مربوط رکھا ہُوا تھا۔ ان کی ڈیوٹیوں کی نوعیت بھی مختلف تھی۔ ان سے زیادہ تر مقامی نظم و نسق کی بحالی کا کام ہی لیا جاتا تھا، لیکن جوشِ جہاد کا یہ عالم تھا کہ وہ لوگ منتیں کر کر کے ہماری چھاپہ مار پارٹیوں کے ساتھ جایا کرتے تھے جو زیادہ تر سرحد کے ساتھ ساتھ لگے مکتی باہنی کے ٹریننگ کیمپ اور اسلحہ کے مراکز کو نشانہ بنایا کرتی تھیں۔

اچانک باہری دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی اور عثمان معذرت کرتا ہُوا اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی میرا دل زور سے دھڑکا۔ آلسنہ کا قرب اور تنہائی کا احساس، میری کیفیت بیان سے باہر ہے۔ میں خاموشی سے نظریں جھکائے اپنے بوٹ کی ٹو کا جائزہ لینے لگا۔ آلسنہ کی حالت بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں تھی۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے مسافر تھے۔ بالآخر اس کو مجھ پر رحم آ ہی گیا۔

”کیسا لگا ہمارا گھر؟“ اس نے اپنی کٹورا سی آنکھوں سے فسوں پھونکتے ہُوئے مجھے مخاطب کیا۔

”بہت اچھا! فائن۔“ میں نے خود کو نارمل کرنے کے لیے خالص فوجی لہجے میں جواب دیا۔ اب گویا اس نے گیند میری طرف لڑھکا کر اپنی جان چھڑالی تھی اور مجھے سوجھ نہیں رہا تھا کہ اس سے کیا کہوں! جو میں کہنا چاہتا تھا وہ ابھی تک ذہن میں واضح ہی نہیں ہو رہا تھا۔ بس ایک بے کلی سی شروع سے اب تک لگی ہُوئی تھی۔

”کالج تو بند ہوں گے؟“ مجھے اور کچھ نہ سوجھا تو اسی فقرے میں پناہ ڈھونڈ لی۔

”جی ہاں!“ اس نے مختصر سا جواب دے کر پھر مجھے اسی بھنور میں لا پھینکا۔

”بور ہو جاتی ہوں گی آپ تو۔“ میں نے حوصلہ کیا۔

”ہاں! پہلے پہل تو بڑا عجیب سا لگا لیکن اب میں زیادہ وقت ٹریننگ حاصل کرنے اور ٹریننگ دینے میں گزارتی ہوں۔“

"ٹریننگ دینے میں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں! میں نے رائفل وغیرہ چلانا تو سیکھ لیا ہے۔ عثمان بھائی سے لٹھ بازی بھی سیکھتی ہوں پھر وہی محلے کی دوسری خواتین کو سکھاتی ہوں۔" اس نے مسکراہٹ کی چاندنی ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے! اس روز تو۔۔۔۔" میں نے نہ جانے کس حوالے سے اس روز کا ذکر کر دیا تھا۔

"اس روز کی بات اور تھی جناب! اب وہ روز کبھی نہیں آئے گا۔" اس کے لہجے کی سنجیدگی نے مجھے بھی سنجیدہ کر دیا اور ایک مرتبہ پھر ہم دونوں خاموشی کے طلسم میں پھنس کر رہ گئے۔ پھر ایک عجیب سی خواہش نے میرے اندر سر اُبھارا۔ میرا جی چاہا میں آنسہ سے وہ سب کچھ کہہ دوں جو میں اس کے قرب میں محسوس کر رہا ہوں، لیکن کیسے؟ اتنی جرأت کہاں سے لاؤ گے لیفٹیننٹ صاحب! برستی آگ میں کودنا اور بات ہے وہاں تو ہر لمحے جذبوں کو مہمیز لگتی ہے لیکن اس ٹھنڈی چاندنی میں تنہا کیسے ہو؟ میری ٹریننگ کا کوئی بھی تو ایسا سبق نہیں تھا جو اس سچویشن پر لاگو ہوتا۔

باہری دروازے پہ پھر آہٹ ہوئی اور آنسہ نے اٹھ کر جانا چاہا۔ میرا حلق سوکھ رہا تھا۔ ایک چیخ اندر سے بلند ہوئی۔

"جلدی کہہ ڈالو برخوردار۔ ان لمحوں کو غنیمت سمجھو۔ یہاں جن حالات میں تم رہ رہے ہو، اگلے پل کا گمان نہیں۔ کہیں کہنے کی حسرت دل میں لے کر نہ مر جانا۔"

میں نے گلا کھنکار کر اس کے اٹھتے قدموں کو لگام دینا چاہی۔ ایک لمحے کو وہ رُکی۔ لمحہ بہ لمحہ وقت گزرتا گیا۔ میں خود سے لڑتا رہا۔ کیا کہوں؟ اور وہ چل دی۔ میں اس کی چال کی متانت میں کھو گیا۔ اس کے بالوں اور گردن کا تناؤ دیکھنے لگا۔ یوں لگا جیسے میں کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں۔ مدھم چاندنی اور سایوں سے لپٹی دیو داسی تقدس اور وقار کا مجسمہ بنی میری دھڑکنوں پر قدم رکھتی گزرتی چلی جا رہی تھی۔ "قوتِ فیصلہ اور اس پر فوری عمل، یہ ہے ایک کمانڈو کی بہترین خوبی" میرا لاشعور جاگا۔

"آنسہ" میرے ہونٹ وا ہوئے خود مجھے اپنی آواز اجنبی سی محسوس ہو رہی تھی۔



موتی بیر گھومے۔ لانبی پلکوں کی اوٹ سے جوت جگاتی ستارہ آنکھوں نے سوال کیا۔ بند سیپ نے اپنے موتی اُگل دیے۔ "جی" پلکیں جُھک گئیں۔

اب فرار اور پناہ کی کوئی راہ نہیں تھی۔ ٹریننگ بہرحال کام آ گئی میں نے حوصلہ کر ہی لیا۔ "دراصل سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کیا کہوں؟" میں نے خود سے الجھنا شروع کر دیا۔ دیوار سے لگے کلاک کی ٹک ٹک میرے اندر گونجنے لگی۔ ذہن سے اُترتی سوچیں زبان نے تھام لیں۔ لفظ ہونٹوں پر آ کر رک گئے۔

وہ پُرامید نظروں سے میری طرف دیکھتی رہ گئی اور لمحے پھسلتے چلے گئے۔ ہم دونوں کو ہوش اس وقت آیا جب کمرے کے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی، تب مجھے احساس ہوا ایک بھرپور نوجوان اور آنسہ کو اکیلی لڑکی ہونے کا۔ ہم دونوں ہی شرمندہ سے پناہ ڈھونڈنے لگے آنسہ کو مجھ سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی وہ اپنی قربت کی مہک بکھیرتی موتی بیروں پر چلتی کمرے سے باہر چلی گئی اور میں خلا میں چکر اتارہ گیا۔

"ساتھی تھا ایک۔" عثمان نے اندر آتے ہی اعلان کیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ بات میری ڈیوٹی سے متعلق تھی اس لیے فوراً نارمل ہو گیا۔

"خیریت؟" میں نے ایک ہی لفظ میں سب کچھ پوچھ لیا۔

"کچھ عجیب سی بات بتائی ہے۔ جیسور سے آیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

۔۔۔۔۔ پھر وہ مجھے عجیب سی بات کی تفصیل بتانے لگا اور میرے ذہن میں سوئے وسوسے بیدار ہونے لگے! دورانِ گفتگو آنسہ اندر آ گئی ۔۔۔۔۔ اس کا چاند چہرہ بتا رہا تھا کہ اس نے میرے دل کا چور پکڑ لیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد عثمان کے "ساتھی" کے ساتھ میں واپس ہیڈ کوارٹر جا رہا تھا معاملہ ہی کچھ ایسا تھا ۔۔۔۔ آنسہ مجھے دروازے تک رخصت کرنے آئی تھی۔ اس کی آنکھیں مجھ سے شکوہ کر رہی تھیں، کہ میں نے بات ادھوری کیوں چھوڑ دی۔ سب کچھ کہہ کیوں نہ دیا؟

# اِک ضربِ کاری

جو محبِ وطن بنگالی ہمارے لیے کام کر رہے تھے اُنھوں نے ایسے ایسے کارنامے انجام دیئے جو ہماری بے حسی کی وجہ سے شاید تاریخ کا حصّہ تو نہ بن سکیں لیکن ان کی یاد ہماری نسلیں کبھی نہ بھلا پائیں گی بعض بنگالی رضا کار خود یا توریوں کے بھیس میں سرحد پار چلے جاتے یا مُکتی باہنی کے حامی بن کر ان کے ساتھ شامل ہو جاتے اور جب بھی کوئی اہم خبر انھیں ملتی وہ اسے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ذمّے دار افراد تک پہنچا دیتے عثمان کا یہ ساتھی بھی جس نے رضا کارانہ طور پر سرحد عبور کی تھی، ایک نہایت اہم خبر لایا تھا۔

کبیر نے ایک سرحدی علاقے میں "خفیہ کیمپ" کی نشاندہی کی تھی جہاں سے مکتی باہنی کو بھاری مقدار میں اسلحہ دے کر مشرقی پاکستان میں داخل کیا جاتا تھا اور دشمن یہ پلان بنا رہا تھا کہ اس علاقے سے حملے تیز کر دیے جائیں انھوں نے اپنا توپ خانہ یہاں چھپا رکھا تھا اور منصوبہ کچھ اس طرح طے پایا تھا کہ ایک خاص دن مکتی باہنی کے بھیس میں بھارتی افواج اس علاقے میں قابض ہو کر "بنگلہ دیش" قائم کر دے۔

ظالموں نے اس گھناؤنے مقصد کے لیے جو قصبہ منتخب کیا وہ سرحد کے بہت ہی قریب ایک ریلوے اسٹیشن تھا ——— اسٹیشن سے سرحد تک کا علاقہ متنازعہ تھا! اسٹیشن کا سرحد کی طرف والا پلیٹ فارم پاکستان میں تھا اور آگے کا علاقہ بھارت نے غصب کر رکھا تھا۔





اسمگلنگ یہاں قیامِ پاکستان کے بعد ہی زوروں پر تھی۔ ریلوے لائن بالکل سرحد کے قریب سے گزرتی تھی اور اسمگلروں کی دیدہ دلیری کی انتہا ملاحظہ ہو کر وہ چلتی ٹرین سے مال باہر پھینک دیتے جو بھارتی سمگلر بلا روک ٹوک اٹھا کر لے جاتے۔ یہ حالات تو وہاں امن کے زمانے میں تھے جب کہ دونوں اطراف کی سیکورٹی فورسز ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے باوجود اسمگلنگ پر قابو نہ پا سکی تھیں اور اب جبکہ ایک طرف سے مکمل تحفظ اور مدد بھی شامل ہو گئی تھی تو صورتِ حال کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس قصبے کے سامنے اور ارد گرد کا علاقہ میدانی ہے اور وہاں دوسرے علاقوں کی طرح دلدل، جنگل اور اُونچی نیچی ٹیکریاں نہیں اور کوئی نمایاں آبی رکاوٹ بھی نہیں تھی ——— ایسے علاقے ٹینکوں کی جنگ کے لیے بہت موزوں سمجھے جاتے ہیں اور دشمن کا منصوبہ بھی یہی تھا کہ وہ کھُلے میدانی علاقے سے اپنی سرحد سے پوری شدّت کے ساتھ گولہ باری کرے گا جبکہ وہاں موجود پاکستانی افواج کی پوزیشنوں کے پیچھے والے روایتی دلدلی اور جنگلی علاقے میں پہلے سے چھپے ان کے ساتھی حملہ کر کے وہاں قبضہ کر لیں گے۔

اوّل تو ہمارے پاس اتنی فوج تھی ہی نہیں کہ ہم ملک کے چپے چپے میں پھیل جاتے پھر اندرون اور بیرونِ ملک سے ہم پر ایک ہی جیسی شدّت سے حملے ہو رہے تھے چونکہ زیادہ خطرہ ہمیشہ گھر کے بھیدیوں ہی سے ہُوا کرتا ہے۔ اس لیے ہماری توجّہ بھی زیادہ تر اندرونِ ملک امن و امان بحال کرنے پر مرکوز تھی۔ اور ہمارا ارادہ یہی تھا کہ اندرونی غدّاروں کا صفایا کرنے کے بعد بیرونی دشمن کو منہ توڑ جواب دیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ سرحدوں پر ہماری افواج کی تعداد خاصی کم تھی اور عموماً ایک ایک کمپنی کو میلوں تک پھیلا دیا گیا تھا جبکہ ایک کمپنی کو زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ ہزار گز کا علاقہ سونپا جا سکتا ہے۔

عثمان اور کبیر میرے ساتھ ہی باہر آئے تھے۔ مَیں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہُوئے انھیں رخصت کرنا چاہا کیونکہ تھوڑی دیر بعد ہمارا گروپ ایک اہم مشن پر اس علاقے میں جا رہا تھا مگر جب مَیں انھیں دروازے تک چھوڑ کر واپس آنے لگا تو عثمان نے مجھے پکارا۔

"بھائی!" وہ مجھے اسی نام سے پکارتا تھا۔

میں رُک کر اس طرف مڑا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جھجک مانع تھی۔

"کہو! کیا بات ہے؟" میں نے اسے حوصلہ دلایا۔

"میں سرحد کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ پہلے ہم لوگ سرحد کے قریب ہی ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ اب بھی اکثر وہاں آنا جانا رہتا ہے۔ میری خواہش تھی کہ آپ مجھے اس مشن میں اپنے ہمراہ لے چلتے!" اس نے بڑی منت سے یہ بات کہی تھی۔

ہم بنگالی رضاکار بھائیوں کو اکثر آپریشنوں میں اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے کیونکہ یہ لوگ ایک تو بنگالی زبان پر قدرت رکھتے تھے اور دوسرے علاقے سے بھی واقف۔ قدم قدم پر ان کی ضرورت پیش آتی تھی، لیکن آج جس مشن پر میں جا رہا تھا، اس پر عثمان کو ساتھ لے جانے کا تصور ہی بڑا اندوہناک تھا۔ اس کی خدمات کا علم جب سے اس کی فائل دیکھ کر مجھے ہوا تھا، مجھے اس سے عقیدت سی ہو گئی تھی وہ اپنے والدین کا سہارا تھا ——— یہ حقیقت بھی میرے مدِ نظر تھی کہ یہاں ہزاروں ایسے ماؤں کے لال تھے جن کے بوڑھے والدین، بہنیں اور بیویاں ان کی جدائی کا ایک ایک پل گن گن کر بیتا رہے تھے، لیکن ہم میں اور عثمان میں بہرحال ایک فرق تھا۔ ہم پیشہ ور فوجی تھے اور وہ رضاکار۔ اس کا مرتبہ ہم سے ہزار گنا بلند تھا۔ اس نے محض وطن سے محبت کی خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔

"میرے بھائی۔ جب تک ہم زندہ ہیں تمھیں ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔ تم لوگ جو کچھ کر رہے ہو وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو ہم کرتے ہیں۔" میں نے اس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بھائی ——— ایسی سعادت ———"

"بے فکر رہو! ابھی بہت مواقع آئیں گے۔ ہمیں ابھی جنگ لڑنی ہے۔ بہت لمبی لڑائی۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اچھا خدا حافظ۔" قبل اس کے کہ وہ اگلی بات کہتا میں نے رخصت چاہی اور دوسری سمت گھوم گیا۔



"فی امان اللہ!" دونوں نے بیک زبان ہو کر دہرایا۔

شام کے بعد میں آپریشن روم سے ملحق سٹنگ روم میں سستانے کے لیے ایک آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ ایک پل کا سکون میسر آیا تو آلسہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ میری دھڑکنوں پر چلتی دل میں آن براجی۔

آلسہ فضاؤں میں کھویا ہوا وہ سندر گیت تھی جو سیاہ چشم دیو داسیاں عود سلگا کر ساکیہ منی بیراگی شہزادے کی یاد میں گایا کرتی ہیں۔ سانولی سلونی دھان پان سی بنگالی ساحرہ خیام کی رباعی بن کر میرے اندر اترنے لگی۔

رتو کی دی ہوئی پیتل کی انگوٹھیاں جو آج بھی میرے گاؤں میں میرے ٹرنک میں رکھی تھیں اس کے کاڑھے ہوئے ریشمی رومال، اس کا سجیلا سراپا، میرا بچپن، ہماری طوفانی محبت سبھی کچھ اس کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہتا چلا گیا۔ محبت کی زہرہ بڑی تمکنت سے محبت کا ترشول پکڑے میری سمت بڑھتی چلی آ رہی تھی۔

——— میں اپنا تجزیہ کرنے لگا:

میں کمزور انسان نہیں ہوں۔ میرا انتخاب "سیانوں کے ایک بورڈ" نے کیا تھا۔ میری خصوصی لائن بھی وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو پتھر کے اعصاب رکھتے ہوں لیکن لڑائی اور محبت کے میدان میں بڑا فرق ہے۔ میں اکیلا پہاڑوں سے ٹکرانے کا بھی حوصلہ رکھتا تھا، لیکن پیار کا وہ ماؤنٹ ایورسٹ میری قوتِ ارادی کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا تھا، اسے سر کرنے کی توانائیاں مجھ میں نہیں تھیں۔ تب مجھے انسان کی فطری کمزوری کا تلخ تجربہ ہوا جس سے کائنات کے عظیم ترین لوگ دوچار ہو چکے تھے۔ خود پر بیک وقت ہنسی آ رہی تھی اور رونا بھی آ رہا تھا ——— فرار کی ساری راہیں ہی مسدود ہو چکی تھیں۔

جب یہ ڈوئل آلسہ نے جیت لی تو میں نے خود سے ایک کومٹ منٹ (COMMIT

MENT) کرلی کر اپنے فرائض کی راہ میں آنسہ کی محبّت کو کبھی دیوار نہ بننے دوں۔ میں راجپوت کا بیٹا تھا۔ میرے "پران" جا سکتے تھے "وچن" نہیں۔ یہ روایت نسل در نسل میرے خون میں منتقل ہوتی آئی تھی۔ وہ قول جو میں نے خود کو دیا تھا اسے نبھانے کے لیے جتنا "صدق" درکار تھا وہ مجھے ورثے میں مل چکا تھا۔

خیالوں کا تانا بانا اردلی کی آمد سے ٹوٹا جو میرے لیے کافی کا مگ لیے اندر داخل ہو رہا تھا۔ ابھی میں نے بمشکل دو گھونٹ ہی بھرے تھے کہ آپریشن روم کا دروازہ کھلا اور ایک چاک و چوبند حوالدار اندر آیا۔

"ارجنٹ میسج سر!" اس نے ایڑیاں بجائیں۔

"او کے" کہتا ہوا میں پھرتی سے اٹھا اور لپک کر آپریشن روم میں داخل ہو گیا۔

وائرلیس آپریٹر اپنے سامنے رکھے پیڈ پر تیزی سے پیغام ڈی کوڈ کر رہا تھا میری بے چین نظریں پیغام پر ٹکی تھیں۔

"ٹاپ سیکرٹ.... اطلاع کی تفتیش کی گئی۔ درست ہے کاغذات ہاتھ لگے ہیں ۵ تاریخ کو حملہ ہوگا۔ اوور اینڈ آل۔"

"ڈس کنکٹڈ سر" ریڈیو آپریٹر نے اپنے کانوں پر چڑھا ہیڈ فون اتار کر نیچے رکھ دیا۔

"او کے" میں نے ہاتھ میں پکڑے مگ سے کافی کا آخری گھونٹ بھرا اور وہی پیغام ہاتھ میں لیے باہر آگیا۔

○

چند منٹ کے نوٹس پر ہم لوگ ایمرجنسی میٹنگ روم میں اکٹھے ہوئے تھے ـــــــ میرے خاص گروپ کے دس جوان میرے ہمراہ تھے! دیوار پر لٹکے ایک نقشے پر ہمارے کرنل صاحب اپنے ہاتھ میں پکڑی چھڑی کے ذریعے مختلف مقامات کی نشاندہی کر رہے تھے۔ اُنھوں نے آڑی ترچھی لکیریں ملحقہ بلیک بورڈ پر لگا کر ہمارے ذہن میں ٹارگٹ سے متعلق تمام جزئیات نقش کر دی تھیں۔



"جنٹل مین! دشمن کی اوچھی حرکتوں کا یہ پہلا باقاعدہ جواب ہے جو آپ لوگ اسے دینے جا رہے ہیں۔ مجھے اُمید ہے ہمارا پہلا طمانچہ ہی اتنا بھرپور ہوگا کہ دشمن کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے اپنی روایت کی پاسداری کرنا تمہارا فرضِ اوّلین ہے۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔"

واقعی دشمن کے خلاف یہ ہماری پہلی پیرا ٹروپر لینڈنگ تھی۔ اس سے پہلے گو کہ بھارتی چھاتہ بردار اکثر مشرقی پاکستان میں اُترتے رہے تھے، لیکن ہم نے دشمن کے علاقے میں زمینی کارروائیاں کی تھیں اور ابھی تک چھاتہ بردار مہم روانہ نہیں ہوئی تھی۔

"آپ لوگ خوش قسمت ہیں پہلی سعادت آپ کے حصّے میں آئی" کرنل صاحب نے باری باری ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور پھر وہ اپنی نیک تمنّائیں سونپ کر رخصت ہو گئے۔

"فال اِن" کرنل کے جاتے ہی میں نے حکم دیا۔ تمام جوان قطار میں کھڑے ہو گئے۔ اگلے حکم پر وہ کمانڈوز کی مخصوص چال سے بھاگتے ہوئے اس ڈریسنگ روم کی طرف جا رہے تھے جہاں ہمیں اپنا اصلی روپ اختیار کرنا تھا ـــــــ چھاتہ بردار کا روپ!

اپنے سینے پر ایئر ونگ سجانے کے لیے جن کڑے مصائب سے گزرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ کچھ وہی جوان لگا سکتے ہیں جنھوں نے یہ سکول پاس کیا ہو۔ میرے اِن تمام جوانوں کے سینے پر ان کے "چھاتہ بردار" ہونے کا نشان اپنی عظمت کی گواہی دے رہا تھا! ہم نے جلدی جلدی ہارنس پہنے یہ وہ پٹیاں ہوتی ہیں جن سے JUMPER بندھا ہوتا ہے دورانِ تربیت انھیں پہن کر سارا سارا دن اذیت ناک مشقوں سے گزرنا پڑتا تھا تب ہمیں یہ مصیبت نظر آتی تھی، لیکن آج جب عملی میدان میں قدم رکھنے جا رہے تھے تو ہارنس محبوبہ کی زلفوں کی طرح نرم و نازک اور ہلکے دکھائی دے رہے تھے۔ اسٹیل ہیلمٹ، کِٹ، ہوائی چھاتہ بردار، اسٹیٹک لائن، ہک، نائلن کی رسیّاں، غرض ہر چیز کا معائنہ میں نے خود پہلے کیا پھر تربیت کے مطابق ہر چھاتہ بردار نے دوسرے کو چیک کیا۔ ہمارے پہلوؤں سے ہلکے ہتھیار بندھے تھے اور پیٹھ پر بندھے کِٹ میں دوسری اہم چیزیں موجود تھیں۔ چیکنگ کا مرحلہ طے ہوا، تو جوانوں کو دوبارہ "فال اِن" ہونے کا حکم دیا۔

——— اور پھر وہ میری سربراہی میں کمانڈو کی پُر وقار چال چلتے اس ٹرک کی طرف جا رہے تھے جس نے ہمیں قریبی ایئرپورٹ تک پہنچانا تھا۔ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہُوئے باری باری تمام جوان ٹرک میں سوار ہو گئے۔

اندھیرے کی دبیز چادر نے آہستہ آہستہ ڈھاکہ کو اپنے حصار میں سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ شام ہوتے ہی شہر ویران سا ہو جاتا تھا۔ چاروں طرف ایک پُرہول سناٹا چھایا تھا۔ بالکل ایسا ہی سکون جیسا سمندر میں طوفان آنے سے پہلے اس کے اوپری پانیوں پر پایا جاتا ہے۔ کبھی کبھی کسی کونے سے اِکّا دکّا فائرنگ کی آواز سناٹے کا تقدّس مجروح کر دیتی۔ ہمارے راستے پر مشتبہ مقامات کے نزدیک رضاکار پہرہ دے رہے تھے۔ ان کی اِکّا دکّا گشت کرتی جیپیں کبھی کبھی ہمارے سامنے یا دائیں بائیں سے "سیف سگنل" دے کر آگے گزر جاتیں۔

آہستہ آہستہ ہم ایئربیس کے نزدیک ہوتے جا رہے تھے! میری طرح باقی جوانوں کے ذہن میں بھی اس وقت صرف اور صرف ایک ہی عزم تھا! دشمن کو فنا کر دینے کا عزم ——— اس دشمن کو جو ہمیں نیست و نابود کرنے پر تُلا ہُوا تھا!! ہم بقا کی جنگ لڑنے والے ہر عفریت سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتے تھے۔

دشمن نے اپنے گھناؤنے مقصد کے لیے ۵ تاریخ کا پروگرام بنایا تھا آج ۴ تاریخ تھی اور ہم اس پر چین آخری لمحوں میں ضربِ کاری لگانے جا رہے تھے! چند منٹ بعد ہم اندھیرے کی چادر میں لپٹے ایئربیس کی عمارت میں داخل ہو رہے تھے۔ رن وے سے کچھ دُور ہی ٹرک رک گیا۔ تمام جوان باری باری چھلانگیں لگا کر "فال ان" ہو گئے۔

حفاظتی اقدامات کے پیشِ نظر روشنیاں بجھا دی گئی تھیں، کہیں کہیں رن وے کے ساتھ ساتھ ہلکی روشنی کے سگنل نما بلب جل بجھ رہے تھے۔ یہ بھی صرف ہماری خاطر ہی کیا گیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر ہم نے ایک دوسرے کو چیک کیا۔ میرا ریڈیو آپریٹر میرے ساتھ ہی کھڑا تھا جیسے ہی ہمیں، دُور کھڑے جہاز کے قریب سے لائٹ سگنل ملا۔ ہم اس سمت چل دیے گمبھیر سناٹے میں صرف



جوانوں کے پاؤں کی ٹھک ٹھک گونج پیدا کر رہی تھی۔ جہاز کے بالکل قریب ہماری کمپنی کے میجر صاحب کھڑے تھے۔ ہمارے سیلوٹ وصول کرنے کے بعد اُنھوں نے قطار میں کھڑے جوانوں پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ ان کی آنکھوں میں جلتے انگارے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

وہ اپنے جیالوں کو الوداع کہنے آئے تھے۔ جیسے ہی وہ آخری جوان کے سامنے سے گزرے۔ جہاز کی دُم (TAIL) یکدم کھُل گئی اور یوُں لگا جیسے کسی بہت بڑے مگرمچھ نے اپنا جبڑا کھول دیا ہو۔

"کم آن ۔ ٹائیگرز۔" میجر کی دھاڑ گونجی۔

"اللہ اکبر" جوان گرجے۔ ایک ایک کر کے وہ جہاز میں سوار ہو رہے تھے۔ سب سے آخر میں' مَیں جہاز میں داخل ہُوا تھا۔

"گڈ لک جمپ ماسٹر۔" اُنھوں نے میری پیٹھ پہ پیار سے دھول جمائی۔

جہاز میں نیم تاریکی چھائی تھی۔ تمام جوان اپنی اپنی جگہ جم کر بیٹھے تھے۔ ان کے چہروں پر سنجیدگی اور آنکھوں میں قہر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی جہاز کی TAIL بند ہو گئی۔ اس کے سوئے انجن جاگے۔ اور اس نے رن وے پر دوڑنا شروع کر دیا، پھر ہلکے سے ارتعاش کے ساتھ جہاز فضا کا سینہ چیرتا آگے بڑھنے لگا۔

اندر پھیلی ہُوئی سنجیدگی میں مجھے عجیب سی گھٹن کا احساس ہونے لگا پھر مجھے P.T.W (ایئر شوٹ ٹریننگ ونگ) یاد آیا اور مَیں نے جوانوں کو للکارا۔

"ہُو آر یو" (WHO ARE YOU)

"ایئر بورن" (AIR BORN) ان کی دھاڑیں گونجنے لگیں۔

اس کے بعد تو "ہوا بردوش" کے نعروں نے تسلسل اختیار کر لیا۔ جس طرح ہم لوگ ٹریننگ میں گلا پھاڑ پھاڑ کر یہ نعرہ لگایا کرتے تھے وہی دیوانگی آج پھر ہم پر طاری تھی۔ جُوں جُوں وہ نعرے لگاتے ان کے جوشِ غضب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پھر وہ وقت بھی آ گیا جب ہم دشمن کے علاقے میں داخل ہو چکے تھے۔ ڈراپنگ زون نزدیک آیا تو جسموں میں چنگاریاں سُلگنے لگیں! دشمن کے علاقے میں ریڈار

رینج سے بچنے کے لیے ہم لوگ خاصی نیچی پرواز کر رہے تھے۔ ہم نے دشمن کے عقب میں ایک گھنے جنگل میں نیچے اُترنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ جہاں ہمارے دوسرے ساتھی ضروری اسلحہ اور سازوسامان کے ساتھ ہمارے منتظر تھے۔

رات کا ایک پہر گزر چکا تھا، جب جہاز کے دونوں دروازوں کے عین اُوپر آویزاں، سُرخ بلب روشن ہو گئے اور ــــ اس کے ساتھ ہی، ان بلبوں کے اُوپر لگی، بڑی سی گھڑی پر ہندسے جلنے بجھنے لگے؛

یہ دیکھتے ہی میرے ہونٹ متحرک اُٹھے: "اسٹینڈ اَپ ــــ"

اور پھر یہ اندازہ کرنے کے لیے: میرے اس حکم پر جوانوں کے کیا تاثرات ہیں؟ مَیں نے اُن کی جانب نظر ڈالی ہی تھی کہ ــــ جہاز کے دونوں دروازے اپنی مخصوص گڑگڑاہٹ کی آواز پیدا کرتے ہُوئے اُوپر اُٹھ گئے۔

پٹ کھلتے ہی، ہوا کی تُند و تیز لہریں جہاز میں در آئیں ــــ جانے ہماری آمد پر وہ کیوں اتنی سیخ پا ہو گئیں کہ:۔ بگولوں کی طرح ہمارے قدموں سے لپٹنے لگیں اور طوفانوں کی طرح جہاز سے پنجہ آزمائی کرنے لگیں۔

جہاز تو ڈولنے لگا تھا! لیکن آفرین ہے ہمارے جوانوں پر ــــ جیسے کچھ اور دیکھ ہی نہیں رہے تھے: مشینی انداز میں اپنی آخری مشق دہرا رہے تھے! وہی سبق ــــ جو اپنے سے آگے والے ساتھی کا ہارنس اور پیراشوٹ چیک کرنے اور اُسے "پاس" کہنے پر مشتمل تھا۔

اور یہ سارا عمل تھوڑی ہی دیر جاری رہا ــــ پھر یہ طوفان خود بخود سمٹ گیا۔

ــــ ستاروں کے اس سائے میں ہم اپنا آپریشن شروع کر رہے تھے! اُسی روشنی میں، جب ــــ آکاش سے پاتال تک، سارے اَن دیکھے راستے ہمارا انتظار کرتے صاف دکھائی دے رہے تھے!!

پھر جیسے ہی اد کے رپورٹ پائیلٹ کو ملی۔ دونوں دروازوں پر سُرخ روشنیاں بجھ گئیں اب



وہاں سبز بلب جل رہے تھے جس کا مطلب تھا جہاز محفوظ علاقے پر پرواز کر رہا ہے۔

"اسٹینڈ ان دی ڈور" (دروازے پر پہنچو) مَیں نے اگلا حکم دیا۔ بجلی کی سی پھُرتی سے آگے والے ہوابردوش MOCK DOOR (چھلانگ لگانے والے دروازے) پر جم گئے۔

"جمپ" مَیں نے گلا پھاڑا۔

دونوں جوان فضاؤں میں کُود گئے۔

اس کے ساتھ ہی قطار میں حرکت پیدا ہُوئی ہر کوئی تیزی سے آگے بڑھتا اپنی اسٹیٹک لائن STATIC LINE جھٹکے سے آگے کی طرف دھکیلتا اور فضاؤں میں کھو جاتا۔

پیراٹروپر لینڈنگ کا سب سے خطرناک مرحلہ پیرالینڈنگ فال (P-L-F) ہوتا ہے۔ گرتے وقت کی پوزیشن صحیح رکھنا ٹریننگ میں تو ممکن ہوتا ہے کیونکہ ہمیں بہرحال یہ ایڈوانٹیج حاصل رہتا ہے کہ ہم اپنے علاقے میں ہیں اور مشقیں کر رہے ہیں لیکن دشمن کی موجودگی اور اس کے علاقے میں گھِرے ہونے کا خوف بسا اوقات اس طرح ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ بہت سے جوان گرتے وقت کی پوزیشن نفسیاتی دباؤ کی وجہ سے صحیح نہیں رکھ پاتے اور کچھ کرنے سے پہلے ہی اپنے ٹخنے تڑوا کر دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

یہاں مجھے اپنی ٹریننگ کا وہ لطیفہ کبھی نہیں بھولتا جو ہمارے ایک اسٹاف نے سنایا تھا۔ ایک ہوابردوش کو جب جہاز سے چھلانگ لگاتے وقت چھاتہ صحیح کرنے کو کہا گیا تو اس نے ہنس کر کہا تھا۔

"کوئی بات نہیں اسٹاف ہم کون سا جنگ لڑنے جا رہے ہیں مشق ہی تو ہے"

ہمیں ایسی مشق نہیں کروائی جاتی وہاں تو ہر وقت یہی احساس رہتا ہے کہ سب کچھ اصلی ہو رہا ہے میرے علم کی حد تک پاکستانی افواج کا کوئی بھی چھاتہ بردار ایسا نہیں ملے گا جس نے دشمن علاقے میں جمپ کیا ہو اور P.L.F غلط کی ہو۔

مختلف درختوں کی شاخوں سے بچتا بچاتا مَیں ایک قدرے صاف قطعۂ اراضی پر گرا تھا۔

اپنے دونین ساتھیوں کو میں نے اپنے نزدیک ہی گرتے دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہم تمام ساتھی خفیہ سگنل کی مدد سے ایک جگہ اکٹھے ہو چکے تھے۔ تربیت کے مطابق میرے ساتھی بکھر کر پہرہ دے رہے تھے اور یہ تو رات کا وقت تھا اگر دن کا سماں بھی ہوتا تو کوئی ان کی کسی حرکت کو نوٹ نہ کر پاتا کیونکہ وہ جنگل ہی کا ایک حصّہ دکھائی دے رہے تھے۔ اپنے پیراشوٹوں اور فالتو سامان سے نجات پانے کے بعد ہم خود کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے۔

میری نظریں بار بار کلائی پر بندھی گھڑی کی سوئیوں پر جاتیں جیسے ہی سوئیاں بارہ کے ہندسے پر اکٹھی ہوئیں۔ میں نے اپنے ریڈیو آپریٹر کو اشارہ کیا۔ اس نے ہیڈ فون کانوں پر چڑھایا اور اپنے پہلے سے موجود دوستوں کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

پہلی ہی کوشش میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ ہم نے مختصر ترین الفاظ استعمال کیے تھے۔ دشمن کا علاقہ تھا۔ جہاں کسی بھی لمحے ہم میں سے کسی کی چھوٹی سی غلطی باقیوں کی زندگیوں کو بھی خطرے میں ڈال سکتی تھی۔ دوسری پارٹی ہم سے قریب ہی کہیں موجود تھی اور اب ملاپ کی گھڑی آرہی تھی یہی سب سے دشوار مرحلہ تھا۔ اس جنگل میں یا اس کے ارد گرد کہیں دشمن بھی لازماً مورچہ بند تھا اور اس کی پٹرول پارٹیاں بھی گشت کر رہی تھیں۔ ہر لمحے اس بات کا امکان موجود تھا کہ بجائے اپنے دوستوں کے ان سے ملاقات ہو جاتی اور ہم کچھ کرنے کی حسرت دل میں لیے رہ جاتے۔

اس خطرناک مرحلے سے نمٹنے کے لیے کمانڈوز کو خصوصی تربیت دی جاتی ہے اور انھیں مختلف جانوروں کی آوازیں نکالنے کا فن سکھایا جاتا ہے۔ قریباً پانچ منٹ بعد ہمارے نئے ساتھی جن کی تعداد چھ تھی بڑے بڑے بکسوں کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ ان بکسوں ہی میں وہ ہتھیار بند تھے جن سے ہم دشمن کا کچھ بگاڑ سکتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد میرے ساتھی راکٹ لانچروں اور ریکائل لیس رائفلوں سے لیس ہو چکے تھے۔

نو واردوں کی کمان ایک صوبیدار صاحب کے ہاتھ میں تھی جنھوں نے اپنی سروس کا بیشتر حصّہ اس علاقے میں گزارا تھا۔ ان کی زبانی علم ہوا کہ اس جنگل کو چاروں اطراف سے بھارتی فوج



نے مورچہ بند ہو کر گھیر رکھا ہے اور اس بات کے امکانات بہت کم ہیں کہ ہم ان سے جھڑپ کا خطرہ مول لیے بغیر آگے نکل کر اپنے ٹارگٹ تک پہنچ سکیں۔ صوبیدار صاحب کی بات بجا تھی میں نے ریڈیو آپریٹر کو ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کرنے کا حکم دیا۔ سلسلہ ملنے پر پہلے ہم نے اپنے بعافیت پہنچنے کی اطلاع دی اور پھر دوستوں سے ملاقات کا مژدہ سنا کر نئی صورتحال سے بھی آگاہ کر دیا۔

"اگلے حکم تک انتظار کرو۔" جواب ملا اور سلسلہ کٹ گیا۔

قریباً دس منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد پھر ریڈیو میں جان پیدا ہوئی۔ ہیڈ کوارٹر ہم سے مخاطب تھا۔

"نئی اطلاع۔ دشمن اپنی تمام قوت یہاں جمع کر رہا ہے۔ آج صبح تک اس کی تیاریاں مکمل ہوں گی ۵ تاریخ کو وہ اپنے آدمی سرحدوں میں داخل کرے گا اور پانچ کی شام کو حملہ۔ حملہ ملتوی کر دو۔ کل شام کے بعد جب دشمن سارا اسباب لے کر تیاری کے مراحل میں ہو گا اسے اچانک نیست و نابود کر ڈالو۔ اوور اینڈ آل۔"

نیا حکم ملتے ہی ہم نے وہاں چھپنے کے لیے پناہ گاہیں تلاش کرنا شروع کر دیں۔ ہمیں آج کی رات اور کل کا دن اسی حالت میں گزارنا تھا۔ اپنی سرحدوں کے اندر اندر فضائی گشت دونوں اطراف سے ہوتی رہتی تھی اور اس امر کے باوجود کہ ہمارا پائیلٹ بڑا منجھا ہوا تھا جو ریڈار کی نظروں سے بچا کر ہمیں یہاں تک لے آیا تھا اس بات کے امکانات موجود تھے کہ دشمن کو کسی فضائی مداخلت کا شک گزرے اور وہ پیرا ٹروپر لینڈنگ کے متعلق سوچ کر ہماری تلاش شروع کر دے۔

یہاں کئی جگہ ٹیلی فون کی تاریں بکھری نظر آرہی تھیں لیکن ہم نے فی الحال انھیں چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ ابھی تک تو ہم نے اپنی موجودگی کا کوئی نشان یہاں نہیں چھوڑا تھا۔ چند منٹ کے بعد ہی میرے تمام ساتھی وہاں سے یوں غائب ہو گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ کسی نے درختوں کی شاخوں پر بسیرا کیا تھا تو کسی کو دلدلی زمین میں اُگی کائی میں پناہ ملی تھی کوئی جنگلی گھاس کا حصّہ بنا بیٹھا تھا اور کسی نے میری طرح خود کو درختوں کے جھنڈ میں چھپا رکھا تھا۔ اپنا بھاری

اسلحہ ہم نے اس طرح چھپا دیا تھا کہ وہ دشمن کی نظر میں نہیں آسکتا تھا۔

○

جس جگہ جنگل میں ہم نے اپنا مرکز بنا رکھا تھا اس کے اردگرد ڈیڑھ دو میل تک ہمارے جوان جنگل کا حصہ بنے پہرہ دے رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو جنگلی درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں سے اس طرح آراستہ کر کے کیموفلاج کیا ہُوا تھا کہ باریک بین نظریں بھی ان کی حرکات کو نوٹ نہ کر پاتیں اور غور کرنے پر بھی وہ جنگل ہی کا حصہ دکھائی دیتے۔

یہ جنگل قریباً چار پانچ مربع میل میں پھیلا ہُوا تھا۔ دن کی روشنی میں میرے جوان دشمن کے بہت قریب سے "ریکی" کر آئے تھے اب ہمیں اس علاقے کے چپے چپے سے متعلق اطلاعات حاصل تھیں کہ دُشمن نے کانٹے دار تار کہاں کہاں لگا رکھے ہیں اور "مائنز" (بارودی سُرنگیں) کہاں کہاں دبا رکھی ہیں۔

شام تک کا وقت بھی یونہی گزر گیا۔ اس دوران مَیں بمشکل دو گھنٹے کی نیند لے سکا تھا یہی حال میرے دوسرے جوانوں کا تھا، لیکن اس نیند نے بھی ہمیں بالکل تازہ دم کر دیا تھا، کیونکہ کمانڈوز کو کئی کئی دن اور رات مسلسل جاگنے کی مشق کروائی جاتی ہے اور بوقتِ ضرورت ہم کسی وقت بھی دورانِ مشق اپنے اندر پیدا کردہ اس صلاحیت کو واپس بُلا سکتے تھے۔

مَیں اپنے ریڈیو آپریٹر کے ساتھ ایک درخت کی شاخوں میں چُھپا بیٹھا تھا اور میرے ریڈیو آپریٹر حوالدار نے اپنا سیٹ اپنے آگے شاخوں کو مچان کی شکل دے کر رکھا ہوا تھا —— ہم دونوں اس پر نظریں جمائے بیٹھے تھے کہ اچانک ریڈیو نے انگڑائی لی۔ تھوڑی دیر بعد ہی آواز واضح ہو گئی۔

"ہیلو ایگلز اوور۔" آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔ مَیں ریڈیو کے اوپر قریباً جُھکا ہُوا تھا کیونکہ حوالدار نے ریڈیو کی آواز خاصی نیچی کر رکھی تھی۔

"ایگلز اٹینڈنگ یو، بگ ماسٹر اوور۔" مَیں نے مائیک میں جواب دیا۔

"اسٹارٹ یور آپریشن اوور اینڈ آل۔"

رابطہ کٹ گیا۔

اس وقت قریباً رات کے نو بجے تھے لیکن یُوں لگ رہا تھا جیسے آدھی رات بیت چکی ہو اور اس کی وجہ وہ گھنیرے بادل تھے جنھوں نے دوبارہ آکر سرِشام ہی آکاش پر ڈیرے ڈال دیے تھے۔ بنگال کا موسم بھی مزاجِ یار کی طرح کبھی ایک سا نہیں رہتا خصوصاً جس علاقے میں ہم آپریشن کے لیے آئے تھے۔ وہاں تو بے شمار جنگلات ہونے کی وجہ سے آسمان پر اکثر کالی گھٹائیں چھا جاتی تھیں۔ جنگلات اور ندی نالوں کے درمیان ایک بہت بڑے قطعۂ اراضی پر میدانی اور ہموار جگہ قدرت کا کرشمہ ہی تو تھی اور ایسے کرشمے یہاں اکثر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

○

ہمارا مشن شروع ہو گیا تھا۔

—— جوان مختلف ٹکڑیوں میں بٹ کر میرے پیچھے پیچھے بلّی کی طرح دبے پاؤں تیزی سے چلے آ رہے تھے۔ ہم نے وہ محفوظ راستہ تلاش کر لیا تھا جس کے ذریعے جنگل میں موجود بھارتی افواج کا سامنا کیے بغیر ہم بخیر و خوبی یہاں سے باہر نکل سکتے تھے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم جنگل کے کنارے اس مقام پر کھڑے تھے جس کے دُور دُور تک دشمن کی پوزیشنوں کا نام و نشان بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا، لیکن اس نے حفظِ ماتقدم کے طور پر اس علاقے کو کانٹے دار تاروں سے گھیر رکھا تھا، اگر ان تاروں میں برقی رو بھی دوڑ رہی ہوتی تو بھی ہمارے نزدیک اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی جبکہ یہاں ایسا معاملہ نہیں تھا۔ قریباً دو منٹ کے بعد ہی ہم اپنا راستہ بنانے کے بعد تاروں کو دوبارہ اسی طرح فٹ کر چکے تھے اور یہ سب کچھ ہم نے بھی دشمن کی طرح حفظِ ماتقدم کے طور پر کیا تھا؛ ممکن ہے کوئی "پٹرول پارٹی" گھومتی ہُوئی اس طرف آنکلے اور انھیں کٹے ہُوئے تار دیکھ کر شک گزرے۔

اب ہم سب لوگ ایک قطار کی صورت میں اس راستے پر کھڑے تھے جہاں سے ہمیں

اپنے ٹارگٹ کی طرف جانا تھا جو یہاں سے چند میل کے فاصلے پر تھا —— ہمارے مشن کا پہلا مرحلہ شروع ہوا تھا۔ سب سے پہلے ہمیں ایک جیپ پر قبضہ کرنا تھا۔

حیرت تھی کہ ابھی تک کوئی آرمی وہیکل وہاں سے نہیں گزرا تھا۔ شاید رات کو وہ لوگ سفر کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ ہم دل ہی دل میں دعائیں مانگتے ہدف کی طرف بڑھتے ہوئے اس سڑک پر پہنچ گئے تھے جو سیدھی ہمارے ٹارگٹ کی طرف جا رہی تھی۔ ہم ایک قطار میں سڑک کے کنارے لگے درختوں کی اوٹ میں چل رہے تھے۔ اچانک خوشی سے دل دھڑکنے لگے جب ہمیں کسی جیپ کے انجن کی آواز سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحے میرے جوان پوزیشن میں آ گئے۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہم دشمن کے علاقے میں اس کی فوجی وردی پہن کر ہی کارروائی کرتے ہیں لیکن وقت آنے پر ہمارا اصل روپ بھی سامنے آ جاتا ہے کیونکہ کسی بھی کمانڈو کے لیے باعثِ سعادت اپنے ملک کی وردی پہن کر جان دینا ہے حالانکہ اکثر اوقات اتنی مہلت نصیب نہیں ہوتی۔

جیپ ابھی پندرہ بیس گز دور تھی جب اچانک ہمارے دو تین جوان اس کی روشنی میں سڑک پر آ گئے انھوں نے چونکہ بھارتی فوجی وردیاں پہن رکھی تھیں اور اس علاقے میں فوج ڈیپلائے تھی اس لیے بادی النظر میں کسی کا ان کے متعلق شک میں مبتلا ہو جانا ممکن نہیں تھا۔ قریب آنے پر البتہ اور بات تھی لیکن اتنا موقع انہیں کس کافر نے دینا تھا کہ وہ ہماری شناخت پوچھتے پھریں۔

یہ جوان ہاتھ اٹھائے جیپ کو رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ جیپ والوں نے بھی یہی سمجھا ہوگا کہ کسی ضرورت کے تحت وہ لوگ انھیں رکنے کا اشارہ کر رہے ہیں! جیپ بڑی تیز رفتاری سے آ رہی تھی اس کی اسکرین کو "حالتِ جنگ" کی پوزیشن میں ان لوگوں نے لٹا رکھا تھا اور بجائے ونڈ اسکرین کے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ کے سامنے ایک ہلکی مشین گن اپنا بھیانک جبڑا کھولے کھڑی تھی۔ پچھلی اور اگلی سیٹوں کے درمیان اسٹینڈ پر ریکائل لیس رائفل نصب تھی جس سے ٹینک ہٹ کیا جاتا ہے۔ اس جیپ کو بھی ان لوگوں نے شاید اگلے روز والے مشن کے لیے تیار کر رکھا تھا۔





جیپ کے پہیے زوردار آواز کے ساتھ چرچرائے اور وہ ان کے قریب آ کر رک گئی دو سپاہی آگے اور ایک پیچھے بیٹھا اونگھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ سبب دریافت کریں ہم ان کے سر پر پہنچ چکے تھے حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ انھوں نے مشینی انداز میں اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

یہ تینوں ہمارے پہلے باقاعدہ شکار تھے۔

ان سے نجات پانے کے بعد میرے تمام ساتھی جونکوں کی طرح جیپ سے چمٹ گئے۔ ہدف سے کچھ فاصلے پر ہم سب علیحدہ علیحدہ ایک دوسرے کو نیک تمنائیں دیتے ہوئے مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ تمام گروپوں نے اپنا اپنا کام تقسیم کر رکھا تھا کچھ لوگوں کو اندر گھس کر ڈائنا مائٹ لگا کر اسے تباہ کرنا تھا۔ کچھ کو بارکوں میں گھس کر شب خون مارنا تھا اور کچھ نے ٹینکوں اور دیگر سامانِ حرب پر نقب لگانی تھی۔

رات کے وقت ٹینک BLIND (اندھے) ہو جاتے ہیں اور عموماً دورانِ جنگ بھی رات کو جو "ٹینک شکار نہیں" نکلا کرتی ہیں وہ چھپ کر لیکن بڑی آسانی سے ٹینکوں کو نشانہ بنا لیتی ہیں۔

جیپ پر میرے ساتھ ڈرائیور وہی حوالدار تھا جسے بیک وقت ریڈیو اپریٹر اور ڈرائیور کا کام سرانجام دینا تھا۔ ریکائل لیس رائفل پر ایک نائیک مستعد تھا اور ایل ایم جی میرے قبضے میں تھی۔ ہم توکل بر خدا بالکل بے پروائی کے سے انداز میں اس بڑے سے لیکن چاروں دوبارہ اچھی طرح "کیموفلاج" میدان کی طرف بڑھ رہے تھے جسے دشمن نے اپنے ہیڈ کوارٹر کی شکل دے رکھی تھی۔ چاروں طرف سناٹا طاری تھا۔ تمام لائٹس آف تھیں۔ البتہ کچھ آرمی وہیکلز کی نقل و حمل بخوبی دکھائی پڑتی تھی۔ شاید ان پر لوڈنگ ہو رہی تھی۔

ہم نے تمام لائٹیں بجھا رکھی تھیں اگر بس چلتا تو اس کے انجن کی آوازیں بھی نہ نکلنے دیتے لیکن ہر بات انسان کے قبضۂ قدرت میں نہیں ہوتی، اگر وہ اتنی ہی قدرت رکھنے لگے تو قادرِ مطلق کو کیونکر یاد کرے؟

وہاں چونکہ گاڑیوں کی آمدورفت لگی ہوئی تھی اور وہ جیپ جس پر ہم [illegible] آ رہی تھی، اس لیے کسی نے ہمیں روکنے کی زحمت نہ کی۔ بے قابو ہوتی دھڑکنوں کو تب سکون ملا، جب ہم نے ایک قدرے محفوظ مورچہ نما جگہ پر جیپ چھپا دی، اب ہم بے چینی سے صوبیدار صاحب کے سگنل کے منتظر تھے جو ایک ٹولی کے ساتھ ڈائنا مائٹ اڑانے گئے تھے۔ ہمارے دلوں سے یہی دعائیں نکل رہی تھیں کہ آغاز انہی کے "بابرکت عمل" سے ہو، اگر اس سے پہلے ہم دشمن سے ٹکرا گئے تو ممکن ہے ہمیں اپنی محنت کا اتنا بھرپور انعام نہ مل سکے جتنا بھرپور انعام اس صورت میں ملنا ہے۔

ہمارے اردگرد ہمارے دوسرے ساتھی بھی اپنے راکٹ لانچرز اور دوسرے تباہ کن اسلحے کے ساتھ گھات لگائے اشارے کے منتظر تھے۔ قریباً پندرہ منٹ کے اذیت ناک انتظار کے بعد ہمارے دل خوشی سے بلیوں اچھل پڑے۔ ہیڈکوارٹر کے ایک کونے سے ایک زوردار دھماکے کے ساتھ سرخ اور نارنجی رنگ کا شعلہ آسمان کی وسعتوں کو لپکا۔ اس کے ساتھ ہی دھماکوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ دوسری پارٹی نے "پٹرول ڈمپ" کو نشانہ بنا لیا تھا۔ پہلا حملہ صوبیدار کی سربراہی میں ہوا تھا۔ انھوں نے ڈائنا مائٹ لگا کر گولہ بارود کے محفوظ ذخائر اڑا دیے تھے پھر تو جیسے زمین آسمان تھاڑنے لگے ہم سب دیوانہ وار دہکتے انگاروں میں کود گئے۔ ہمارے کرنل صاحب کے وہ الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے: "تم وہ خوش قسمت جوان ہو جنھیں دشمن پر پہلی بھرپور ضرب لگانے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔"

اور ہم واقعی "باسعادت" بننے پر تل گئے تھے۔

——— آگ کی لپٹوں سے اٹھنے والی روشنی نے ہمارے شکار کی نشاندہی بھی کر دی تھی۔ ہمارے دائیں طرف کچھ فاصلے پر درختوں کی قطار کے نیچے دن کی روشنی میں تباہی پھیلانے والے PT-۷۶ ٹینک کھڑے تھے۔ بھارتی سورماؤں کو اپنے ان آہنی قلعوں پر بڑا مان تھا کیونکہ یہ ٹینک خشکی اور پانی میں ایک سی قوت سے لڑتا ہے اور پانی میں سے بآسانی تیر کر پار نکل جاتا ہے وہاں قریباً چھ PT-۷۶ دن بھر کے تھکے ہارے بیلوں کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے۔ ہمارے نائیک



کے وجود میں بجلیاں کوندنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ٹینکوں کے بجائے فولاد کے پگھلے ہوئے ڈھانچے نظر آنے لگے جو فضا میں پھٹ کر اچھل رہے تھے۔ بالکل ایسے ہی جیسے بچوں کے کھیلنے والے واٹر بال اچانک پھٹ جاتے ہیں ٹینکوں کی درگت بنتے دیکھ کر میرے جوان فرطِ مسرت و انبساط سے نعرے لگانے لگے۔

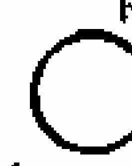
اس مہم سے ابھی فارغ ہی ہوئے تھے کہ اچانک جیپ کو جھٹکا لگا اگر حوالدار پھرتی کا مظاہرہ کر کے اچانک جیپ کو دائیں طرف تیزی سے نہ کاٹ لیتا تو ہمارے پہلو سے آنے والا ٹینک کا گولا ہمیں چاٹ جاتا ——— شاید ہماری جیپ سے ہونے والی فائرنگ کی چکا چوند نے ان لوگوں کو متوجہ کر لیا تھا اور ہمارے پہلو سے ایک ساتھ تین T-۵۵ ٹینک مست ہاتھیوں کی طرح جھومتے چلے آ رہے تھے۔

T-۵۵ ٹینک دنیا کا شاید اس وقت تک واحد ٹینک تھا جو اندھیرے میں بھی اسی پھرتی سے لڑ سکتا تھا جس کی توقع اس سے دن میں رکھی جاتی تھی۔ جیپ کے اچانک گھومنے سے ٹینک بے قابو ہوئے ڈگمگاتے شرابیوں کی طرح اپنی ہی جھونک میں آگے نکل گئے اور واپس پلٹنے سے پہلے "پرلوک" سدھار گئے کہ ہمارے نائیک نے نشانہ بازی میں کسی چوک کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ ان کے کریو جلتے ٹینکوں سے چھلانگیں لگاتے باہر نکلتے تو میری ایل ایم جی انھیں چاٹ جاتی۔ ہمارا یہ آپریشن بیس منٹ تک جاری رہا اور سچی بات تو یہ ہے کہ اب وہاں ہمارے شکار کرنے کو کچھ رہ بھی نہیں گیا تھا۔ کیونکہ ہماری طرح کسی بھی جوان نے اس کارِ خیر سے محروم رہنا گوارا نہیں کیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم لوگ اپنی سرحد کی طرف سمٹ رہے تھے! دشمن سنبھل گیا تھا اور وہ ہم پر INTENSE فائرنگ کر رہا تھا۔ اس نے ہر قسم کے اسلحے کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا تھا لیکن اب بے کار تھا کیونکہ ہم اپنا کام کر چکے تھے اور جھنجلائے ہوئے دشمن کے پاس کھسیانی بلی کی طرح سوائے اپنا کھمبا نوچنے کے اور کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا۔

اپنی سرحدوں کی طرف فاتحانہ مراجعت کرتے ہوئے ہم O.P کے فرائض بھی انجام دیتے آ رہے تھے اور جہاں کہیں سے دشمن کی کوئی ہیوی گن چمکتی دکھائی دیتی وہیں اپنی بیٹریوں کا فائر منگوا کر اسے نیست و نابود کروا دیتے۔

یہ دھما چوکڑی قریباً ایک گھنٹے ہی میں اپنے انجام کو پہنچ گئی کیونکہ اب دشمن بھی لڑائی لڑنے کی پوزیشن میں نہیں تھا، نہ ہی وہ اس مرحلے پر براہِ راست کھُل کر جنگ میں اُلجھنا چاہتا تھا ـــــ اپنا ٹنوں اسلحہ پھونک کر وہ خاموشی سے اپنے زخم چاٹ رہا تھا اور ہم لوگ اپنے آروی پوائنٹ پر اکٹھے ہو رہے تھے۔ جہاں کرنل صاحب ہمارے استقبال کو بہ نفسِ نفیس موجود تھے۔



ہمارے پیچھے دھماکے بلند ہو رہے تھے۔ کیونکہ ہمارا اور سرحدی افواج کا آپریشن اکٹھے ہی شروع ہوا تھا۔ وہاں موجود ہماری افواج نے بھی ان لوگوں کو خبردار ہونے سے پہلے جا لیا تھا۔ دو، دو۔ تین، تین کی ٹولیوں میں جوان واپس آ رہے تھے۔ قریباً آدھ گھنٹہ ان کی واپسی میں لگا کیونکہ دشمن اندھا دھند اور بے تحاشا گولہ باری کر رہا تھا اور ایسی موسلا دھار گولہ باری میں محفوظ راستہ تلاش کرنا خاصا مشکل تھا۔

آدھے گھنٹے بعد گنتی ہوئی تو ہمارے چار جوان کم تھے ان کی شہادت کی تصدیق ان کے ساتھیوں سے ہو گئی۔ جوان کے میڈل اور اسلحہ ساتھ لے آئے تھے۔ ہماری حتی الوسع کوشش یہی ہوتی ہے کہ ہم اپنے شہیدوں کی لاشیں دشمن کے قبضے میں نہ رہنے دیں۔ ہماری فوج کی تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات ملیں گے۔ جب ایک شہید کی لاش کے حصول کے لیے ہمیں ایک لڑائی لڑنا پڑی اور کئی اور جوان اپنے ساتھی کی لاش کے حصول میں منصبِ شہادت پر فائز ہو گئے۔

لیکن یہ بات ہر جگہ نہ تو ممکن ہوتی ہے نہ مناسب۔ خصوصاً کمانڈوز مشن میں تو اس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ایک کمانڈو جتنی توانائیاں بھی اپنے اندر رکھتا ہے اس کی کوشش یہی ہوتی



ہے کہ اسے دشمن کو تباہ کرنے کے لیے بروئے کار لایا جائے۔ تین ساتھیوں کو تو میرے جیالے اپنے ہاتھوں سپردِ خاک کر آئے تھے لیکن چوتھا گولا بارود کے ذخائر کے ساتھ خود بھی اُڑ گیا۔

یہ سانحے ہمارا روزمرّہ کا معمول ہیں۔ مَیں تو ہرگز نہیں کہوں گا کہ دن رات زندگی موت کے اس کھیل میں رہتے ہوئے ہمارے دل پتھر ہو چکے تھے یا ہم اتنے بے حس ہو جاتے ہیں کہ اپنے ساتھیوں کی شہادت بھی ہم پر اثر انداز نہیں ہوتی، بہرحال ہم بھی انسان ہیں۔ مانا ہمارے سینے فولاد کے بنے ہوئے ہیں مگر ان میں بھی ایک گوشت کا لوتھڑا دھڑک رہا ہے کسی حادثے کو ہم بھی اتنی ہی شدت سے محسوس کرتے ہیں جتنی شدت سے ایک عام انسان کو کرنا چاہیئے لیکن ہم میں اور عام لوگوں میں ایک فرق ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ عام آدمی انسانی موت پر منفی محسوسات کا اظہار کرتا ہے سوگوار اور پژمردہ ہو جاتا ہے اور اکثر اس کی کمرِ ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ جب کہ ہماری تربیت اس کے برعکس ہوتی ہے ہم اپنے عظیم رفقا کی شہادت سے نیا عزم پاتے ہیں۔ ہمارا مورال بڑھتا ہے اور دل میں یہ ولولہ جاگزیں ہوتا ہے کہ ؛ ہم ان کے مشن کو جس کی ادائیگی میں وہ اپنی جان کا نذرانہ پیش کر گئے، پایۂ تکمیل کو پہنچائیں گے یہی وجہ ہے کہ ہمارے سارے جیالے دیوانوں کی طرح دشمن پر ٹوٹتے ہیں۔ تب ان کے ذہنوں سے اپنا ماضی، حال، مستقبل، گھر بار، بیوی بچے، ماں باپ، یار سنگی، مسائل، الجھنیں سبھی کچھ مٹ جاتا ہے۔ وہاں تو صرف ایک ہی عزم رہ جاتا ہے۔ دشمن کو نیست و نابود کر دینے کا عزم۔ وہ رعد بن کر کڑکتے ہیں اور صاعقہ کی طرح دشمن کے خرمن کو خاشاک کر ڈالتے ہیں۔ خواہ انھیں ہی کیوں نہ اس کا ایندھن بننا پڑے۔

سلامتی ہو ان ماؤں پر جنھوں نے ایسے سرفروش جنے۔
اقبال مند ہوں وہ باپ جن کے وہ سپوت تھے!
بامراد ہوں وہ بہنیں اور خوش بخت ٹھہریں وہ بھائی جن کی گودیوں میں وہ پلے بڑھے!
سدا سہاگن ٹھہریں وہ بیوائیں جنھوں نے اپنے ہاتھوں اپنے سہاگ وطن پر وار دیئے۔

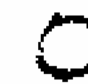
کائنات بھر کی رفعتیں ان راہوں کی دھول اپنی آنکھوں سے چُنتی رہیں گی جن راستوں کو مادرِ وطن کے ان جیالے سپوتوں نے اپنے قدموں سے فیض بخشا۔

ان کے میڈل باری باری عقیدت و احترام کے آنسو بہاتی آنکھوں سے ہم سب نے لگائے ان کے درجات کی بلندی کو بے اختیار ہمارے ہاتھ بارگاہِ خداوندی میں اٹھے۔ ہماری خاموش لہو بہاتی آنکھوں نے ان کے حضور عظمتوں کی نذر گزاری اور ہم اس ٹرک پر سوار ہو گئے جو ہمیں قریبی ایئرپورٹ پہ لے جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

ایئرپورٹ سے علی الصباح ہم واپس ہیڈکوارٹر آ گئے جہاں دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ہماری بٹالین کے باقی جوان ہمارے منتظر تھے۔ انھوں نے ہمیں گرم جوشی کے ساتھ سینوں سے چمٹا لیا اپنے پیاروں کے نوحے ان کی آنکھوں نے بھی بلند کیے لیکن وہ بچوں کی طرح روئے نہیں، حوصلہ مند فوجیوں کی طرح ضبط کیے رہے۔

مشن رپورٹ دے کر میں اور دوسرے جوان اپنی بارکوں کو چل دیے۔ پچھلے دنوں اور راتوں کی تھکاوٹ ہم نے دوپہر تک کروٹیں بدل کر ہی پوری کر لی تھی۔ ہم کچھ بھی تھے لیکن ہماری حالت تو بہرحال ان سوگوار ماتم کرنے والوں کی سی تھی جو اپنے پیاروں کو ابھی ابھی سپردِ خاک کر کے آئے ہوں۔ نیند آتی تو کیسے؟

ان کے سرخرو چہرے بار بار سوال بن کر اُبھرتے ڈوبتے رہے وہ سوال جن کا جواب نہ ہم دے پائے تھے نہ دے پائیں گے۔ وہ ہم سے بار بار یہی پُوچھتے تھے کہ ساتھیو! ہم تو رہِ وفا میں جاں سے گزر گئے ہماری امانتوں کا کیا بنے گا؟ ان کو "خائن" تو نہ لے جائیں گے۔ رکھوالو ہمارے اثاثوں کی لاج رکھنا۔



دشمن کے خلاف ہمارا یہ شاید پہلا چھاتہ بردار مشن تھا۔!

میرے دوسرے جوانوں کے جذبات بھی یقیناً میری ہی طرح تھے۔ ہم لوگ اس بات



پر فخر کر رہے تھے کہ ہم نے اپنے مکار دشمن پر اُس کی اپنی سرزمین پر پہلی بھرپور اور کاری ضرب لگائی ہے۔

ہماری یہ کامیاب کارروائی دشمن کے اُن اوچھے ہتھکنڈوں کا منہ توڑ جواب تھی جو وہ پچھلے کافی لمبے عرصے سے اپنائے ہوئے تھے۔ بھارتیوں کے سدھائے ہوئے مکتی باہنی کے درندے زیادہ تر سویلین ہی کو اپنا نشانہ بنایا کرتے تھے۔ ابھی تک اُن میں اتنی ہمت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ کسی فوجی کنوائے سے بھی دو بدو مقابلہ کر سکیں۔

اکا دکا فوجیوں پہ اُن کے حملے البتہ جاری تھے لیکن اُن کی بہیمانہ کارروائیوں کی بھینٹ زیادہ تر وطن دوست پاکستانی ہی چڑھا کرتے تھے۔

اُس روز جب میں کمرے میں لیٹا اپنے پورلو پاکستان کے شب و روز کی فکر میں غلطاں تھا تو ایک بے نام سا خوف، ایک انجانی سی خلش آہستہ آہستہ مجھ پہ طاری ہونے لگی۔

# عثمان

شام کو کرنل صاحب نے ہنگامی میٹنگ میں ایک اہم کام میرے سپرد کیا؛ بھارت میں داخل ہو کر وہ مشن پورا کرنا تھا جسے عام لوگ "جاسوسی" اور فوجی لوگ "ریکی کرنا" کہتے ہیں اور اس کے لیے میرا اسوییلین مددگار تھا عثمان!

عثمان کا انتخاب میرے کہے بغیر کرنل صاحب نے خود ہی کیا تھا انھیں اس بات کا علم تھا کہ ہم دونوں نے زندگی کے نازک ترین لمحات، ہر چند کہ ان کی مدت مختصر تھی۔ اکٹھے گزارے ہیں اور موت کی شاہراہ پر چند لمحوں تک ایک دوسرے کا ساتھ دینے والے زندگی بھر کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ انھوں نے سارا مشن "بریف" کر کے بڑی پُر اُمید نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔

"علی! تم سے پاک فوج کی بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں بیٹے!" ان کے اس مختصر سے فقرے نے میرے ذہن میں اتنا زوردار چھنا کا کیا تھا کہ میں اندر سے بج اٹھا۔

مَیں نے عثمان کو بجائے ہیڈکوارٹر طلب کرنے کے خود اس کے گھر جانے کا فیصلہ کیا اس خواہش کے پس منظر میں یقیناً میرا وہ جذبہ بھی کارفرما تھا جسے آنسہ سے محبت کہہ لیجئے۔

اپنی اور آنسہ کی آخری ملاقات کے ایک ایک لمحے کی لذت محسوس کرتا مَیں وردی ہی میں جیپ اڑاتا در حبیب کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔ رات کے تاریک سائے بڑی آہستگی سے شہر کے دامن میں اتر رہے تھے سڑکوں پر گشت شروع ہو چکی تھی۔ ڈھاکہ سو بھی رہا تھا اور بیدار بھی تھا۔



گھر کے دروازے پر میرا استقبال لانبی پلکوں والی "وش کنیا" نے کیا جو سارنا تھ کے مندروں سے اُٹھ کر آنکھوں میں آرتی کی جوت جگائے میرے سامنے آن کھڑی تھی۔ اس کی کچھ پریشان لٹیں شانوں پر آگری تھیں کچھ بال چاند چہرے سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔

"آپ؟" اس کے نینوں نے جوت جگائی۔

"ہاں میں!" میرے اندر سے کوئی بولا۔

"آجائیے نا!" عنایت نے انگڑائی لی "کیسے ہیں آپ؟"

میرا جی چاہا۔ اس سے بہت کچھ کہوں سب کچھ بتا دوں لیکن رعبِ حسن تھا کہ الاماں! کہنے کو بات بدل بدل جاتی تھی۔

"ٹھیک ہوں۔ آپ تو ٹھیک رہیں نا؟" مَیں نے کمرے کی سمت چلتے چلتے پُوچھ لیا۔

وہ اچانک رُکی، پلٹی، جلتی آنکھوں سے میری سمت دیکھا پھر خاموشی سے آگے بڑھ گئی وہاں میرے سوال کا جواب موجود تھا۔ اس مثبت جواب نے میرا مان بڑھا دیا فخر و انبساط سے میری دھڑکنیں لرزنے لگیں۔

"کون ہے بیٹی! کس سے باتیں کر رہی ہو؟" اندر سے اس کی ماں بولی۔

"علی ہیں امّی۔"

اس دوران دوسرے کمرے سے عثمان اور اس کے والد نکل آئے۔

"ارے آپ ہیں بھائی!" عثمان مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔

"آؤ بیٹے آؤ ۔۔۔ جیتے رہو" دونوں بوڑھے باری باری میری بلائیں لینے لگے۔ ہم اندر کمرے میں چلے آئے۔ تھوڑی دیر بعد ماں بیٹی تو "کچھ بنانے" اور چاچا نماز پڑھنے چلے گئے! کمرے میں عثمان اور مَیں اکیلے رہ گئے۔ مَیں نے اسی موقعے کو غنیمت جانا اور گفتگو شروع کر دی۔

جب اسے یہ علم ہُوا کہ ہم اکٹھے مشن پر جا رہے ہیں تو بے اختیار اس نے مجھے گلے لگا لیا اس کا ولولہ اور شوقِ جہاد لائقِ تحسین تھا۔ ہم اس علاقے سے متعلق جہاں سے ہم نے سرحد عبور

کرنی تھی۔ دبی زبان سے گفتگو کر رہے تھے کہ اچانک ایک طوفانِ بدتمیزی اندر گھس آیا۔

عثمان نے تیزی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولنا چاہا لیکن اس سے زیادہ تیز رفتاری سے وہ مجھ پر واپس آ رہا تھا۔ کمرے میں گھسنے والے نے دروازے کے پٹ اتنی زور سے کھولے تھے کہ عثمان ان سے ٹکرا کر الٹ گیا۔ میں نے پھرتی سے اسے الگ کیا اور چونک پڑا۔ میرے سامنے "امیت سرکار" کھڑا تھا۔

امیت سرکار میرے ہی نہیں، کسی کے لیے بھی اجنبی نہیں تھا۔ میرے خصوصی شعبے کا معمولی سپاہی بھی اُسے جانتا تھا ـــــــ اس کے ہاتھ درجنوں بے گناہوں کے خون سے رنگے ہُوئے تھے اور مقامی غنڈوں میں اسے ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ امیت سرکار ایک ہندو لیڈر کا بیٹا تھا۔ اس کا باپ تو بھارت میں پناہ لے چکا تھا لیکن وہ خود یہیں رہ کر مکتی باہنی کی مقامی تنظیم کی سربراہی سنبھالے ہُوئے تھا۔

اس کی سرکردگی میں قاتلوں کا ایک گروہ پچھلے تین چار ماہ سے بے گناہ بہاریوں اور محبِ وطن پاکستانیوں کے خون سے ہولی کھیل رہا تھا جس کسی پر انھیں پاکستان دوست ہونے کا شک ہوتا اسے بہیمانہ طریقے سے موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ عثمان چونکہ محمد پورہ کی جانی پہچانی شخصیت تھی اور رضا کاروں میں بھی اسے ایک اہم مقام حاصل تھا اس لیے اس کا ابھی تک امیت سرکار جیسے غنڈوں سے بچے رہنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

کمرے کا دروازہ انھوں نے اتنا اچانک کھولا تھا کہ ہمیں سنبھلنے کی مہلت بھی نصیب نہ ہوئی اور عثمان کے ساتھ میرے ہاتھ بھی مشینی انداز میں اوپر اُٹھ گئے۔

عثمان کوئی پیشہ ور کمانڈو نہیں تھا۔ تربیت یافتہ ہونے کے باوجود وہ بہرحال سویلین تھا اور پھر امیت سرکار کے متعلق اسے کوئی خوش فہمی بھی نہیں تھی ـــــــ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ خاصا خوفزدہ نظر آ رہا تھا! پھر میں نے اچانک اس کی حالت میں ایک تغیّر محسوس کیا۔ اس نے آہستہ آہستہ خود پر قابو پا لیا ممکن ہے میری موجودگی کے احساس نے اسے حوصلہ دیا ہو یا



اس نے میرے سامنے بزدلی دکھانا معیوب سمجھا ہو۔

کمرے میں صرف امیت سرکار ہی گھسا تھا۔ اس کا ایک ساتھی دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ جب کہ دوسرے کمرے سے عورتوں کی سہمی سہمی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، شاید انھوں نے آنسہ اور اس کے والدین کو وہاں الگ کمرے میں گھیر رکھا تھا اور اگرچہ یہاں سے دوسرا کمرہ نظر تو نہیں آتا تھا لیکن ان پر گزرنے والی قیامت کو ہم بخوبی محسوس کر سکتے تھے میرے لیے خوش آئند بات یہ تھی کہ امیت سرکار کے اندر گھسنے ہی شراب کی بدبو کا کمرے میں احساس ہُوا تھا۔

"بہت چالاک بنتے تھے!" اس نے عثمان کو گالی دیتے ہُوئے کہا ـــ اس کی آواز میں ہکلاہٹ تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ شراب پیتے پیتے اٹھ کر آ گیا ہے، اور یہ کسی حد تک تھی بھی حقیقت۔ ـــــــ مکمل ہوش و حواس کے ساتھ اس کا محبِ وطن پاکستانیوں کے گڑھ میں چلے آنا کبھی ممکن نہ تھا اور سچّی بات ہے مجھے تو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ آخر وہ یہاں تک پہنچا کیسے؟

"خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ اسی میں تمھاری خیریت ہے!" میں نے دانستہ اسے اپنی طرف متوجّہ کیا۔ میری خواہش تھی کہ اسے کسی نہ کسی طرح خوب طیش دلاؤں اور "آؤٹ" کر دوں جس کے بعد اس پر قابو پانا زیادہ ممکن تھا۔

"چپ کر و سالے"۔ اس نے میری توقع کے عین مطابق غصّے سے بے قابو ہوتے ہُوئے بنگالی زبان میں گالیاں بکنی شروع کر دیں۔

نشے کی حالت میں ایک تو ویسے ہی انسان کو غصّہ اور خوشی زیادہ محسوس ہوتے ہیں دوسرے میں نے اسے بات بھی بڑی اشتعال انگیز کہہ دی تھی۔ بھلا ایک شخص جو ہم پر اسٹین گن تانے کھڑا ہو، اسے گرفتاری کا حکم دینا عجیب سی بات تو تھی! امیت سرکار کی اس بکواس سے عثمان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا لیکن وہ بے چارا بے بسی سے ہاتھ اٹھائے کھڑا رہا۔ میں نے بھی اُسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی ممکنہ قدم اٹھانے سے منع کر دیا تھا۔

"تم چاروں طرف سے گھیرے میں آچکے ہو خواہ مخواہ اپنی زندگی سے نہ کھیلو" میں نے اسے پسخ پا کیا۔

جواب میں حسبِ توقع اس نے جی بھر کے مجھے پھر گالیاں دیں اور جوشِ غضب میں اسٹین گن تان کر میری سمت بڑھا لیکن کچھ سوچ کر رک گیا۔۔ اس کا دوسرا ساتھی جو دروازے میں پستول تانے کھڑا تھا، ہمیں برابر عجیب سی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس نے بھی چڑھا رکھی تھی۔ دوسرے کمرے میں اب ڈری ڈری اور سہمی سہمی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں شاید ان لوگوں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

"اے تم دونوں باہر نکلو" امیت سرکار نے عثمان اور مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے حکم دیا اور خود تقریباً ڈگمگا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ اس حالت میں اسے اشتعال دلانے سے صرف فائدہ ہی نہیں نقصان کا امکان بھی تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ہم میں سے کسی کو غصے میں گولی مار دے لیکن لاکھ نشے کی حالت میں ہونے کے باوجود شاید اسے اس بات کا احساس تھا کہ جیسے ہی فائر کی آواز گونجے گی ملحقہ مکانوں سے اولوں کی طرح رضا کار برسنے لگیں گے اور انھیں جان بچانا مشکل ہو جائے گی ـــــــ وہ لوگ شاید کسی گاڑی میں یہاں تک آئے تھے اور اب کمال دیدہ دلیری سے ہمیں اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے۔

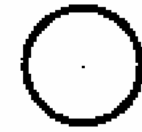
مکتی باہنی کے ایسے غنڈے میری جیب میں پڑے تھے۔ میرے لیے اس کی اہمیت کچھ بھی نہیں تھی، اگر ابھی تک میں نے اسے مہلت دی تھی تو محض اس لیے کہ عثمان کے فائرنگ کی زد میں آنے کا خطرہ تھا۔

"ٹھیک ہے اگر تم نے کتے کی موت مرنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو تمہاری مرضی" کہتے ہوئے میں ایک قدم اس طرح پرے ہٹا جیسے اس کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔ میرا اگلا قدم ذرا غلط طریقے سے اٹھا اور بادی النظر میں چالاک ترین آدمی بھی یہی سمجھتا کہ میرا پاؤں رپٹ گیا ہے۔ میں ذرا سا لڑکھڑایا تو امیت سرکار ڈگمگایا اور یہی لمحہ اس پر قیامت ڈھا گیا۔ میں نے دائیں بازو پر



زمین بوس ہوتے ہوئے اس کی پنڈلیوں پر پاؤں سے ضرب لگائی تو وہ اچانک تکلیف سے دہرا ہو گیا اور اسٹین گن سمیت زمین پر جا گرا اس کے دوسرے ساتھی نے بوکھلا کر فائر ضرور کیا لیکن عثمان جیسے چھٹی حس کے تابع ہو کر اچانک زمین پر لیٹ گیا گولی سامنے دیوار سے لگی دوسرے فائر کی مہلت اسے نصیب نہ ہو سکی۔ میں نے دائیں ہاتھ کو زمین پر جمائے ہوئے بائیں لات گھمائی اور پوری قوت سے زوردار ٹھوکر اس کے پیٹ میں لگائی تو وہ ایک مرتبہ کراہا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔

فائر کی آواز نے دوسرے محلے داروں ہی کو نہیں اس کے دوسرے ساتھیوں کو بھی ہوشیار کر دیا تھا۔ میں نے عثمان کو جھک کر اسٹین گن اٹھاتے دیکھ لیا تھا؛ ادھر سے مطمئن ہو کر میں نے دروازے کے ساتھ چپکتے ہوئے باہر جھانکا اور ایک گولی بلا مبالغہ میرے بالوں کو چھوتی گزر گئی۔ دوسرے کمرے کے دروازے پر کھڑے ان کے واحد ساتھی نے فائرنگ شروع کر دی تھی۔ اس نے فائرنگ کرتے ہوئے بھاگ کر اندر گھسنا چاہا تاکہ اس کمرے میں اپنے ساتھیوں کا حشر دیکھ سکے جیسے ہی وہ دروازے میں تیزی سے اندر آیا میں نے اڑنگا لگا کر اسے زمین بوس کر دیا۔ اس دوران میں باہر سے فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں میں یہی سمجھا کہ ابھی شاید ان کے ساتھی باقی ہیں جو گولیاں چلا رہے ہیں۔ آنسہ اور چاچا، چاچی کی زندگی کو ان سے سخت خطرہ لاحق تھا۔ میں تیزی سے باہر لپکا اور یہی میری بہت بڑی غلطی تھی جس کا فائدہ امیت سرکار نے اٹھایا۔



دوسرے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا میں نے ٹھوکر مار کر اسے کھولا تو ایک کونے میں آنسہ اور اس کے والدین ایک دوسرے سے لپٹے دبکے ہوئے تھے مجھے دیکھ کر وہ تینوں ایک دوسرے سے الگ ہو کر بے چینی سے میری سمت لپکے اور چاچا تو بے اختیار مجھ سے لپٹ گئے، پھر یہی عمل چاچی اور آنسہ نے بھی دہرایا۔ میں عجیب مصیبت میں پھنس گیا تھا نہ جانے رفتن نہ پائے ماندن والی بات تھی۔ تینوں کو میں نے بڑی آہستگی سے خود سے الگ کر کے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے

ہونے کو کہا اور خود تیزی سے واپس اسی کمرے کی طرف پلٹا۔

——— یہ دیکھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کہ وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اور کمرے کی مخالف سمت والا دروازہ کھلا تھا۔

میرے جسم میں بجلیاں سی کوندنے لگیں اور دوسرے لمحے میں تربیت یافتہ کمانڈوز کی طرح اسی دروازے سے اس طرح جھک کر باہر نکلا تھا کہ اگر اچانک بھی کوئی فائرنگ کرنے لگتا تو میرے بچنے کے امکانات باقی تھے ——— اب میں اس دروازے کے سامنے کھڑا تھا جس سے گزر کر اندر آیا تھا! باہر فائرنگ زوروں پر تھی شاید ان لوگوں کی آپس میں ٹھن گئی تھی۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے ابھی تک کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا کہ کون دوست ہے اور کون دشمن۔ ان حالات میں یہاں سے سر باہر نکالنا بھی خودکشی کے مترادف تھا۔ جانے کون سے لمحے کسی دشمن یا دوست کی گولی کھوپڑی میں روشندان بنا دے۔

میں واپس اسی کمرے میں چلا آیا جہاں چاچا، چاچی اور آنسہ کو چھوڑ آیا تھا وہ ابھی تک خوفزدہ سے دیوار سے لگے کھڑے تھے مجھے دیکھ کر ان کے چہروں پر تازگی آئی۔

"خیریت ہے بیٹا؟" جانے چاچا نے کیسے حوصلہ کیا۔

"گھبرائیے نہیں چاچا سب ٹھیک ہو گیا ہم نے ان پر قابو پا لیا ہے۔" میں نے انھیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"شکر ہے تیرا میرے مولا" چاچا نے اطمینان کی سانس لی۔

"بیٹا آج تیری وجہ سے اللہ نے ان موذیوں سے بچا لیا" چاچی میری بلائیں لینے لگیں۔

آنسہ منہ سے تو کچھ نہ بولی لیکن اس کی آنکھوں نے مجھ سے وہ سب کچھ کہہ دیا جو شاید وہ زبان سے زندگی بھر نہ کہہ پاتی! اب اکا دکا گولیاں چلنے کی آواز ہی آ رہی تھی یا تو وہ لوگ پسپا ہو گئے تھے یا پھر مارے گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو میرا ہاتھ فوراً اپنے سروس ریوالور کے دستے پر پہنچ گیا۔



"میں ہوں بھائی" عثمان کی آواز گونجی۔

اس نے صورتِ حال کی نزاکت کو جان لیا تھا اور مجھے اپنی شناخت کروا کے خطرے کا احساس ختم کر دیا تھا۔ ریوالور ہولسٹر سے لگا کر میں بے چینی سے باہر لپکا۔ میرے پیچھے پیچھے باقی لوگ بھی باہر آ گئے۔

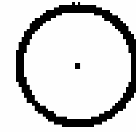
"بھاگ گیا حرامی۔ اس کے باقی دونوں ساتھی تو مارے گئے لیکن خود نکل گیا" میرے پوچھنے سے پہلے ہی عثمان نے سب کچھ بتا دیا۔

میرا جی چاہا اپنا سر پیٹ لوں سب مجھے رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ امیت سرکار کو اس کے حوالے کیوں کیا؟ حالانکہ اس کے سوا اور چارہ بھی نہیں تھا لیکن پھر بھی ایک خلش سی مجھے لگی رہی اور میں خود کو ہی اس کے فرار کا ذمے دار جاننے لگا۔

"خیر جائے گا کہاں بچ کر۔ تم سناؤ باقی ساتھی تو ٹھیک رہے نا" میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے پشیمانی کا احساس ہو۔

"ہاں! لیکن......" اس نے بددلی سے کہنا چاہا۔

"ارے لیکن ویکن کچھ نہیں۔ کیا ہوا؟ کہاں جائے گا آخر وہ" میں نے اس کی بات کاٹ کر اس کا کندھا تھپتھپایا اور اسے واپس اسی کمرے میں لے آیا جہاں ہم پر یہ قیامت لوٹی تھی۔



دروازے پر دوبارہ آہٹ ہوئی۔ عثمان اٹھ کر باہر گیا اور جلد ہی پلٹ آیا۔

"دونوں لاشیں سرکاری اسپتال بھیجنے کا بندوبست کر دیا گیا ہے اور ہمارے ساتھی سرگرمی سے امیت کو تلاش کر رہے ہیں" اس نے آتے ہی اعلان کیا۔

مجھے یقین تھا اب وہ اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔!

امیت سرکار انٹرپول کو بھی مطلوب تھا بین الاقوامی پولیس کے ریکارڈ کے مطابق وہ دنیا

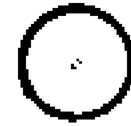
کے مشہور ہائی جیکروں کا ساتھی رہا تھا اور اس نے ایک دو مرتبہ باقاعدہ جہاز اغوا کرنے کی کارروائیں میں حصہ بھی لیا تھا۔ وہ بہت محتاط مجرم تھا ایسا مجرم جو کسی معاملے میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے کئی بار سوچتا ہے۔ وہ شاید کبھی محمد پورہ نہ آتا لیکن شراب کے نشے نے اس کا ذہن ماؤف کر دیا تھا۔ اور عثمان کی تلاش ان لوگوں کو کافی دیر سے تھی، صرف امیت سرکار ہی نہیں مکتی باہنی کا بچّہ بچّہ اس کے خون کا پیاسا تھا۔ سر پہ مصیبت پڑتے ہی امیت سرکار کی عقل ٹھکانے آگئی تھی اور اس نے میری غفلت سے فائدہ اٹھا لیا تھا۔

مَیں ان لوگوں سے تھوڑی دیر کے لیے معذرت کر کے باہر آ گیا اور اپنی جیپ میں لگے ٹرانسمیٹر کے ذریعے ہیڈکوارٹر کو اس تازہ واقعے کی اطلاع کر کے مشتبہ علاقے کو گھیرے میں لینے کی ہدایت کر دی۔ خود میں مقامی رضاکاروں کے ساتھ کم از کم اس وقت تک رہنا چاہتا تھا جب تک فوج کا کوئی دستہ ان کی مدد کو نہ آ جاتا۔ کیونکہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ یہیں کہیں چھپا ہو یا اپنے ساتھیوں کے ساتھ تھوڑی دیر بعد پھر یہاں گھات لگائے

عثمان بھی میرے ساتھ ہی باہر چلا آیا تھا۔ وہ مقامی رضاکاروں کا کمانڈر تھا اور دوسری طرف امیت سرکار بھی اسے دھوکہ دے کر نکل گیا تھا اس بات نے بھی اسے خاصا پریشان کر رکھا تھا، حالانکہ مَیں نے اسے کئی مرتبہ حوصلہ دیا تھا کہ: اس میں اس کی کوتاہی کو قطعاً دخل نہیں، لیکن وہ دودھ پیتا بچّہ تو نہیں تھا۔

——— تقریباً ایک گھنٹے بعد ایک ٹرک پر سوار چند جوان وہاں آ گئے۔ مَیں نے رضاکاروں کو ان کے گھروں کو بھیج دیا اور جوانوں کو وہاں پہرہ دینے کا حکم دے کر خود ہیڈکوارٹر کی طرف چل دیا۔ دراصل میں خود آپریشن روم میں بیٹھ کر امیت سرکار کی گرفتاری کے آپریشن کی نگرانی کرنا چاہتا تھا۔ میری شدید خواہش تھی کہ یہ موذی اب بچ کر نہ جانے پائے۔ عثمان کو مَیں نے تشفّی دے کر وہیں چھوڑ دیا اور اگلے روز اس سے ملاقات کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔





بستی سے باہر ہمارے ہیڈکوارٹر کو جانے والی سڑک دُور دُور تک سنسان دکھائی دے رہی تھی۔ مَیں جیپ کی ہیڈلائٹس روشن کیے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ ہیڈکوارٹر کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔ اچانک میرے سامنے سڑک پر رکھی ایک عجیب سی رکاوٹ آ گئی۔ شاید کسی نے وہاں چارپائی رکھی ہُوئی تھی۔ میرا پاؤں فوراً بریک پر گیا اور دوسرے ہی لمحے مجھے سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا: یہ مکتی باہنی کی شرارت تھی ——— وہ لوگ اکثر رات میں ہمارے گشتی دستوں پر اس طرح نقب لگایا کرتے تھے۔

مَیں نے بریک پیڈل پر پورا دباؤ ڈال کر اسٹیرنگ کو تیزی سے گھمایا اور جیپ دو پہیوں پر اچانک مڑ کر گھوم گئی۔ میرے اس اچانک عمل نے ہی مجھے گولیوں کی اس بارش سے محفوظ رکھا تھا جس نے ترچھی جیپ کی باڈی میں درجنوں سوراخ کر دیے تھے۔

جب جیپ کے چاروں پہیئے زمین پر لگے تو مَیں اس میں موجود نہیں تھا۔ مَیں نے فائرنگ کی ریٹ.... ٹٹ کے ساتھ ہی سڑک کے کنارے کھڑے درخت کی طرف چھلانگ لگا دی تھی۔ اور اس کے تنے کی اوٹ میں تیزی سے لڑھکنیاں کھاتا پندرہ بیس گز دُور نکل گیا۔ اندھیری رات نے دشمن کا "ٹارگیٹ" اس کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ ورنہ میری موت کا تو مکمل سامان موجود تھا۔ کھڑے ہونے کا رسک میں لینے سے رہا۔ نوکیلے پتھروں نے میری وردی کا ستیاناس کر دیا تھا۔ مسلسل لڑھکنے سے کندھے اور پیٹ پر خراشیں آ گئی تھیں جن میں اب سوئیاں سی چبھنے لگی تھیں۔ لیکن میں اسی رفتار سے لڑھکتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے بے اختیار اپنی ٹریننگ کا وہ لمحہ یاد آ گیا جب ہمارے انسٹرکٹر جیپ کے ساتھ باندھ کر ہمیں سڑک پر گھسیٹا کرتے تھے اور ہم اس ظالمانہ مشق پر انھیں "ہلاکو" کا خطاب دے چکے تھے ——— لیکن عملی زندگی میں آج جب ایسا موقع پیش آیا تو دل سے بے اختیار اپنے اساتذہ کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں۔

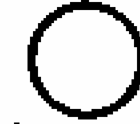
کتنے عظیم لوگ تھے وہ ——— ! کن کن مشکلات سے گزرنے کا سلیقہ اُنھوں نے ہمیں

سکھایا ــــ

الٹ بازیاں لگاتے اپنے دماغ کو کبھی نہ الٹنے دینا ورنہ چھٹی ــــ

اسٹاف کے کہے لفظ میرے نہاں خانۂ ذہن میں جل بجھ رہے تھے اور مَیں نے حتی الوسع اپنے حواس پر قابو رکھا ہُوا تھا۔ میرے دائیں بائیں آتشیں اولے گر رہے تھے حملہ آور ایک نہیں تھا۔ کتنے ہی لوگ تھے جنھیں شاید میرا ہی انتظار تھا یا پھر مَیں ہی ان کے قابو آیا تھا۔

یہ کوئی دیہاتی CULTIVATED علاقہ تو تھا نہیں کہ مَیں چھپ چھپا کر بھاگ جاتا۔ سڑک کے کنارے درخت تھے اور اس کے آگے کھُلا میدان۔ مَیں اپنی تربیت کے بل بوتے پر ان کی گولیوں سے محفوظ رہا تھا ورنہ میرے جسم کا تو حلیہ بگڑ چکا ہوتا۔ اب مَیں نے زمین سے اُٹھ کر آگے کی سمت جھکے جھکے "زگ زیگ" انداز سے درختوں کے ساتھ ساتھ بھاگنا شروع کر دیا۔



درختوں کی اوٹ سے ہٹ کر میدان میں بھاگنے کا خطرہ مول لینے کے بجائے مَیں نے سڑک کے ساتھ ساتھ آگے کی طرف نکلنا مناسب جانا تھا۔ میرے پاس صرف ایک سروس ریوالور تھا۔ ایمرجنسی اسٹین گن بھی جیپ میں رہ گئی تھی اور اتنی مہلت مجھے نصیب نہیں تھی کہ اپنے ساتھیوں کو اس ناگہانی مصیبت سے آگاہ کر سکتا۔ ریوالور کی حیثیت ان لوگوں کے سامنے پلاسٹک کے کھلونے جتنی بھی نہیں تھی اب میری واحد اُمید خدا کی ذات ہی تھی۔

پھر جیسے قدرت کو میری حالت پہ رحم آگیا ــــ دور سڑک پر کسی ٹرک کی ہیڈ لائٹس روشن ہوئیں تو میرے حوصلے دوچند ہو گئے۔ مَیں نے اب بھاگتے بھاگتے ریوالور سے تعاقب میں آنے والوں پر بھی وقفے وقفے سے گولیاں چلانی شروع کر دی تھیں۔ جلد ہی ریوالور خالی ہو گیا۔ آنے والوں نے صورتِ حال کی نزاکت کا احساس ہوتے ہی ٹرک روک لیا اور وہ اب پوزیشن لے کر زمین پہ کرالنگ کرتے ہُوئے ہماری سمت بڑھ رہے تھے۔ ٹرک کے ہُڈ پر لگی لائٹ مشین گن نے آگ اگلنا شروع کر دی تھی اور پیش قدمی کرنے والوں کو بڑا شاندار

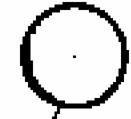


کور COVER مہیا کر رکھا تھا تخریب کار انھیں دیکھتے ہی دُم دبا کر بھاگے لیکن مخالف سمت سے بھی اب ایک ٹرک آکر رکا تھا جس میں سے جوان کود کود کر باہر نکل رہے تھے۔

میرے ساتھیوں نے بڑی دانشمندی سے انھیں گھیرے میں لیا تھا اور اب وہ اپنا دائرہ ان کے گرد تنگ کر رہے تھے۔ دشمن کی فائرنگ سے محفوظ ہونے کا احساس ہوتے ہی میں ہاتھ اوپر کیے زمین سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آوازیں دے کر اپنے ساتھیوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ جلد ہی میری پہچان مکمل ہو گئی ــــ اُنھوں نے مجھے تعظیم دی اور اپنے کام میں جتے رہے۔ بمشکل دس منٹ ہی گزر پائے تھے کہ تخریب کاروں کا دم ٹوٹ گیا اور اُنھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

امیت سرکار ہتھیار ڈالنے والوں میں شامل نہیں تھا۔

اس رات ہم نے شہر کا کونہ کونہ چھان مارا ہر مشتبہ جگہ پہ اس کی تلاش میں چھاپہ مارا لیکن خدا جانے اسے زمین نگل گئی تھی یا آسمان چٹ کر گیا۔ تقریباً آدھی رات تک ہمارا "سرچنگ آپریشن" جاری رہا، لیکن اسے نہ مِلنا تھا نہ مِلا۔ مَیں آپریشن روم سے ملحقہ کمرے میں رکھی آرام کرسی میں دھنس گیا۔ اور وہیں مجھے اُونگھ آگئی۔



صبح آنکھ مؤذن کی آواز سے کھلی۔ مَیں آنکھیں ملتا آپریشن روم میں گیا جہاں ڈیوٹی پر موجود حوالدار نے سر کے اشارے سے میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی ہماری ناکامی کی اطلاع کر دی، پژمردہ سا ہو کر مَیں پلٹا، جسم کا بند بند ٹوٹنے کا احساس ہو رہا تھا۔ نہایا تو نارمل ہُوا۔

مَیس میں ناشتہ کرتے ہُوئے دوستوں نے بچ جانے پر مبارک باد دی۔ گھر سے ماں کا خط آیا تھا۔ وہی سلامتی کی دعائیں اور بامُراد ہو کر جلد لوٹ آنے کی خواہش! آخر میں ماں نے حسبِ سابق لکھا تھا: "رجو تمھیں سلام لکھواتی ہے" اس کے پاس بہت بڑا ذہن تو تھا

نہیں۔ بھئی تو بے چاری دیہاتی عورت ہی نا! اصل میں اس فقرے میں وہ سب کچھ میری ماں کہہ جاتی تھی جو اس کے دل میں تھا۔ اس نے تو دورانِ تعلیم ہی رضیہ اور میرے متعلق خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے اور چاہتی تھی کہ جلد از جلد اُس کے خواب حقیقت کا روپ دھار لیں۔

خط کے اس حصے پر پہنچ کر مجھے بسا اوقات اپنے اور اپنی ماں پر ترس آنے لگتا تھا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ : بنگال کی ساحرہ نے میری نسوں سے رجو کی ساری شیرینی نکال کر مجھے کھوکھلا کر دیا ہے اور اب میری شریانوں میں اس کی چاہت کا امرت جل ٹھاٹھیں مارنے لگا ہے۔

آئلسہ کی محبت کے سمندر کی جھاگ اڑاتی موجوں نے رضیہ کے برسوں کے پیار کو اس کی ساری توانائیوں سمیت یوں اٹھا کر پٹخا ہے کہ انھیں سر اٹھانے کے قابل ہی نہیں چھوڑا، بسا اوقات بڑی الجھن ہوتی تھی ؛ سوچیں پھر پھر کر آتیں اور مجھے اپنے ساتھ جانے کہاں سے کہاں بہالے جاتیں۔ پھر یوں معلوم ہوتا کہ میں بکھر کر رہ گیا ہوں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے خط کا جواب لکھتے وقت منافقت اپنانی پڑتی اور میں اپنی ماں کی خواہشات کے احترام میں خط کے آخر میں اسی کے سے انداز میں رضیہ سے متعلق کوئی نہ کوئی بات تحریر کر دیتا ــــ ایسے ذومعنی فقرے سُن کر وہ کتنی خوش ہوتی ہوگی ؟ اس کا تصوّر ہی میرے لیے وحشت ناک تھا لیکن یہ سب کچھ ناگزیر تھا۔

دوپہر کے وقت جب میں اپنے مشن کے سلسلے میں عملی قدم اٹھانے کے لیے عثمان کی طرف جا رہا تھا تو ہمارے ایک سوئیپر نے مجھے ایک خط لا کر دیا جو اسے کوئی میرے نام دے کر چلا گیا تھا۔ میں نے حیرانگی سے لفافہ کھولا جس میں لکھا تھا۔

"لیفٹیننٹ علی! ہماری فہرست کے صفِ اوّل لوگوں میں اب تم بھی شامل ہو۔ ہمیں "اسپیشل گروپ" کے ایک ایک رُکن کا علم ہے اور تم سب چُن چُن کر قتل کیے جاؤ گے۔ کل رات زندہ بچ نکلنے پر اکڑ نہ جانا ــــ بہت جلد تم بھی مادرِ وطن کے غدّار عثمان سمیت اپنے انجام کو پہنچو گے۔"

امیت سرکار

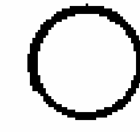
ایسے دھمکی آمیز پیغامات ہمارے افسران کو اکثر ملتے رہتے تھے۔ میری باری آج آئی تھی۔ میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے لفافے سمیت وہ رقعہ تہہ کر کے جیب میں رکھا اور اپنی جیپ کی طرف چل دیا۔ عثمان عموماً رات کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ گشت کیا کرتا تھا یا پھر وہ لوگ چھاپہ ماریوں پر جایا کرتے تھے۔ اس لیے میں نے اسے ملنے کے لیے یہی وقت مناسب جانا تھا۔ علاوہ ازیں اسے ہیڈ کوارٹر سے بھی ہدایات جاری ہو چکی تھیں۔

جیپ چلاتے ہوئے میں نے امیت سرکار کے خطرے کو بالکل ہی نظر انداز نہیں کر دیا تھا کسی بھی لمحے سڑک کے دونوں اطراف سفر کرتے بظاہر سادہ لوح سے بنگالیوں سے یہ اُمید کی جا سکتی تھی کہ وہ کوئی ہینڈ گرنیڈ مجھ پر اچھال دیں یا مجھے گولیوں سے بھون ڈالیں لیکن مجھے ایسے معاملات سے نمٹنے کی جو خصوصی اہلیت حاصل تھی اس نے میرا حوصلہ بڑھا رکھا تھا۔ میرے ذہن میں انسٹرکٹر کے وہ الوداعی کلمات تازہ تھے کہ : "یہاں ہر جھاڑی کے پیچھے ایک سانپ مجھے ڈسنے کا منتظر ہے۔"

مجھے اس سانپ سے خود ہی نہیں بچنا تھا بلکہ سادہ لوح اور وطن دوست بنگالیوں کو بھی بچانا تھا۔ یہی تھا ــ وہ عزم جس نے ہمیشہ میرے ولولوں کو تازہ کیے رکھا اور میرا مورال ہر نئے حادثے کے بعد مزید بڑھتا چلا گیا۔

ــــ اور آج میں عثمان کے ساتھ جس مشن پر جا رہا تھا اصل میں وہی میری "خاص لائن" تھی۔ بنیادی طور پر میں "کمانڈو جاسوس" تھا اور ضرورت پڑنے پر ملک کے لیے دونوں قسم کی خدمات انجام دے سکتا تھا۔ مجھے "بریف" بھی یہی کیا گیا کہ : مجھے زیادہ تر خدمات ملک سے باہر انجام دینی تھیں اور میری ذہنی تربیت بھی اسی نہج پر کی گئی تھی ــــ اب وہ وقت آ گیا تھا جب مجھے ملکی خدمات کے لیے وردی اتار کر سویلین کپڑے پہننے تھے اور یہی وہ نازک

ذمے داری تھی جس کی انجام دہی سے میں اب تک محفوظ تھا۔



دروازہ حسبِ توقع آلنسہ نے کھولا۔

رات کے واقعات کی پرچھائیاں اس کے سوگوار چہرے پر ناچ رہی تھیں، وہ میری طرح فولادی اعصاب نہیں رکھتی تھی نہ ہی اپنے بھائی کی طرح اسے ایسے حادثات سے نمٹنے کا تجربہ ہو چکا تھا۔ معمولی سی رائفل سے نشانہ بازی سیکھ لینے سے وہ اپنے اندر کے خوف کا گلا گھونٹنے سے تو رہی۔ وہ خوف جو اب آہستہ آہستہ سارے پوربو پاکستان میں سرایت کر رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس کے چہرے کی سنولاہٹ جاگ اٹھی۔ سرمگیں آنکھوں کا سحر بیدار ہونے لگا رتجگے سے نینوں میں جھلملائے گلابی ڈورے مکھڑے پر ناچتے دھنک رنگوں سے ہم کلام ہونے لگے۔ ساڑھی کا پلو سر پر سلیقے سے سجاتے ہوئے اس نے مجھے خوش آمدید کہا اور ایک طرف ہو گئی۔ اس لمحے نہ جانے کیوں میرے اندر یہ خواہش انگڑائیاں لینے لگی کہ میں اپنی اس روز کی ادھوری بات مکمل کر دوں۔ یہاں اگلے پل کا گمان نہیں تھا پھر جہاں میں جا رہا تھا وہاں سے بچ کر آنے کے مواقع بھی تو ففٹی ففٹی سے زیادہ نہ تھے۔ کسی نے میرے اندر چیخ کر کہا۔

"لیفٹیننٹ علی! کہنے کی حسرت لے کر نہ مرنا۔ یہ بوجھ سر سے اتر ہی جائے تو بہتر ہے۔" لیکن اظہار کے لیے جو قوتِ گویائی درکار تھی وہ کہاں سے آتی؟ جانے کس قوت نے میری راہنمائی کی اور میرے نطق نے بنگالی ساحرہ کو مخاطب کر ہی لیا۔ "آلنسہ"

"جی" اس نے میری طرف گھومتے ہوئے کہا۔

یہی وہ لمحہ تھا جس سے میں ہمیشہ ڈرتا رہا۔ اسے کیا کہوں؟ لفظوں کی جھولیاں خالی ہو رہی تھیں ذہن سے پھسلتی سوچیں نوکِ زبان پر ٹھہر گئی تھیں۔ ایک کپکپاہٹ سی ہونٹوں پر بسیرا جما بیٹھی۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا۔ اصل میں میں کہنے کے معاملے میں خاصا بزدل ہوں۔" نہ جانے



کیسے میں نے فقرہ مکمل کر دیا۔

"کہہ دیجئے نا ایسی کیا بات ہے" اس کی غزالی آنکھوں کے ناوک میرا کلیجہ چھیدنے لگے دھڑکنیں تھیں کہ اندر ہی اندر ہلائے دیتی تھیں۔ تب مجھے سپاہی بننا پڑا، سچ کہنے والا فوجی میں نے اسے بڑی جرأت سے کہہ دیا "آلنسہ تم نے مجھ پر بھی جادو پھونک دیا ہے۔ تم بنگالی لوگ بڑے ظالم ہوتے ہو۔ منہ سے کچھ نہیں کہتے اندر ہی اندر اپنے جادو کے زور سے اپنی گرفت "معمول" پر مضبوط کرتے جاتے ہو۔" جانے میں کیا کیا کہتا رہا۔ ماحول کا احساس ذہن سے نکال پھینکا وہاں تو صرف آلنسہ تھی۔ آلنسہ اور صرف آلنسہ۔

"یہ جادو تو مجھ پر بھی چل گیا ہے علی!" اس کی آنکھوں میں جھلملاتے موتیوں نے اس کے کہے لفظوں پر دلالت کی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے اچانک مجھے تحت الثریٰ سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر بٹھا دیا ہو۔ فخر و انبساط کا بپھرا ساگر میرے اندر لہریں مارنے لگا اور میں نے مغلوب ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

ہم دونوں اپنی دنیا میں تب پلٹے جب اندر سے چاچی نے آواز دے کر پوچھا "باہر کون ہے بیٹی؟"

چاچی بہرحال ماں تھی اور جس امانت کی اس نے آج تک نگہبانی کی تھی اب اسے لوٹانے کا فریضہ بھی اسی کے نازک کندھوں پر آن پڑا تھا۔ مرتی مارتی مخلوق کے بیچوں بیچ وہ آلنسہ کا ہاتھ تھامے جانے کب سے کسی "امین" کی منتظر تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا سامنا کرنے پر جس اندرونی کیفیت کا شکار ہوئے تھے وہ عام دنیا کی نظروں میں تو شاید نہ آ سکتی لیکن چاچی نے اسے تخلیق کیا تھا۔ اس کے کل پرزوں کو بنایا سنوارا تھا۔ اس نے میری اور اپنی بیٹی کی اندرونی کیفیت کو بھانپ لیا تھا ——— شاید لاشعوری طور پر اسے بھی کسی ایسی پناہ گاہ کی تلاش تھی جس کے دامن میں کم از کم اس کی بیٹی ہی امان حاصل کر لے۔

اس کے ذہن نے تقسیم کے مناظر فراموش نہیں کیے تھے اور ہر ذی شعور یہ محسوس کرنے

لگتا تھا کہ منافرت جس تیزی سے پنپ رہی تھی اور حالات لوگوں کو جس دھارے پر بہائے لیے چلے جاتے ہیں وہ اس امر کی گواہی ہے کہ تاریخ خود کو دہرانے لگی ہے۔ جب تاریخ دہرانے کا عمل وقوع پذیر ہوتا ہے تو جغرافیائی حالات اس پر اثر انداز نہیں ہو پاتے پھر بہار اور بنگالہ میں فرق باقی نہیں رہتا۔ جن لوگوں نے انھیں بہار میں رُلایا اور توڑا تھا وہی اب بنگالی قومیت کا روپ دھار کر ان کے مقابل تھے۔ تب چاچی خود آنسہ تھی اور وقت نے اُسے بنایا تھا کہ محفوظ سہارے کے بنا آنسہ کی حیثیت ہی کیا ہے؟ اس نے یقیناً چاہا ہوگا کہ میں آنسہ کو اپنے حصار میں لے کر اسے یلغار سے محفوظ کر لوں۔

"علی ہیں اماں۔" بیٹی نے ماں کو مژدہ جاں فزا سنایا۔

چاچی "میرا بیٹا۔ میرا لال" کہتی کمرے سے نکلی اور مجھے اپنے کمزور سینے سے چمٹا کر اپنی بے بسی کا احساس دلا دیا۔ "بیٹا جگ جگ جیو! تم نے کل ہماری عزت بچالی ورنہ امیت جیسے غنڈے کے ہاتھوں کون محفوظ ہے۔" احساسِ شکر نے لفظوں کا روپ دھار لیا۔

"چاچی۔ آپ گھبرائیے نہیں۔ جب تک مجھ جیسے سپاہی زندہ ہیں ہزاروں امیت بھی آپ کا بال بیکا نہیں کر پائیں گے۔" میرے لہجے کے اعتماد نے بوڑھی کو پگھلا دیا۔ اس کی عینک کے شیشے دھندلا گئے!

"بیٹھو بیٹا، عثمان اور اس کے والد ابھی آتے ہیں۔ عثمان تمھیں بٹھانے کو کہہ گیا ہے" انھوں نے رندھے ہوئے گلے سے مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

پھر میں انھیں حوصلہ دیتا رہا اور آنسہ چائے بناتی رہی۔ اس کی واپسی اور دروازے پر دستک ایک ساتھ ہوئی۔ میں نے خود اٹھ کر دیکھنا چاہا لیکن مجھ سے پہلے چاچی "میں دیکھتی ہوں" کہہ کر میرے کمرے سے نکل گئی اور میں آنسہ کی چائے بناتی انگلیوں کی لرزش میں اُلجھ کر رہ گیا۔ کچھ دیر پہلے گویائی کے جس کرب سے میں دوچار تھا اس کا شکار وہ بھی ہو رہی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن کہہ نہیں پا رہے تھے۔



"عثمان بھی آپ کے ساتھ کہیں جا رہے ہیں کیا؟" اس نے چائے میری طرف سرکائی۔

"تمھیں کیسے علم ہے؟" میں نے گفتگو بڑھانے کو یونہی فقرہ اُچھال دیا۔

"آپ کی گفتگو سے اندازہ ہوا تھا۔"

"چھپ کر سُنی تھی کیا؟"

"نہیں جی۔" وہ جھینپ گئی۔

"پھر"

"آپ نے تو جرح شروع کر دی۔" اس نے مجھے "غنیمت لمحوں" کا احساس دلایا۔

"دُعا کرنا۔"

"میں تو پہلے ہی روز سے آپ کی سلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔" اس نے انگلیوں سے ساڑھی کا پلو مروڑا۔

"میں خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں آنسہ۔" میں نے گمبھیر لہجے میں اسے احساس بخشا۔

"میں آپ کی فتح مندانہ واپسی کی دعا کروں گی۔ آپ جہاں بھی جائیے یاد رکھیے گا۔ ایک کمزور سی لڑکی آپ کی راہوں میں آنکھیں بچھائے بیٹھی ہے۔" اس نے اتنے مضبوط لہجے میں یہ بات کہی تھی کہ میں دہل گیا۔

اگلی بات کہنے سے پہلے مجھے خواہ مخواہ بسکٹ اٹھا کر منہ میں رکھنا پڑا۔ چاچی واپس آگئی تھیں۔

"حامد تھا۔ کہہ گیا ہے کہ دونوں باپ بیٹا اس کے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔" چاچی نے ہم دونوں کو اپنی آمد سے مطلع کیا۔

"او۔ کے" میرے منہ سے جانے کیوں نکل گیا۔

"ارے بیٹا! چائے تو تم نے پی ہی نہیں۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" چاچی نے میرے سامنے ں کی توں دھری پیالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی "باخبری" جتائی۔

"چاچی اصل میں ہم فوجی لوگ ہیں نا! چائے خوب ٹھنڈی کر کے پیتے ہیں۔" میں نے لفظوں میں پناہ ڈھونڈی۔

"شربت بنا کے۔" آنسہ نے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی چاندی بکھیری۔ بے ساختہ ہم دونوں ہنس پڑے۔ شاید وہ بھی میری حالت سے محظوظ ہو رہی تھی۔

"اب ایسی بات بھی نہیں۔" میں نے بات بنائی۔

پھر آنسہ برتن سمیٹ کر چل دی اور چاچی نے مجھے کریدنا شروع کر دیا۔ وہ بڑے غیر محسوس طریقے سے میرا "جغرافیہ" جاننے لگی۔ گھر بار۔ ماں باپ۔ بہن بھائی اور کسی حد تک ذاتی خیالات ہماری گفتگو کا سلسلہ دونوں باپ بیٹے کی آمد سے ٹوٹا۔

"معاف کرنا بیٹا۔ ہمیں علم تو تھا لیکن بڑی اہم میٹنگ تھی۔ تم جانو امیت سرکار کی اس علاقے میں آمد نے لوگوں کو خاصا خوفزدہ کر رکھا تھا۔ لیکن اللہ کے فضل سے اب سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ بیٹا جھوٹ کی عمر ہوتی ہے نہ پاؤں اور سچائی تو بہر حال غالب آ کر رہتی ہے۔ میرا دل کہتا ہے ایک روز ہمارے ورغلائے گئے لوگوں کی آنکھوں سے پٹی ضرور کھلے گی۔" چاچا نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے آگاہ کیا۔

میرا جی تو چاہا کہ کہہ دوں "چاچا صبح کے بھولے شام کے بعد گھر لوٹیں تو ان کی پہچان باقی نہیں رہتی ——— لوگ شام تک ہی ایک دوسرے کو یاد رکھتے ہیں پھر سب کچھ بھول جاتے ہیں۔" لیکن میں نے عرض کیا تاکہ بسا اوقات سب کچھ جانتے بوجھتے انسان کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے تصویر کا صرف ایک رُخ دیکھنے کی خواہش کرتا ہے۔

"ضرور چاچا! انشاءاللہ سچائی غالب آ کر رہے گی۔ تمہارا بہایا خون پانی نہیں بنے گا۔ رنگ لائے گا۔" میں نے چاچا کا حوصلہ قائم رکھنا چاہا۔

ہمارے پاس سوائے "تازہ صورتِ حال" کے اور کوئی موضوعِ گفتگو نہیں تھا۔ تھوڑی دیر تک دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد چاچا اُٹھ کر چلے گئے پھر میں اور عثمان دوبارہ سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور



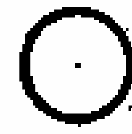
عثمان مجھے کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں لگا کر سرحدی علاقے کی پوزیشن سمجھانے لگا۔ اس نے مجھے کلکتہ کے راستے میں آنے والے ایک ایک گاؤں اور مکتی باہنی کے ممکنہ اڈوں سے متعلق آگاہ کر دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ مختلف چھاپہ ماردستوں کی رہنمائی کے فرائض ادا کر چکا تھا لیکن اس مرتبہ چونکہ معاملہ ذرا مختلف نوعیت کا تھا۔ اس لیے ہم نے تمام پہلوؤں پر خوب سوچ بچار کی اور بالآخر ایک نتیجے پر پہنچ کر متفق ہو گئے۔

عثمان کو میں نے شام کو مقررہ وقت پر ہیڈ کوارٹر پہنچ جانے کو کہا اور خود ان لوگوں سے رخصت چاہی۔ آنسہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی تھی۔

ہمیں جاتے وقت ایک دوسرے سے کچھ کہنے سُننے کا موقع تو نہ مل سکا لیکن اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی نے مجھے کہہ دیا تھا "علی! تم جہاں بھی جاؤ یاد رکھنا ایک سانولی سلونی سی لڑکی تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائے تمہاری فتح مندانہ واپسی کے لیے دعاگو ہے۔"

اس گلی کا موڑ مُڑنے تک، جہاں ان کا گھر تھا وہ دروازے سے گردن نکالے مجھے دیکھتی رہی موڑ کاٹتے ہوئے ایک لمحے کے لیے میں نے اس کی سمت دیکھا۔ پھر ایکسیلیٹر پر میرا دباؤ بڑھ گیا۔ اب میں تھا اور میری جولانیاں، وہ اور لوگ ہوتے ہیں جنہیں محبت بزدل بنا دیتی ہے مجھے سپاہ گری ورثے میں ملی تھی اور یہ نظریہ بھی کہ محبت ہماری ہمتوں کو مہمیز لگاتی ہے۔

میں چاہتا تھا جب واپس پلٹوں تو آنسہ کے سامنے فخر سے کہہ سکوں میں نے اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کی اور اپنی دھرتی کے تقدس کو قائم رکھنے میں غفلت کا مرتکب نہیں ہوا۔



آپریشن روم کے باہر ہی سویلین لباس میں کوئی شخص میری راہیں تک رہا تھا ——— میرے قدموں کی آہٹ پر جب وہ میری طرف گھوما تو خوشی اور حیرت کے ملے جذبات نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔

"سر" بے اختیار میرے مُنہ سے نکلا۔

"مائی بوائے" میرے انسٹرکٹر نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے مجھے سینے سے لگا لیا۔ وہ خود بھی مجھے "لانچ" کرنے آئے تھے اور اپنے لگائے ہوئے پودے کی پرداخت کا معائنہ کرنے بھی۔ انھوں نے میرے آنے تک میری فائل کا مکمل مطالعہ کر لیا تھا اور میں نے اپنے عظیم استاد کو شرمندہ ہونے کا موقع نہیں دیا تھا۔

"فائن مائی بوائے۔ ویری فائن" انھوں نے اپنا مخصوص فقرہ میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے دہرایا۔ یہ ان کا خاص انداز تھا۔ جب وہ کسی بات پر خوشی کا اظہار کرتے تو یہی طریقہ اپناتے تھے۔

"تھینک یو سر۔ یہ سب کچھ آپ کی تربیت کا اثر ہے سر!" میں نے سر خم کرتے ہوئے ان کی عظمت کا اقرار کیا۔

"کم آن" میرے خراج عقیدت کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ مجھے ایک علاحدہ کمرے میں لے آئے جہاں اعلیٰ افسران کی کونسل ہماری منتظر تھی۔ سب نے میرے استاد کو، گو کہ وہ عہدے کے لحاظ سے ان میں سے اکثر سے چھوٹے تھے، ان کی عظیم خدمات کے عوض تعظیم دی۔

"بچے نے مایوس تو نہیں کیا سر؟" انھوں نے میری پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے میرے کرنل صاحب سے پوچھا۔

"نو میجر! یہ تو واقعی تمہارا شاگرد ثابت ہوا ہے" کرنل نے سگار کا کش لگاتے ہوئے کہا اور میرے انسٹرکٹر صاحب کی آنکھیں فخر سے چمک اٹھیں۔ پھر میرے افسران میرا مشن مجھے بریف کرتے رہے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ہم لوگ فارغ ہوئے۔ میرے انسٹرکٹر صاحب میرے ساتھ ہی میرے کمرے میں چلے آئے وہ ابھی تک مجھے زیر تربیت لڑکا ہی سمجھ رہے تھے۔ انھوں نے ٹریننگ کا ایک ایک سبق دوبارہ دہرایا۔ مجھ سے مختلف قسم کے سوالات کرتے رہے۔ جہاں کہیں میں ذرا سا چوکتا وہ فوراً میجر سے انسٹرکٹر کا روپ دھار لیتے اور وہی ڈانٹ ڈپٹ شروع ہو جاتی۔ شام کے بعد جب میرے اردلی نے عثمان کے آنے کی اطلاع دی تو وہ مجھ سے



جدا ہو گئے۔

"او کے بوائے اب انشاءاللہ لانچنگ پیڈ" (وہ مقام جہاں سے جاسوس دشمن کے علاقے میں داخل ہوتا ہے) پر ملاقات ہو گی گرمجوشی سے مصافحہ کر کے وہ رخصت ہو گئے۔

جانے اس مرتبہ ان کے الگ ہونے سے مجھے کیوں اکیلے پن کا احساس ہو رہا تھا۔ ہمیں یہاں سے اپنے سرحدی علاقے میں واقع لانچنگ پیڈ تک مکتی باہنی کا روپ دھار کر ہی سفر کرنا تھا۔ یہ ایک طرح سے ہماری ٹریننگ تھی، کیونکہ کلکتے میں ہمیں مکتی باہنی کا روپ دھار کر ہی قیام کرنا تھا اور انہی کی آڑ میں اپنا کام بھی کر گزرنا تھا۔ میری گندمی رنگت اور چھریرے بدن پر جب بنگالی لنگی اور کرتا ہوتا تو کسی کو یہ گمان بھی نہ گزرتا تھا کہ میں بنگالی نہیں ہوں۔ میرے اگلے ایک دانت پر سونے کا خول چڑھ چکا تھا اور ماتھے پر چوٹ کے نشان نے جو چوٹ کے نشان سے زیادہ میک اپ کا کمال تھا، میری ہیئت بالکل بدل کر رکھ دی تھی۔ جہاں تک بنگالی بولنے کا تعلق تھا میرا پہلا ہی حربہ کامیاب ہو سکتا تھا۔۔۔ بدقسمتی سے میں پیدائشی گونگا تھا میرے ساتھ ظلم وستم کی ایک بہترین COVER STORY موجود تھی۔ مجھے صرف ذہن اور ہاتھ استعمال کرنے تھے زبان نہیں، البتہ عثمان کو زیادہ تر زبان ہی سے کام لینا تھا۔ اس کی بنگالی پر مہارت سے کسی بھی ایسے شخص کو جو اسے نہ جانتا ہو اس پر شک نہیں گزر سکتا تھا۔

اپنے کام سے متعلق بنیادی معلومات تو عثمان کو حاصل تھیں کچھ خاص نوعیت کی تکنیک اس لیے بھی اس کے لیے ضروری نہیں تھی کہ اسے تو محض رہنمائی کرنی تھی۔ اصل کام تو میرا تھا ہم نے اپنی حفاظت کے لیے فی الحال صرف ایک ایک ریوالور کچھ فالتو راؤنڈز کے ساتھ اپنے پاس رکھا تھا یہ وہی ریوالور تھے جو بھارتی حکومت نے مکتی باہنی کو سپلائی کیے تھے اور تخریب کاروں کے پاس سے عموماً برآمد ہوتے تھے۔ بہترین کور اسٹوری اور ریوالورز بظاہر دونوں ایسی چیزیں تھیں جنہیں پانے کے بعد خطرہ خاصا کم ہو گیا تھا لیکن ہم

ان چیزوں پر تکیہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

رات کے پہلے پہر ہم دونوں سویلین کپڑوں میں چھپتے چھپاتے ہیڈ کوارٹر سے اس طرح دبے پاؤں باہر نکلے تھے کہ کسی پہرے دار کی نظر بھی ہم پر نہ پڑی تھی۔ ہیڈ کوارٹر کے سامنے بنی سڑک عبور کر کے ہم کھیتوں کے اس وسیع سلسلے میں کھو گئے جو سڑک کی دوسری سمت دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ اس علاقے سے متعلق کم از کم ہمیں اس حد تک معلومات ضرور حاصل تھیں کہ یہاں کے کن کن علاقوں کے لوگ مکتی باہنی کے ہمدرد اور کہاں کہاں پاکستان کے ہمدرد موجود ہیں ہمیں اسی روپ میں سرحد تک پہنچنا تھا تاکہ مقامی غداروں کی طرف سے سرحد پار خطرے کا سگنل نہ پہنچ جائے۔

یہ ایک طرح سے صریحاً خود کو داؤ پر لگانے والی بات تھی کہ ہم مکتی باہنی کی ہمدردیاں حاصل کر کے ان کے سرحد پار کیمپ میں پہنچ کر ان پر نقب لگائیں کسی بھی مرحلے پر ہمارا پول کھل سکتا تھا۔ جس کے بعد ایک اذیت ناک موت ہمارا مقدر بن جاتی میں تو اس آگ میں اس لیے بھی کود گیا تھا کہ یہ میری "ڈیوٹی" تھی کہ میں ہر حکم کی تعمیل کروں لیکن عثمان۔ وہ اپنے گھر کا واحد سہارا تھا۔ بوڑھے والدین کی لاٹھی اور بہن کا مان۔ میرے دل سے بے اختیار دعا نکلی کہ الٰہی انہیں بے سہارا نہ کرنا نہ ہی کسی بہن کا مان لوٹنے دینا۔ اس کی عظیم رضاکارانہ خدمات کو میں کن الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتا۔ دنیا کی کسی لغت میں وہ الفاظ موجود نہیں تھے۔

کھیتوں سے خاصی دور جا کر ہم برآمد ہوئے اور اس گاؤں کی طرف چل دیے جو ہماری پہلی پناہ گاہ تھی۔

صبح کاذب کا اجالا رات کی تاریکیوں پر دھیرے دھیرے غالب آ رہا تھا۔ کرنوں کی چاندنی نے سنہرے ریشے کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ اندھیرے سے پھوٹتی اجالے کی چاندنی اور اس کے پس منظر میں مشرق سے ابھرتا سورج۔ یہ نظارہ ہی کسی وطن دوست کو رُلانے کے لیے کافی تھا۔ اور جب ہم لوگ گاؤں کے باہر ایک ٹیوب ویل پر پہنچے تو کرنوں کا جادو جاگ چکا تھا۔ ٹیڑھی



میڑھی پگڈنڈیوں کے اُلجھے اُلجھے راستوں پر اکا دکا کسان آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک دو سے ہمارا سامنا بھی ہوا، لیکن کسی نے ہم سے تعرض نہ کیا۔ غالباً انھوں نے ہمیں "پہچان" لیا تھا۔ ٹیوب ویل کے باہر ہی ہمارا ٹکراؤ اس گٹھے ہوئے جسم اور کینہ توز آنکھوں والے کسان سے ہوا جو ایک چارپائی پر اکیلا بیٹھا بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔

عثمان نے اسے مکتی باہنی کے مخصوص انداز میں سلام کیا اور جواب موصول ہونے پر ہم چارپائی کے دوسرے کونے پر سمٹ کر بیٹھ گئے۔

"کدھر سے آئے ہو تم لوگ؟" اس نے مشکوک نظروں سے ہمیں گھورا۔

"رنگا مالی سے؟"

——— عثمان نے اس کی تسلی کروائی جس گاؤں کا نام عثمان نے لیا تھا اس پر پچھلے ہی روز پاکستان آرمی نے ریڈ کی تھی اور وہاں پندرہ بیس تخریب کار مقابلے میں مارے گئے تھے۔ وہ گاؤں مکتی باہنی کا گڑھ تھا ظاہر ہے جو تخریب کار یہاں سے فرار ہوئے تھے وہ اسی علاقے میں بکھرے ہوئے تھے۔ ہمارے تعارف نے اسے کسی حد تک مطمئن تو کر دیا تھا، لیکن شک کی پرچھائیاں اس کی آنکھوں میں ابھی تک ہلکورے لے رہی تھیں۔

"فوج ہمارے تعاقب میں ہے ہمیں صرف آج دن کے لیے پناہ چاہیئے۔ اندھیرا پھیلتے ہی ہم نکل جائیں گے۔" عثمان نے اس سے کہا۔

"تمہارا کیا نام ہے؟" اس نے بجائے عثمان کی بات کا جواب دینے کے مجھے مخاطب کیا۔

جواب میں میں صرف ہاتھ نچا کر رہ گیا۔

"یہ بے چارہ گونگا ہے۔" عثمان نے ترحم آمیز لہجے میں اسے بتایا۔

"ٹھیک ہے میرے خیال میں یہ جگہ کچھ زیادہ محفوظ نہیں ہے۔ میں تم لوگوں کو نزدیک ہی ایک ٹھکانے تک لے جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ہم دونوں اس کے پیچھے پیچھے سر جھکائے چل دیے ہمیں لے کر وہ کھیتوں کے بیچوں بیچ

چلتا ایک ویرانے میں لے گیا۔

"یہ جگہ کچھ محفوظ ہے" اس نے درختوں کے جھنڈ میں بنے ایک گھروندے کی طرف اشارہ کیا۔

"شکریہ۔ مہربانی اگر ممکن ہو تو کھانے پینے کو کچھ دے دو۔ ہم کل دوپہر سے بھوکے ہیں" عثمان نے اس سے بڑے ملتجی لہجے میں کہا۔ میں اس کی شاندار اداکاری پر اسے دل ہی دل میں اب تک نہ جانے کتنی مرتبہ داد دے چکا تھا۔

"گھبراؤ نہیں سب کچھ پہنچ جائے گا" اس نے بڑے ذو معنی سے الفاظ کہے تھے۔ ہمیں اس کمرے میں جہاں ایک کھاٹ پہلے سے پڑی تھی بٹھا کر وہ خود روٹی پانی کا بندوبست کرنے باہر چلا گیا۔

"بھئی کمال کے اداکار ہو" میں نے اس کے جاتے ہی عثمان کو داد دی۔

"آپ گونگے ہیں بھائی! یہ مت بھولیے" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہ! واقعی یار مجھے تو خاموش رہنا ہے" میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی جمائی۔

ہم دونوں بجائے اندر بیٹھنے کے کھاٹ اٹھا کر کمرے سے باہر آ گئے اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل طے کرنے لگے، دس منٹ بعد ہمارے میزبان کی واپسی ہوئی، لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اس کے پانچ ساتھی اور بھی تھے۔

"گھبرانا بالکل نہیں" میں نے عثمان کے کان میں سرگوشی کی۔

"او کے" اس نے میرے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے مزاحیہ انداز اپنا کر میرے خدشات رفع کر دیے۔

آہستہ آہستہ وہ لوگ ہمارے قریب آ کر رک گئے۔ انھوں نے اپنے لباسوں میں اسلحہ چھپا رکھا تھا۔ ہمیں پناہ دینے والے نے ہاتھوں میں کھانے کے برتن تھامے ہوئے تھے۔ ہم نارمل بیٹھے رہے۔ نو واردوں نے ہمارے نزدیک پہنچ کر اچانک پستول نکال لیے۔



"ہینڈز اپ" سب سے اگلے نے للکارا۔ ہم نے ہاتھ اٹھا دیے اور کھڑے ہو گئے۔ اسی شخص نے ہمیں دیوار کے قریب پہنچنے کا حکم دیا اور دیوار کے نزدیک پہنچ کر ہمیں دیوار سے لگ کر الٹے کھڑے ہونے کی ہدایت کی۔

"تلاشی لو" اس نے اپنے ایک ساتھی کو بنگالی میں حکم دیا۔ ہماری تلاشی لینے والے نے خاصی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا ـــــ یہاں سے دو بھارتی ریوالور کچھ پاکستانی اور کچھ بھارتی کرنسی کے علاوہ اور انھیں کیا مل سکتا تھا؟ تمام چیزوں پر قبضہ کرنے کے بعد انھوں نے ہمیں ہاتھ گرانے کی اجازت دے دی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اسی بنگالی نے عثمان کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"کبیر" عثمان نے نام کے ساتھ اپنا وہ گروپ بھی بتا دیا جس سے ہم نے اپنی وابستگی کا اظہار کیا تھا۔

ابھی اس کی بات بمشکل مکمل ہوئی تھی کہ ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر لگا "جھوٹ بکتے ہو" اس کے ساتھی نے عثمان کو گھورتے ہوئے کہا۔

تھپڑ اتنا زوردار اور اچانک تھا کہ عثمان چکرا کر گر پڑا۔ یہی وہ نازک لمحہ تھا جس سے اس کے صدق اور صبر کا امتحان ہونا تھا۔ بجائے غصہ یا جھنجلاہٹ کے وہ اطمینان سے گال سہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ انکوائری کیوں نہیں کر لیتے" اس نے بے بسی سے ان لوگوں کو مخاطب کیا۔

"تیری انکوائری کی ایسی کی تیسی" کہتے ہوئے ایک اور دیہاتی اس پر پل پڑا۔ اس نے زوردار گھونسا اس کے منہ پر مارا۔ اسی اثنا میں باقی لوگ میری طرف پستول تانے کھڑے رہے۔

عثمان نے قمیص کی آستین سے خون پونچھا اور دوبارہ ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم لوگ اپنے ساتھیوں پر ظلم کر رہے ہو" اس نے غصے اور بے بسی کے ملے جلے

جذبات سے چلا کر کہا۔

"ابے تو گونگا ہے؟" اس بدمعاش نے جو ان کا سرغنہ تھا میری سمت دیکھا۔

"اس بے زبان پر ظلم نہ کرنا ورنہ خدا کا عذاب پڑے گا تم پر۔" عثمان نے میرے اور ان کے بیچ ڈھال بنتے ہوئے کہا۔

سرغنہ نے عثمان کو دھکّے دے کر پرے ہٹایا اور اس کے ساتھ ہی اتنی زوردار لات میرے پیٹ میں ماری کہ بلا مبالغہ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ جواب میں میرے منہ سے ایسی ہی کراہ نکل تھی جیسی کسی گونگے کے مُنہ سے نکلتی ہے۔ میں درد کی شدّت سے دوہرا ہو کر آگے کی طرف جھک گیا۔ اس کے دوسرے ساتھی نے مجھے بالوں سے پکڑ کر پیچھے جھٹکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی پہلے نے زوردار گھونسے میرے پیٹ میں مارنے شروع کر دیے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری آنتیں پھٹ جانے کو ہیں۔ درد کی شدّت بے حال کیے دیتی تھی۔ لیکن میں نے نہ صرف خود پر ضبط کیے رکھا بلکہ دماغ کو بھی گرم نہ ہونے دیا۔ وہ کردار نگاری میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی بڑی زبردست قیمت وصول کر رہے تھے۔ انھوں نے مار مار کر مجھے آدھ موا کر دیا لیکن میرے حلق سے گونگوں والی چیخیں ہی برآمد ہو سکیں۔ پھر جیسے انہیں یقین آ گیا کہ ہم سچّے ہیں۔

انھوں نے ہمارے ہتھیار اور کرنسی لوٹا کر اپنے رویّے پر ندامت کا اظہار کیا لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ ایسا کرنا ان کے لیے ضروری تھا کیونکہ دشمن کے آدمیوں کا بھیس بدل کر ان میں گھس آنے کا بھی امکان تھا۔

ہم نے پانی سے چہرے پر جمے خون کو صاف کیا۔ مجھے اپنی تکلیف کی پروا نہیں تھی، لیکن عثمان کی فکر ضرور تھی اس بے چارے نے کب ایسی مار کھائی ہو گی۔ ہماری ٹھکائی سے فارغ ہو کر انھوں نے دستر خوان بچھا کر اشک شوئی کے لیے ہمارے آگے وہی بھات اور دال رکھ دی جو ہمارا میزبان لایا تھا۔



"اتنی مار کے بعد یہی کچھ ملے گا؟" عثمان کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔ میں اس کی دیدہ دلیری پر حیران رہ گیا۔ خدا جانے وہ پہلے ہی سے اتنا دلیر تھا یا میری معیت میں خود کو مجھ سے کمتر ثابت کرنے پر تیار نہیں تھا بہرحال دونوں میں سے جو بات بھی تھی اس کی ہمتوں کو سلام۔

"آپ لوگ شام تک یہیں رہیں شام کو ہمارے آدمی قریبی ندی کے ذریعے آگے پہنچا آئیں گے۔" ہمارے میزبان نے کہا۔ بمشکل ہم نے چند لقمے ہی زہر مار کیے تھے ——— کھاتے کیا خاک پیٹ میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

"اچھا دوستو! شام تک کے لیے خدا حافظ" کہہ کر وہ لوگ ہمیں زخم چاٹنے کے لیے اکیلا چھوڑ کر گاؤں کی طرف چل دیے۔

"تم واقعی عظیم پاکستانی ہو عثمان بھائی۔" میں نے ان کے جاتے ہی بے اختیار اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"آپ سے زیادہ نہیں۔" اس نے میری پیٹھ پر تھپکی دی۔

دوپہر کو ایک آدمی ہمارے لیے کھانا لے کر آیا اور اس نے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ "وہ لوگ تمھیں کھوجنے کے لیے گاؤں میں آئے تھے۔"

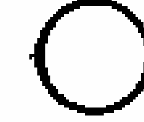
"اچھا! ——— پھر؟" عثمان نے اداکاری کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

"ہم نے انھیں غلط راستے پر لگا دیا۔ گھبراؤ نہیں اب سب ٹھیک ہے۔" اس نے ہمیں تسلی دی۔

ہمارے ہیڈ کوارٹر نے اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی اور ہماری "جعلی تلاش" کے لیے وہاں فوج کا ایک دستہ بھی بھیج دیا تھا جس نے ہماری تلاش میں گاؤں کا کونا کونا چھان مارا۔

شام تک ہم ان لوگوں کے مہمان رہے۔ اس کے بعد انھوں نے ہمیں رخصت کرنے کا

پروگرام بنایا ہم نے انھیں یہی بتایا تھا کہ ہمارا گروپ چونکہ منتشر ہو چکا ہے اس لیے تازہ ہدایات حاصل کرنے ہم کلکتہ جا رہے ہے۔ تین آدمیوں نے ہمیں اپنی حفاظت میں لے لیا۔ اور وہ رات گئے ہمیں ایک ندی کے نزدیک لے آئے جہاں پہلے سے ایک کشتی ہماری منتظر تھی۔ یہ بظاہر تو عام سی ماہی گیری والی بادبانی کشتی تھی، لیکن اُنھوں نے اسے ایک طرف سے گن بوٹ کی شکل دے رکھی تھی۔ ملاحوں کے روپ میں وہاں مکتی باہنی کے غنڈے جدید اسلحے سے مسلح تھے۔ ان کے چہرے اتنے معصوم نظر آتے تھے کہ ان پر شک کرنے کا خیال ہی نہیں گزر سکتا تھا۔



ہمیں کشتی والوں کے حوالے کر کے گاؤں کے لوگ رخصت ہو گئے۔

کشتی آہستہ آہستہ لہروں کے دوش پر اپنی منزل کو چل دی ـــــ ہم دونوں درمیانی تختے پر بیٹھے تھے۔ دو آدمی اسے چپوؤں سے کھے رہے تھے اور ہمارا سفر دریا کی موافق سمت میں جاری ہونے کی وجہ سے رفتار خاصی تیز تھی۔ ہمارے پیچھے ایک شخص چپو سنبھالے کشتی کی سمت درست رکھے ہوئے تھا اور ساتھ والے تختے پر آٹو میٹک رائفل گود میں رکھے اس کا وہ ساتھی بیٹھا تھا جو ہمارے اندازے کے مطابق ان کا کمانڈر بھی تھا کشتی پر ہمارا استقبال بھی اسی نے کیا تھا، لیکن صرف ہاتھ ملانے پر ہی اکتفا کیا ابھی تک باقی تعارف ادھورا تھا۔

"میرا نام شرما ہے کیپٹن شرما۔" اس نے ٹوٹی پھوٹی بنگالی میں عثمان کو مخاطب کیا۔ اس کا تعلق بھارتی فوج کی مدراس رجمنٹ سے لگتا تھا۔ مجھے اس بات کا بھی علم تھا کہ مدراسی افسران بھارتی خفیہ سروسز خصوصاً سپیشل سروس گروپ کی جان سمجھے جاتے تھے۔

"کبیر" عثمان نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔ اپنے سامنے بھارتی فوج کے کیپٹن کو دیکھ کر یقیناً وہ بھی میری طرح اندر ہی اندر تلملا رہا تھا لیکن ہائے ری مصلحت



فی الوقت ہمیں خاموشی ہی اختیار کرنی تھی۔

"تم لوگوں نے بڑی بہادری دکھائی۔ بڑا زبردست مقابلہ کیا!" اس سے ہمارا غائبانہ تعارف پورے حوالے کے ساتھ کروا دیا گیا تھا۔

"جی شکریہ! ہمارا تو سارا خاندان مارا گیا۔ ایک یہ بھائی بچا ہے۔" عثمان نے تقریباً رونی صورت بناتے ہوئے کہا۔

"اب آپ سرحد پار کس جگہ جائیں گے؟" اس نے مطلب کی بات بالآخر کہہ دی۔

"ہم کیمپ میں نہیں کسی ٹریننگ سنٹر میں جائیں گے کیوں ہے؟" عثمان نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے اشاروں سے مجھے سمجھا کر مخاطب کیا۔

میں نے جواب میں پُرجوش طریقے سے "اوں آں" کرتے ہوئے ہاتھ ہلا ہلا کر شکرام کی دہائی دی۔ بے وقوف کیپٹن کچھ متاثر ہونے لگا تھا۔

"پہلے کبھی تم لوگ گئے ہو؟" اس نے ہمیں کریدنے والی نظروں سے دیکھا۔

"ہاں ایک مرتبہ گیا تھا میں" عثمان نے مکمل اعتماد سے جواب دیا۔

"کس کے ساتھ؟" کیپٹن شرما نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اچانک اگلا سوال داغا اس نے بڑا زبردست نفسیاتی حربہ آزمایا تھا۔ اصل میں تخریب کاروں کے مختلف گروہوں کا رابطہ الگ الگ بھارتی ایجنٹوں سے ہوتا تھا عموماً ایک علاقے کے لوگوں کا جو بھارتی "ڈیلنگ آفیسر" ہوتا اس کا حلقہ اسی علاقے تک محدود رہتا تھا۔ جس گاؤں میں ہم نے پناہ حاصل کی تھی ان کا گروپ لیڈر کوئی اور تھا اور وہاں کسی نے ہم سے ہمارا "خصوصی ذریعہ" دریافت نہیں کیا تھا۔ شاید یہ ایک طرح ان لوگوں کا اندرونی معاملہ ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے "ذریعے" کا کھوج نہیں لگاتے تھے صرف اپنے کام سے کام رکھتے تھے، لیکن اب معاملہ اور تھا بھارتی انٹیلی جنس کا کیپٹن ہمارے سامنے بیٹھا تھا اور وہ صرف اسی مشن پر یہاں آیا ہوگا کہ بھیس بدل کر مکتی باہنی میں داخل ہونے والے "غداروں" کا پتہ لگا سکے۔

جب اس نے اچانک یہ حربہ آزمایا تو ایک لمحے کے لیے تو میں دہل کر رہ گیا مجھے ڈر تھا کہ عثمان اب پھسلا کہ اب پھسلا لیکن وہ بھی کچی گولیاں کھیلے ہُوئے نہیں تھا۔

"امیت سرکار کے ساتھ"۔ اس نے مکمل اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ شاید جلدی میں اسے صرف امیت سرکار ہی یاد رہ گیا تھا یا اس نے اس طرح بھارتی کیپٹن کا شک دور کرنا چاہا تھا۔ کیونکہ امیت سرکار کو مکتی باہنی میں جو حیثیت حاصل تھی اس کا علم سب کو تھا۔ ورنہ تو میں نے اسے اور بھی دو تین نام بتائے تھے۔

"اوہ۔ یہ بات ہے"۔ کیپٹن شرما نے مطمئن ہوتے ہُوئے گردن جُھکا دی۔

"یہاں سے سرحد تک کیسے جاؤ گے"؟ اس نے اب ہمدردانہ لہجہ اختیار کر لیا تھا۔

جواب میں عثمان اسے اپنے مشن سے متعلق تفصیلات بتانے لگا۔ وہ جہاں کہیں محسوس کرتا عثمان کو مشورہ دے دیتا۔ پھر اس نے ہمیں اپنے "گروپ آفیسر" کا حوالہ دے کر اس سے ملنے کے لیے کہا کیونکہ ہم نے اسے بتا دیا تھا کہ ہمارا قائد تو وہاں مارا گیا ہے اور منتشر ہو چکے ہیں۔ اب ہم "نیا رابطہ" بنانے جا رہے ہیں اور یہ کہ ہمیں "مقامی ذرائع" پر اعتماد نہیں۔

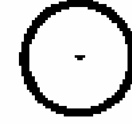
کیپٹن شرما نے اپنے نمبر بنانے کے چکر میں ہمیں خود ہی متعلقہ "ذریعے" سے آگاہ کر دیا۔ اس کے لیے یہ بڑی خوش آئند بات تھی کہ وہ اپنے افسران کے سامنے زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا ــــــ اس نے دو نئے "شکار" جو پھانسے تھے۔

وہ دونوں آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے تھے۔ باقی لوگ بدستور اپنے کام میں مشغول تھے۔ انھوں نے گردن گھما کر ہماری طرف دیکھنے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔ خاصے سمجھدار دکھائی دیتے تھے۔

ــــــ کشتی کو لہروں کے دوش پر بہتے ہُوئے تقریباً ایک گھنٹہ ہو چکا تھا اس دوران میں سارے راستے بھارتی کیپٹن ہماری برین واشنگ کرتا آیا تھا۔ اس نے وہی رٹا رٹایا سبق ہمارے سامنے دہرایا تھا جو اس کے باقی ساتھی اور ہم نوا دہراتے آئے تھے ــــــ پاک



فوج کے ظلم و ستم کی وہ منظرکشی کی تھی کہ عام اور سیدھے سادھے بنگالیوں کا اسے سُن کر بھٹک جانا سو فیصد یقینی تھا عثمان نے بھی بڑھ چڑھ کر اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی اور وہ تو میری توقعات سے کہیں زیادہ کارآمد ثابت ہُوا تھا اگر اسکی جگہ میں بھی ہوتا تو اس سے زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ نہ کر پاتا۔



ندی اب درختوں کے ایک گھنے سلسلے میں گم ہوتی نظر آ رہی تھی۔

اس سے پہلے ہم لوگ درمیان میں سفر کرتے آئے تھے اب کھیولوں نے اسے کنارے کے ساتھ ساتھ لگانا شروع کر دیا تھا۔ درختوں کے سلسلے کے نزدیک ہم کنارے سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ کیپٹن شرما کے تختے میں سے ایک ننھا سا لیکن خاصا طاقت ور رینج کا ٹرانسمیٹر برآمد ہُوا۔ اس نے کسی سے رابطہ قائم کر کے خفیہ زبان میں آگے کے حالات دریافت کیے تھے۔ ٹرانسمیٹر بند کرتے ہُوئے وہ خاصا فکرمند دکھائی دے رہا تھا ــــــ :

"شاید ہم لوگوں کو واپس جانا پڑے"۔ اس نے پریشان کُن لہجے میں کہا۔

"کیوں"؟ عثمان نے حیرت سے پُوچھا

"پاکستانی فوج علاقے میں موجود ہے۔"

"بس۔ اتنی سی بات"؟ عثمان نے چُٹکی بجاتے ہُوئے کہا۔

"مطلب"؟ اب شرما کے حیران ہونے کی باری تھی۔

"شرما صاحب! ادھر ہمارے لیے موت ہے اور آگے بھی صرف موت! اگر مرنا ہی ہے تو ہم لڑ کر مریں گے۔ آپ ہمیں اُتار دیں ــــــ ہم واپس نہیں جائیں گے"۔ عثمان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں میرا پیغام وصول کر کے آگے پہنچا دیا تھا۔

ــــــ "تم پاگل ہو! کیا ــــــ تمہارا واسطہ پاکستانی فوج سے نہیں پڑا"؟ وہ شکار کی بُو پاتے ہی شیر کی طرح جھپٹتے ہیں اور جب تک شکار پر قابو نہ پالیں پیچھے نہیں ہٹتے خواہ

انھیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں۔" کیپٹن شرما نے یہ فقرہ تیزی سے انگریزی میں کہا تھا پھر موقعے کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے اسے ٹوٹی پھوٹی بنگالی میں دہرا دیا۔

"ہاں! ہاں! ہم پاگل ہیں۔ ہم کیچوے کی طرح نہیں مریں گے۔" عثمان کی اداکاری پر میں عش عش کر اٹھا۔

"ٹھیک ہے تمھاری مرضی۔" شرما نے ہتھیار ڈال دیے۔

کشتی کو اس کے اشارے پر کنارے کے بالکل ساتھ لگا دیا گیا۔ ہم دونوں کنارے پر اتر گئے۔ "بے وقوف مت بنو۔ میں تمہیں بزدل نہیں سمجھتا، لیکن اس طرح کنوئیں میں چھلانگ لگا دینا کہاں کی بہادری ہے۔" اترتے وقت ہمیں شرما نے دوبارہ سمجھانا چاہا۔

جواب میں عثمان نے ہاتھ ملا کر اسے رخصتی کا اشارہ دیا اور ہم لوگ آگے بڑھ گئے! کیپٹن شرما اور اس کے ساتھیوں نے بادلِ نخواستہ کشتی کو لہروں کی مخالف سمت میں چلانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر تک ہم چھپ کر ان کی حرکات کا جائزہ لیتے رہے پھر تیزی سے درختوں کے جھنڈ میں آگے ہی آگے بڑھنے لگے —— ہم جلد از جلد اپنی فوج سے رابطہ قائم کرنا چاہتے تھے۔

مقامی تخریب کاروں کی حد تک تو بات قابلِ برداشت تھی، لیکن بھارتی فوج کا ایک کیپٹن ہمارے سامنے یُوں دندناتا پھرے یہ ہماری عزت نے گوارا نہ کیا۔ میں اگر چاہتا تو ان سب کو کشتی ہی میں ٹھکانے لگا سکتا تھا لیکن ہم نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ لوگ خلافِ توقع بکھری ہوئی بھیڑوں کا ریوڑ نہیں، بلکہ بھیڑیوں کا منظم گروہ ہیں اور کڑی سے کڑی ملاتے ہوئے ان کے رابطے خاصے لمبے ہو گئے تھے۔ ہماری معمولی سی چُوک بھی ہمارے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر کر رکھ دیتی اس لیے ہم نے ہر قدم نہایت سوچ سمجھ کر اور بڑی احتیاط سے اٹھانا تھا۔

حسبِ توقع ابھی ہم بمشکل تیس چالیس گز ہی چل پائے تھے کہ اچانک "ہالٹ" کی آواز بلند ہوئی ہم نے فوراً ہاتھ اٹھا دیے۔ بظاہر آس پاس کوئی نظر نہیں آ رہا تھا پھر آہستہ آہستہ



درختوں نے میرے شیروں کو اگلنا شروع کیا۔ سب سے آگے ایک حوالدار اسٹین گن تانے کھڑا تھا۔ اس کے عقب میں دو جوان تھے جبکہ ہمارے پیچھے سے ٹارچ کی روشنی ہم پر آ رہی تھی۔

"کون ہو تم؟" حوالدار نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"ہمیں اپنے کمانڈنگ آفیسر کے پاس لے چلیے۔" میں نے اپنی فوج کے مخصوص لہجے میں یہ بات دہرائی۔

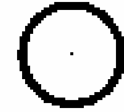
حوالدار نے چند لمحوں تک میری بات کا وزن کیا پھر جیسے اسے سمجھ آ گئی، لیکن اپنی تربیت کے مطابق وہ دھوکے میں آنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ لوگ ایک طرف ہٹ گئے اور ہمیں گھیرے میں لے کر ہاتھ اُٹھائے ہوئے آگے آگے چلنے کا حکم دیا۔ یہاں سے چند گز دور ہی ٹینٹ کے نزدیک آ کر رک گئے۔ ٹینٹ کے اندر لالٹین جل رہی تھی۔ حوالدار مؤدب انداز میں اندر داخل ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی ٹینٹ کا پردہ ہٹا اور لالٹین کی مدھم روشنی میں ایک لیفٹیننٹ کا چہرہ نظر پڑا جسے دیکھتے ہی میری باچھیں کھِل گئیں۔

"فاروق!" میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔

میرے سامنے میرا اکیڈمی کا روم میٹ لیفٹیننٹ فاروق کھڑا تھا۔

"علی تم" وہ تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔

گشت والے جوان ابھی تک حیرت سے ہمیں دیکھ رہے تھے پھر سارا معاملہ ان کی سمجھ میں آ گیا اور وہ سیلوٹ کر کے واپس چلے گئے۔ میں نے عثمان کا تعارف اپنے "روٹی وال" سے کروایا۔ اسے سامنے دیکھ کر بے اختیار ٹریننگ کا زمانہ یاد آ گیا، لیکن یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں تھا۔ سب سے پہلے میں نے اسے تازہ ترین حالات کی رپورٹ کی اور فوری ایکشن لینے کو کہا۔ چند منٹ بعد ہی دو تیز رفتار گن بوٹس کیپٹن شرما کے تعاقب میں روانہ ہو گئیں۔



رات ہم نے فاروق کی مہمان نوازی ہی میں بسر کی اور علی الصبح وہاں سے نکل گئے ——

یہاں ہمیں اگلے دیہات کے متعلق کافی حد تک اہم معلومات حاصل ہوئی تھیں۔

——— جس جگہ ہماری فوج نے پڑاؤ ڈالا تھا، اس کے قریب ہی ایک گاؤں آباد تھا لیکن ہم نے اسے نظر انداز کر دیا اور خاصا لمبا چکر کاٹ کر آگے نکل گئے۔ ہمارا سفر شام تک جاری رہا۔ اب ایک طرح سے ہمیں مکتی باہنی سے متعلق اپنی شناخت کروانے کے لیے مستند حوالہ بھی مل گیا تھا اس لیے ہم محفوظ ہو چکے تھے۔ وہ رات بھی ایک گاؤں میں کٹی جہاں ہمیں اگلے سفر کے متعلق تازہ ہدایات ملیں۔ اس دوران مشتبہ مقامات سے متعلق اطلاعات ہم اپنے مخصوص لوائنٹ پر "ڈیڈ ڈراپ" کرتے جاتے تھے اور ہماری فوج ہمارے وہاں سے ہٹ جانے کے بعد ہی کارروائی کرتی تھی تاکہ کسی کو ہم پر شک بھی نہ گزرے۔ مختلف اسٹیمروں، لانچوں، ماہی گیری کی کشتیوں، ٹرکوں اور بسوں کے ذریعے ہم تقریباً چار روز کے بعد کھلنا کے ایک سرحدی مقام پر جا پہنچے۔ جہاں ایک خفیہ مقام پر انسٹرکٹر صاحب ہمارے منتظر تھے۔

"ہیلو مائی بوائے! ہاؤ آر یو؟" انھوں نے حسبِ عادت میرے ساتھ گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔

عثمان سے ان کا تعارف غائبانہ تو تھا۔ آج پہلی مرتبہ وہ اُس سے مل رہے تھے۔ وہ اس میدان کے پرانے شہسوار تھے اور نظروں میں آدمی کو تول لیا کرتے تھے۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ تک وہ بھرپور نگاہوں سے عثمان کا جائزہ لیتے رہے پھر میرے کندھے پر ہاتھ جماتے ہوئے بولے۔

"فائن"! اور مجھے سب کچھ سمجھ آگیا۔ ابھی مَیں نے انھیں عثمان کے کارناموں کے متعلق کچھ بتایا ہی نہیں تھا کہ اُنھوں نے سب کچھ جان لیا۔ مجھے خود سے زیادہ اپنے استادِ محترم کی مردم شناسی پر اعتماد تھا۔ جب اُنھوں نے پہلی ہی نظر میں میرے انتخاب کی داد دے دی تو مَیں خود کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔

ہم لوگ وہاں دوپہر کے قریب پہنچے تھے۔ اس وقت بھی اکّا دکّا فائروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ سرحدی جھڑپوں اور ایک دوسرے کے علاقے میں گھس کر نقب لگانے کی کارروائیوں کا آغاز رات کے وقت تو کبھی کا ہو چکا تھا لیکن دن کو اکثر خاموشی چھائی رہتی تھی۔ صرف مکتی باہنی والے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے لیکن خاطر خواہ جواب ملنے پر وہ بھی چُپ سادھ لیتے۔

ہم یہاں "سنگینوں کے سائے" میں الگ تھلگ ایک کیموفلاج کمرے میں بیٹھے تھے۔ جہاں ایک پُرانی سی میز پر نقشہ بچھا کر میجر صاحب نے پہلے ہی سے کچھ علاقے مارک کر رکھے تھے۔ سرحدی علاقے کے توچپے چپے کا عثمان کو علم تھا۔ وہ ہمیں کچھ مخصوص علاقوں کی نشاندہی کر رہے تھے۔ اس دوران وہ میرے یاد کیے ہوئے سبق بھی ساتھ ساتھ دہراتے جا رہے تھے:

"دیکھو بیٹے! اس سے پہلے جو کچھ تم کرتے رہے ہو اسے ریہرسل ہی سمجھنا۔ تمھارا اصل کھیل اب شروع ہوا ہے۔ سپاہی کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے باوقار موت۔ اپنی دھرتی ماں کی عظمت کے لیے بسا اوقات اُس کو خون کا نذرانہ اس سے دور رہ کر بھی دیا جاتا ہے، جہاں تم جا رہے ہو وہاں تمھیں سمجھانے والا کوئی نہیں ہو گا۔ صرف تم اور خدا کی ذات! میرے بیٹے! مَیں تمھاری سرخروئی کے لیے دعا کرتا رہوں گا۔" اُنھوں نے شام کے بعد مجھے ایک طرف لے جاتے ہوئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گمبھیر لہجے میں آخری بریفنگ کی ——— مَیں اب بھی اُن کی نظروں میں وہی بوائے ہی تھا۔

پھر ہم تینوں نے اکٹھے چائے پی۔ رات کو سرحد عبور کرنے والے رات کا کھانا نہیں کھایا کرتے اس کی کوئی طبی وجہ تو یقیناً ہو گی، لیکن ہر ایجنٹ کو یہ بات ایک طرح سے روایت کی طرح منتقل ہوتی ہے۔

سرحدی فوج کے دو جوان تھوڑی دیر بعد ہمیں لینے آگئے ہم ان کے ساتھ ہی چل دیے۔ سرحد سے کچھ اُدھر ہی میجر صاحب نے باری باری ہم دونوں کو گرمجوشی سے گلے لگایا: "فی امان اللہ" اُنھوں نے ہم پر نظریں جماتے ہوئے کہا اور یکدم واپس مُڑ گئے۔

اب دونوں جوان آگے آگے تھے اور ہم ان کے پیچھے پیچھے، وہ مختلف ٹیڑھے میڑھے راستوں سے گزرتے ہُوئے ہمیں اس مخصوص مقام کی طرف لے جا رہے تھے جو ان کے خیال میں ہمارے لیے بہترین جگہ ہو سکتی تھی۔ ہم چاروں دبے پاؤں لیکن خاصی تیز رفتاری سے اپنا سفر طے کر رہے تھے۔

پھر ایک جگہ پہنچ کر وہ رک گئے "وائٹ لائن" آ گئی تھی یہ ایک بند کی سی شکل تھی ــــ مٹی کا بند جس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر برجیاں سرحد کی نشاندہی کے لیے لگائی گئی تھیں۔ وہ دونوں مستعد ہو کر پوزیشن میں ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ سرحدی لکیر پر پہنچ کر ہم ان کی طرف گھومے تو اُنھوں نے عقیدت اور جوش کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ ہمیں "گن سیلوٹ" پیش کیا۔

یہ نذرانۂ عقیدت "ملک کی آنکھوں" کو سرحد کا رکھوالا پیش کرنا سعادت جانتا ہے ـــ اس وقت دونوں طرف جذبات کا ایک سا عالم تھا ـــــ وہ لمحے ہم پر بھی وہی کیفیت لے کر آئے تھے جس سے ہماری سرحدوں کے جیالے گزر رہے تھے ہم دونوں نے ہی ایک لمبا سانس اپنے پوربو پاکستان کی فضاؤں کی سمت منہ کر کے کھینچا تھا۔ ہم چاہتے تھے ان پاکیزہ ہواؤں سے عزائم کو سینوں میں بیدار کر لیں۔

پھر وہ تو وہیں بیٹھ گئے اور ہم دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے بھارت میں داخل ہو گئے۔

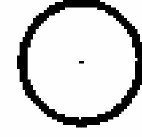
ان محافظوں نے کافی دیر تک وہیں رک کر ہمارا انتظار کرنا تھا تا کہ ہماری عافیت سے کسی حد تک مطمئن ہو کر اُٹھیں۔ عثمان "تجربے کار رہبروں" کی طرح میرے آگے آگے چل رہا تھا اور میں چند قدموں کے فاصلے سے اس کے پیچھے! ہم دونوں نے بھگوڑے مشرقی پاکستانیوں کا روپ دھار رکھا تھا۔ ہم مُکتی باہنی کے اس سے پہلے "بے قاعدہ" ورکر تھے جو اَب کیپٹن شرما (جو ہمارے خیال کے مطابق اب تک جہنّم رسید ہو چکا تھا) کے "اسپائی ماسٹر" کا "ذریعہ" بن کر "باقاعدہ گوریلوں" کا روپ دھارنے کلکتہ میں کسی خفیہ کیمپ میں شرکت کرنے جا رہے



تھے۔

رات کا پہلا پہر تھا اور چاند کی آخری راتیں۔ ابھی تک چاند نے اپنا رخِ زیبا آکاش کی پہنائیوں سے باہر نہیں نکالا تھا۔ ہم قدرے محتاط اور کسی حد تک بے دھڑک کلکتے کی سمت چلتے چلے جا رہے تھے۔

ہمیں اب ڈر تھا بھی کس بات کا۔ ہم اپنے بھارتی دوستوں کے محفوظ ہاتھوں تک تو پہنچ چکے تھے۔ اب ہمارا "مظلومیت" کا دور ختم ہو چلا تھا اور "انتقام" لینے کا وقت آ گیا تھا۔ ہائے رے ہم!



ہم آگ میں کُودنے جا رہے تھے، بھلے بعد میں ہمیں بوقتِ ضرورت کیا کیا مل سکتا تھا۔ ــــ فی الحال تو ہمارے پاس دو بھارتی ریوالور تھے یا چند سو روپوں کی پاکٹ نی اور بھارتی کرنسی باقی اللہ اللہ خیر صلّا۔

مجھے تو اس کام کی باقاعدہ تربیت حاصل تھی کہ ــــــ جب بھی موقع ملے بھیڑیوں کے غول میں گھُس جاؤں اور عین اُن کے درمیان بیٹھ کر ـــــــ اُنہی کا شکار کروں! مگر، میرا ساتھی عثمان چاہے ظاہری نظر میں جو کچھ بھی تھا وہ بہرحال سویلین تھا۔ ــــــ ایک امن پسند شہری! ایک سیدھا سادا سا طالب علم جس کے ہاتھوں سے وقت نے کتاب تو چھین لی تھی اور اس کی بجائے گرنیڈ اور اسٹین گن تھما دیے تھے۔

ہم آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور خیالات کا ایک طویل سلسلہ ہمارا ہم سفر تھا ــــــ اپنی تقدّس مآب سرزمین کے لیے اپنی جان کا حقیر نذرانہ پیش کرنے کی خواہش تو روزِ اوّل سے میرے سینے میں سُلگ رہی تھی مگر، اُس کے ساتھ ساتھ اب یہ اُلجھن بھی ستانے لگی تھی کہ، سرحد پار کرنے کے فن میں ــــ میرا ساتھی، عثمان کیوں اتنا ماہر ہے اور اس علاقے کے چپّے چپّے سے واقفیت حاصل کرنے کی آخر اسے کیوں اتنی ضرورت پیش آئی؟

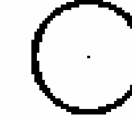
ابھی تک تو میں نے اُس سے اس راز کو کریدنے کی ذرا بھی کوشش نہ کی تھی، اب جو خیال آیا تو سوچا —— اُسے ٹٹولوں! لیکن وہ تو اپنے ہی خیالوں میں گم تھا۔

—— سرحدی علاقے میں پہنچتے ہی وہ کچھ سنجیدہ سا ہو گیا تھا جانے کیوں؟

"شاید اپنے متوقع انجام کے متعلق وہ فکرمند ہے۔" میں اُس کے بارے میں خیال آرائی کرنے لگا! "آخر ہے تو وہ گوشت پوست کا عام انسان —— کوئی نہ کوئی تشویش اُس کے ذہن و قلب پر ضرور اثر انداز ہو سکتی ہے!"

وہ میرے خیالوں سے بے خبر، چلتے چلتے رُک گیا —— اور ایک درخت کے نزدیک رُک کر مجھے بھی اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بڑی محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کے قلب میں جھانکنے لگا۔



—— مسلسل پیدل چلنے سے شاید عثمان کچھ تھکاوٹ سی محسوس کرنے لگا تھا، جبکہ —— میرے لیے یہ معمول کی کارروائی تھی۔

رات کا دوسرا پہر تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی ماحول کے سینے میں آہستہ آہستہ اُتر رہی تھی اور درخت سے ٹیک لگائے ہم دونوں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

—— ممکنہ حالات اور واقعات کی باتیں: کیا حالات پیش آئیں اور ہم اُن سے کیسے عہدہ برآ ہوں گے کہ اچانک عثمان نے ایک عجیب سی بات کہہ دی —— شاید میرے دل کی آواز اس نے سن لی تھی!

"علی! تمھیں حیرت نہیں ہوئی کہ میں آخر سرحدی علاقے سے اتنی واقفیت کیسے رکھتا ہوں۔ جبکہ میں کوئی انگلو بھی نہیں کہ جس کا آنا جانا دونوں اطراف لگا رہے؟" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔



"ہو تو رہی تھی۔ لیکن تم سے کچھ پوچھنا عجیب سا لگا۔" میں اور کیا کہتا۔

"میں اس سے پہلے بھی درجنوں مرتبہ آر پار آ چکا ہوں۔ میں نے اب تک یہ بات تمھیں اس لیے نہیں بتائی تھی کہ میرے خیال میں تمھیں شاید افسران نے آگاہ کر دیا ہو گا لیکن اب جبکہ ہم موت کی شاہراہ پر اکٹھے سفر کرنے جا رہے ہیں، تو نہ جانے دل کیوں چاہتا ہے کہ تمھیں بہت کچھ بتاؤں۔ بہت کچھ کہوں۔" وہ خاموش ہو کر میرے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔

"کہو" میں نے صرف ایک لفظ بولنے پر ہی اکتفا کیا۔

"میں پچھلے دس ماہ سے پاک فوج کے لیے خدمات سرانجام دے رہا ہوں اور اس علاقے سے میں نے درجنوں سرفروشوں کو کلکتہ پہنچایا ہے۔ ان میں سے کتنے واپس آئے اور کتنے بامراد ہوئے اس کا علم تو مائی کمان یا پھر خدا کی ذات ہی کو ہے۔"

—— میرے ذہن نے خود بخود ساری کڑیاں ملانی شروع کر دیں: کرنل صاحب نے عثمان کی ذات میں کتنی بھرپور دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔

ویسے تو گردشِ حالات نے ہم دونوں کو آپس میں ٹکرایا تھا لیکن ہماری ملاقات بہرحال ہو کر رہتی کیونکہ عثمان ہمارا بہت ہی قابل اعتماد ایجنٹ تھا۔ ہمارے او۔سی صاحب نے سمجھا ہو گا کہ میں نے عثمان کا یہ روپ بھی جان لیا ہو گا اس لیے انھوں نے خود کہنا مناسب نہ سمجھا اور میرا خیال بھی کبھی اس طرف نہ گیا۔

"واہ میاں صاحبزادے بڑے ہوشیار بنے پھرتے تھے اور معمولی سی بات نہ جان پائے!" میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔

"یہ بات میرے لیے باعث سعادت ہے کہ آج میں اپنے وطن کے ایک جانباز کے ساتھ ایک اہم مشن میں عملی شمولیت کر رہا ہوں —— اس سے پہلے میرے فرائض لوگوں کو یہاں تک لانے اور یہاں سے لے جانے تک ہی محدود تھے اور پھر تمھارے ساتھ رہتے ہوئے تمھارے متعلق میرے جذبات بھی ایک عام دوست سے بڑھ کر بھائیوں جیسے ہو گئے ہیں۔"

اس نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا۔

"یہ میری خوش نصیبی ہے؛" میں نے کہا۔

"میری بھی۔ کہ میری ایک بہت پرانی خواہش نے حقیقت کا روپ دھارا۔ ایک محبِ وطن پاکستانی ہونے کے ناطے میری بہت دیر سے آرزو تھی کہ میں ان جیالوں کے ساتھ راہِ شہادت پر چند قدم چل سکوں جو ہم لوگوں کے لیے بقا کی جنگ لڑنے جاتے ہیں ـــــ آج جب یہ موقع ملا ہے تو اپنے مقدر پر رشک تو آتا ہے لیکن۔ مجھے فراخدلی سے اپنی اس کمزوری کا اعتراف بھی کرنا ہے کہ میں تمھاری طرح تربیت یافتہ کمانڈو نہیں ایک عام انسان ہوں، ایسا انسان جو تصویر کا صرف مثبت ہی نہیں منفی رُخ بھی دیکھتا ہے بلکہ اس پر کچھ زیادہ ہی نظر رکھتا ہے۔

ـــــ "ہم بہاری لوگ"، وہ تڑپنے لگا: "ذرا سیدھے سادے انداز ہی سے بات کرتے ہیں ـــــ شاید ابھی تک ہم میں بہت زیادہ منافقت نہیں آئی ـــ میں یہ ضرور سوچتا ہوں کہ وطن کی راہ میں شہادت پا کر عظیم مرتبے پر سرفراز ہو جاؤں گا لیکن میرے بعد گھر والوں کا کیا ہوگا؟ ممکن ہے والدین طبعی عمر کے ایک خاص حصے میں پہنچ جانے کی وجہ سے مر کر کارزارِ حیات سے جان چھڑا لیں۔ لیکن ـــــ زندگی کی یہ چومکھی لڑائی آنسہ کیا تنہا لڑ پائے گی؟ وہ اتنی بہادر لڑکی تو نہیں کہ فوراً مر کر چھٹکارا پا لے ـــــ یہ پہاڑ سی زندگی اکیلے وہ کیسے کاٹے گی؟

ـــــ "بس دل پر یہی ایک بوجھ ہے"۔ اپنی بات ختم کر کے اُس نے ایک طویل سانس کھینچی۔

وہ بولتا جا رہا تھا اور میرا دل جیسے کسی شکنجے میں کَٹتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی؛ مجھ پر منوں بوجھ ڈال دیا تھا۔

ـــــ بھلا میں اسے کیسے سمجھاتا کہ اس کے اندازے کے بالکل برعکس میں بھی آخر ایک کمزور انسان ہوں، نہایت ہی کمزور اور ناتواں ـــــ اور میرے سینے میں بھی ایک



دل دھڑک رہا ہے۔

اخلاق اور مذہب بھی انسان پر کچھ ذمہ داریاں عائد کرتے ہیں! اگلی بات اس کے ہونٹوں پر تو مچل رہی تھی، لیکن زبان پر لانے سے وہ اس لیے ہچکچا رہا تھا کہ وہ ایک بہن کا بھائی تھا۔ اس نے مجھے احساس دلا دیا تھا کہ وہ مجھ پر کس حد تک اعتماد کرنے جا رہا ہے لیکن ساتھ ہی اس کی مجبوریوں نے مجھ سے التجا بھی کر دی تھی کہ "علی۔ بس ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ اب تم اپنا فرض نبھاؤ۔"

"عثمان بھائی" میری آواز سرگوشی سے کچھ بلند ہونے لگی تھی۔ لیکن فوراً حالات کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے میں نے خود پر قابو پا لیا کہ ہم دشمن کے علاقے میں گفتگو کر رہے تھے:

تم مجھ پر اس سلسلے میں اعتماد کر سکتے ہو ـــــ یہ ایک انسان کا دوسرے انسان سے ایک شریفانہ عہد ہے۔ خدا نہ کرے اگر کبھی ایسا ہو بھی گیا تو علی قیامت والے روز تمھارے سامنے شرمندہ ہو کر نہیں آئے گا!!"

ـــــ میری بات نے اُس پر جیسے جادو کا اثر کیا۔ وہ تڑپ اٹھا، بے قراری سے اُس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور سسک پڑا۔

"علی بھائی ہم کسی قابل بھی تو نہیں لیکن آنسہ اس دُنیا کی مخلوق نہیں۔ بخدا میں یہ بات اس لیے نہیں کہہ رہا کہ میں اس کا بھائی ہوں۔ وہ میری بہن نہ ہوتی تو بھی میں اسکے متعلق یہی رائے دیتا۔" اس کی آنکھوں نے چمک کر اس کی سچائی پر مہرِ تصدیق لگا دی۔

میری اس یقین دہانی نے عثمان میں جیسے زندگی کی نئی روح پھونک دی تھی۔ وہ پھر سے ڈھاکہ کے محمد پورہ والا عثمان بن گیا تھا جیسے اس نے مطمئن ہو کر تمام وسوسوں کو ذہن سے نکال پھینکا ہو۔

ـــــ مجھے بھی یہ فیصلہ کر لینے کے بعد خود پر فخر محسوس ہونے لگا تھا۔

تھوڑی دیر تک باتیں کرنے کے بعد ہم نے دوبارہ رختِ سفر باندھا اور ایک

ولولۂ تازہ ، اِک عزمِ نو ، کے ساتھ قدم بہ قدم کلکتے کی طرف بڑھنے لگے جہاں خطرات کا دیو اپنا ہولناک جبڑا کھولے ہمارا منتظر تھا۔

نیا دیس ـــــ نئے لوگ ـــــ نئی چالیں ـــــ نیا کھیل !!!

وسوسے ـــــ اُمیدیں ـــــ خوف ـــــ حوصلہ !!!

دشمن سے ٹکرانے کا عزم !

دشمن کو فنا کر دینے کی شدید خواہش !

اُس لمحے ہمارے ذہن عجیب و غریب خیالات کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔

# بحرِ بے کنار

صبح کے قریب ہم ایک مضافاتی قصبے میں پہنچ گئے۔ ہم نے یہاں کام کرنے کے لیے پہلے سے ایک لائحہ عمل طے تو کر لیا تھا لیکن اس بات کا یقین ہم کو نہ تھا کہ اس کے مطابق ہم عمل پیرا بھی ہو سکیں گے یا نہیں کیونکہ اس کا دارو مدار آئندہ پیش آنے والے حالات پر تھا ـــــ یہاں ہماری منصوبہ بندی نے ایک دوسرا رخ اختیار کیا تھا۔ اب ہم دونوں نے الگ رہ کر کام کرنا تھا عثمان کو مکتی باہنی میں گھس کر انڈین انٹیلی جنس کے ارادوں اور عزائم سے باخبر رہنا تھا اور مجھے اس کی اطلاعات پر بروقت کارروائی کرنا تھی۔

سرحدی محافظوں سے جان چھڑانے کے لیے فی الحال [illegible] بھی "گونگا انقلابی" ہی بنا ہوا تھا۔ چونکہ سینکڑوں کی تعداد میں لوگ بھاگ بھاگ کے مشرقی پاکستان سے بھارت آ رہے تھے اور ان میں زیادہ تعداد انہی لوگوں کی ہوتی تھی جو یا تو بقولِ خود مظلوم تھے یا پھر مکتی باہنی کے ورکر، اس لیے بھارتی بارڈر سیکورٹی فورس اُن سے کوئی خاص تعرض نہیں کرتی تھی، سوائے اس کے کہ مبادا ان میں سے کوئی "پاکستانی ایجنٹ" ہو۔

ہماری کوشش یہی تھی کہ بی۔ ایس۔ ایف (بارڈر سیکورٹی فورس) سے ہمارا سامنا نہ ہونے پائے۔ اس لیے ہم نے خاصا لمبا راستہ اختیار کیا تھا اور رات بھر چلتے رہے تھے۔ اس قصبے میں چپے چپے پر بھارتی سیکورٹی کے لوگ پھیلے ہوئے تھے۔ یہی بات نہیں کہ کسی نے کہا: وہ انقلابی

ہے اور انھوں نے "آمنا صدقنا" کہہ کر اسے قبول کر لیا۔ وہ لوگ بڑی بھرپور اور مکمل تفتیش کرتے تھے اور ذرا سا بھی شک گزرنے پر نووارد کو کسی عقوبت خانے میں لے جاتے تھے جہاں سے کوئی مائی کا لال سچ لیے بغیر باہر نہیں نکل پاتا تھا اور جب انھیں ذرا سا بھی ثبوت مل جاتا کہ : نوگرفتار پاکستانی ایجنٹ ہے تو وہ اُسے گولی مارنے میں ذرا بھی تو دیر نہیں کرتے تھے اور اب تک انھوں نے سینکڑوں ایسے بے گناہوں کو جو واقعی بھارتی ایجنٹ ہی تھے محض اس لیے موت کی نیند سلا دیا تھا کہ انھیں ان پر ڈبل ایجنٹ ہونے کا شک ہو گیا تھا۔

ان تمام حقائق کا علم مجھ سے زیادہ عثمان کو تھا لیکن ہمارے درمیان جو ایک "شریفانہ عہد" طے پا گیا تھا۔ اس کے بعد سے تو خوف اور فکر کو مَیں نے اس کے نزدیک بھی پھٹکتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اب آنکھیں بند کر کے کسی بھی طے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھا۔

پہلے میرا خیال یہی تھا کہ ہم یہیں سے الگ ہو جائیں لیکن عثمان نے سختی سے اس بات کی تردید کر دی۔ شاید اس کی دانست میں ابھی یہ کچھ مناسب نہیں تھا۔

ہم دونوں سیدھے قصبے کے بس اسٹینڈ پر پہنچے تھے۔ لوگوں کی آمدورفت شروع ہو چکی تھی۔ دکانیں کھُل رہی تھیں اور کلکتہ جانے والی بسیں تیاری کے مراحل میں تھیں۔ ہمارا رُخ ایک ٹی اسٹال کی طرف تھا۔ لکڑی کی ایک بینچ پر ایک بوڑھا بنگالی اخبار ہاتھ میں پکڑے چائے سُڑک رہا تھا۔ ہم دونوں اس کے نزدیک پہنچے تو وہ چونکا۔ ایک نظر ہم پر ڈالی اور بولا۔

"بنگلہ دیش سے آئے ہو؟" انھوں نے ابھی سے مشرقی پاکستان کو "بانگلہ دیش" بنا لیا تھا۔

"ہاں جی" عثمان نے جواب دیا۔

"کون سا گاؤں ہے تمھارا؟"

"کومل باڑی" عثمان نے ایک گاؤں کا نام لے دیا۔

"کہاں؟"

"ڈھاکہ کے نزدیک۔"



"اوہ۔ بہت دُور سے آرہے ہو" بوڑھے نے "اوہ" کو کچھ زیادہ ہی لمبا کر دیا تھا۔

"بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچے ہیں" عثمان کی آواز میں دنیا بھر کا درد سمٹ آیا تھا۔

"کوئی بات نہیں اب تم بالکل محفوظ ہو" بوڑھے نے باقاعدہ تھپکی بھی دی تھی۔

بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ وہ بوڑھا اور ٹی اسٹال والا دونوں ہی سیکورٹی کے ٹاؤٹ تھے پھر بوڑھا تو بظاہر انجان بنا کرید کرید کر عثمان سے اس کی جعلی درد بھری کہانی سنتا رہا جب کہ ٹی اسٹال والے نے ہمارے آگے چائے کی ایک چینک اور دو کپ رکھ دیے۔ ایک پلیٹ میں اس نے بڑے بڑے خطائی نما رس بھی ہمارے سامنے سجا دیے تھے۔

"کہاں جاؤ گے اب تم لوگ؟" بوڑھے نے چائے کے خاتمے پر پوچھا۔

"کلکتہ" عثمان بولا۔

"کس کے پاس؟"

"اپنے دوستوں سے مدد لینے جا رہے ہیں بابا! ہم یہاں رہنے نہیں آئے ہم اپنے دیش میں جا کر لڑیں گے۔ دیش کو آزاد کرائیں گے" اس نے آخری فقرے باقاعدہ ہاتھ ہلا ہلا کر بڑے پُرجوش طریقے سے کہے تھے۔

چائے والے نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔

"اِدھر بانگلہ دیش کے سپاہیوں سے پیسہ نہیں لیتا" اس نے ہندی میں کہا۔

"ہاں ہاں رہنے دو۔ رہنے دو۔ کوئی بات نہیں تم لوگ ہمارے مہمان ہو" بوڑھے نے بھی عثمان کو منع کر دیا۔

بوڑھا دورانِ گفتگو کن انکھیوں سے کئی مرتبہ میرا جائزہ لے چکا تھا۔ میرا تعارف ایک گونگے حریت پسند کی حیثیت سے عثمان نے آغاز ہی میں کروا دیا تھا جس کا سارا کنبہ فوج کا نشانہ بن چکا تھا۔ خاصا خرانٹ بڈھا تھا۔ اس کے چہرے سے اس بات کا اندازہ لگانا دشوار تھا کہ اسے مجھ پر ترس آرہا ہے یا وہ میرے گونگے ہونے پر مشکوک ہے۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد ہم وہاں سے اُٹھے تھے۔ بوڑھا وہیں بیٹھا رہا۔ شاید اگلے شکار کا منتظر ہو گا اور ابھی ہم لوگ بمشکل ٹی اسٹال سے نکل کر چند گز ہی بس اسٹینڈ کی طرف بڑھے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"اے کدھر جانا ہے؟" بولنے والے کا لہجہ اس کے ہندی اسپیکنگ ہونے کی چغلی کھا رہا تھا لیکن انداز کلکتہ والا تھا ہم دونوں ہی ایک ساتھ گھومے تھے پیچھے ایک خاصا معزز بنگالی سادہ کپڑوں میں ملبوس کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی پولیس کے چند سپاہی ایک طرف کھڑے اس کے اشارے کے منتظر تھے۔

"کلکتہ جائے گا صاب" عثمان نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

"بانگلہ دیش سے" عثمان نے بنگالی میں کہا۔

"ادھر چلو سالا" گالی تو ان کی نوکِ زبان پر دھری تھی۔

ہم دونوں اُدھر چل دیے اور سپاہیوں کی معیت میں ایک پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئے۔ جہاں ہمارا استقبال مشرقی پاکستان کے ایک غدّار نے کیا۔

"کیا نام ہے؟"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"کس کے پاس جا رہے ہو؟"

"کس گروپ سے ہو؟"

"کون گینگ لیڈر ہے؟"

"وہاں کس کے ساتھ کام کر رہے تھے؟" وغیرہ وغیرہ

اس نے جاتے ہی ہم پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی، لیکن ہر سوال کا جواب عثمان نے بڑے تحمل اور بردباری سے دیا۔ اصل میں کیپٹن شرما کے روپ میں قدرت نے ہماری اتنی

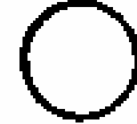


بڑی مشکل حل کر دی تھی کہ عام حالت میں شاید کبھی ہم وہ کچھ نہ پا سکتے جو شرما کی ایک گھنٹے کی معیت میں ہمیں ملا تھا۔

شرما کا تعلق بھارت کی اعلیٰ ترین خفیہ ایجنسی "را" سے تھا اور اس نے ہمارے "جذبۂ آزادی" سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو کر ہمیں اپنا "ذریعہ" بنایا تھا۔ ہم نے جہاں بھی اس کے دیے ہوئے حوالے کو دہرایا ہماری جان محفوظ رہی، کسی نے ابھی تک ہم سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ اس "حوالے" تک ہم پہنچے کیسے ہیں؟ شاید ابھی تک ہمارا واسطہ نچلے درجے کی ایجنسیوں کے پروردہ ایجنٹوں ہی سے رہا تھا اور بطورِ فوجی اس بات کا تو مجھے بھی علم تھا کہ سرحدی مقامات کے ارد گرد عموماً عام قسم کی سیکورٹی ہی سے کام لیا جاتا ہے۔ اعلیٰ پائے کے لوگ تو پیچھے پیچھے رہتے ہیں۔ پردے کے پیچھے۔ وہ کبھی کیمرے کے سامنے نہیں آتے۔

"باہنی" کے کمانڈر سے بھگتنے کے بعد ہمیں پھر انہی مراحل سے گزرنا پڑا ـــــ اس مرتبہ ہمارا تفتیش کنندہ ایک سکھ کرنل تھا۔ اس سے بھی جلد ہی نجات مل گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم لوگ ایک بس کے ذریعے کلکتہ کی طرف عازمِ سفر تھے۔

مجھے ان لوگوں پر حیرت ہو رہی تھی کہ انھوں نے غدّاروں کو بے حد و حساب سہولتیں فراہم کر رکھی تھیں، سرحدی علاقوں میں ان سے معمولی سی پوچھ گچھ کے بعد انھیں چھوڑ دیا جاتا تھا اور اکثر لوگ بجائے کیمپوں میں جانے کے عموماً کلکتہ شہر کا رُخ کیا کرتے جہاں ان کے آقا انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے اور جی بھر کے رنگ رلیاں منانے کے مواقع فراہم کرتے تھے۔



کلکتہ پہنچتے ہی ہم نے الگ ہونے کی تدبیر کی، اب مجھے اچانک غائب ہونے کا ڈرامہ رچانا تھا جس کے جواز میں پہلے ہی سے ایک گھڑی گھڑائی کہانی عثمان کے پاس موجود تھی۔ ہمارا وہ مخصوص SAFE HOUSE سیف ہاؤس جو پہلے ہی سے ہمارا منتظر تھا بس اسٹینڈ سے بمشکل دو میل کے فاصلے پر واقع تھا! اس ٹھکانے تک پہنچنے میں ہم نے کم از کم تین گھنٹے

لگائے تھے اور ان تین گھنٹوں میں ہم نے کلکتے کی ایک ایک گلی کی یاترا کی، محض اس بات کا اندازہ لگانے کے لیے کہ کوئی ہمیں چیک تو نہیں کر رہا؟ چالاک سے چالاک سیکورٹی والا بھی اگر ہماری نگرانی کر رہا ہوتا، تو ہم اُسے "ڈاج" دینے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

اپنے اس مخصوص ٹھکانے پر پہنچ کر میں تو غائب ہو گیا جب کہ عثمان اپنے مشن پر چل دیا۔ ہم نے آئندہ "ملاپ" کے لیے "آر۔ وی" سسٹم موجودہ حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہیں ترتیب دے لیا تھا اور یہ میری تربیت سے بالکل مختلف طرح کا انداز تھا۔ مجھے اپنی بہترین صلاحیتیں آزمانے کے لیے اب میدان میں آنا تھا۔

عثمان توسیدھا اس حوالے تک پہنچ رہا تھا جس کا ذکر کیپٹن شرما نے کیا تھا جب کہ میں مشرقی پنجاب کے ایک مونے سکھ کا روپ دھارے تازہ ہدایات لینے اپنے ٹھکانے کا رُخ کر رہا تھا۔

—— یہ SAFE HOUSE سیف ہاؤس پہلے سے سرگرم ہمارے ایک انتہائی قابل ایجنٹ نے قائم کیا تھا اور اسے ایک طرح یہاں "سپائی ماسٹر" کی حیثیت حاصل تھی۔

عموماً پہلی ہی مرتبہ لانچ کرنے والے ایجنٹ کا رابطہ ہائی کمان سے اتنی جلدی نہیں قائم کیا جاتا، پہلے اسے اپنے طور پر قدم جمانے کا موقع دیا جاتا ہے کیونکہ اس کی معمولی سی غلطی بھی سارے "گینگ" کے پرخچے اڑا سکتی ہے۔ لیکن میں بھٹی سے کندن بن کر نکلا تھا میرے افسران کو اعتماد تھا کہ میں مر تو سکتا ہوں، لیکن قابو آنے کی صورت میں اپنا ٹھکانا نہیں بتا سکتا پھر حالات میں اتنی تیزی سے اور اچانک تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں کہ میرے لیے اپنا ایک الگ جال بننے کو وقت ہی کہاں رہ گیا تھا۔

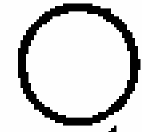
مجھے تو بہرحال پہلے سے قائم شدہ ایک نظام میں کسی جگہ فٹ ہو جانا تھا —— یہ ٹھکانہ کلکتے کی ایک انتہائی گنجان آباد بستی میں تھا۔

—— میں شام کو اپنا حلیہ بدل کر ایک پنجابی مونے سکھ کا روپ دھارے وہاں



اپنے ایک ساتھی کا منتظر تھا جسے شام کو پانچ بجے مجھ سے مل کر اگلی ہدایات مجھ تک پہنچانی تھیں۔ ہمارے ملاپ کے لیے جو جگہ مقرر تھی وہ اس آبادی کا ایک تفریحی پارک تھا۔ اب تک اس بارے میں میری معلومات یہی تھیں کہ تفریحی پارک ایک بہت بڑا گراؤنڈ ہوتا ہے جس کے مختلف کونوں میں لوگ آبادی کے ہنگاموں سے الگ تھلگ تھوڑی دیر کے لیے سکون حاصل کرتے ہیں، لیکن یہاں گنگا الٹی بہہ رہی تھی —— گاندھی پارک میں گھستے ہی مجھے یوں لگا جیسے میں کسی چڑیا گھر میں آن پھنسا ہوں۔ یہ گراؤنڈ ضرور تھا۔ خوبصورت باغ اور مصنوعی پہاڑی بھی چشمے سمیت یہاں موجود تھی لیکن عوام۔ خدا کی پناہ! یہ پارک کسی جلسہ گاہ کا منظر پیش کر رہا تھا جہاں سیاسی لیڈروں کی بجائے کسی مشہور فلم ایکٹریس کو تقریر کی دعوت دی گئی ہو۔

پانچ بجنے میں بمشکل چند منٹ باقی تھے جب میں وہاں پہنچا اور پارک کے جنوبی دروازے سے ملحق دیوار کے قریب اپنے خیال میں دوسروں سے الگ تھلگ جا کر کھڑا ہو گیا۔



جاسوس کے لیے اپنی سروسز کا خطرناک ترین مرحلہ وہ ہوتا ہے جب اسے کسی دوسرے ایجنٹ سے ملاقات کرنی ہوتی ہے ہر وقت ذہن پر یہی خوف سوار رہتا ہے کہ دونوں میں سے اگر ایک بھی پولیس کی نظر میں آ چکا ہو تو دونوں بے موت مارے جائیں گے۔ دنیا کے بہترین جاسوس اپنی غلطی سے کم اور دوسروں کی غلطی سے زیادہ پکڑے گئے ہیں جو شخص مجھ سے ملنے آ رہا تھا وہ ہمارا گھاگ ایجنٹ تھا اور ایک لمبے عرصے سے یہاں قیام پذیر تھا مجھے الجھن اس بات سے ہو رہی تھی کہ پہلی چوری ہی پر نہ پکڑا جاؤں باقی تو سب خیریت تھی۔

جونہی گھڑی کی سوئیاں پانچ پر رکیں، میں چوکنا ہو کر پارک میں آنے جانے والوں کا کن اکھیوں سے جائزہ لینے لگا۔ انہی میں وہ "ذاتِ شریف" بھی موجود تھے، جسے مجھ سے ملنا

تھا اور اگر وہ سیکورٹی کی نظر میں آ چکا تھا تو میرے صیاد بھی انھی آنے جانے والوں میں موجود تھے۔

مَیں گردن موڑے ایک ہیرو قسم کے بزرگ کا جائزہ لے رہا تھا جس پر مجھے اب تک یہی شک تھا کہ وہی میرا "دوست" ہے کہ اچانک میں بدک گیا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی ——— میرے دائیں طرف سے گونجدار آواز سنائی دی:

"الکھ نرنجن" مَیں اس طرح اپنی جگہ سے ہٹا جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔

"شانت رہو بالیکے!" اسی ہٹے کٹے جوگی نے مجھے تسلی دی جس نے مجھے پہلے ڈرایا تھا۔ اس کے الفاظ سُن کر مَیں چونکا۔!

"ہرے اوم ہرے اوم" میرے منہ سے گھبرائی سی آواز نکلی۔

"دِلّی سے آیا ہے بچّہ!" دوسرا کوڈ ورڈ موصول ہُوا۔

"آگرہ سے بابا!" ہم نے خفیہ لفظوں کا تبادلہ کیا۔

"گھبراؤ نہیں بالیکے یہاں آنند ہی آنند ہے۔ آؤ بابا سے پرشاد لو گیان دھیان جہاں سے ملے پالو بچّہ!" اس نے مجھے مطمئن کر دیا۔

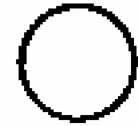
"ہم تو داس ہیں آپ کے بابا" مَیں نے بھی اسے اطمینان دلایا۔ ہم نے ان فقروں میں ایک دوسرے کو نہ صرف اپنی پہچان کرا دی بلکہ اپنے اصلی ہونے کا یقین بھی دلا دیا تھا۔

کلکتے کی مرتی مارتی مخلوق کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے کے پھٹے میں ٹانگ پھنسانے کی مہلت نکال سکیں۔ ایسے مہارشی مُنی جٹ دھاری مختلف گروؤں، جوگیوں اوتاروں اور بھگوانوں کا روپ دھارے وہاں پھرتے رہتے ہیں۔ لوگوں کو ان سے صرف اس حد تک دلچسپی ہوتی ہے کہ "بابا ترنگ میں سٹے کا نمبر بتا دے گا" اور اس "نمبر" کے چکر میں وہ بابا کے تلوے چاٹنے تک سے گریز نہیں کرتے۔ ہم دونوں گرو اور بالیکے باغ کے ایک کونے میں چائے کی کیتلی سامنے رکھے تھوڑی دیر بعد محوِ گفتگو تھے۔



جب بھی ہمیں کسی کے اپنی طرف متوجہ ہونے کا احساس ہوتا باباجی فوراً گفتگو کا انداز بدل دیتے وہ ہمارے "اسپائی ماسٹر" تھے اور مجھے بعد میں علم ہُوا کہ انھوں نے کئی روپ بیک وقت دھار رکھے تھے ہم موجودہ صورتِ حال پر بحث کرتے رہے بالآخر ایک نتیجے پر پہنچ کر اٹھ گئے۔

جاتے جاتے وہ مجھے اچھا خاصا "زادِ راہ" عنایت کر گئے تھے۔



پھر باباجی تو اپنی برکتیں لٹانے وہاں رہ گئے اور مَیں واپس چلا آیا۔

——— وہ رات مَیں نے ایک دوسرے درجے کے ہوٹل میں گزارنے کی سوچی۔ یہ ہوٹل بھی امرتسر کے کسی سردار جی کا تھا اور یہاں زیادہ تر پنجابی لوگ ہی قیام کرتے تھے، انھوں نے مجھے "جی آیاں نوں" کہا اور معمولی کرایہ وصول کرکے ایک سنگل بیڈ کمرہ مجھے سونپ دیا۔ مقامی "قباحتوں" سے بچنے کے لیے جو یہاں کی زندگی کا جزوِ لاینفک بن چکی ہیں، مَیں نے کاؤنٹر پر موجود سردار جی سے درخواست کی: کہ وہ کم از کم آج رات کسی کو میرے کمرے میں آنے کی اجازت نہ دیں! میرا مطلب سمجھ کر وہ مسکرائے۔

"کیوں مہاراج جی کلکتے والے پسند نہیں آئے۔ پنجاب کا مال بھی ہے ادھر"۔ انھوں نے بڑی بے حیائی سے آنکھ کا ایک کونہ دباتے ہوئے کہا۔

"نہیں سردار جی اصل میں دو تین روز سے سفر میں ہوں نا! اس لیے کافی تھک چکا ہوں اور آرام کرنا چاہتا ہُوں"۔ مَیں نے کھسیانا سا ہو کر معذرت پیش کی۔

"ٹھیک ہے مہاراج جی کل سہی!" میرے جاتے جاتے اس نے فقرہ اچھال دیا۔ مَیں نے اسے بھی غنیمت جانا کہ کم از کم آج رات کوئی "حوازادی" میری نیند میں مخل نہیں ہوگی، ورنہ تو وہاں اس سے صرفِ نظر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

کمرے میں پہنچ کر مَیں نے کھانا وہیں منگوایا اور لمبی تان کر سو رہا۔

صبح میری آنکھ اس وقت کھلی جب روشندان سے دھوپ میرے کمرے میں اُترنے لگی تھی۔ ہوٹل کے ہال میں پنجاب کے روایتی ناشتے سے بہرہ مند ہو کر باہر آگیا۔ احتیاطاً ایک پستول مَیں نے اپنے کپڑوں میں محفوظ کر لیا تھا میرا رُخ ریلوے یارڈ کی اس ویران سمت کی طرف تھا جہاں عثمان کو اب سے دو گھنٹے بعد مجھ سے ملنا تھا۔

ہماری اس ملاقات پر حقیقت میں ہمارے آئندہ مستقبل کا دارومدار تھا۔ عثمان نے کل کیپٹن شرما والے حوالے سے رابطہ قائم کر لیا ہوگا اور اب اس نے مجھے وہی رپورٹ دینی تھی۔ یہ بڑا مشکل کام تھا کسی انٹیلی جنس آفیسر کا اعتماد حاصل کرنا اور وہ بھی اس صورت میں جب کہ کیپٹن شرما خود غائب تھا! ظاہر ہے وہ ہمارے ہتھے چڑھ چکا ہو گا۔ عثمان پر پاکستانی ایجنٹ ہونے کا شک بھی کیا جاسکتا تھا لیکن ہم نے کیپٹن شرما کے باقی گروپ کے لوگوں کے حلیے اور نام حفظ کر رکھے تھے اور ہماری مہم بھی بڑی مختصر نوعیت کی تھی ہمیں وہاں بمشکل پندرہ بیس روز قیام کرنا تھا اور اسی دوران سب کچھ کر گزرنا تھا۔

آر۔ وی R.V کے لیے اس جگہ کا انتخاب ہم نے کل ہی کیا تھا۔ یہاں سے گزرتے ہوئے اتفاقاً ہماری نظریں اس طرف اٹھیں تو یہ گوشۂ عافیت نظر پڑا اور ہم نے اس حشرات الارض کی سی آبادی والے شہر میں اسے مامون و محفوظ جان کر آئندہ اپنی ملاقاتوں کے لیے انتخاب کر لیا تھا۔ مَیں یارڈ کے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ چاروں طرف سے شنٹنگ کرتے انجنوں کا شور سنائی دے رہا تھا ـــــــ عثمان نے تربیت کے مطابق مخالف سمت سے اندر آنا تھا اور میری نظریں اس کی آمد کے راستے میں گڑی تھیں۔

وقتِ مقررہ کے دو منٹ بعد ہی وہ اس سمت سے آتا دکھائی دیا۔ اس کا گلنار چہرہ بظاہر اس امر کی نشاندہی کر رہا تھا کہ اس نے میدان مار لیا ہے۔ مَیں اچانک مخالف سمت سے نکل کر اس کے سامنے آیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر "بھائی" کا نعرہ لگا کر میری سمت بانہیں پھیلاتا ہُوا بڑھا اور مجھ سے لپٹ گیا۔



اسے الگ کرنے اور دھکا دینے کا عمل میری طرف سے ایک ہی وقت میں وقوع پذیر ہُوا تھا میری چھٹی حِس کام کر گئی ورنہ وہ گولی جو ہم دونوں کے درمیان سے گزر کر سامنے دیوار میں گھُس گئی تھی اپنی قیمت چکا چکی ہوتی۔ خود مَیں ایک طرف ہوا میں تیرتا ہُوا اس طرح حملہ آور پر آیا تھا کہ اسے اگلا فائر کرنے کی مہلت ہی نصیب نہ ہوئی۔

پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ اس سے پہلے کہ مَیں اپنا پستول نکالوں ایک زہریلی پھنکار میرے عقب سے گونجی: "ہینڈز اپ"۔

ہاتھ اٹھا کر مَیں آواز کی سمت گھوم گیا۔ میرے سامنے امیت سرکار اسٹین گن تانے کھڑا تھا: "سالا ہم کو بے وقوف سمجھتا ہے"۔ اس نے ہمیں گالیاں دیتے ہُوئے کہا۔

مَیں نے کبھی ورِیام ہونے کا دعویٰ نہیں کیا لیکن مشقتوں اور تربیّت کی جس بھٹی سے نکل کر مَیں کندن بنا تھا اس کا تصوّر بھی بڑے بڑے سورما نہیں کر سکتے ـــــ ایک مرتبہ دورانِ تربیت جب تپتی ریت پر مسلسل تین گھنٹے مارچ کرنے کے بعد ہمارے "اندر" لوہے پگھلانے والی بھٹیاں بن گئے تھے اور بدن کے عرق میں ہمارے جوڑ سُلگ کر خشک لکڑیوں کی طرح چٹخنے ہُوئے محسوس ہونے لگے تھے تو ہم نے اپنے "اسٹاف" سے EXERCISE کے خاتمے پر پُوچھا تھا: "سر! کیا عملی زندگی میں ایسے حالات کا تصوّر بھی ممکن ہے؟"

"اس سے بھی بدتر حالات پیش آسکتے ہیں ـــــــ" ہمارے اسٹاف نے رعد کی طرح کڑک کر کہا تھا۔

اصل میں ان مشقتوں کا مقصد جسمانی اذیتیں برداشت کرنے سے زیادہ جوانوں کو ذہنی عذاب جھیلنے کے لیے تیار کرنا ہوتا ہے ـــــــ ہم جس شعبۂ زندگی سے تعلق رکھتے تھے وہاں مصیبت پڑنے پر بزدلی یا اوسان خطا جانے پر جھنجلاہٹ کا شکار نہیں ہوا جاتا۔

گرمیوں اور سردیوں کے لاتعداد عذابوں کا مزا چکھنے کے بعد مَیں نے اس موت کی وادی کا سفر اپنایا تھا۔ مَیں نے چوتھی سمت ضرور اختیار کی تھی لیکن راستے میں ملنے والے

مختلف آدم خور جنوں، انسانی خون پینے والی چڑیلوں اور منتر پڑھ کر پھونکنے سے انسان کو پتھر کا بت بنا دینے والی جادوگرنیوں سے بچنے کے ڈھنگ مجھے آتے تھے لیکن اس لمحے امیت سرکار کو اچانک وہاں دیکھ کر سنسنی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی —— ہم دشمن کی سرزمین پر، دشمن ہی کے پروردہ پلنے کے رحم و کرم پر کھڑے تھے! وہ لوگ جو کسی کے ہاتھ مادرِ وطن کا سودا کرنے سے نہ چوکیں ان سے انسانیت، انصاف یا امن پسندی کی توقع دلوانے کا خواب نہیں تو اور کیا ہے؟ امیت سرکار کے ہاتھوں اس طرح بے ضرر کیچوے کی مانند پکڑے جانے کے بعد ہمارا انجام کیا ہو سکتا تھا؟ اس کا تصوّر ہی بڑا المناک تھا، موت سے زیادہ مرنے کا عمل تکلیف دہ ہوتا ہے اور جب میری توجہ اس "عمل" کی طرف گئی جس سے مارنے سے پہلے یہ خون آشام بھیڑیئے ہمیں گزارتے تو ایک جھرجھری لے کر گویا میں خوابِ غفلت سے بیدار ہو گیا۔

یہ افسانوی بات نہیں کہ اکیلا کمانڈو نہتا ہونے کے باوجود پانچ مسلح آدمیوں سے نمٹ سکتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کمانڈو کسی آسمانی مخلوق کا نام نہیں بلکہ وہ بھی اس مرتی مارتی کائنات کا حصہ ہیں جو ناقابلِ بیان تربیت کے مراحل سے گزر کر کچھ اضافی صفات سے ضرور متصف ہو جاتے ہیں۔ پھر ہر انسانی عمل حالات کا محتاج ہے۔!!

"مواقع —— حاصل ہی نہیں ہوتے، پیدا کیے جاتے ہیں" —— میرے انسٹرکٹر زندہ پیر کی طرح میرے لاشعور سے جاگے۔

عثمان بھی اب دہشت زدہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مجھے خود سے زیادہ فکر اسکی یوں بھی تھی کہ کہیں وہ دو سانڈوں کی لڑائی میں پس کر نہ رہ جائے۔ میری کسی بھی حرکت سے بدک کر اگر اچانک ہی امیت سرکار سے گولی چل جاتی تو عثمان اس کا پہلا نشانہ بنتا۔

امیت کا دوسرا ساتھی جسے میرے ہاتھوں زبردست زک پہنچی تھی ایک کونے میں کھڑا ہمیں خوں خوار آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ اس کی حالت اس جھنجھلائے ہوئے بھیڑیے



کی سی تھی جس کے منہ سے اس کا نوالہ چھین لیا جائے اس کی آنکھوں میں جاگنے والی بربریت میں اتنے فاصلے سے بخوبی محسوس کر سکتا تھا۔ وہ اشارہ پاتے ہی ہماری ہڈیاں تک چبا جانے سے گریز نہ کرتا۔

میرے کھڑے ہاتھ کی ضرب اور پاؤں کی ٹھوکر نے اس پر جو قیامت ڈھائی تھی اس کا اندازہ اسکے چہرے سے بخوبی ہو رہا تھا جس پر خباثت بڑھتی جا رہی تھی۔ اپنے جبڑے اس نے تکلیف اور غصے کے کھولتے جذبات کو دبانے کے لیے بھینچ رکھے تھے جن سے اسکے چہرے کی ہڈیاں ابھر کر اور نمایاں ہو گئی تھیں۔ اگر اسے معمولی سا میک اپ کروا دیا جاتا تو وہ خون پینے والا ڈریکولا نظر آتا۔

زمین پر گرا اپنا پستول اس نے اٹھا کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا! ہم اس مصروف ترین ریلوے اسٹیشن کے اس حصے میں کھڑے تھے جہاں سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ نہیں ہوا تھا۔ —— یہاں شنٹنگ کرنے والے انجنوں کا شور یا کانٹے بدلنے کی آوازیں تو سنائی دے رہی تھیں لیکن کسی کو اتنا ہوش نہیں تھا کہ وہ پلٹ کر ہماری خبر لے۔

وقت نے ہم دونوں کو یکساں موقع دیا تھا۔ اگر امیت سرکار اور اس کے ساتھی کو بھارتی سرکار کے پروردہ ایجنٹ ہونے کا ایڈوانٹیج میسر تھا تو ہمیں بھی یہ سہولت حاصل تھی کہ یہاں سے بلند ہونے والی گولی کی آواز انجنوں کے شور میں دب کر رہ سکتی ہے۔ کم از کم ایک دوسرے سے بھڑ جانے کی صورت میں کچھ وقت تک ہم "دنیا والوں" کی نظروں سے بچے رہ سکتے تھے۔

"پستول جیب میں ڈال لو بزدل۔" امیت سرکار نے اپنے ساتھی کو گالی دی۔

اس نے ابھی تک پستول اسی امید پہ ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا کہ ابھی اس کا لیڈر اسے حکم دے گا کہ ہمیں باری باری گولی مار کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لے۔ اس نے خاصی جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے پستول اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ جس طرح اس نے خود پر قابو

پارکھا تھا اس کا اندازہ کچھ مَیں ہی لگا سکتا تھا۔

"اس روز تو بچ گیا تھا سالے ـــــــ آج دیکھوں گا تجھے۔ تیری تو نہ جانے مجھے کب سے تلاش تھی۔" امیت نے عثمان کو مخاطب کیا۔

"اور مجھے تیری ۔۔۔!" عثمان کی آواز میں چھپے ہوئے قہر نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اس کی شخصیت کے اسرار آہستہ آہستہ مجھ پر منکشف ہو رہے تھے بزدلی کے بجائے اُس نے غصے میں پناہ پائی تھی۔

"شٹ اپ" امیت سرکار گلا پھاڑ کر دھاڑا۔

"یو شٹ اپ۔" عثمان نے اس سے بھی زیادہ اُونچی آواز سے چلّا کر کہا۔

قدرت ہر راستہ خود ہموار کر رہی تھی ـــــــ بس یہی کچھ اصل میں مجھے درکار تھا! ہماری پہلی کوشش یہی ہوتی ہے کہ حملہ آور کو ابنارمل کر دیں تاکہ وہ جھنجلا کر، طیش کھا کر کوئی غلط حرکت کرے، کہیں سے لغزش کھائے اور ہم وہ کر گزریں جسے عرفِ عام میں معجزے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

عثمان کے دوبدو جواب نے امیت سرکار پر رعشہ طاری کر دیا تھا لیکن وہ پیشہ ور گوریلا تھا اور اس سے پہلے اس نے میرے ہاتھ بھی دیکھ رکھے تھے۔ اسی لیے شاید اس نے اپنی دماغی تمازت کو کھوپڑی کی ہنڈیا سے باہر نہ آنے دیا۔

"جاؤ گاڑی ادھر لے آؤ۔" اس نے بجائے عثمان کو گالی دینے کے اپنے ساتھی کو حکم دیا۔ "سب سے پہلے مَیں تمہاری زبان تالو سے الگ کروں گا اور پھر تمہاری لاش گاڑی میں ڈال لے جاؤں گا ـــــــ" اس نے بڑے خونخوار لہجے میں عثمان سے کہا۔

"تم یہ حسرت ہی دل میں لے کر مر جاؤ گے۔" عثمان نے گویا اُسے آسمانی فیصلے سے آگاہی دے دی۔

اس کا ساتھی میرے پہلو سے نکل کر اور امیت سرکار کے سامنے سے گزر کر آگے جانے لگا۔



ـــــــ اور یہ وہی وقت تھا جب اسے میرے اور امیت کے درمیان دیوار بننا تھا۔ مجھے وہ لمحہ دعوتِ عمل دے رہا تھا کہ مَیں جو کچھ کر سکتا تھا اس ایک لمحے میں کر گزروں۔ اس کے بعد مرنے تک مجھے کوئی موقعہ میسر نہ آتا۔

مَیں نے نظروں سے وہ فاصلہ ناپا جسے ایک ہی جست میں مجھے عبور کرنا تھا۔ قدموں میں چھپی طاقت کو اعتماد کے پلڑے میں تولا کر انہی قدموں پر اُچھل کر مجھے گوہرِ مقصود تک پہنچنا تھا۔ مَیں نے ذہن میں پوشیدہ ساری حکمتِ عملی کو ایک نقطے پر مرکوز کیا اور ساعتِ سعید کا انتظار کرنے لگا۔

جب اس کے ساتھی نے امیت سرکار کے حکم کی تعمیل میں اپنی جگہ سے حرکت کی تو اس نے گویا پاؤں کی مٹی چھوڑ کر مجھے کالے علم سے چھٹکارا دلا دیا۔ تب مجھے فضاؤں میں ہر وقت موجود رہنے والی ان طلسماتی قوّتوں کا گیان حاصل ہوا جو اب میرے وجود کا حصّہ بن چکی تھیں۔ میرے بازوؤں اور پنڈلیوں کی مچھلیاں پھڑکنے لگیں جیسے ہی وہ اس "نقطۂ انتہا" کو پہنچا جو میرے مشن کا نقطۂ آغاز تھا۔ مَیں زور سے چلّایا۔ "ڈاؤن ۔۔!"

جہاں یہ ایک طرف عثمان کو زمین بوس ہونے کا اشارہ تھا وہاں امیت سرکار کو چند لمحوں کے لیے بوکھلا دینے کا ایک نفسیاتی حربہ بھی تھا۔ پھر جھپٹنے اور پلٹنے کا عمل ایک ساتھ وقوع پذیر ہُوا۔ مَیں ترچھا ہو کر ہوا میں زقند بھرتا اس کے پہلو میں آ رہا تھا وہ شخص میری ڈھال تھا جس کی آڑ میں میرے منصوبے نے کامیابی حاصل کرنا تھی۔

ـــــــ میرے پاؤں جُڑ کر اس کی پسلیوں میں گھُسے، ایک تو حملہ اچانک اور زوردار، دوسرے پشت سے اور بے خبری میں وہ اپنی جگہ سے گولی کی نکلتی امیت پر گرا جس کی اسٹین گن بوکھلاہٹ میں زمین کی طرف جھُک گئی تھی۔ مضروب کا منہ اور سینہ شتر بے مہار کی طرح اس کے بازوؤں پر آیا اور ان پر سے پھسلتا ہُوا اسٹین گن سمیت زمین پر لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز

نہیں تھا کہ امیت سرکار کو سنبھلنے کی مہلت نصیب ہو جاتی، مَیں نے ہتھیلیاں زمین پر ٹکاتے ہوئے ماہر پہلوانوں کی طرح اپنی دونوں ایڑیاں اس کے سینے پر ماریں اور اس کے سیدھے ہوتے ہی اس پر سواری گانٹھ لی۔

ـــــ عثمان نے بھی اپنا فرض نہیں بھلایا تھا میرے "ڈاؤن" پکارنے پر وہ گرا اور دوسرے ہی لمحے اُٹھ کر دوبارہ دوسرے شخص پر جھپٹ پڑا۔ یہ بالکل اسی طرح تھا جیسے کوئی پہلوان حریف کو زوردار فلائنگ لک مار کر بے بس کر دے اور اس کے بعد رنگ کے رسوں پر چھلانگ لے کر اس کے نیم مردہ جسم پر دلیری سے تین کی گنتی کروائے۔ اب صورتحال یہ تھی کہ سب سے نیچے اسٹین گن تھی اور اس کے اوپر امیت سرکار کا ساتھی اور ان دونوں کے اوپر عثمان۔

امیت سرکار پر چھاتے ہی میرے سامنے وہ بلیک بورڈ نمایاں ہو گیا جس پر انسانی، اعصابی نظام کا نقشہ کھینچا تھا۔ خون کا دباؤ بڑھانے اور گھٹانے والی نالیاں ـــــ خون سپلائی کرنے اور وصول کرنے والی وریدیں! خون کی ایک ایک نالی پر میرے انسٹرکٹر صاحب کی چھڑی پھر رہی تھی اور وہ اس کے پورے نظام کار سے آگاہی دینے لگے تھے:

"یہ ہے وہ مقام" انھوں نے ایک مخصوص مقام پر چھڑی کی نوک جمائی۔ پھر اسے بلیک بورڈ پر چاک کی مدد سے نمایاں کیا۔ "اس پر صرف دس سیکنڈ کا دباؤ ہیوی ویٹ چیمپئن کو بھی موت کی نیند سلا دے گا۔ مائی بوائے، یہاں مغلوب پر سب سے پہلا ردّعمل یہ ہوگا کہ اس کے اعصاب مختل ہو جائیں گے، ذہن اور جسم کا رابطہ منقطع ـــــ سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں مفقود، اور جسم کا اندرونی نظام تو اس طرح بگڑتا ہے کہ ہاتھ پیروں سے جان نکل جاتی ہے، مغلوب چلانا چاہتا ہے، مگر چلا نہیں پاتا ـــــ وہ کچھ نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ بے بسی سے اپنے مرنے کا نظارہ کرتا رہے۔"

میرا آہنی پنجہ اُسی مخصوص مقام کو گرفت میں لیے ہوئے تھا اور میرے گھٹنوں نے مضبوطی سے اس کی گردن کو جکڑ رکھا تھا ـــــ وہ مچلا، تڑپا، ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی

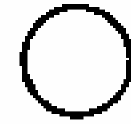


طرح ڈکرایا لیکن محض دس سیکنڈ کے مختصر وقفے میں اس کی مدافعت ختم ہو گئی۔ اس کی سانوں کا تانا بانا اکھڑ گیا۔ اس میں زندگی کی رمق تک باقی نہیں رہی تھی۔ اس کی پھیلی اور پھٹی ہوئی آنکھوں میں خوف اور حیرت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

میرے سامنے اس ویپاٹر کی لاش پڑی تھی جس نے اب تک جانے کتنے بے گناہ انسانوں کا خون چوسا تھا اور صرف دس سیکنڈ میں لقمۂ اجل بن گیا تھا۔

عثمان کو کیا کرایا شکار تو ضرور میسر آگیا تھا لیکن اس کا حریف تربیت یافتہ گوریلا تھا۔ اس نے بمشکل چند سیکنڈ کے بعد ہی عثمان کی برتری ختم کر دی تھی اور جب مَیں امیت سرکار سے فارغ ہو کر پلٹا تو وہ عثمان پر بیٹھا اسٹین گن سنبھالنے کی فکر میں تھا۔

"ـــــ کسی بھی لمحے کسی کی نظر بھی ہم پر پڑ سکتی ہے،" اور بنا بنایا کھیل بگاڑنے کا خطرہ مول لینے کے لیے مَیں تیار نہیں تھا۔ سوچوں سے زیادہ باعمل ہونے کا جذبہ میرے رگ و پے میں سرایت کر گیا ـــــ مَیں اٹھا، جھپٹا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کی گردن پر ایک خاص زاویے سے جمائے وہ بغیر آواز نکالے ڈھیر ہو گیا۔ عثمان نے جھٹک کر لاش سے نجات حاصل کی۔ مَیں نے اسٹین گن اٹھانے کی زحمت بھی نہ کی اور حیرت زدہ عثمان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف دوڑ لگا دی، کیونکہ ایک شنٹنگ کرتے انجن سے باہر لٹکتی گردن نے اس ڈرامے کا آخری منظر دیکھ لیا تھا جب تک اس کی حیرت زدہ نگاہیں وہاں سے ہٹتیں یا اس کے گلے میں اٹکی چیخ باہر نکلتی، ہم اس کی دسترس سے باہر ہو چکے تھے۔



وہاں کھڑی مختلف گاڑیوں کے ڈبوں میں ہم ایک طرف سے داخل ہوتے اور دوسری طرف نکل جاتے لیکن گاڑیوں کا یہ سلسلہ شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوتا جا رہا تھا میری مقدور بھر کوشش یہی تھی کہ ہم سے افراتفری کا مظاہرہ نہ ہونے پائے ہم کسی کو خود پر شک کرنے کا موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ہماری رفتار تیز ضرور تھی لیکن یہ بالکل ویسی ہی تیزی تھی جس کا

مظاہرہ کلکتہ کی سڑکوں یا ریلوے پلیٹ فارموں پر دفتر پہنچنے والے کیا کرتے تھے ——— ہم بھاگ نہیں رہے تھے تیز رفتاری سے چل رہے تھے۔

عثمان نے میرے ہاتھوں، لمحوں میں ——— ان کی موت کا نظّارا کیا تھا۔ میرا یہ روپ اس کے لیے اجنبی تو تھا نہیں۔ میری خصوصی اہلیت کا اُسے بخوبی اندازہ تھا لیکن خالی ہاتھوں ابھی تک اس نے کسی کو کسی کا خون کرتے نہیں دیکھا تھا۔ پھر جس طرح ہم موت کے آہنی شکنجے سے نکل کر موت کو شکست دے کر بھاگے تھے، وہ اس کے لیے ایک حیرت انگیز تجربہ ہی نہیں معجزہ تھا اور ایسے معجزے کا انکشاف اس پر پہلی مرتبہ ہُوا تھا۔

فوج کی کسی گشتی پارٹی کے ساتھ دشمن پر گھات لگانا، ٹھائیں ٹھائیں کرنا یا ڈائنامیٹ لگا کر کسی پُل کو اڑا دینا اور بات ہے اور کسی کمانڈو کے ساتھ خالی ہاتھوں کسی کی جان نکلتے دیکھنا اور بات۔ وہ کچھ کھویا کھویا سا نظر آتا تھا۔ ابھی تک اُس نے خود کو صورتِ حال سے ہم آہنگ نہیں کیا تھا۔

"کہاں چلے گئے عثمان بھائی؟" مَیں نے ریلوے لائن عبور کرتے ہُوئے اسے حالات کے طلسم سے نکالنا چاہا۔

"اوہ ——— کہیں نہیں۔" اس نے چلتے چلتے جواب دیا۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ زبردستی اس نے ہونٹوں پر چپکا رکھی تھی۔

"ویسے تو سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟" مَیں نے اس کے کندھے کو ٹٹولا۔

"سب اچھا ———" اس نے ہماری ایک مخصوص اصطلاح مسکراتے ہُوئے اپنائی۔ شاید اس نے اپنی بزدلی کو محسوس کر لیا تھا اور اسی طرح کے دو چار ہلکے پھلکے جملوں کا تبادلہ کر کے ہم نے ماحول کو کسی حد تک غیر سنجیدہ کر لیا تھا۔

اب ہم ریلوے اسٹیشن کے عوام سے بھرے پڑے ایک پلیٹ فارم پر پہنچ چکے تھے۔ جہاں ریلوے شیڈ کے دوسری طرف دو لاشوں کی موجودگی کی اطلاع نے خاصی سنسنی پھیلا رکھی



تھی ——— ایسے قتل یہاں روزانہ کا معمول ہیں لیکن ایک سٹین گن اور پستول کی موجودگی میں ان کا بغیر گولی کے مر جانا لوگوں کی سمجھ سے باہر تھا۔

"پاکستانی گُس پیٹھیوں کی حرکت ہے۔"

"لاشیں رات کی وہیں دھری تھیں۔"

"حملہ آور ابھی یہیں موجود ہیں۔"

مختلف لوگ، مختلف اندازے اور مختلف باتیں ——— !!

ہماری وہاں موجودگی کے دوران ہی ایک ریلوے ملازم ہانپتا کانپتا وہاں آ گیا۔ لوگ، کسی نئے انکشاف کی توقع میں اس طرف لپکے۔

"ابھی مرے ہیں ——— ابھی تھوڑی دیر پہلے، ہم نے خود انھیں مرتے دیکھا ہے ——— دو تھے وہ ——— انھوں نے گلا دبا کر انھیں مار ڈالا" ——— اور اس کے ساتھ ہی خوف کی ایک نئی لہر لوگوں میں دوڑ گئی۔

"مَیں نہ کہتا تھا کہ قتل ابھی ہُوئے ہیں" ——— ایک کونے سے آواز آئی۔

"قاتل یہیں موجود ہیں کہیں نہیں جا سکتے" ——— ایک دوسرے مہاشے جی نے شوشہ چھوڑا۔

"مرنے والے فوج کے آدمی ہیں" ——— اسی ریلوے ملازم نے دوبارہ اعلان کیا اور اس اعلان کے ساتھ ہی وہاں افراتفری پھیل گئی۔ سب کی زبان پر ایک ہی تکرار تھی "پاکستانی کمانڈو آ گئے ——— پاکستانی کمانڈو آ گئے ——— !!"

"فوج کے آدمیوں کو تو ظاہر ہے دوسری فوج کے آدمی ہی مار سکتے تھے" لوگ۔

"ہرے اوم، ہرے اوم ——— رام رام۔ واہگورو ——— ہے کالی مائی" اور نہ جانے کیا کیا اناپ شناپ پکارتے وہاں سے غائب ہو رہے تھے۔

پلیٹ فارم کی رونق گھٹتی جا رہی تھی ——— !

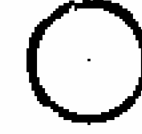
ہم ایک کونے میں لگے ٹیلی فون بوتھ کے سامنے کھڑے بے چینی سے اپنی باری کے

منتظر تھے ـــــ مجھے پہلی فرصت ہی میں یہ اطلاع "سیف ہاؤس" کو دینی تھی۔

ـــــ دشمن کے متعلق ہمارے اندازے بالکل غلط ثابت ہوئے تھے۔ وہ ہماری توقعات سے بڑھ کر چالاک نکلے انھوں نے پہلے ہی مرحلے میں ہم پہ ہاتھ ڈالنے کی بجائے ہمارا تعاقب کر کے پورے گینگ کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ عثمان تو براہِ راست اُن سے منسلک تھا اور اس کے ہاتھ سے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن مَیں غائب ہو کر کہاں چلا گیا ؟ اسی حقیقت کا سراغ لگانے کے لیے وہ بے چین تھے۔ مجھے یہ تو علم تھا کہ جس طرح چکّر دے دے کر مَیں عثمان کو سیف ہاؤس تک لے آیا تھا۔ بڑے سے بڑا سیکورٹی والا بھی اگر میرے تعاقب میں تھا تو اس نے "ڈاج" کھا لیا ہو گا، لیکن ایسا رسک لیا ہی کیوں جائے ؟

"نئے سرے سے منصوبہ بندی اور اپنے ٹھکانوں کا خاتمہ تو قابل برداشت ہے لیکن یہ بات قابلِ برداشت نہیں کہ دشمن کو ہم پر شک ہو جائے اور ہماری کسی غلطی کی وجہ سے ہمارا ایک ایجنٹ بھی اس کے ہتھے چڑھ جائے ـــــ اس طرح بہت سے لوگ بغیر کچھ کیے ضائع ہو جائیں گے" ٹریننگ کا یہ سبق کھلی کتاب کی طرح میرے سامنے تھا۔

خدا خدا کر کے ہماری باری آئی۔ مَیں نے نمبر گھمایا اور نمبر ملتے ہی "کورڈ ورڈ" دہرا دیا، دوسری طرف سے بھی جواب وصول ہوا اور فون کریڈل میں لٹکا کر میں باہر نکل آیا ـــــ دوسری طرف میرے ساتھی حرکت میں آ چکے تھے۔



کلکتہ کی مثال اس سمندر جیسی ہے جس میں دُنیا بھر کے ندی نالوں کا پانی آ کر اکٹھا ہوتا ہو ـــــ یہاں بھارت ہی نہیں، دُنیا بھر میں پائے جانے والے تمام نسلوں کے لوگ موجود ہیں۔ مقامی اور غیر مقامی کی تمیز یہاں مشکل ہے۔ بھارتی عوام میں سے غیر مقامیوں میں سب سے نمایاں پنجابی ہیں اور وہ بھی پنجابی سکھ ـــــ ! جن کا روپ مَیں نے دھار رکھا تھا۔

کلکتہ کی سیکورٹی کے متعلق مجھے کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ مجھے علم تھا کہ اس وقت تک اسٹیشن کیا اس کے ارد گرد کے تمام علاقے میں، چپے چپے پر ان لوگوں کی نظر ہو گی ـــــ اگر "مقتولین" کسی باقاعدہ منصوبے کے تحت ہمارا پیچھا کر رہے تھے تو اُن کی آمد و رفت کا باقاعدہ ریکارڈ وہاں موجود ہو گا اور ان کے ساتھیوں کو بخوبی علم ہو گا کہ وہ کن لوگوں کا تعاقب کر رہے تھے ! ۔ اس صورت میں سب سے پہلے انھیں ہم دونوں پر شبہ ہوتا۔ بھارتی انٹیلی جنس "را" RAW یہاں سرگرم عمل تھی ان کے افسران کے۔ جی۔ بی کے تربیت یافتہ تھے اور جدید ترین آلات جاسوسی سے آراستہ۔ ان کے لیے کسی کلُو کا حاصل کرنا بہت مشکل نہیں ہوتا اور ایک مرتبہ اگر کوئی معمولی سا کلُو ان کے ہاتھ لگ جائے تو وہ بڑی تیزی سے حرکت میں آ جاتے ہیں۔

امیت سرکار جیسے بین الاقوامی غنڈے کی براہِ راست نگرانی "را" کر رہی تھی اور اس کی سرگرمیوں کا ریکارڈ بھی وہیں محفوظ تھا۔

اگر پولیس لاشوں تک پہنچ چکی تھی تو اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اب انٹیلی جنس والے ہم دونوں کا کھوج لگا رہے تھے ! مَیں نے اپنا حُلیہ ڈاڑھی بڑھا کر سکھوں کی طرح پگڑی باندھ کر کافی حد تک تبدیل کر لیا تھا لیکن عثمان جس روپ میں گھر سے نکلا تھا اسی روپ میں ابھی تک موجود تھا اور اس کے پہچان لیے جانے کا خطرہ بھی اس کے ساتھ ہی منڈلا رہا تھا۔

اب مسئلہ فی الحال یہاں سے غائب ہونے کا اور وہ بھی اس صورت میں جب کہ چاروں طرف سیکورٹی والے شکاری کتوں کی طرح ہماری بُو سونگھتے پھر رہے تھے ! مجھ سے پہلے عثمان کے ذہن میں اس وسوسے نے سر اٹھایا جس کا اظہار کرتے وقت فرار کی راہ بھی اُس نے ساتھ ہی بتا دی۔

ہم اس وقت لوگوں کے بیچوں بیچ راستہ بناتے ایک سے دوسرے پلیٹ فارم پر جا رہے تھے۔ عثمان نے چائے کے ایک اسٹال کے نزدیک مجھے رکنے کا اشارہ کیا اور ہم وہاں پہلے سے تیار شدہ چائے کی ایک ایک پیالی پکڑ کر ایک کونے میں جا کھڑے ہوئے۔

"علی بھائی"۔۔۔۔ اُس نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگائے لگائے سرگوشی کی۔

"ہوں" مَیں نے بھی اسی ایکشن میں جواب دیا۔

"میرے خیال میں ہمارا اکٹھا رہنا دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔"

"کیوں بھلا؟" محسوس تو مَیں بھی کر رہا تھا لیکن اس کے خیالات جاننے کے لیے مَیں اُس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"وہ لوگ شروع سے اب تک میرے پیچھے ہیں۔ تم درمیان سے غائب ہو گئے تھے۔ میرے خیال میں مجھے انھوں نے اتنی مہلت بھی اسی لیے دی تھی کہ جب مَیں تم سے ملوں، وہ ہم دونوں پر ہاتھ ڈال سکیں امیت اور اس کا ساتھی میرا تعاقب کرتے یہاں تک آئے تھے شاید اس کے ساتھی نے فائر بھی ہمیں دھمکانے کے لیے کیا تھا اگر مارنا مقصود ہوتا تو وہ مجھے وہیں مار دیتے۔۔۔۔ اب اس حادثے کے بعد تو وہ ہمارے خون کے پیاسے ہو رہے ہوں گے۔ میری انھیں اچھی طرح پہچان ہے اور تمھیں شاید نہ پہچان پائیں۔۔۔۔ وہ لوگ یہاں ضرور موجود ہوں گے۔ تمھارا میرے ساتھ رہنا اب ٹھیک نہیں۔ ایک جان کا دو جانوں سے جانا بہرحال احسن ہے"۔۔۔۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو رہا۔

زندگی بڑی پیاری شے ہے۔ یہ کوئی کتابی فقرہ یا کوئی ایسی تحریر نہیں جو لبسوں یا ڈرکول کی پیشانی پر سجا دی جائے بلکہ فطری تقاضا ہے وہ بندریا جس نے اپنے پاؤں جلنے پر بچّوں کو پاؤں تلے لے لیا تھا کوئی بہت ظالم ماں نہیں تھی بلکہ جاندار کی اپنے آپ سے ازلی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو گئی تھی۔

عثمان کی بات بظاہر تو بڑی معقول تھی؛ اگر مرنا ہی تھا تو وہ اکیلا مرنے میں کیوں خوامخواہ اُس کے ساتھ مروں؛ لیکن ایک مرتے ہوئے انسان سے الگ ہو جانا میری غیرت کے منافی ہی نہیں بلکہ تربیت کے بھی سراسر برعکس تھا۔ مَیں نے اپنی فوج کے مختلف رجمنٹل ہیڈکوارٹرز میں گونجتی وہ کہانیاں سنی ہی نہیں محسوس بھی کی تھیں کہ ایک جوان کی صرف لاش



حاصل کرنے کے لیے پانچ پانچ جوان شہید ہو گئے تھے۔ میرا تعلق کسی روایتی فوج سے نہیں تھا بلکہ ایک خاص قومی نہج پر میری تربیت کی گئی تھی۔

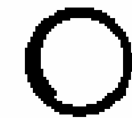
"ہم جیتے بھی اکٹھے ہی ہیں اور مرتے بھی اکٹھے"۔۔۔۔! مَیں نے اس جیالے کو ابھی فراموش نہیں کیا تھا۔ جس نے پہلی ہی مہم میں یہ کہہ کر میرا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ:

"صاحب فور دل ہمارا سنگی ہے ہم نے ہر مشکل میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے۔
ہم نے ساری زندگی ایک دوجے کا سنگ نبھایا ہے اب موت کی شاہراہ پر وہ
اکیلا کیسا جائے گا۔ ہم اپنے گاؤں والوں کو کیا منہ دکھائیں گے سر؟ روزِ قیامت
اپنے سنگی سے آنکھیں کیسے ملائیں گے؟"

سرِ فلک پہاڑوں کے درمیان جنم لینے والے اس پتھر دل اور ان پڑھ پٹھان نے مجھے ایثار کی تربیت جان دے کر دی تھی، مَیں نے اس کا سبق بھلایا نہیں تھا۔ ایسے سبق ہم بھلایا نہیں کرتے۔۔۔۔ سچے جذبوں میں گندھی ہوئی قربانیاں فراموش کی ہی نہیں جا سکتیں۔

"دیہ پورب پچھم کا سنگ ہے عثمان بھائی! ہم ہزار میل کی مسافت طے کر کے ایک دوسرے میں جذب ہوئے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت خطرے کا کوئی احساس محبت کی اس دیوار کو نہیں توڑ سکتا۔۔۔۔" مَیں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف جھکتے ہوئے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔

"علی بھائی"۔۔۔۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ جذبات کی شدت سے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔



چائے کی پیالیاں رکھ کر ہم وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ مَیں نے تربیت کے مطابق اُسے اپنے آگے رکھا اور خود اس کا تعاقب کرنے لگا۔ عثمان ہجوم کے بیچوں بیچ خود کو ایک طرح سے چھپائے ہوئے چل رہا تھا لیکن کب تک؟ آخر ان لوگوں نے بھی کچّی گولیاں نہیں کھیلی

تھیں یوں بھی میں کبھی خوش فہمی کا شکار نہیں رہا۔

ہم دونوں پلیٹ فارم کی سیڑھیاں چڑھ کر اُتر رہے تھے اس راستے پر مسافروں کی آمدورفت کچھ زیادہ نہیں تھی۔ایک جگہ سیڑھیوں کے موڑ پر ایک "ذات شریف" گہری نظروں سے آنے جانے والوں کا جائزہ لے رہے تھے۔خدا جانے اس نے عثمان کے چہرے پر بکھری بوکھلاہٹ سے کچھ اندازہ لگایا یا وہ ان لوگوں میں شامل رہا تھا جو عثمان کے حلیئے سے آشنائی رکھتا تھا کہ جیسے ہی عثمان اس کے قریب سے گزرا ؛ اے کدھر جاتا ہے ٹھیرو !" کہہ کر وہ عثمان کی طرف بڑھا۔

عثمان کے پاؤں تو وہیں زمین میں گڑ گئے جبکہ میرا ردِ عمل ذرا مختلف تھا۔میری رفتار پہلے سے کچھ بڑھ گئی اور جیسے ہی میں اس کے آگے سے گزرا، دائیں بازو کی زوردار ضرب میں نے اس کے پیٹ میں لگائی۔ دوسرے سرے سے اوپر آنے والے اکا دکا مسافروں نے یہی سمجھا تھا کہ ہم دونوں ٹکرا گئے ہیں۔اچانک حملے نے اسے بوکھلا دیا اور وہ سیڑھیوں سے پھسلتا اوپر چڑھنے والوں کے قدموں میں ڈھک گیا۔عثمان کے لیے یہ حرکت مضروب سے بھی زیادہ خلافِ توقع تھی، ابھی تک اُسے اپنی آنکھوں پر شاید یقین نہیں آ رہا تھا۔

"کیا مسخری کرتا ہے بابا !" میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر آگے کی سمت دھکیلا اور پھر اسے اپنے ساتھ ہی لیتا چلا گیا۔

یہاں کسی کو اتنی مہلت نصیب نہیں تھی کہ وہ رُک کر گرنے والے کا احوال دریافت کرتا ایک تو یوں بھی کلکتہ کی مرتی مارتی مخلوق صرف اپنے کام سے کام رکھنے کی عادی ہے۔ دوسرے "پاکستانی کمانڈوز کے ہاتھوں ہونے والے قتل"ــــــ اسٹیشن پر ویسے ہی سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔اسے سنبھل کر چلّانے یا لوگوں کو ہماری اصلیّت بتانے میں جتنا وقت درکار تھا وہ کوئی بہت زیادہ وقت نہیں لیکن اتنا کم بھی نہیں کہ ہم اُس سے فائدہ نہ اٹھا پاتے، بجائے سیدھے راستے چلنے کے ہم وہیں سے بائیں طرف کٹے اور سیڑھیوں کے پھیلے اس

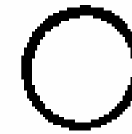


طلسم ہوشربا میں کبھی دائیں کبھی بائیں چڑھتے اترتے بالآخر ایک دوسرے پلیٹ فارم پہ اتر گئے جہاں مختلف "بھاشاؤں" میں ایک ہی فقرے کی تکرار گونج رہی تھی۔

"یہاں پاکستانی کمانڈوز موجود ہیں۔"

"وہ ابھی ابھی پرلے پلیٹ فارم سے بھاگ کر نکل گئے ہیں" گویا اس 'ذاتِ شریف' نے چیخ چیخ کر لوگوں کو ہماری بابت آگاہی دے دی تھی۔

ہماری حالت اب اس شیر جیسی تھی جو ہانکا کرنے والوں کے درمیان پھنس جائے اور جس کے گرد اگرد گھیرا تنگ سے تنگ ہوتا جا رہا ہو۔ ہماری پہچان اگر کسی کو یہاں ہو جاتی تب تو بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ ہم لوگ ایک بڑے ہجوم میں گھرے تھے لیکن لوگوں میں پھیلی افراتفری ہی واحد امید تھی جس سے ہمیں فائدہ اٹھانا تھا۔



میں نے بجائے اس انبوہِ کثیر میں پھنسنے کے عثمان کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا اور ہم سامنے کھڑی ٹرین کے ایک ڈبے میں جا گھسے ــــــ یہ کوئی پسنجر ٹرین تھی جس میں زیادہ رش نہیں تھا۔

ــــــ عثمان واقعی اس خطرناک صورتحال سے بوکھلا گیا تھا اور اپنی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ اس نے ٹرین میں سوار ہوتے ہوئے بھی کیا۔ جب وہ دروازے میں گھستے ہی میری طرف پلٹا : "یہاں تو پہلے ہی کافی لوگ ہیں" اس نے پلٹ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔حالانکہ ہمارے پلان کے مطابق ہمیں ایک دوسرے سے آشنائی ظاہر نہیں کرنی تھی میرے پیچھے بھی گاڑی میں سوار ہونے والے دو تین بنگالی کھڑے تھے۔چند ثانیے کو تو میری سمجھ میں بھی نہ آیا کہ کیا کروں لیکن میرے اوسان بحال تھے۔

"کیا بولتا ہے بابا ! سالا اتنا لمبا سفر ایسا تو کھڑے سے رہا، ٹھیک ہے دوسرے ڈبے میں چلو" میں نے اُسے آنکھ کے اشارے سے واپس آنے کو کہا۔ دوسرے ڈبے میں

داخل ہونے سے پہلے اس کا کندھا دبا کر مَیں نے دو تین مرتبہ تھپکا اور تسلی دی "گھبرانے کی کوئی بات نہیں !"

شاید عثمان کو اپنی بوکھلاہٹ کا احساس ہونے لگا تھا اس نے بڑے عجیب سے انداز سے سر کو ہلا کر کندھے جھٹکے جیسے یہ کوئی نفسیاتی طریقہ ہو اوسان بحال کرنے کا ۔ وہ مسکرانے لگا ۔

دوسرے ڈبے میں اپنی "برادری" کے کچھ لوگوں کو دیکھ کر خواہ مخواہ میری باچھیں کھل گئیں، مَیں نے عثمان کو اپنے سامنے کھڑکی سے لگی اکیلی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اس کے دائیں طرف برتھ پر بیٹھے سرداروں کی طرف بڑھ گیا۔

"سری واہے گورو جی کا خالصہ۔ سری واہے گورو جی کی فتح ۔" مَیں نے انھیں مخاطب کیا ۔

جواب میں سرداروں نے بھی "فتح" بلائی۔

ہم لوگ ایک دوسرے کی خیر خیریت جاننے لگے ۔ وقت گزاری کا قدرت نے بڑا بہترین بہانہ مہیا کر دیا تھا. اس طرح بے تکلفی سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر کسی کو مجھ پر شک کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ عثمان کی البتہ اور بات تھی لیکن اُس نے بھی ہمت پکڑ لی تھی اور وہ کھڑکی کے سامنے اس طرح آڑا ترچھا ہو کر بیٹھا تھا کہ نہ تو باہر سے دیکھنے پر اس پر صحیح طور سے نظر پڑتی تھی نہ ہی اندر سے، البتہ وہ خود اندر اور باہر ہونے والی صورتِ حال کا اندازہ بخوبی لگا سکتا تھا۔

خیریت گزری کہ گاڑی کی روانگی تک وہاں کوئی چیکنگ پارٹی نہ آئی۔ پھر وسل بجی، جھنڈی لہرائی اور گاڑی نے رینگنا شروع کیا۔

——— جیسے جیسے گاڑی پلیٹ فارم سے نکل رہی تھی ہماری جان میں جان آ رہی تھی۔ ہم نے اس سے سفر تو کرنا نہیں تھا بس ایک حفاظتی اقدام کے تحت اس میں جا گھسے



تھے اگر ابھی تک سیکورٹی والے یہاں نہیں پہنچے تھے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ لوگ بے خبر تھے یا انھوں نے گاڑیوں میں تاک جھانک کرنا مناسب ہی نہ جانا ہو۔

میری چھٹی حس نے اس پلیٹ فارم پر چکراتے کئی مشتبہ چہروں کی اب تک نشاندہی کر دی تھی ——— ابھی تک ہمارا ان کے ہاتھوں محفوظ رہنا کسی معجزے سے ہرگز کم نہ تھا۔

"کیا شبھ نام ہے اپنا؟" کونے میں بیٹھے ایک بوڑھے سردار کو یکدم جیسے خیال آیا، حالانکہ ہم نے اب تک ایک دوسرے کے گاؤں اور ضلع سے واقفیت حاصل کر لی تھی لیکن تھے تو نرے سکھ! عقل ذرا دیر سے آئی تھی، مَیں نے انھیں بتایا تھا کہ: کلکتہ میں، مَیں نیا نیا ہی آیا ہوں ۔

"امرجیت سنگھ مہاراج جی!" میرے لہجے کے انکسار نے اسے کچھ زیادہ ہی پگھلا دیا تھا۔

"ضی آیاں نوں! (کس طرح آنا ہوا) اس نے دائیں مونچھ کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کی مدد سے بل دیتے ہوئے پوچھا۔

"بس باپو جی کچھ نہ پوچھو!" میرے لہجے میں ایک زمانے کی یاسیت جھلک رہی تھی۔

"گھبرا نہ چھیندے، بات کر۔" باپو جی نے اپنے چھیندے کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

خدا نہ کرے کبھی آپ کو مشرقی پنجاب (بھارت) کی جیل یاترا نصیب ہو، اگر کسی جیل میں ۱۰۰ قیدی ہوں تو ان میں سے کم از کم ۷۰ قتل کے ہوں گے ۔ ایک تو سکھ ویسے ہی گرم دماغ ہوتے ہیں پھر "بیساکھ میں" "واڈیوں" کے بعد جب ان کی جیب بھی گرم ہو جائے تو ان کا اپنے آپ میں رہنا ناممکن ہو جاتا ہے ——— ہر سال بیساکھی پر پنجاب بھر میں قتل و غارت گری کا ایک طوفان ضرور اٹھتا ہے اور وہاں کسی کو محض اس بات پر ہی قتل کر دیا جاتا ہے کہ:

"ساڈے کھیتاں کولوں ہنگورا مار کے لنگیا سی۔" (ہمارے کھیتوں کے قریب سے

کھلتے ہوئے گزرا تھا)

"دشمنی مہاراج جی! میں اکیلا ہی بچا ہوں ورنہ تو سارا کنبہ ہی . . . ." اور میری آنکھیں چھلک پڑیں۔

"ہش کے او ئے پتر! امن رکھ۔ واہگورو بھلی کرے گا"۔ اس نے اُٹھ کر مجھے تھپکی دی۔ میں نے اپنی قمیص کی آستین سے آنسو پونچھے۔ عثمان ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے میری سمت دیکھ رہا تھا پھر اس نے یوں گردن ہلائی جیسے اسے سارے معاملے کی سمجھ آگئی ہو۔

"میرا نام آتما سنگھ ہے پتر! میرے ہوتے ہوئے نہ کوئی یہاں تجھے کچھ کہہ سکتا ہے نہ وہاں تیرا بال بیکا ہو سکتا ہے۔" اس نے بڑے اعتماد سے یہ بات کہی تھی اور جب وہ بات کرتا تو اس کے ہمراہی بڑے مودب ہو کر اس کی گفتگو سننے لگتے۔ کیا مجال جو کوئی اس کی بات میں مداخلت کرے۔

"دھنواد باپو جی" میں نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

پھر وہ مجھے اپنا ایڈریس سمجھانے لگا: وہ کلکتہ کا مشہور ٹرانسپورٹر تھا۔ سورج گڈز ٹرانسپورٹ کا مالک! اس کے بیس کے قریب تو ذاتی ٹرک تھے۔

اور اتنا بڑا کروڑ پتی آدمی پسنجر ٹرین سے آخر کہاں جا رہا ہے؟ ــــــ یہ تھا وہ پہلا سوال جس نے میرے ذہن میں کلبلانا شروع کیا۔

"مہاراج نے سیالدہ تک جانا تھا۔ ہم نے کہا گاڑی سے ہی چلتے ہیں۔" اس کے ایک ساتھی نے شاید میرے اندر جاگنے والے وسوسوں کو بھانپ لیا تھا۔

دورانِ گفتگو جب میں نے عثمان کی طرف نظر اٹھائی تو اس نے خطرے کا اشارہ کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھ گیا۔ میں بے بس اپنی جگہ سے چپکا رہا؛ "جاؤں کہ نہ جاؤں؟" عجیب مخمصے نے آگھیرا تھا۔

"چنگا باپو جی! مجھے ذرا ایک واقف کار کو ایک دو ڈبوں میں تلاش کرنا ہے، جانے

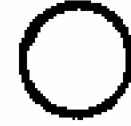


وہ کہاں چلا گیا۔" کہتے ہوئے میں اُٹھ کھڑا ہوا ــــ اسے اکیلا چھوڑنا میری غیرت کو گوارا نہ تھا۔

"پتر آئیں ضرور (بیٹا آنا ضرور)" میرے اٹھتے اٹھتے سردار آتما سنگھ نے کہہ دیا۔

"ست سری اکال جی" میں نمسکار کر کے آگے کھسک گیا۔

"ست سری اکال" انھوں نے کورس میں جواب دیا۔



عثمان ڈبے کے ٹائیلٹ سے لگا کھڑا تھا گاڑی ابھی اسٹیشن کی حدود میں تھی مختلف کانٹے بدل کر اسے مختلف لائنوں پر ڈالنے کا عمل کچھ زیادہ ہی سست تھا۔ "پچھلے تیسرے ڈبے میں" عثمان نے منہ دوسری طرف کیے ہوئے مختصر سی بات کر کے مجھے تفصیلی حالات سے آگاہ کر دیا۔ جس ڈبے کے متعلق اس نے کہا تھا اس میں مکتی باہنی کے آدمی غالباً اسی کی تلاش میں داخل ہوئے تھے بڑے مکار لوگ تھے ان کا خیال تھا ٹرین کو محفوظ جان کر ہم اس میں داخل ہوں گے اور جب کوئی وہاں ہمیں چیک کرنے بھی نہیں آئے گا، تو اطمینان سے بیٹھے رہیں گے اور اسی اطمینان کی حالت میں وہ اچانک ہمیں دبوچ لیں گے۔

"قوتِ فیصلہ جتنی مضبوط ہو گی اتنے ہی تم کامیاب رہو گے۔ فوری فیصلہ اور بروقت عمل اسی میں تمہاری نجات ہے۔" میرے خضرِ راہ نے نہاں خانۂ ذہن سے سر اٹھایا۔

ٹرین کی رفتار اتنی کم تھی کہ لوگ اس میں باآسانی چڑھ اُتر رہے تھے میں نے بھی عثمان کا بازو پکڑ کر اسے چلتی ٹرین سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس کے پیچھے اتر گیا۔ یہاں اکا دکا لوگ ہی آ جا رہے تھے۔ زیادہ تر ریلوے کے ملازمین ہی تھے۔ ذرا آگے نظر دوڑائی تو دل جیسے دھک سے رہ گیا۔ تھوڑی دُور پولیس کے جوانوں نے ریلوے لائن کو دونوں اطراف سے گھیر رکھا تھا۔ اب ٹرین کے آہستہ ہونے کا مطلب

بھی بخوبی سمجھ میں آگیا وہ لوگ اچانک "ریڈ" کر کے اسے "چیک" کرنا چاہتے تھے اس طرح فرار کے ایک فیصد امکانات بھی باقی نہیں رہتے تھے۔

دو ملکی باہنی والوں کا اچانک نظر آجانا تائیدِ غیبی تھا اور اس امر کا اشارہ بھی کہ:
وہ ذاتِ برحق ہماری مکمل پشت پناہی کر رہی ہے! اور یہ اعتماد جس کسی کو حاصل ہو جائے کہ ——— اس کی مدد پر کائنات کا خدا موجود ہے، اس کی توانائیوں کا عالم کیا ہوگا؟
اس کے حوصلے آکاش کی وسعتوں کو نہ سمیٹنے لگیں گے؟

میں نے وہاں ایک طرف دیوار کی اوٹ میں عثمان کو ٹھہرنے کا اشارہ کیا! اپنے بائیں ہاتھ "بیت الخلا" کا بورڈ پڑھ کر جس کے ساتھ ہی "صرف ریلوے ملازمین کے لیے" بھی لکھا تھا میرے ذہن میں ایک شاندار منصوبہ ترتیب پا گیا۔

——— ایک بد قسمت ریلوے فائرمین کو میں نے اس طرف جاتے دیکھا تھا اردگرد اور کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا ——— میں بے دھڑک اس کے تعاقب میں بڑھ گیا۔

"اے کدھر جاتا ہے تو؟" اس نے ایک سکھ کو دیکھ کر غصے سے کہا۔

اپنی بات کا جواب اسے بھرپور دو ہتھڑ کی شکل میں ملا جو میں نے اس کے سینے پر مارا تھا ——— ایک تو کلکتہ کی پیدائش اور پھر ریلوے فائرمین جس کے پھیپھڑے پہلے ہی دھواں نگل نگل کر سیاہ ہو رہے تھے، بے چارے کو "ہائے" کہنے کی فرصت نصیب نہ ہوئی۔

——— بمشکل ایک منٹ بعد اس کا جسم کپڑوں سے بے نیاز ہو چکا تھا صرف ایک زیر جامہ اس کے تنِ نازک پر باقی رہ گیا تھا میں نے بڑے معذرتی جذبات سے سو روپے کا ایک نوٹ اس کے زیر جامہ میں پھنسایا اور اسے ایک لیٹرین میں ڈال کر عثمان کو اشارہ کیا۔



——— اسے قریب بلا کر میں نے فوراً کپڑے تبدیل کرنے کو کہا۔ چند لمحوں تک تو وہ حیرت سے میری طرف دیکھتا رہ گیا۔ پھر جیسے بات اس کے ذہن نے ہضم کر لی "واہ علی بھائی واہ!" اس نے بے اختیار مجھے داد دی اور دوسرے ہی لمحے اپنے کام میں جت گیا۔ میں نے عثمان کے کپڑے بھی اسی بیت الخلا میں پھینک دیے جہاں ہمارا شکار استراحت فرما رہا تھا۔

اب عثمان ریلوے فائرمین کی وردی میں ملبوس تھا اور میں ——— ! میں نے پگڑی اتار کر اسے پٹکے کی شکل میں کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ شکار کے جیب سے برآمد ہونے والی چار مینار سگریٹ کی ڈبی سے ایک سگریٹ نکال کر میں نے سلگا لیا۔ دوسرا سگریٹ میرے کان میں پھنسا تھا اور بال بکھر کر ماتھے پہ آ گئے تھے۔ میں شکل سے چھٹا ہوا غنڈہ دکھائی دے رہا تھا ——— پنجابی غنڈا!

ہم نے بجائے اسٹیشن کی طرف مڑنے کے اب ریلوے لائن کے وسیع جال کے ایک سمت نظر آنے والی اس چھوٹی سی دیوار کا رخ کیا جس کے پرلی طرف اسٹیشن کی حد ختم ہو جاتی تھی۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ خوش گپیاں کرتے چلے جا رہے تھے، بادی النظر میں یہی دکھائی دیتا تھا کہ میں اس ریلوے ملازم کا کوئی دوست ہوں اور ہم دونوں مل کر کوئی غلط قسم کا دھندا ضرور کرتے ہیں ورنہ ایک ریلوے فائرمین کی ایک پنجابی بدمعاش سے دوستی چہ معنی دارد؟

دیوار کے ساتھ ساتھ واچ مین کھڑے تھے کیونکہ یہ ورکشاپ کا علاقہ تھا اور لوہا چوروں کی جنت۔ لیکن میرا قد کاٹھ اور چال ڈھال دیکھ کر کسی نے ہمیں روکنے یا پوچھنے کی جرأت نہ کی اور ہم دونوں آسانی سے دیوار پھلانگ گئے۔

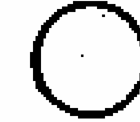
یہاں خاصی گہما گہمی تھی اور اسٹیشن کے اندر والی بات ابھی تک یہاں نہیں پہنچی تھی۔ ہم ایک سائیکل رکشا میں بیٹھ کر قریبی بازار کی طرف مڑ گئے جہاں ریڈی میڈ کپڑوں کی دکانیں بھی موجود تھیں۔ سائیکل رکشا میں بیٹھے بیٹھے میں نے اپنا حلیہ درست کیا اور دوبارہ معزز سکھ

کا روپ دھار لیا۔

—— بازار کے ایک کونے میں بنے ٹی اسٹال پر عثمان کو بٹھا کر میں اندر داخل ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد میری واپسی ایک بہترین ریڈی میڈ سوٹ کے ساتھ ہوئی۔

—— ہم نے ایک تفریح گاہ کا راستہ لیا جہاں CHANGE کرنے کے بعد عثمان جب میرے سامنے آیا تو وہ ریلوے فائرمین کی بجائے ایک معزز اور امیر قسم کا بنگالی نظر آ رہا تھا۔ اس کے بدن پر بہترین سوٹ اور آنکھوں پر شاندار عینک جمی تھی۔ میری گھڑی اس کی کلائی پر منتقل ہوچکی تھی اور شیو کروا کر اُس نے ڈاڑھی سے بھی نجات پالی تھی۔

وہ کلین شیو ایک بزنس مین نظر آ رہا تھا۔ بریف کیس اُس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا جس میں ایک بڑے بینک کی چیک بُک اور بھارتی کرنسی موجود تھی۔ یہ چیزیں بھی میں نے اپنے پاس سے منتقل کی تھیں۔ میں نے وہاں سے دور دراز ایک مقام پر بنے اعلیٰ ہوٹل میں اسے کمرے کر قیام کرنے اور اگلی ہدایت تک وہیں رہنے کو کہا اور خود اس سے الگ ہوگیا۔ مجھے سیف ہاؤس کی فکر کھائے جا رہی تھی ——



میرا رُخ ایک پرائیویٹ ٹیلی فون بوتھ کی طرف تھا۔

—— اور جیسے ہی میں نے اپنے دوستوں سے رابطہ قائم کیا وہاں پہلے سے میرے لیے موجود پیغام مجھے مل گیا:

"نمبر ۲ پر پانچ بجے شام" ——!

اس وقت چار بج رہے تھے۔ ہماری بھاگ دوڑ کافی دیر جاری رہی تھی ——

نمبر ۲ ہماری ایک آر۔ وی (R - V) کا نام تھا اور ٹھیک پانچ بجے میں ریلوے بکنگ آفس کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں میرے دوسرے ساتھی نے مجھ سے ملنا تھا۔

—— ہم دونوں نے ایک دوسرے کو مخصوص نشانات سے شناخت کرنا تھا۔



ہم شکل آشنا نہیں تھے! یہ بکنگ آفس سٹرک سے ذرا ہٹ کر عوام کی سہولت کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ میں بکنگ آفس کے برآمدے میں بنچ پر بیٹھ گیا۔ میری نظریں اس واحد دروازے کی طرف لگی تھیں جو لوگوں کی آمد و رفت کے لیے مخصوص تھا۔

بمشکل دو منٹ ہی گزرے تھے جب میں نے اپنے جیسے ایک سکھ نوجوان کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے سوٹ پہنا ہوا تھا اور شکل سے کسی یونیورسٹی کا طالب علم نظر آ رہا تھا۔ سفید شیشوں کی عینک دیکھ کر بادی النظر میں وہ کوئی گیانی قسم کا سکھ دکھائی دیتا تھا لیکن مجھے علم تھا کہ یہ شیشے ڈمی ہیں۔ اس کے داہنے ہاتھ پر پلاسٹر چڑھا تھا اور بائیں ہاتھ میں براؤن رنگ کا ایک خاص ٹریڈ مارک والا بریف کیس اس نے تھاما ہوا تھا۔

دروازے سے اندر داخل ہو کر اس نے ایک سرسری نظر وہاں بیٹھے لوگوں پر ڈالی ہماری نظریں جیسے ہی آپس میں ٹکرائیں میں وہاں سے اُٹھ کر ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ اپنے دائیں ہاتھ کو ایک مخصوص انداز سے اب تک دو تین مرتبہ سر کے گرد گھما لیا تھا۔ چند لمحوں تک وہ کن انکھیوں سے مجھے دیکھتا رہا پھر ٹہلتا ہوا میری طرف آ گیا۔

"ست سری اکال جی!" اس نے بڑے مؤدب لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

"ست سری اکال!" میں نے دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے اسے دائیں ہاتھ میں پہنی ایک خاص انگوٹھی بھی دکھا دی۔

"ٹائم کیا ہے مہاراج؟"

"جوانی کا" میں نے آہستہ سے سرگوشی کی۔

اس طرح کے دو چار جملوں کے بعد اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر خاص رنگ کا ایک رومال نکالا اور اسے خواہ مخواہ ہونٹوں پر پھیرا پھر جیب میں ڈال لیا۔ "خاصا رش ہے میرے خیال میں تھوڑی دیر بعد آئیں گے!" میں نے اس کی طرف فقرہ اُچھالا۔

"ہاں کون پاگلوں کی طرح ڈیڑھ دو گھنٹے قطار میں کھڑا رہے!" اس نے مسکراتے ہوئے

گردن ہلائی اور میرے آگے آگے چلنے لگا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کا تقریباً بیس منٹ تک تعاقب کرتے رہے اس دوران میں اُس نے مجھے خاصی گلیاں اور بازار گھما دیے تھے، جب ہم دونوں کو یقین ہو گیا کہ کوئی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا، تو پہل میں نے ہی کی کیونکہ وہ مجھ سے جونیئر تھا۔ میں نے دو چار لمبے قدم اٹھائے اور اس کے برابر جا پہنچا۔

"بس کرو یار۔ صبح سے جوتیاں گھسا رہے ہیں۔" میں نے کچھ ایسے انداز سے کہا کہ خواہ مخواہ اس کی ہنسی نکل گئی۔

"جیسی آپ کی اِچھا۔" اس نے جھکتے ہوئے کہا اور ہم قریبی ریستوران میں گھس گئے۔

صبح سے مسلسل بھاگ دوڑ نے بھوک چمکا دی تھی۔ رات کی سیاہیاں ملگجے کا چہرہ نوچنے کو تیزی سے اس کی سمت پھیل رہی تھیں۔ سڑک کنارے بجلی کے کھمبوں سے لٹکتے بلبوں کی بیمار روشنیاں جھپک جھپک کر انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ لوگوں کی آمد و رفت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

"خیریت رہی؟" میں نے بیرے کو آرڈر دیتے ہی اس سے پوچھا۔

"ایک دم خیریت۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ لوگ شاید آپ کی واپسی کے منتظر ہیں ٹھکانہ ان کی نظر میں ہے جب رات کو مایوس ہو کر وہ چھاپہ ماریں گے تو طاقتور ٹائم بم ان کا منتظر ہو گا۔"

"ویل ڈن ____ خاصے عقل مند معلوم ہوتے ہو۔" میں نے اسے تحسین بھری نظروں سے دیکھا۔

"تھینک یو سر۔" وہ انکسار سے جھک گیا۔

تازہ ہدایات اس کے ذریعے مجھے حاصل ہوئی تھیں اور اگلے پروگرام سے متعلق تفصیلات کا بھی علم ہوا تھا ____ وہ لوگ چونکہ خاصی دیر سے سرگرم عمل تھے اسی لیے مجھ سے بہت زیادہ باخبر تھے۔ انھوں نے دو تین خصوصی مقامات نوٹ کر رکھے تھے جہاں مکتی باہنی کے کرتا دھرتا اپنے پروردہ پلّوں سمیت قیام کرتے تھے یہ مقامات ایک طرح سے ان کے ہیڈ کوارٹر اور آپریشن روم تھے جہاں "را" کے بڑے بڑے جرنیل بیٹھ کر منصوبہ بندی کرتے تھے اور یہیں سے مشن بریف کر کے انھیں مشرقی پاکستان میں دھکیلا جاتا تھا ____ ہم انھیں ان کے منصوبوں سمیت نیست و نابود کرنے کا عزم رکھتے تھے۔

ہم انھیں بتانے آئے تھے کہ انھوں نے ہماری امن پسندی کا غلط مطلب لیا ہے ____ ہم صرف ریشم کی طرح نرم ہی نہیں بلکہ فولاد کی طرح سیسہ پلائی دیوار بننا بھی جانتے ہیں! کوئی زک ہم نے ابھی تک اگر اٹھائی تھی تو یہ کہ لنکا، گھر کے بھیدیوں کے ہاتھوں ڈھایا گیا تھا!! دشمن نے ہمیں اپنے محفوظ قلعوں میں بیٹھ کر للکارا تھا اور ہم اس کی للکار کا جواب دینے یہاں آئے تھے ____ اس کا چیلنج ہم نے جوانمردوں کی طرح قبول کیا تھا۔

یہ نوجوان خاصا ذہین تھا اور اپنے کام کا ماہر بھی۔ اس نے مختصر سی ملاقات میں میری آنکھیں کھول دی تھیں۔ ہمارے پیشے کا تقاضا بھی یہی تھا کہ میں اس کے متعلق کوئی جانکاری حاصل نہ کروں۔ وہ کوئی بھی تھا، تھا تو اپنا۔ جو کوئی بھی اس کا "سائیں" تھا اس نے اس کی سرپرستی کا حق ادا کر دیا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے تک وہ میرے ساتھ رہا پھر اگلے روز کا پروگرام دے کر رخصت ہو گیا۔

____ اب میرے لیے مسئلہ تھا رات گزارنے کا کہ رات کہاں بسر ہو؟ ہوٹل، سرائے، آشرم، مسافر خانہ کئی پناہ گاہیں تھیں۔ لیکن میرے ذہن نے ایک اور ہی طرف رہنمائی کی: آتما سنگھ کی طرف۔ وہ ڈیرے دار آدمی تھا اور میری کوئی ادا اُسے بھا گئی تھی پھر یہ بھی تو ممکن تھا کہ میرے ذہن نے اس کے متعلق جو نظریہ قائم کیا تھا وہ سچ ہی ثابت ہو ____ جی ہاں۔ میری چھٹی حس نے گیان حاصل کیا تھا کہ یہ شخص وہ نہیں جو ظاہری صورت میں نظر آتا ہے یہ تو کوئی غیر معمولی قسم کی چیز ہے اور اگر یہ بات سچ تھی تو قدرت نے میری ملاقات

یونہی اس سے نہیں کرائی تھی! آتما سنگھ میرے لیے ترپ کا پتا ثابت ہو سکتا تھا جسے پھینک کر ہاری ہوئی بازی جیتی جاتی ہے۔“

دم توڑتے اُجالوں کا تعاقب کرتا میں ایک ٹیکسی کے ذریعے گیانی آتما سنگھ کے ”ڈیرے“ کی طرف چل دیا۔ اس کا ڈیرہ شہر کی ماڈرن آبادی میں ایک شاندار بنگلے کی صورت میں موجود تھا۔ لیکن نظر والے بخوبی اندازہ کر لیتے تھے کہ یہ بنگلے سے زیادہ کوئی مضبوط قلعہ ہے جس کی دیواریں غیر معمولی طور پر اُونچی تھیں اور جن کے اوپر کانٹے دار لوہے کے تاروں میں یقیناً بجلی کی رو دوڑ رہی تھی۔

میں نے آبادی کے باہر ہی ایک راہگیر سے اس کا ٹھکانہ پوچھا۔ پہلے تو اس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا پھر عجیب سی نظروں سے میری سمت دیکھتے ہوئے سامنے ہی کوٹھیوں کی قطار کی طرف اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا اس بات سے بے خبر کہ میں نے اسے گھوم کر ایک نزدیکی بنگلے میں داخل ہوتے دیکھ لیا ہے میں جان بوجھ کر اسی سمت بڑھ گیا جس طرف اس نے مجھے دیکھنا چاہا تھا۔ تھوڑا آگے جا کر مجھے پھر واپس اسی طرف آنا پڑا کیونکہ وہاں سے علم ہوا تھا کہ گیانی جی کا بنگلہ تو پیچھے رہ گیا ہے۔

ابھی میں اس سے کچھ دور ہی تھا جب دو تین مخصوص وضع قطع کے غنڈوں کو میں نے اس طرف بڑھتے دیکھا۔ اپنی طرف سے انھوں نے یہی ظاہر کیا تھا جیسے وہ روزانہ کی مٹرگشت پر نکلے ہیں لیکن میں نے بنگلے کی ایک کھڑکی پر لہراتی پرچھائیاں دیکھ کر صورت حال کا اندازہ لگا لیا تھا: ”شاید گیانی جی کو میرا امتحان مقصود ہے۔“

”ابے کدھر جاتا ہے سالا!“ ـــــ ایک غنڈے نے میرے کندھے پر زوردار ہاتھ مار کر مجھے اپنی طرف مخاطب کیا۔

”اپنا راستہ لو!“ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھنا چاہا۔



”تیری.....“ جواب میں مجھ پر گالیاں برسنے لگیں۔

میرا مشن بہت عظیم تھا، لیکن تھا میں بہرحال ایک انسان اور ایسی نسل کا نمائندہ جس میں عزت کچھ زیادہ ہی پائی جاتی ہے۔ اس لمحے میرے اندر وہ راجپوت جاگ اٹھا جس کی خودسری سے خود میں بھی پناہ مانگتا تھا ـــــ میں نے اس لمبے تڑنگے سیاہ فام شخص کو جو کسی مخلوط النسل کا شاہکار نظر آتا تھا گھومتے ہوئے زوردار ضرب لگائی اور وہ لڑکھڑا کر اپنے ساتھی پر جا گرا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے کسی ماہر فن پہلوان کی طرح اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔

ـــــ اس نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے ٹانگ چلائی اور اگر میں اچانک جھکائی دے کر ایک طرف نہ ہٹ جاتا تو یقیناً میرا جبڑا اس کی ایڑی کی زوردار ضرب سے ٹوٹ جاتا! اپنی دانست میں میں اس کے اس داؤ سے تو بچ گیا تھا مگر یہ الگ بات کہ اپنے مرکزی نقطے پر پہنچتے ہی اس نے بیک لگ لگائی اور اس کے تلوے کی زوردار ضرب میرے پیٹ میں لگی۔

بجائے سہم جانے کے اپنی فطرت کے مطابق دشمن کے وار نے میرا طیش بڑھا دیا لیکن تربیت آڑے آتی رہی۔ دماغ ٹھنڈا رہا ورنہ کوئی بھی جلدی میں کی جانے والی حرکت نقصان پہنچا دیتی اگر میں کوئی عام آدمی ہوتا تو لاکھ تربیت یافتہ ہونے کے باوجود اس کے اس کاری وار سے ڈگمگا جاتا ـــــ ڈگمگایا میں بھی ضرور تھا لیکن تکلیف کی شدت سے نہیں۔ میرا زور اپنی دائیں سمت رہا جہاں اس کا ایک ساتھی اگلے اقدام کے لیے پر تول رہا تھا۔

ـــــ میری پشت اس انداز سے اس سے ٹکرائی جیسے وہ آدمی کی بجائے اکھاڑے کا رسّا ہو میری دونوں کہنیوں نے اسے ڈکرا دیا اور پنجوں کے بل اچھل کر میں نے سیدھے ہوتے ہوئے اسی مخلوط النسل سیاہ فام کے سینے میں زوردار ٹکر ماری۔ اسے شاید اتنے اچانک اور تیز ردعمل کی توقع نہیں تھی یا پھر اس طرح کی ٹکر کا سامنا اس کو اس سے پہلے نہیں ہوا تھا وہ بوکھلا گیا اور الٹ پڑا۔

تیسرا غنڈا اپنے جوہر آزمانے کو تیزی سے میری طرف جھپٹا لیکن منہ پر لگنے والے پنچ

نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے اور پھر وہ تینوں ہی کسی مشینی عمل کے تحت اکٹھے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ مجھے تو یہی محسوس ہُوا جیسے ابھی تک وہ مجھے بہت "لائٹ" لے رہے تھے، اور حالات کی نزاکت کا احساس انھیں اب ہوا تھا۔

——— ان کا پروگرام تو مجھے فٹ بال بنانے کا تھا لیکن میں ان کے لیے لوہے کی اینٹ ثابت ہو رہا تھا۔ اب انھوں نے مجھے مہلت دینے کی بجائے اپنے ارمان نکالنے کا فیصلہ کر لیا ——— تینوں تربیت یافتہ کھلاڑیوں کی طرح تین اطراف سے حملہ آور ہُوئے لیکن میں زمین پر موجود ہوتا تو میرا کچھ بگاڑ پاتے میں تو فضا میں پرواز کر رہا تھا اور لینڈ کیا تھا میں نے سیاہ فام کے کندھوں پر ——— میں اس کی گردن پر طوق کی طرح پھنس کر بیٹھا اور دونوں پاؤں اسکی بغلوں میں اس طرح پھنسائے کہ اس کے بازو صرف لہرا کر رہ گئے۔ اس عمل کا اختتامی نقطہ اس کے لیے بڑا ہی کربناک تھا۔ میں نے آگے کی سمت جھکتے ہوئے بازو پھیلائے، جسم کو زوردار جھٹکا دیا۔ سیاہ فام تناور درخت کی طرح آندھی کے زور سے زمین کی طرف جھکا میرے دونوں ہاتھ اس کی گدی پر جم گئے اور اس کا چہرہ زمین سے ٹکرایا تو میرا وزن اس کی گردن پر موجود تھا۔ وہ زخم خوردہ کتّے کی طرح چلّانے لگا۔ اس کے دونوں ہمراہی دائیں بائیں سمت سے مجھ پر آہنی ہتھوڑے برسانے لگے لیکن صرف ایک ایک وار کر سکے۔ وہ بھی میری کوتاہی کی وجہ سے کہ زقند بھر کر سیاہ فام پر سے اٹھنے میں میں نے کچھ زیادہ لمحے ضائع کر دیے۔ مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی پھُرتی بھی دکھا سکتے ہیں۔ ایک دفعہ تو پسلیوں کی جلترنگ بجی لیکن پھر کہاں ——— !؟ میری زوردار لاتوں اور کھری ہتھیلی کی ضربات نے انھیں آدھ موا کر دیا۔

ہم لڑتے لڑتے اب مخصوص بنگلے کے سامنے پہنچ چکے تھے جہاں میں نے اس پُراسرار شخص کو داخل ہوتے دیکھا تھا۔ جس سے سب سے پہلے میں نے گیانی آتما سنگھ کے متعلق جانکاری حاصل کرنا چاہی تھی۔ پھر وہ دونوں تو زخم چاٹنے کے لیے ہٹ گئے لیکن اس مرتبہ سیاہ فام پلٹا تو "کھٹک" کی آواز اس کے دائیں ہاتھ سے اُبھری۔ اس نے اپنے پاؤں میں پہنی جُراب سے وہ مخصوص بٹن والا چاقو نکال کر کھولا تھا جو یہاں کے غنڈوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ زمین پر گرنے سے اس کا منہ کسی خون پینے والی ڈائن کا سا ہو گیا تھا۔ اس کے سیاہ چہرے کے گرداگرد پھیلی سُرخ لکیروں کے جال میں اس کی سفید آنکھیں کسی "ویمپائر" کا نقشہ پیش کر رہی تھیں اور وہ چاقو پکڑے بڑے خوں خوار انداز میں میری طرف بڑھا۔

——— لیکن اچانک جیسے مسمریزم کے کسی عمل نے اسے آدمی سے پتھر کا بت بنا دیا۔ میرے عقب سے گیانی آتما سنگھ کی کڑک دار آواز گونجی۔

"بس" ——— اس کے ساتھ ہی ہمارے دونوں اطراف سے کھلنے والی کھڑکیاں جہاں سے متجسّس چہرے ——— گردنیں باہر جھکائے اس رزمن اکھاڑے کا نظّارہ کر رہے تھے، کھٹا کھٹ بند ہونے لگیں۔ ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی جنگل سے کوئی ٹائیگر بھاگ کر شہر میں آگیا ہو اور لوگ اس کے خوف سے سہم کر خود کو کمروں میں مقید کر لیں۔

——— گیانی آتما سنگھ میرے تصوّر سے کچھ بڑھ کر ہی ثابت ہُوا تھا۔

"ہش کے او شیرا!" اس نے میرے قریب پہنچ کر میرے کندھے پر تھپکی دی۔

"کیا ہرج ہے بالوجی! ذرا ہو لینے دو۔ یہ تماشا بھی دیکھ لیں۔ میں نے بھی دو سال جاپانی پہلوانوں کی جوتیاں چاٹی ہیں" میں نے بڑے مضبوط لہجے میں گیانی جی کو مخاطب کیا۔

"پُتر آتما سنگھ دیگ کا ایک دانہ چکھتا ہے! تُو نے شیرنی کا دُودھ پیا ہے۔ میں نے صبح ہی تیرے ماتھے پر ارجمندی کا نشان دیکھ لیا تھا ——— !"

میں خاموش کھڑا رہا۔ وہ تینوں گدھے گردنیں جھکائے اس طرح کھڑے تھے جیسے اپنے دیوتا کو نذر گزار رہے ہوں۔

"آجا پُتر ——— آج تک دُنیا کی کوئی ہستی اتنی جلدی آتما سنگھ کا دل نہیں جیت سکی۔ ضرور تُو کسی شبھ گھڑی کی پیدائش ہے پُتّر! مجھے بھی کئی جنم سے تیری تلاش تھی۔"

اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر میرے ساتھ ساتھ چلتے ہُوئے کہا۔ ہم دونوں بنگلے کے

مین گیٹ سے اندر داخل ہو گئے جس پر ایک مضبوط قد کاٹھ کا پٹھان رائفل پکڑے پہرہ دے رہا تھا۔ اس نے گیانی کو دیکھتے ہی ایک طرف ہٹ کر تربیت یافتہ فوجیوں کی طرح سلامی دی۔ اور گیانی مجھے لیے ایک شاندار لمبے چوڑے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا جس کی سج دھج دیکھ کر کسی فلمی سیٹ کا گمان گزرتا تھا۔

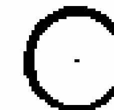
"رات ہو چلی ہے پُتّر ——— میرے پاٹھ کا سمے (وقت) نکلا جا رہا ہے۔ نہا دھو کر کھانا کھا اور سُکھ کی نیند مان۔ یہاں تیرے لیے آنند ہی آنند ہے۔" اس نے مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ اور میرے حُلیے پر نظر کی۔

"دھن وادی ہوں باپو جی۔" میں نے انکسار سے کہا۔ گیانی آتما سنگھ نے ایک کونے میں لگے پش بٹن پر انگلی دبائی اور چند سیکنڈ بعد بغلی دروازے سے بجلی کا کوندا لپکا میرے ذہن نے آسمان پر گرتی اس بجلی کا تصوّر کیا جسے لباس میں ملفوف کر کے عورت کی شکل میں قدرت نے زمین پر اُتار دیا ہو۔ اس کے آدھ ننگے پنڈے پر نگاہیں ٹھیرتی ہی نہیں تھیں۔

"اپنا پُتّر ہے ——— اس کا خاص خیال رکھنا۔ آرام میں فرق نہ آئے۔" اس نے آنے والی قیامت کو حکم سنایا۔

"جو حکم مہاراج جی۔" آسمانی بجلی نے ہاتھ باندھ دیے۔ گیانی نے کمرے کے ایک کونے میں ٹنگی گورو نانک کی تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ باندھے۔

"ست گورو نانک تیری اوٹ۔ سچے بادشاہ" جھک کر اُس نے تصویر کو سیس نوائے اور مجھے اس قتّالہ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر باہر چلا گیا۔



"ادما کہتے ہیں داسی کو۔" شعلۂ جوّالہ نے انگڑائی لی۔ وہ تصویر کی طرح ہاتھ باندھ کر میرے حضور کھڑی تھی۔

"باتھ روم کدھر ہے؟" مجھے اس قتّالہ سے بچنے کا اور تو کوئی بہانہ نہ سوجھا۔



آئیے مہاراج۔" اس نے جھکتے ہوئے ہاتھ سے ایک سمت اشارہ کیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اچانک کسی نے مجھے بجلی کے شاک سے جھٹکا لگایا ہو۔ میرے جسم میں انگارے ناچنے لگے۔ ایک سنسناہٹ سی میرے تن بدن میں آنکھ مچولی کھیلنے لگی۔

——— صوفے سے اُٹھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے کان جل رہے ہیں اور تلوؤں اور ہتھیلیوں میں بھی شرارے تڑپنے لگے۔

گھاگ عورت تھی، پہلے ہی وار میں میری دُکھتی رگ چھیڑ دی۔ جب تک میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا نہ ہو گیا وہ اسی انداز سے جھکی رہی پھر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ایک طرح سے مجھے ایک ہی بھرپور وار میں چاروں شانے چت کرنا چاہا تھا۔ وہ میرے بالکل نزدیک آ گئی ——— اتنی قریب کے اس کی سانس میرے حواس پر چھانے لگی اور عین اُسی لمحے جب میں بالکل سحر زدہ ہو گیا تھا ——— میرا ضمیر مجھے جھنجھوڑنے لگا:

"ہوش کر لفٹین علی ——— چارہ کر۔ پہلے ہی مرحلے میں پھسل گیا! یہ بھی سردار آتما سنگھ کی آزمائش ہے!! لعنت تیرے کی نالائق کہیں کا۔"

تب مجھے یوں لگا جیسے میں کسی ناگن کے زہریلے جسم سے لپٹ رہا ہوں جو کسی بھی لمحے اپنا پھن پھیلائے مجھ پر زہر کی پچکاری پھینکے گی اور میرے وجود کو ڈس کر چلی جائے گی! میں موت کی گہری نیند سے بیدار ہو گیا۔

"صرف وہی کرو جو کہا جائے۔" میں نے انگریزی میں پھنکارتے ہوئے کہا۔

چند لمحے تو وہ حیرت سے میرا منہ تکتی رہی ——— اس ردِّ عمل کی توقع اسے ہرگز نہ رہی ہو گی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے ہٹ کر ہاتھ باندھ دیے:

"شما چاہتی ہوں مہاراج۔" اس نے میری اس حرکت کو شاید میرا "نخرہ" ہی سمجھا تھا۔ اس کی اداکاری پر میں عش عش کر اٹھا۔ کیا مجال جو ایک شکن بھی اس کے ماتھے پر اُبھری ہو۔ وہ ویسی کی ویسی ہی رہی۔

○

پھر میں گیانی آتما سنگھ کے محل میں بنے اس فرانسیسی سامان سے آراستہ پیراستہ غسل خانے میں دن بھر کی تھکاوٹ اُتار رہا تھا جہاں ایک کونے میں میرے لیے نیا جوڑا ٹنگا ہوا تھا۔ جب میں نہا دھو کر واپس آیا تو وہی دشمنِ ایمان اوما میری منتظر تھی۔

"کھانا تیار ہے مہاراج۔" اس نے ڈرائنگ روم کی ایک سمت رکھی میز کی طرف اشارہ کیا۔ ایک مؤدب بیرا وہاں موجود تھا۔ کھانا میز پر چُنا ہوا تھا۔

—— لیکن حیرتوں کا پہاڑ ان پر تب ٹوٹا جب میں نے میز پر بیٹھتے ہی اعلان کر دیا کہ میں "ویشنو" ہوں شکم پُری تو میں نے اپنے اس دوست کے ساتھ ہی کر لی تھی جس سے ابھی میں ملاقات کر کے آیا تھا۔ لیکن میں نے ان لوگوں کو یہ تاثر نہ دیا اور سبزیاں اور پھلکے نگلتا رہا۔

گیانی اس اثنا میں مسلسل غائب رہا۔ وہ اپنی ہر حرکت سے پُراسرار ثابت ہو رہا تھا۔ میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں "گیانی" بھی تھا اور "آفتِ ناگہانی" بھی۔ ایک بوڑھے سکھ کا کلکتہ جیسے بین الاقوامی شہر میں بیٹھ کر داداگیری کرنا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ ضرور کوئی مافوق الفطرت ہستی تھا جو سانپوں کی اس بستی میں شیش ناگ بنا بیٹھا تھا۔

کھانے سے فراغت کے بعد میری رہنمائی اوما نے ایک آرام دہ خواب گاہ کی طرف کی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے اُس نے تھوڑی دیر پہلے کے میرے غیر معمولی سلوک کو بالکل نظرانداز کر دیا تھا۔ وہ ہر صورت میری خدمت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس کی ہر ضرب کاری تھی لیکن اس کا واسطہ کسی جرائم پیشہ شریف زادے سے نہیں ایک تربیت یافتہ کمانڈو سے تھا۔ جس نے عصمت کا ایک ہی مفہوم سمجھا تھا: اس کے نزدیک عورت کی تقدیس بھی وہی تھی جو مرد کی۔ فاحشہ عورتیں ہی نہیں ہوتیں مرد بھی ہوتے ہیں۔ وہ رات الف لیلیٰ کی طلسمی رات کی طرح مجھے نئے نئے جہانوں سے آشنا کرتی رہی۔



میری بزدلی جانیے یا ایمانداری کہ مجھ میں اپنے ضمیر کا سامنا کرنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ اپنے اندر کی عدالت کے سامنے مجرم بن کر پیش ہونے کا تصوّر ہی میرے لیے اذیت ناک تھا۔ اوما نے جب اپنے سارے داؤ آزما لیے تو وہ بھی جیسے لُوٹ سی گئی۔ میری دانست میں اسے کسی مرد کے ہاتھوں یہ پہلی ہار ہوئی تھی بالآخر شکست خوردہ سی ہو کر اس نے بیڈروم کے دروازے کا سہارا لے کر مجھ سے کہا۔

"سر! میں نے آج تک ہار نہیں مانی تھی۔ آپ نے اوما کو بھی شکست دے دی۔" اس کے لہجے کی تھکاوٹ اس کے لفظوں میں عیاں تھی۔

"میں نے بھی —— مجھے بھی اس بات کا زعم ہے۔" کہہ کر میں نے کروٹ بدل لی۔

دروازہ آہستگی سے بند کر کے وہ مجھے "شب بخیر" کہہ کر چلی گئی۔ میں نے اپنا پستول سرہانے رکھا ہوا تھا۔ ابھی تک گیانی نے مجھ سے مکمل بے نیازی برتی تھی۔ حتیٰ کہ میرے جزا فیے کے سلسلے میں بھی۔ میرے سرہانے ٹیلیفون دھرا تھا لیکن یہاں سے عثمان کو فون کرنا میں نے مناسب نہ سمجھا! "اگر گیانی نے مجھے اپنے حلقۂ خاص میں شامل کر لیا ہے تو یہ میری خوش بختی ہے۔ اس کی آڑ میں ہمارے بہت سے ایسے خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتے ہیں جن کی ابھی تک ہمیں حسرت ہی رہی تھی۔" رات کافی دیر گئے تک میں اس سے متعلق لائحہ عمل ترتیب دیتا رہا۔ بالآخر ایک فیصلے پر پہنچ کر میں مطمئن ہو گیا اور اطمینان نصیب ہوا تو ایک نئے کرب نے آن گھیرا۔

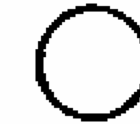
یہ آلسہ تھی جو میرے دامنِ دل کو وا دیکھ کر میری دھڑکنوں پر چلتی چلی آئی تھی —— جس نے مجھ سے بنگال کے سحر کی عظمت کا لوہا منوا لیا تھا، جو زندگی کی تپتی جھلساتی شاہراہوں پر اماوس کی ٹھنڈی چاندنی کی مانند اپنی چھایا بکھیر رہی تھی۔ جس کے دامن میں پرکھوں سے چلنے والے قافلوں کے تھکے ماندے راہرو امان پاتے تھے اور جس کی یادوں کی ٹھنڈی اوس محبت کی شبنم بن کر میرے اندر قطرہ قطرہ اتر رہی تھی؛ اور ساری کلفتیں، سارے دُکھ، ساری تھکن

بھول کر میں صرف اس کے متعلق ہی سوچنے لگا۔

"تم مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے لفٹین علی! کیونکہ میں فضاؤں میں قرنوں سے رچا بسا ابدیت کا گیت ہوں۔ میں محبت کے ساز پر گایا جانے والا وہ نغمہ ہوں جس کی گونج سے پتھروں میں شگاف پڑ جاتے ہیں۔ جس کی تھرتھراہٹ سے کوئی جائے پناہ نہیں۔ تم تمھاری جولانیاں، تمھارے پہاڑ ارادے، تمھاری سنگلاخ قوتِ ارادی، ان میں سے کسی کی بھی میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں، تم چاہو بھی تو میرے کھینچے ہوئے حصار سے نکل نہیں سکتے۔"

اُس کی صدا مجھے پورب کی سمت سے آتی سنائی دے رہی تھی اور اس کے ایک ایک حرف کی صداقت پر آمنا، صدقنا کی پکار میرے اندر سے بلند ہو رہی تھیں۔

جب اُس نے دیکھ لیا کہ میں اس کی محبت کے طلسمی پنجرے سے نہیں نکل پایا تو جیسے اُسے مجھ پر رحم آ گیا۔ اس کی پُر شفقت لوریوں نے مجھے نیند کی دیوی کو سونپا اور جس طرح دبے پاؤں وہ میرے من آنگن میں اُتری تھی اسی طرح بغیر آہٹ پیدا کیے چُپ چاپ لوٹ گئی۔



صبح میری آنکھ گیانی آتما سنگھ کے پاٹھ کرنے کی پُر سوز آواز سے کھلی۔ بڑا خرانٹ بڈھا تھا کمبخت۔ ایک زمانے کا سوز اس کی آواز میں بھرا تھا۔ جو کچھ وہ اناپ شناپ کہہ رہا تھا وہ تو میرے پلے نہ پڑا۔ البتہ اس کے لہجے کا گداز اپنی جگہ ایک نہ جھٹلائی جانے والی حقیقت تھی ——— میں نے بیڈ روم کے دروازے کی جھری سے باہر جھانکا تو داما اور دو تین دوسری خواتین سمیت تقریباً کوئی پندرہ بیس خواتین و حضرات اس کے گرد جمگھٹا لگائے مودب، اس کا پاٹ سن رہے تھے۔

میں بھی بیڈ روم سے منسلکہ باتھ روم سے نہا کر تازہ دم ہو گیا اور پستول اپنے کپڑوں میں چھپا کر وہیں آ گیا تھا ——— سکھی دھرم کے مطابق پہلے میں نے دونوں ہاتھ باندھ کر سری



دربار صاحب، کو سیس نوائے پھر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ ابھی مجھے بیٹھے بمشکل ایک ڈیڑھ منٹ ہی گزرا تھا کہ گیانی آتما سنگھ نے "گرنتھ صاحب" بند کر دی۔ اسکی عقابی نظریں میرے اور اس کے درمیان بیٹھے لوگوں کے سروں پر سے پھسلتی ہوئیں میرے آر پار ہونے لگیں۔

"پُتر یہ سچے رب کی بانی ہے۔ جہاں نرنکار کا ذکر ہو رہا ہو وہاں مکتی ہی مکتی ہے۔ سب کو پناہ ہے۔ ہم سچے بادشاہ کے دربار میں بیٹھے ہیں۔ اس کے کچھ آداب ہیں پُتر! تم اپنا آتشی کھلونا وہیں رکھ آؤ۔" اس کا یہ انکشاف کرنا، میں حیرت زدہ بالکل نہیں ہوا مجھے تو ابھی اس کی طرف سے ایسے بے شمار ڈراموں کی توقع تھی۔

میں چپ چاپ اٹھ کر چل دیا۔ کیا مجال جو کسی نے نظر اُٹھا کر بھی میری سمت دیکھا ہو۔ وہ سب تو دنیا مافیہا سے بے خبر نظر آ رہے تھے۔ پستول رکھ کر جب میں دوبارہ واپس آیا تو گیانی جی کا پاٹھ شروع تھا۔ پاٹھ کے خاتمے پر ہم سب نے مل کر "ارداس" پڑھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم کالی ماتا کے شہر میں نہیں بلکہ امرتسر کے "دربار صاحب" میں موجود ہیں۔

"ارداس" کے خاتمے پر سب نے مل کر "ست سری اکال" کا جنکارا بلند کیا۔ اور "فتح" بلا کر گیانی آتما سنگھ کی طرف نظریں جما کر بیٹھ رہے۔ گیانی جی نے اشارہ کیا دو مودب ملازمین نے وہاں دستر خوان بچھا دیے۔ جن کے دونوں اطراف وہاں موجود لوگ گیانی سمیت مودب ہو کر بیٹھ رہے۔ اس کی ایک ایک ادا قابلِ تحسین تھی۔ بہت فراڈ تھا کمبخت ۔ دستر خوان کے گرد بیٹھا وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی "مالا" کے منکے گراتا رہا۔ پھر دو نہنگ سکھ اندر داخل ہوئے ایک کے ہاتھ میں پکڑے تھال میں "کڑاہ پرشاد" تھا اور دوسرے کے تھال میں پوریاں۔ لوگ عقیدت مندوں کی طرح ان کے آگے ہاتھ پھیلا دیتے اور وہ ہر ایک کے ہاتھ پر دو پوریاں اور "کڑاہ پرشاد" رکھ کر آگے بڑھ جاتے۔

پرشاد چکھتے (کھاتے) ہوئے گیانی سمیت تمام لوگ "واہگورو ـــ سچے پادشاہ" کو یاد کرتے رہے۔ پھر گیانی جی کے "آگیا" دینے پر وہ سب ایک ایک کر کے وہاں سے چلے گئے۔

اب وہاں مَیں تھا اور گیانی آتما سنگھ!!

"ادھر آجا پُتّر" اس نے مجھے قریب بُلا لیا۔ مَیں سر جھکائے اس کے داہنے ہاتھ پر آ گیا۔ لیکن اس نے مجھے سامنے بٹھا لیا۔

"کیا نام بتایا تھا تو نے پُتّر!"

"امرجیت سنگھ، گیانی جی" مَیں نے انکسار سے جواب دیا۔

"نہ پُتّر ——— گیانی میں لوگوں کے لیے ہوں تیرے لیے نہیں۔ تو مجھے باپو ہی کہا کر"

اس لمحے گیانی جی کے لہجے میں ایک جہان کا کرب سمٹ آیا تھا۔ ہر قدم پر اس کا نیا روپ سامنے آ رہا تھا۔

"گاؤں کون سا بتایا تھا پتّر"

"ایک بات ہے باپو جی! بُرا نہ مانیے تو کہوں"

"ہاں ہاں ——— کیوں نہیں! کیوں نہیں!" اس نے بڑی شفقت سے کہا۔

"مَیں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کیا کرتا ہوں؟ ——— ابھی میرے اور آپ کے درمیان ایسا رشتہ قائم نہیں ہوا کہ مَیں ان سارے سوالوں کے جواب دینے کا پابند ہوں۔ کل کا دن اور رات میرے لیے خطرناک تھے مجھے پناہ چاہیئے تھی۔ آپ نے دے دی، آپ کا دھنواد! مَیں بھی جٹ بچّہ ہوں کسی کا قرض سر پہ نہیں رکھنا جس طرح جی چاہے اس احسان کا بدلہ وصول کر لیں"۔ مَیں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"ہش کے اوئے پُتّر ——— آج تک اس شہر میں کسی نے آتما سیہاں سے اس لہجے میں بات نہیں کی۔ لیکن پہلے ہی روز سے جانے کیوں میرا من تیری طرف کھینچ رہا ہے تو کسی کرموں والی کا جنا ہے پُتّر۔ صرف تیرا امتحان ضرور لیا ہے وہ بھی اس لیے کہ آتما سیہاں نسلی بندوں اور جانوروں کی قدر کرتا ہے۔ پُتّر میں بندے کے دانت ضرور دیکھتا ہوں۔ مَیں تجھ سے یہ نہیں پُوچھتا کہ تو کس چکر میں ہے۔ کیا دھندا کر رکھا ہے لیکن مَیں نے تیرا انتخاب کیا ہے اور



میرے کسی کتّے پر بھی حرف آجائے تو آتما سیہاں کا جینا کیسا؟ اس لیے پُتّر مجھے تمھاری فکر تو ضرور کرنی ہوگی ———" وہ مسکراتا ہوا بڑی ہوشیاری سے سب کچھ کہہ گیا جو اس کا مدعا تھا، لیکن مَیں نے بھی کچّی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔

"باپو اوّل تو میرے جیتے جی کوئی مجھے بے آبرو نہیں کر سکتا اور دوسری بات کہ کسی اور کے حوالے سے جینا، مَیں مردانگی نہیں جانتا" ——— میری بات نے آتما سنگھ کے ماتھے پہ دو تین بل تو نمودار کر دیے اس نے اُلجھی اُلجھی نظروں سے میری سمت دیکھا بھی ضرور لیکن اس کی لمبی عمر کا راز ہی شاید اسی بات میں پنہاں تھا کہ اس نے "نسلی جانوروں اور انسانوں" کی قدر کرنا سیکھا تھا اور ان کے حصول کے لیے وہ ہر ممکن اقدام کر لیا کرتا تھا ——— حتیٰ کہ اپنے اصولوں کی قربانی سے بھی دریغ نہ کرتا۔

"ٹھیک ہے پُتّر! ابھی تیرا خون کچھ زیادہ ہی گرم ہے۔ اس لیے شاید تُو وہ بات نہ سمجھ سکے جو مَیں کہہ رہا ہوں۔ جب خون کی حدّت کم ہو گی تو سب کچھ جان لوگے لیکن کیا مزا آئے گا جب سوائے ہاتھ ملنے کے اور کچھ باقی نہ رہے گا ———" اس لمحے آتما سنگھ کی آواز کسی کنویں سے آتی سنائی دے رہی تھی۔

"بات یہ ہے باپو جی کہ ہم باپ بیٹے کا رشتہ قائم کر رہے ہیں۔ میرے خیال سے اس کے تقاضے کچھ اور ہیں اگر آپ میرے لیے صرف گیانی جی رہتے تو بات اور تھی"۔ مَیں نے بات سر جھکائے جھکائے کی تھی۔

"تو باتیں بہت کرتا ہے پُتّر اور جی دار بھی بہت ہے واہگورو تیری رکھشا کرے۔"

اس کے لہجے سے شکست جھلک رہی تھی۔

——— اور اس سے پہلے کہ مَیں اگلی بات کروں اچانک سامنے والا دروازہ کھلا۔ اس مرتبہ اندر آنے والی ہستی کے سامنے ایک چھوڑ کئی ادما ہیچ تھیں لیکن اس کے پاس "دعوت" نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہاں تو ایک تقدّس تھا۔ پاکیزگی اس کے روئیں روئیں سے

پھوٹتی تھی۔اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور پنجاب کی روایتی مٹیاروں کی طرح سر پر دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔

"باپو جی....."اس کی نظر شاید ابھی گیانی آتما سنگھ پر پڑی ہی تھی۔مجھے دیکھ کر اس نے چاہا کہ انہی قدموں پلٹ جائے۔

"آجا پُتّر! اپنا پُتّر ہے ——— آجا آجا"گیانی جی کی پکار پر وہ پلٹی اور "ست سری اکال" بلا کر ایک طرف دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔اس کی بادامی رنگ کی بڑی بڑی آنکھوں میں تجسّس ہلکورے لے رہا تھا شاید آج تک اس نے کسی نوجوان کو اپنے باپو کے سامنے اس طرح بیٹھے نہیں دیکھا تھا۔

"ویر ہے تیرا امرجیت سیہاں اور یہ میری پُتّری ہے امرت کور" ہمارے تعارف کا مرحلہ بھی گیانی جی نے خود ہی طے کر دیا۔

"ست سری اکال بہن جی۔"مَیں نے اسے مخاطب کیا اس اندازِ تخاطب پر جب اس نے آنکھیں اٹھائیں تو ان کی ویرانی رُلا دینے والی تھی۔خود گیانی آتما سنگھ کی کیفیت بھی عجیب سی ہو رہی تھی۔

"آؤ پُتّر ناشتہ کر لیں"اس نے ہم دونوں کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔مَیں دونوں باپ بیٹی کے پیچھے چلتا ہوا مختلف کمروں سے گزر کر آخر ایک ایسے کمرے میں پہنچا جو اس گھر کا حصہ ہی معلوم نہیں ہوتا تھا۔یہاں بڑی سادگی نظر آ رہی تھی ——— ایک تخت پوش پر ایک عورت بیٹھی تھی جس کے چہرے سے وقار جھلک رہا تھا۔اس نے مجھے دیکھ کر دوپٹے کو سلیقے سے سر پر رکھا۔یہ امرت کور کی ماں تھی۔

"امرجیت سنگھ ہے یہ"گیانی کی آواز لرز رہی تھی۔

بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا یہ گیانی آتما سنگھ کے سب سے بڑے لڑکے کا نام تھا جسے کلکتہ کے ایک بڑے دادا نے جو گیانی جی کا کاروباری رقیب تھا مروا ڈالا تھا اور جس کی

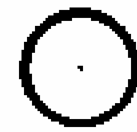


موت کے بعد گیانی آتما سنگھ نے قسم کھائی تھی کہ : وہ اپنے بیٹے کی موت میں حصّہ لینے والے ایک ایک شخص کو اس کے کنبے سمیت مار ڈالے گا۔

——— اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کو بادلِ نخواستہ کسی یورپی ملک میں پہنچا دیا تھا اور خود یہاں ایک بیٹی اور بیوی سمیت قیام کیے ہوئے تھا۔گیانی آتما سنگھ پرانا بدمعاش تھا۔جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا اس کے تعلقات بھی اپنی ہی روش کے لوگوں سے استوار ہوتے چلے گئے۔اور اس کا دھندا بھی بین الاقوامی نوعیت کا ہوتا گیا ——— اب وہ وقت آگیا تھا جب اس کا شمار کلکتہ کے بین الاقوامی شہرت کے اسمگلروں میں ہونے لگا تھا۔

"امرجیت میرا بچّہ" کہہ کر اس نے مجھے گلے لگا لیا۔اس لمحے مجھے خود سے شرم محسوس ہو رہی تھی اور اس بات کا پچھتاوا بھی ہو رہا تھا کہ مَیں ان لوگوں کے پاس آیا ہی کیوں؟ اس تقدّس مآب عورت کے وشال سینے سے لپٹ کر مَیں اپنے گاؤں جا پہنچا جہاں میری ماں اسی طرح کسی مصلّے پہ بیٹھی میری واپسی کے لیے دعا گو تھی اور میری بہن، جس نے اپنے ویر کے لیے جانے کیسے کیسے سپنے آنکھوں میں سجا رکھے تھے ——— پھر رضیہ بھی تو تھی!!

"ماتا جی۔"مَیں نے انھیں خود سے الگ کر کے وہیں بٹھا دیا۔ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔



ہم نے ناشتہ اکٹھے ہی کیا تھا۔

——— یہ وہی پنجاب کا روایتی ناشتہ تھا! دودھ، دہی اور مکھن جس کے ذائقے میں میری زمین، میرے وطن کی چاشنی رچی بسی تھی۔

ہم وہیں بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں بھی کرتے رہے ——— امرت میری سیوا میں جو آنند محسوس کر رہی تھی، وہ اُس کے انگ انگ سے ظاہر ہو رہا تھا۔

اور جب ہم فارغ ہو گئے، تو وہ لوگ مجھے جانے نہیں دیتے تھے۔

"ابھی ٹھہرو ــــ ایک روز اور! دل تو ہمارا بھرا نہیں" سب کہہ رہے تھے مگر ــــ مَیں تو یہاں رہنے کے لیے نہیں آیا تھا ــــ مجھے تو میری نئی ذمّہ داریاں آوازیں دے رہی تھیں۔

"مَیں پھر آؤں گا ــــ اگلے دو تین روز میں ضرور پلٹ آؤں گا!"

اور میرے اِس وعدے پر مجھے اجازت مل گئی ــــ گیانی آتما سنگھ مجھے باہر تک چھوڑنے آئے،

"پُتّر! اگر جٹ کا بچّہ ہے تو اپنے قول کو صِدق سے نبھانا ــــ چنگا رب راکھا"

اور اس نے باوردی نوکر کو اشارہ کیا: "انھیں جہاں کہیں چھوڑ آؤ ــــ"

"رب راکھا" کہہ کر مَیں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ــــ جب تک گاڑی چلی نہیں، گیانی جی پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھتے رہے اور مَیں سوچتا رہا کتنا گہرا شخص ہے یہ ـ!

"ــــ سمندر کی طرح"

"ــــ جس کا کوئی کنارہ نہیں!"

میرے ہونٹ خود بخود لرزنے لگے اور میری آنکھیں گوروجی کی نظروں میں گم ہو کر اپنے لیے نئی راہیں تلاش کرنے لگیں۔



# بھیڑیوں کے بھٹ میں

کار سے مَیں نے جلد ہی چھٹکارا پا لیا اور گیانی جی کی طرف سے ممکنہ تعاقب کے پیشِ نظر ایک لمبی مٹرگشت کے بعد اپنے ٹھکانے تک جا پہنچا جہاں کرنل صاحب کا خصوصی پیغام میرا منتظر تھا۔

"رابطہ قائم کرو!"

میرا ایک ساتھی وہاں سے میرے ساتھ روانہ ہوا اور ہم ایک دور دراز اور کسی حد تک غیر آباد مقام پر چلے گئے۔ یہ ہمارا ایک طرح سے یہاں کا جاسوسی ہیڈ کوارٹر تھا جہاں ایک طاقتور ٹرانسمیٹر کے ذریعے چند منٹ بعد ہی میرا رابطہ اپنے ہیڈ کوارٹر سے بحال ہو گیا۔

"ونڈر فل!" کرنل صاحب نے میری گیانی آتما سنگھ والی "اچیومنٹ" پر مجھے بے اختیار داد دی۔

انھوں نے بتایا کہ: "آج رات ہمارے دوست پانیوں میں سے اُبھریں گے۔"

ــــ اور نیک تمنائیں دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

جس تیز رفتاری سے حالات بدل رہے تھے اس میں ہم "انتظار کرو" کی عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ہمیں ہر قدم فوری اور تیز رفتاری سے اٹھانا تھا کیونکہ پہلے ہی بہت سا پانی ہمارے سروں سے گزر چکا تھا۔ عثمان نے صرف ایک دن ان لوگوں کے ساتھ گزار کر

جہاں بہت سے خطرات مول لیے تھے وہاں کم از کم ان کے ایک خصوصی مرکز کا پتہ بھی لگا لیا تھا اور یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں تھی ——— اب ہمارا پہلا وار اسی مرکز پہ ہونا تھا جہاں زیادہ تر مشرقی پاکستان سے آنے والے بھگوڑے تخریب کاروں کے لیڈر قیام کرتے تھے۔ اور جہاں "را" کے بڑے بڑے ذہن ان کے منہ میں بنت نئے نعرے اور ان کے شرارتی ذہنوں میں تباہ کاری کے رنگا رنگ منصوبے ڈال کر انھیں مشرقی پاکستان میں دھکیلتے تھے۔

——— اس جزیرہ نما جگہ کا نام شاید لکشمی کانا پور تھا۔

لکشمی کانا پور ایک تکون نما جزیرے کی طرح سمندر کے پیٹ سے نمودار ہو کر خشکی کی طرف بڑھتا نظر آتا ہے اس کے ایک سمت پورٹ کننگ اور دوسری طرف کچھ اوپر جا کر ڈائمنڈ ہاربر ہے۔ لکشمی کانا پور کو کوئی فوجی اہمیت تو حاصل تھی نہیں اور یوں بھی یہ انٹیلی جنس کا طریقِ کار ہوتا ہے کہ وہ لوگ اپنا کام خفیہ ہی کرتے ہیں اور کسی بھی کارروائی کے لیے شور شرابے سے گریز کرتے ہیں۔ اس لیے یہاں نہ تو کوئی فوجی یونٹ ڈیپلائے کیا گیا تھا اور نہ ہی "را" کے اس مرکز کے گرد اگرد کوئی حفاظتی جال بُنا گیا تھا۔ بس وہی حفاظت کے عام بندوبست موجود تھے۔

——— عثمان نے اس ہیڈ کوارٹر کی یاترا اگلے ہی روز کی تھی اور یہیں سے نکل کر وہ مجھے ملنے آیا تھا۔

امیت سرکار اور اس کے ساتھی کی موت کے بعد یہاں کے کرتا دھرتا لوگوں کو اس بات کا علم تو ہو گیا تھا کہ ان کا یہ مرکز ہماری نظروں میں آ چکا ہے لیکن ایک تو یوں بھی ذی ناز اپنے کسی اہم مرکز کا دشمن کی نظروں میں آ جانا کچھ ایسی عجیب بات نہیں سمجھی جاتی اور دوسری بات یہ کہ مشرقی پاکستان میں ہماری نیوی کی پتلی حالت کے پیشِ نظر یہ بات تو اُن لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ ہم کبھی ان پر حملہ کرنے کا تصوّر بھی کر سکتے ہیں۔

عثمان سے میں نے اُس کے ہوٹل کے کمرے میں ملاقات کی تھی ——— وہاں سے



ہم نے ایک مرتبہ پھر "را" کے اس مرکز کے اندرونی نظام کا جائزہ لیا اور تھوڑی ہی دیر میں تمام جزئیات میرے ذہن میں منتقل ہو گئیں ——— اب ہم دونوں ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے خفیہ ٹھکانے کی طرف جا رہے تھے۔

شام تک ہم نے دو مرتبہ اپنے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا ——— میرا پلان سمجھنے میں انھیں ذرا بھی دشواری پیش نہ آئی اور انھوں نے سیدھا سادا جواب دیا "مشن جاری رکھیں ——— آنے والے نئے دوستوں کو تمہاری پہچان کرا دی گئی ہے۔"

○

جیسے ہی افق پر مغربی سمت میں سورج کا سفر اختتامی لمحوں کو پہنچا میں اور عثمان اپنے ٹھکانے سے نکل کر روانہ ہو گئے۔ ہم نے ماہی گیروں کے کپڑے پہن رکھے تھے عام بسوں کے ذریعے سفر کر کے ہم ایک مخصوص مقام پر پہنچے جہاں ایک مچھلیاں پکڑنے والی لانچ ہماری منتظر تھی۔ جس میں ہمارے ساتھی ڈھیر ساری مچھلیوں سمیت ہمارے منتظر تھے۔ یہ مچھلیاں انھوں نے صبح سے اب تک شکار کی تھیں۔ اسی لانچ کے ایک خفیہ خانے میں طاقتور ڈائنامیٹ اور ڈیٹونیٹر بھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ کچھ ہلکا پھلکا لیکن خاصا کارآمد اسلحہ۔

لانچ پر موجود ماہی گیروں کو دیکھ کر کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ یہ لوگ کوئی خطرناک ارادہ بھی رکھتے ہوں گے۔ وہاں اکّا دکّا لانچیں دُور دُور گھومتی نظر آ رہی تھیں۔ اب سبھی لوگ تھک ہار کر واپسی کا سفر کر رہے تھے۔ ہمیں کسی نے لانچ میں سوار ہوتے نہ دیکھا۔ پھر انجن تو میں نے سنبھال لیا اور وہ لوگ اِدھر اُدھر بکھر کر بیٹھ رہے۔ ہم دل ہی دل میں سلامتی کی دعائیں مانگتے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے ——— دُور دُور تک کسی سٹیمر یا کشتی کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ہمارا سفر ساحلی علاقے کے ساتھ ساتھ جاری تھا کہ ساحلی علاقے کے ایک کٹاؤ میں چھپی نیول پولیس کی ایک تیز رفتار گن بوٹ اچانک منہ پھاڑے ہماری طرف بڑھنے لگی ---- اُسے دیکھتے ہی میرے تینوں ساتھیوں نے اگلے اقدام کے لیے میری جانب دیکھا۔ مَیں نے انھیں پُرسکون رہنے کی تلقین کی اور اسٹیئرنگ کے قریب رکھا وہ چھوٹا سا کھلونا اپنی جیب میں منتقل کر لیا جو کسی بھی لمحے پھٹ کر قیامت ڈھا سکتا تھا۔ ان پر بھی اور ہم پر بھی۔

"ہالٹ ---- رک جاؤ" انگریزی اور بنگالی دونوں زبانوں میں گن بوٹ کے ڈیک پر کھڑے ایک آفیسر نے میگا فون میں چلاتے ہوئے کہا۔ مَیں نے انجن بند کر دیا۔ گن بوٹ ہمارے قریب جھاگ اڑاتی آ کر ٹھہر گئی ---- لہروں کے دوش پر ڈگمگاتی لانچ [illegible] چھلانگیں لگا کر تین سپاہی اور ایک ان کا آفیسر داخل ہو گئے باقی رائفلیں تانے وہیں کھڑے رہے۔

"کون ہو ---- کدھر جاؤ گے" ---- اسی افسر نے جھاڑ پلائی۔

"ہم مچھیرے ہیں"

[illegible] سا جواب اسے ہمارے ایک ساتھی نے دیا اول تو اسی سے اس کی تسلی ہو گئی لیکن پھر بھی اس نے اتمام حجت کے لیے اپنے ساتھیوں کو لانچ ٹٹولنے کا حکم دیا اور جب کچھ ہاتھ نہ آیا تو دو چار مچھلیاں اٹھا کر چلتے بنے۔ اتنی بڑی بلا سے اتنی جلدی نجات مل جانے پر ہم نے خدا کا شکر گزارا۔

لکشمی کانتا پور کے نزدیک ہم ساحلی علاقے پر اُتر گئے۔ اب ہمیں قریباً ایک ڈیڑھ میل پیدل سفر کر کے منزلِ مقصود تک پہنچنا تھا۔ ہمارے ساتھیوں نے لانچ وہیں ایک طرف اوٹ میں کھڑی کر دی۔ ان میں سے ایک لائٹ مشین گن کے ساتھ لانچ پر مورچہ جما کر بیٹھ گیا۔ جبکہ دوسرے نے ہمارے واپسی کے راستے میں ایک محفوظ جگہ پر مورچہ قائم کر لیا۔

"فی امان اللہ دوستو!" دونوں نے ہمیں ایک ایک بیگ سونپتے ہوئے کہا۔



"فی امان اللہ" ہم نے بھی انھیں خدا کے حوالے کیا اور سوئے منزل گامزن ہو گئے۔ ایک گمبھیر سناٹا ہر طرف طاری تھا ---- دُور دُور تک کسی ذی ہوش کا نام و نشان نہ تھا! وہاں ہم تھے یا خدا کی ذات جس نے ایک غیر متزلزل اعتقاد ہمارے سینوں میں بھر دیا تھا۔

---- اور یہی بھروسہ تھا جو اندھیروں کو روشنی دکھاتا ہوا ہماری راہنمائی کر رہا تھا۔ ہم نے "رام" کے مرکز تک پہنچنے کے لیے جو راستہ اختیار کیا تھا، وہ اگرچہ کچھ لمبا اور چکردار تھا، لیکن ---- محفوظ تھا۔

کوئی سڑک قریب سے نہ گزرتی تھی جس پر کسی کی آمدورفت ہوتی! بس بھیکڑ کی لمبی لمبی جھاڑیاں تھیں ---- بے آب و گیاہ پتھریلی پہاڑیاں اور جھلسی ہوئی زمین جس میں سے ہمارا ہر قدم ایک بھرپور اعتماد اور مکمل احتیاط سے اپنا راستہ بنا رہا تھا۔

---- اور آخر، چلتے چلتے ہمیں آبادی سے الگ تھلگ بنی وہ عمارت دکھائی دینے لگی تھی جس کے دونوں اطراف زرد بلبوں کی بیمار روشنی آنکھیں جھپک رہی تھی۔

مَیں نے ایک ٹیلے کی اوٹ میں بیٹھ کر وہ دوربین نکالی جس کے شیشے رات کے اندھیرے میں بھی سب کچھ دیکھ لینے اور دکھا دینے کی سکت رکھتے تھے۔ عمارت کے ارد گرد ایک پر ہول سناٹا طاری تھا صرف اوپر کی منزل کے برآمدے میں گھومتا پھرتا ایک سنتری تھا یا پھر ایک کونے سے اٹھتی سرچ لائٹ کی روشنی! اس کے علاوہ کچھ دکھائی نہ دیا۔

اندر جانے کیا تیاریاں تھیں؟ ---- ان کا علم ہمیں نہیں تھا۔

---- ہر خاص نوعیت کی عمارت کی طرح اس کے گرد اگرد بھی بڑی لانبی لانبی جنگلی گھاس سر اٹھائے کھڑی تھی یا پھر وہ نالہ تھا جس میں عمارت کی گندگی بہہ رہی تھی ---- ہم نے اسی جنگلی گھاس میں سے گزر کر وہاں تک پہنچنا تھا۔

ہم نے ماہی گیروں کی طرح لنگیاں باندھ رکھی تھیں اور جسم پر آدھی آدھی آستینوں کی

قمیصیں پہن رکھی تھیں یا پھر ہماری پیٹھ پر مچھلیاں اٹھانے والے وہ تھیلوں سے بنے بڑے بڑے تھیلے تھے جن میں ہم نے بیگ چھپا رکھے تھے ۔۔۔ ابھی گھاس میں بمشکل چند قدم ہی چلے تھے کہ ٹانگوں میں خراشیں پڑنے لگیں اور پھر ان خراشوں میں اسطرح ایک آگ سی دوڑنے لگی جیسے کسی نے زخموں پر نمک چھڑک دیا ہو۔ اب مجھے بخوبی سمجھ آگئی تھی کہ اس طرف کی حفاظت سے وہ لوگ بے نیاز کیوں ہو گئے تھے واقعی یہاں کسی کے گھسنے کا تصوّر بھی محال تھا۔

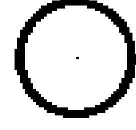
میرے لیے یہ کوئی نیا تجربہ نہیں تھا ایسی کئی اذیتیں مَیں نے اپنی تربیت ہی میں سہہ لی تھیں لیکن عثمان کو جس کرب اور تکلیف کا سامنا تھا وہ مَیں بخوبی محسوس کر رہا تھا ۔۔۔ آفرین ہے اس پر کیا مجال جو اس نے اُف تک کی ہو ۔۔۔ وہ تربیت کے عین مطابق میرے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

عمارت کی دیوار کے نیچے پہنچ کر ہم رک کر اپنے کام میں جُت گئے ۔۔۔ بیگ کھلے تو ان میں سے عجیب عجیب چیزیں برآمد ہونے لگیں۔ یہ مختلف قسم کے ٹائم بم تھے جو بے ضرر کھلونوں کی شکل میں ہمارے سامنے موجود تھے۔

ہم ہر کھلونے سے منسلک گھڑی پر وقت کا تعین کرتے اور اسے ہولے سے دیوار کے اندر لڑھکا دیتے ۔۔۔ اب ہمارا رُخ عمارت کے باہر کے دروازوں کی سمت تھا۔ ۔۔۔ ہر دروازے سے ایک سڑک اندر جاتی تھی اور اس سڑک کے نزدیک پھٹکنا ہی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا وہ اتنے بے خبر نہیں تھے کہ یہاں بھی ان کی نظر نہ رہی ہو۔ مَیں نے اندھیرے کی آڑ میں کہنیوں کے بل گھسٹتے ہُوئے ایک دروازے کی طرف رینگنا شروع کیا یہ لوہے کا سیاہ رنگ کا بہت بڑا پھاٹک تھا جو اندر سے بند تھا پھاٹک کے ساتھ ساتھ درختوں کا ایک طویل سلسلہ اندر پھیلتا چلا گیا تھا اور اندر سے سائیں سائیں کی آوازوں کے سوا اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ یہاں ایسا ہی سکوت طاری تھا جیسے سمندر پر



بڑا طوفان آنے سے پہلے طاری ہوا کرتا ہے ۔۔۔ مَیں نے پھُرتی سے ڈیٹونیٹر لگائے اور ایک تار سے منسلک کر کے تار کو وہاں تک لے آیا جہاں اسٹین گن تھامے عثمان مجھ پر نظریں جمائے بیٹھا تھا اس نے پھُرتی سے تار کا سرا اپنے قریب رکھی بیٹری سے منسلک کر دیا مَیں نے گھڑی کی سوئیوں پر نظر دوڑائی ۔۔۔ ہمارے دوسرے دوستوں کی آمد قریب تھی۔



عثمان کو وہیں بٹھا کر مَیں دوبارہ اسی لمبی لمبی گھاس کا عذاب جھیلتا تیز رفتاری سے ساحل کی طرف بڑھ گیا۔

ساحل پر میں بے چینی سے سمندر پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ جب مجھے دور لہروں کے دوش پر ایک گن بوٹ ہچکولے لیتی نظر آئی۔ ساحل نزدیک ہونے کی وجہ سے اس کے انجن بند تھے۔

۔۔۔ تین بار اس طرف سے ٹارچ روشن ہوئی جس کے جواب میں مَیں نے بھی وہی عمل وقفے وقفے سے دہرایا اور اس کے ساتھ ہی مجھے کچھ سائے سمندر میں اُترتے نظر آئے جو بڑی تیز رفتاری سے تیرتے ہوئے اِسی سمت آ رہے تھے ایک ربڑ کی کشتی انھوں نے اپنے حلقے میں لے رکھی تھی جو ان کے ساتھ ہی ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ ساحل کے قریب آ کر وہ رک گئے اور کسی ممکنہ دھوکے کے پیشِ نظر ان میں سے ایک جوان آگے بڑھا۔ ۔۔۔ ساحل پر آ کر مَیں نے اسے اپنے لباس سے پستول نکالتے دیکھا پھر وہ قدم بہ قدم آگے بڑھا قریب پہنچنے پر مَیں اوٹ سے نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ ہمارے درمیان چند الفاظ کا تبادلہ ہُوا اور اس نے مطمئن ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں کو بازو لہرا لہرا کر اشارے کیے تو وہ سب بھی تیزی سے ساحل پر آگئے۔

ربڑ کی کشتی کھینچ کر وہ ساحل پر ہی لے آئے تھے ۔۔۔ اس میں راکٹ لانچر تھے! بمشکل دو منٹ بعد وہ لوگ تیار تھے اور اب ان کی کمان عملاً میرے ہاتھ میں تھی۔ مَیں نے

بڑی پھرتی سے باری باری تمام جوانوں کو چیک کیا اور انھیں لے کر آگے بڑھ گیا۔ عثمان تک ہم لوگ قریباً پندرہ منٹ ہی میں پہنچ گئے تھے خیریت گزری کہ میرے پیچھے وہاں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی اور عثمان بھی جوں کا توں موجود تھا۔ ہمارے نئے ساتھی جو تعداد میں دس تھے ——— چند منٹ ہی میں عمارت کے گرداگرد اس طرح پوزیشن لے چکے تھے کہ وہاں کے مکینوں کے فرار کی کوئی راہ باقی نہیں رہی تھی۔ ہم سب لوگ ٹریگروں پہ انگلیاں رکھے ایک خاص اشارے کے منتظر تھے یہ انتظار بڑا اعصاب شکن تھا۔ خدا خدا کر کے وہ مبارک ساعت بھی آگئی جب دیواروں کے ساتھ ساتھ پھینکے گئے ٹائم بموں نے پھٹنا شروع کر دیا۔

"چارج" میں نے حکم دیا۔

عثمان کا ہاتھ لیور پر دبا اور دروازے کے پرخچے اُڑ گئے۔

——— جوان تو اسی ایک لمحے کا انتظار کر رہے تھے! نعرۂ تکبیر پکارتے ہوئے اندر کُود گئے۔

ہم نے عمارت کے ایک ایک کمرے میں گھس کر اپنے ارمان نکالے۔

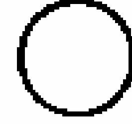
ہم لوگ عمارت کے سامنے والے اور پچھلے حصے پر حملہ آور ہوئے تھے، جو ایک طرح سے الگ بلاک کی شکل اختیار کیے ہوئے تھے۔ راکٹ لانچروں سے فائر آنے لگے تھے۔

اور یہ آپریشن جلد ہی مکمل ہو گیا۔

——— جب ہم دس منٹ بعد واپس پلٹ رہے تھے، اس وقت تک "را" کا مرکز اپنے تمام تر منصوبوں سمیت خس و خاشاک کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکا تھا۔
لیکن اس سے قبل کہ ——— ہم لوگ دشمن کی لاشوں کا شمار کرنے بیٹھتے، ہمیں یہ فکر ستانے لگی کہ جن دھماکوں سے ملکشی کا ناتاپور کا جزیرہ لرز رہا ہے، جانے کتنی دیر میں اس کی گونج بھارتی فوج کو سنائی دے ؟



اور بلا وجہ ہم بھی مرنے کو تیار نہ تھے۔



واپسی کا سفر ہم نے دو گروپوں کی شکل میں کرنا تھا ایک گروپ تو نیول کمانڈوز پر مشتمل تھا اور دوسرے میں عثمان اور میں شامل تھے۔ وہ لوگ تو ساحل کی اس سمت میں لپسپا ہو رہے تھے جہاں ایک تیز رفتار جنگی گن بوٹ ان کی منتظر تھی جبکہ ہمارا رُخ اُس طرف تھا جہاں ماہی گیری کی لانچ پہ بیٹھا ہمارا ساتھی بے چینی سے ہماری راہ تک رہا تھا۔

ابھی ہم دونوں گروپ اس مقام تک ہی بمشکل پہنچے تھے جہاں سے ہمیں اپنی اپنی منزل کی طرف علاحدہ ہونا تھا کہ اچانک خلاف توقع فوجی وہیکلز کی آواز نے ہمارے قدم پکڑ لیے دوسرے ہی لمحے تمام جوان اپنے ہتھیار سنبھال کر مختلف ٹیکریوں کی اوٹ میں مورچہ بند ہو گئے۔

شاید یہاں کوئی یونٹ ڈیپلائے تھی جو ہنگامی پیغام ملنے پر ان لوگوں کی مدد کو آ رہی تھی۔ اندھیرے میں انھوں نے اپنی ہیڈ لائٹس بجھا رکھی تھیں صرف اگلی چھوٹی بتیاں جن پر پہلے ہی رنگ کیا گیا تھا روشن تھیں وہ لوگ ٹیڑھے میڑھے راستے پر ایک جیپ اور ایک ٹرک کے ساتھ ہچکولے کھاتے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ آگے آگے ایک جیپ تھی جس میں کھڑے ایک جوان نے آنکھوں سے دوربین لگا رکھی تھی باقی لوگ مستعد بیٹھے تھے اور ان کے پیچھے ٹرک میں جس پر مشین گن نصب تھی ان کے دوسرے ساتھی ہنگامی مدد کے لیے آ رہے تھے۔

میری کوشش یہی تھی کہ ہنگامے سے گریز کیا جائے اور کسی بھی طرح ہم لوگ ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر وہاں سے نکل جائیں لیکن وہ بھی خاصے ہوشیار نظر آتے تھے۔ ہم سے تھوڑے فاصلے پر ہی وہ رک گئے۔ ٹرک سے بھارتی فوجی چھلانگیں لگا کر نیچے اُترنے لگے جیپ میں کھڑا ان کا آفیسر انھیں چلا چلا کر پوزیشن الاٹ کر رہا تھا۔ پھر انھوں نے بڑے منظّم

اندازے جیپ کو تین اطراف سے گھیرے میں لے کر آگے بڑھنا شروع کیا ۔انھوں نے بالکل وہی انداز اختیار کیا تھا جیسا عموماً آرٹلری ایڈوانس کے وقت اپنائی ہے جیپ کو ایک طرح سے ٹینک کی حیثیت حاصل تھی جس کی آڑ میں وہ آگے بڑھ رہے تھے ٹرک میں لگی مشین گن کے پیچھے ایک لوہے کا ٹوپ نظر آرہا تھا اسے شاید ان لوگوں نے کور نگ فائر کے لیے یہاں کھڑا کیا تھا۔

ایڈوانس کرنے والے سپاہیوں کے پاس عام نوعیّت کی آٹومیٹک رائفلیں ہی تھیں یہ کوئی باقاعدہ تیاری سے آنے والی فوج تو تھی نہیں وہ لوگ تو اچانک ہنگامی پیغام ملنے پر ہر اول امدادی دستے کی حیثیت سے آگئے تھے ہمیں اُمید تھی کہ اصل فوج ان کے پیچھے آرہی ہوگی۔

اب سوائے مقابلے کے اور چارہ نہیں تھا ۔میرے ساتھ نیول کمانڈوز کا گروپ کمانڈر لیٹا ہوا تھا میرا اشارہ پاتے ہی وہ ٹرک کی طرف رینگ گیا، باقی جوانوں کو میں نے ایسی پوزیشن میں بٹھا دیا کہ اب ایڈوانس کرنے والے قدم بہ قدم ان کے نرغے میں پھنسنے کے لیے ان کے نزدیک سے نزدیک تر ہوتے جارہے تھے۔میں خود اندازے کے مطابق ان سرکنڈوں کے جھنڈ میں جا گھسا جہاں سے جیپ کو گزرنا تھا۔

یہ ساری کمپنی بمشکل پندرہ بیس سپاہیوں پر مشتمل تھی ۔میرے ساتھی میرے سگنل کے منتظر تھے میں نے گرنیڈ سے پن نکال کر اسے پھینکنے کی پوزیشن میں تیار کر لیا۔ جیسے ہی بدقسمت جیپ میری رینج میں آئی میں نے اللہ کو یاد کیا اور پہلا گرنیڈ اس پہ اُچھال دیا۔ پھر یکے بعد دیگرے دو اور گرنیڈ بھی پرخچے اڑاتی جیپ پہ اُچھالے جو بہت بڑے غبارے کی طرح پھٹ کر اپنے سواروں سمیت منتشر ہو چکی تھی ۔

یہی ردّ عمل دوسری طرف اس ٹرک کے ساتھ گروپ کمانڈر نے دہرایا ۔اس کے ساتھ ہی ہمارے جوان قہرمان دیوتا بن کر اُن پر آگ اگلنے لگے ۔محض تین یا چار منٹ کی

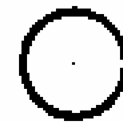


تیز ترین کارروائی نے ان کا نام و نشان مٹا دیا۔اب وہاں جھلسی ہوئی زمین تھی ۔آگ میں دھڑا دھڑ جلتے ٹرک اور جیپ کے ڈھانچے یا پھر کہیں اوندھے کہیں سیدھے منہ پڑی بھارتی سپاہیوں کی حیرت زدہ لاشیں ۔ان بے چاروں کو بمشکل ہی چند گولیاں فائر کرنے کی مہلت نصیب ہوئی تھی۔

میرے دوست میرے گرداگرد جمع تھے اور اگلے حکم کے منتظر۔

"خدا حافظ دوستو!۔۔۔۔ میں نے ان کے گروپ کمانڈر کی پیٹھ پر تھپکی دے کر انھیں آگے بڑھایا ۔

۔۔۔۔ جاتے وقت انھیں صرف ہم دونوں کی فکر دامن گیر تھی کیونکہ ہم دشمن کے عین درمیان سے گزر کر جارہے تھے ۔جبکہ وہ سمندر کی پناہ میں کسی حد تک محفوظ تھے ۔رات کے وقت سوائے خاص نوعیّت کے جہازوں کے اور کوئی جہاز انھیں کھوجنے سے قاصر تھے اور جب تک دشمن کی نیوی کے دیو ہیکل جہاز ان کی خبر لینے کو آتے وہ اپنی تیز رفتار ہلکی پھلکی گن بوٹ میں محفوظ پانیوں تک پہنچ جاتے۔



ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اندھیرے کا حصّہ بن کر غائب ہوگئے اب میں اور عثمان اپنی لانچ کی طرف جارہے تھے۔ ہمارے پاس دو اسٹین گنیں یا پھر کچھ ہینڈ گرنیڈ اور ایک آدھ دھواں پیدا کرنے والا بم تھے۔

۔۔۔۔ دوستوں سے علاحدگی کے وقت یہ بات میرے ذہن میں تھی کہ ہم بُری طرح گھیرے میں آچکے ہیں اور لانچ تک پہنچ جانا کوئی اتنا آسان نہیں تھا۔ دشمن اس علاقے کی ایک ایک انچ زمین سونگھتا پھر رہا ہوگا ۔عثمان کو میں نے کچھ مخصوص داؤ بتا کر اپنے تعاقب میں لگا لیا تھا۔ اور خود اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ ہمارے درمیان کچھ فاصلہ بہر حال موجود تھا واپسی کے لیے ہم نے پہلے سے مقرر کردہ راستہ اپنایا تھا۔ کیونکہ اس راستے کو مدِّ نظر رکھ کر ہم نے اپنی حکمتِ عملی ترتیب دی تھی جس پہ ہمارے کامیابی سے فرار کا انحصار تھا۔

ہمارا ایک جانباز بھی ان ہی راستوں کے آس پاس کہیں موجود ہماری نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے آخری دم تک ہم سے پوشیدہ رہ کر ہماری حفاظت کے فرائض انجام دیئے تھے۔ یہ ایک طرح سے ہمارا پہلا دفاعی قلعہ تھا جس میں ہمیں پناہ ملتی اور آخری دفاعی حصار تھا لانچ پر لگی ہوئی مشین گن جس کے گرد ہمارا دوسرا مستعد ساتھی چشم براہ تھا۔ دھماکوں کی آوازیں یقیناً انھوں نے بھی سُن لی ہوں گی اور اس کے بعد سے ان پر کیا گزر رہی ہو گی۔ اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھوں نے اس کارزارِ عشق میں قدم رکھا ہو۔

ہم ابھی ساحل کے اس مقام سے جہاں لانچ ہماری منتظر تھی بمشکل ایک آدھ فرلانگ دور ہی تھے کہ اچانک فضا تھرا اٹھی۔

"ہالٹ۔ ہالٹ۔ ہالٹ۔ ہالٹ" ——— ہمارے چاروں اطراف سے گونج سنائی دے رہی تھی۔

ہم چاروں طرف سے گھیرے میں آچکے تھے اور وہاں پہلے سے "ناکہ بند" فوجی دستے کے گھیرے میں پھنس چکے تھے۔

سوائے ہتھیار پھینکنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ کوئی بھی غیر معمولی حرکت ہم دونوں کی جان لے لیتی۔ میری تقلید میں عثمان نے بھی اسٹین گن پھینک دی اور ہاتھ اُٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ ٹارچوں کی تیز روشنی نے ہماری آنکھیں چندھیا دیں اور جب ہم کچھ دیکھنے کے قابل ہُوئے تو چاروں اطراف مختلف نوعیت کی گنیں چھپائے بھارتی فوجی دستے دکھائی دیے۔ ان کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا اور وہ کسی خاص حکم کے تحت ہی ابھی تک خاموش تھے ورنہ ہماری تکا بوٹی کرنے کے موڈ میں نظر آرہے تھے!! ہم نے انھیں معمولی دُکھ تو نہیں پہنچایا تھا۔

ایک جھاڑی کی اوٹ سے ان کا کمانڈر نکل کر سامنے آیا اور دیکھتے ہی ہم پر حیرتوں کا سمندر لوٹ پڑا۔ جی ہاں۔ وہ لمحہ ہی ایسا تھا۔



ہمارے سامنے وردی میں ملبوس کیپٹن شرما کھڑا تھا۔ آنجہانی کیپٹن شرما۔ جو ہمارے خیالوں کے مطابق مشرقی پاکستان ہی میں جہنم رسید ہو چکا تھا۔ قبروں سے مردے جی اٹھنے کا محاورہ تو سن رکھا تھا لیکن شمشان گھاٹ سے بھی راکھ اور ہڈیوں میں جان پڑ جاتی ہے؟ — یہی تھی وہ واحد سوچ جو اس لمحے مجھ پر غالب تھی۔

"ویل کم لیفٹیننٹ علی" ایک زہریلی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل رہی تھی۔

"سیم ٹو یو" مَیں نے باقاعدہ اپنا ہاتھ بھی مصافحے کے لیے بڑھا دیا۔

اچانک اس طرح زندہ ہو کر اپنی دانست میں کیپٹن شرما نے مجھے بڑا زبردست نفسیاتی جھٹکا لگایا تھا اور یہ تھی بھی کسی حد تک حقیقت۔ ابھی تک میں دریائے حیرت ہی میں غوطہ زن تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آخر وہ ہمارے جوانوں کے ہاتھوں سے کس طرح بچ کر نکل آیا تھا جب کہ مَیں نے خود دو تیز رفتار کشتیاں اس کے تعاقب میں بھیجی تھیں اور ان کے پاس کوئی ایسا اسلحہ بھی نہیں تھا کہ کیپٹن شرما اور اس کے ساتھی مقابلہ کر کے فرار ہو سکیں۔ دریا کے دونوں اطراف ہماری افواج مورچہ زن تھیں اس طرح فرار کے راستے بھی مسدود تھے صرف ایک دریائی راستہ ہی محفوظ رہ جاتا تھا لیکن اس پر بھی ہمارے برق رفتار جوان اس کے تعاقب میں تھے۔ اس کے باوجود میں اس پر اپنے کسی بھی عمل سے اپنی کسی بھی کمزوری کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات یوں بھی میری شانِ مردانگی کے خلاف تھی اور میری تربیت سے تو بالکل ہی لگا نہیں کھاتی تھی۔

"اگر مرنا ہی ہے تو کیوں نہ باوقار موت قبول کی جائے؟ گڑگڑانے یا التجائیں کرنے سے دشمن اپنا فیصلہ تبدیل کرنے سے تو رہا پھر اس بات کو بھی ہمیشہ مدِنظر رکھیے کہ یہ مردِ مومن کی شان نہیں کہ وہ دشمن سے رحم کی بھیک مانگے" میرے "سر" نے لاشعور کی اوٹ سے انگڑائی لی۔

میرا یہ عمل شاید کسی حد تک غیر اختیاری بھی تھا۔ کیپٹن شرما نے بھی کسی ہچکچاہٹ کا

مظاہرہ کیے بغیر اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ہم دونوں کی گرفت میں یوں تو ایک سی سختی چھپی تھی لیکن اس امر کا احساس مجھے بہرحال تھا کہ یہاں معاملہ غالب اور مغلوب والا ہے۔

"تمہارے متعلق ہمیں وہ کچھ معلوم ہے جو شاید تم خود بھی اپنے تئیں نہیں جانتے۔ تمہارے جنم سے لے کر یہاں تک پہنچنے کے ایک ایک لمحے کی کہانی۔ سب کچھ ہماری نظر میں ہے مسٹر علی! مَیں اگر چاہتا تو بنگلہ دیش ہی میں تمہیں کتے کی موت مار ڈالتا لیکن ہمارے بھی تمہاری طرح کچھ اصول ہیں، میری بہرحال یہ کوشش رہی ہے کہ مَیں کلکتہ میں تمہارے تعلقات جان سکوں۔"

"اور اس میں تم کامیاب رہے۔" مَیں نے اس لمحے سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

"ہاں۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ ہم نے تمہیں سیالدہ کے بعد مس کر دیا لیکن اب بہرحال تم ہماری گرفت میں ہو۔" اس نے اپنا ہاتھ مونچھوں پر پھیرا۔

"یہ صرف 'اتفاق' ہے مسٹر شرما۔" میں پھنکارا۔

"ہاں! بالکل ایسے ہی ایک حسین اتفاق سے ہم پہلے بھی دوچار ہو چکے ہیں، جب تمہاری مخبری پر تمہارے جیالے میرے تعاقب میں دنیا کھنگال رہے تھے۔ مَیں ایک درخت کی شاخوں میں بیٹھا یہ تماشا دیکھ رہا تھا اور وہ بے چارے "فریڈم فائٹرز" مارے گئے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے آزادی یونہی تو ملنے سے رہی۔" اس مرتبہ اس نے ہلکا سا قہقہہ بھی لگایا تھا۔

"مسٹر شرما! میں پندرہ منٹ سے زیادہ تمہاری قید میں نہیں رہوں گا۔" مَیں نے بڑے بھرپور اعتماد سے ہوا میں تیر چلایا اور اپنی بات کا ردِعمل مجھے شرما کے چہرے پر ایک لمحے کو بدلتے رنگ کی شکل میں دکھائی پڑا۔

"ہاں! ہاں! تم اب ایسی ہی باتیں کرو گے۔ ایک بوکھلائے ہوئے انسان سے اسی کی توقع ہوگی۔" وہ فوراً سنبھل گیا۔

"مسٹر شرما! تمہیں فوجی نہیں ادب کا طالب علم ہونا چاہیے تھا۔ فقرے خوبصورت کہہ لیتے ہو۔" اس مرتبہ قہقہہ لگانے کی باری میری تھی۔



عثمان ہم دونوں کی صورتیں ٹکرٹکر دیکھ رہا تھا۔ ایسا جاندار ڈرامہ اور شاندار ڈائیلاگ اس نے پہلے کب دیکھے سنے تھے۔

"لیفٹیننٹ علی! تمہیں پندرہ منٹ سے پہلے ہم جہنم واصل کر دیں گے۔ اتنی مہلت کو غنیمت جانو۔ اس کی وجہ بھی صرف یہ ہے کہ یہ ہماری دوسری ملاقات ہے اور دشمن ہوتے ہوئے بھی ہم بہرحال انسان ہیں۔ ہماری ہائی کمان کے احکام تمہارے متعلق بہت سخت ہیں اتنی مہلت دینے پر ممکن ہے میرا کورٹ مارشل ہو جائے کیونکہ تم نے ابھی ابھی ہماری غفلت سے فائدہ اٹھا کر ہم پر بڑا کاری وار کیا ہے۔ NOW GO TO HELL" اتنا کہہ کر وہ ایک طرف ہٹ گیا۔

مَیں نے کندھے اچکائے اور ان سپاہیوں کے آگے آگے چل دیا جنھوں نے میرے پیچھے اسٹین گنز تان رکھی تھیں۔ ابھی تک شرما نے عثمان کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ مَیں نے آنکھوں آنکھوں میں اسے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ عثمان کے قدم بھی میرے ساتھ اٹھے۔ کیپٹن شرما اور اس کے سپاہیوں نے اس پر کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا۔ شاید وہ یہی چاہتے تھے۔

انھوں نے ہمیں ایک کھلی ورین نما جیپ میں بٹھایا۔ ایک سیٹ پر ہم دونوں بیٹھے تھے اور ہمارے سامنے والی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ ایک حوالدار بیٹھا تھا اور ہمارے اور ان کے درمیان شیشے کی دیوار حائل تھی۔

"مسٹر علی تمہیں بھاگنے کی مکمل اجازت ہے۔" کیپٹن شرما نے میرا تمسخر اڑایا۔

مَیں چپکا ہو رہا وہ واپس مڑ گیا۔

——— اس کو یہ بات کہنے اور میرا تمسخر اڑانے کا پورا حق حاصل تھا کیونکہ ہمارے آگے ایک جیپ اور پیچھے ٹرک آرہا تھا جس پر مسلح اور چاق و چوبند جوان کسی بھی ناگہانی آفت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ میرے دل سے ایک ہی دعا نکل رہی تھی "خدایا

یہ لوگ واپسی کے لیے وہی راستہ اختیار کریں جس پر ہمارا ساتھی ہمارا منتظر ہے۔"

—— دراصل ہمیں چند لمحوں کی مہلت درکار تھی۔ صرف چند لمحات کے لیے اگر فرصت میسّر آجاتی تو ہم وہ کچھ کر گزرتے جس کا تصوّر بھی کیپٹن شرما نے کبھی نہ کیا ہو۔ میرا خمیر بڑی نرم مٹی سے اٹھا تھا۔ مجھے مارنا ہی نہیں جی داروں کی طرح مرنا بھی آتا تھا۔ میرے لاشعور میں خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ایسے انہونے حالات میرے لیے کوئی انجانی چیز بھی نہیں تھے۔ میں اکیلا ہوتا تو یوں گلے کی طرح شرما مجھے باندھ کر نہ لے جاتا۔ بس ایک عثمان کے ساتھ نے مجھے کچھ زیادہ ہی مصلحت پسند بنا دیا تھا۔ میں ہر قدم اٹھانے سے پہلے اب یہ بھی ضرور سوچ لیتا تھا کہیں دو بیلوں کی لڑائی میں عثمان نہ پس جائے۔ یہی وجہ تھی کہ شرما کو میں نے اتنی دیر تک خوش ہونے کا موقع دیا تھا لیکن ڈیگن نما پک اپ میں سوار ہوتے ہی عثمان نے بڑی عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔ شاید اس نے میری اندرونی کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔ اس کی آنکھیں مجھ سے کہہ رہی تھیں: "بھیا میری خاطر اپنی روایات کو نظر انداز نہ کر دینا۔ مجھے تو آج یا کل بہر حال اپنا منصب پانا ہی ہوگا —— وہی منصب جس کے لیے میں نے ہی نہیں مجھ جیسے کئی ماؤں کے سپوتوں نے اپنا آپ تیاگا ہے۔"

"بھائی میری پروا نہ کرنا!" اس نے انگریزی میں ایک سرگوشی اس وقت میری طرف لڑھکا دی۔ جب ہماری گاڑی کسی پتھر سے نیچے اترتے ہوئے ذرا سی کانپی تھی۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تھپکی دی۔ اس تھپکی کا خاموش مفہوم جان کر اس نے اطمینان کی سانس بھی لی تھی۔ یہ ایک طرح سے کیپٹن شرما کا احسان تھا کہ اس نے ہماری آنکھیں اور ہاتھ نہیں باندھے تھے۔ اس کی وجہ اس کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خود اعتمادی تو تھی ہی لیکن ایک طرح سے اس امر کو انجام دینے میں اس کی انانیت بھی آڑے آئی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور آفیسر بھی اگر اس نفسیاتی پس منظر سے گزرتا تو اس کا عمل مختلف ہرگز نہ ہوتا۔



ہماری دعائیں مستجاب ہوئیں شاید اس لیے کہ ہم نیکی کی راہ کے مسافر تھے۔ بقا کی لڑائی لڑنے والے یا پھر قدرت کو ہماری حالت پر رحم آگیا تھا۔ انھوں نے وہی راستہ اختیار کیا تھا جسے واپسی کے لیے ہم چُن چکے تھے: ہمیں اصولاً اب سے خاصی دیر پہلے اپنے ساتھیوں تک پہنچ جانا چاہیئے تھا —— اب تک نہ پہنچنے کا مطلب ہمارے ساتھی بخوبی جانتے تھے اور انھوں نے حالات کی سنگینی کا اندازہ کرتے ہی اپنا کام شروع کر دیا تھا۔

جیسے جیسے ہم اس مقام سے قریب ہوتے جا رہے تھے جہاں ہمارا ساتھی ہماری واپسی کا منتظر تھا میرے خون کی حدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا پھر اچانک میری شریانوں میں انگارے تڑپنے لگے۔ عثمان بھی یقیناً کچھ ایسی ہی کیفیت سے گزرا ہوگا اور جیسے ہی جیپ نے ایک جھاڑیوں کے جھنڈ کے گرد نیم دائرے میں گھوم کر آگے نکلنا چاہا اس پہ جہنّم کا دہانہ کھُل گیا۔

—— ہلکی مشین گن کی فائرنگ سے میں نے فوراً اندازہ لگا لیا تھا کہ ہمارا لانچ والا جانباز بھی اپنے ساتھی کی مدد کو آگیا ہے اور یہ بڑی بات تھی۔ ہمارے حوصلے دو چند ہو گئے۔ وین کے ڈرائیور نے خاصی مشّاقی کا مظاہرہ کیا تھا اس کے بریک اچانک اس طرح لگے جیسے اس نے پیڈلوں کے بجائے ہینڈ بریک کا ایمرجنسی استعمال کیا ہو۔ یہ دھچکہ ہمارے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ سامنے بیٹھے دونوں سپاہی جھٹکے سے ہلے اور آگے کی سمت جھکے۔ ہلے تو ہم بھی تھے لیکن اس طرح نہیں جیسے وہ دونوں —— میرے جھٹکا کھانے کا بھی ایک مخصوص انداز تھا اور عثمان کو تو جیسے الہام ہو گیا تھا کہ میں اب کچھ نہ کچھ ضرور کر گزروں گا۔ وہ تو فرمانبردار بچوں کی طرح گاڑی کے فرش پر ہم تینوں کے قدموں میں بچھ گیا۔

میں اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ان کی طرف جھکا۔ بالکل ایسے جیسے ان کے منہ نوچ لینے کا ارادہ ہو حالانکہ میرا قطعاً ایسا ارادہ نہیں تھا۔ میرے دونوں ہاتھ جس شدّت سے کھلے تھے اس سے زیادہ شدت سے بند ہوئے لیکن یونہی نہیں۔ بند ہونے سے پہلے دونوں

گردنیں میری ہتھیلیوں اور انگلیوں کے شکنجے میں کَسی جاچکی تھیں انھوں نے سنبھلنا چاہا لیکن کہاں اتنی مہلت انھیں کون کا فر دیتا۔ دونوں کے سر مَیں نے پوری قوت سے ٹکرا دیے اگر انھوں نے فولادی خود پہنے ہوتے تو کوئی بات تھی۔ ان کے سروں پر تو موٹے کپڑوں کی ٹوپیاں تھیں جن کی حیثیت کاغذ کی دیوار سے زیادہ ہرگز نہیں تھی۔ ان کے سر آپس میں ٹکرانے سے ایسی آواز پیدا ہوئی تھی جیسی دو منہ زور مینڈھوں کے آپس میں ٹکرانے سے ہوتی ہے۔ پہلے ہی ٹکراؤ نے ان کے کس بل نکال دیے تھے اور ان کی گردنیں توریوں کی طرح لٹک گئی تھیں لیکن حفظِ ماتقدم کے طور پر مَیں نے دوبارہ ان کے بھیجے آپس میں بجا کر رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

اس عمل کو انجام دینے میں بمشکل چند سیکنڈ لگے تھے۔

ـــــ ابھی تک پچھلا ٹرک ناگہانی آفت سے سنبھلنے کے لیے اندھے بھینسے کی طرح دائیں بائیں ہلکورے لے رہا تھا۔ ان غنیمت لمحوں سے فائدہ نہ اٹھانا کفرانِ نعمت کے مترادف تھا ـــــ مجھ سے پہلے عثمان ایک سپاہی کی اسٹین گن پر قبضہ کر چکا تھا۔ دوسرے کی گن اٹھانے کی سعادت میرے نصیب میں آئی۔

ڈگمگاتی وین میں سے ہم ایک ساتھ جھاڑیوں کے جھنڈ میں کود گئے جس مقام پہ ہم دونوں گرے اور گر کر سنبھلے تھے وہاں سے بمشکل چند فٹ کے فاصلے پر ہمارے ساتھی نے ان پہ جہنم کا دہانہ کھول رکھا تھا۔

"اس طرف جناب" اس نے اپنی بیٹھ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس کے لہجے میں چھپے سکون اور اعتماد سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اکیلا نہیں اپنی ذات میں ایک بریگیڈ تھا۔ یہ ہمارا لانچ والا دوست تھا جسے دوسرے ساتھی نے ہنگامی مدد کے لیے یہیں بُلا لیا تھا۔ ابھی تک وہ لوگ صرف جیپ پہ فائرنگ کر رہے تھے پچھلے دونوں وہیکلز کو انھوں حفظِ ماتقدم کے طور پر چھیڑا ابھی نہیں تھا کیونکہ ان کے خیال میں ہم انھی دونوں گاڑیوں میں سے کسی ایک میں ہو سکتے تھے۔



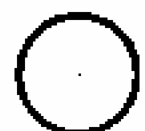
ہمارے دوسرے ساتھی نے ہمیں باہر چھلانگ لگاتے دیکھ کر اسٹین گن پھینکی اور یکے بعد دیگرے وہ وین اور ٹرک پر دستی بم پھینکنے لگا۔ کیپٹن شرما شاید خود اعتمادی کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ان کی اپنی سرزمین پر ہمارے جانباز اتنی دیدہ دلیری کا مظاہرہ کر گزریں گے۔

ہماری رہائی کے لیے کسی حملے کے امکان کو اس نے رَد نہیں کیا ہوگا لیکن اسطرح اچانک اور اتنی تیزی کے ساتھ ہمارے دوستوں کے حرکت میں آجانے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی بڑھی ہوئی خود اعتمادی نے بالآخر اسے مروا دیا۔

عثمان اور مَیں نے بجائے اپنے محسن کی ہدایات پر عمل کرنے کے "اُس طرف" THAT WAY اپنایا اور چند سیکنڈ میں اسٹین گنیں خالی کر دیں۔ تین چار منٹ کوئی اتنا زیادہ وقفہ نہیں ہوتا کہ بوکھلائی ہوئی فوج رات کے اندھیرے میں دشمن کی پوزیشن کا اندازہ لگا کر سنبھل سکے۔ گاڑیوں کے جلتے ڈھانچوں سے کچھ سلگتے چیختے چلاتے باہر ضرور گرے تھے لیکن انھوں نے مقابلہ کرنے کی بجائے جان بچانے میں عافیت جانی تھی اور وہ لڑھکنیاں کھاتے ہم سے دُور سے دُور تر ہٹتے چلے گئے تھے۔ ہم نے انھیں شکار کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔

مارنا اور زندہ رکھنا انسان کے بس میں نہیں ہوتا۔ جس کا بہترین ثبوت ہم خود تھے۔ وہ لوگ جو ہمیں مارنے آئے تھے اب ہمارے ہاتھوں بے ضرر کیڑوں کی طرح مر رہے تھے۔

موت کو اتنا قریب دیکھ کر ایک تو انسان فطرتاً دلیر ہو جاتا ہے اور جب موت کے منہ سے وہ بار بار بچ نکلے تو یہ دلیری دوچند ہو جاتی ہے ـــــ اس روز مجھے پہلی بار اس بات کا "عین الیقین" ہوا کہ مارنے والے سے بچانے والا واقعی زیادہ قوت رکھتا ہے۔



ابھی تک تو ہمارا محفوظ رہنا ہی معجزہ تھا ـــــ لیکن اس سے زیادہ مہلت کی توقع

رکھنا پاگل پن ہوتا۔

——— ہم نے مرنے والوں اور مرتے ہوئے بھارتی سورماؤں کو ان کے حال پر چھوڑا اور اپنی کمین گاہ کا رُخ کیا۔ مقامی دوستوں میں سے ایک ہماری رہنمائی کر رہا تھا اور ہم تینوں اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ لانچ کے نزدیک پہنچ کر میں نے یہی سمجھا کہ "اب اس میں بیٹھ کر ہم یہ "آبی جہنم" عبور کریں گے"، لیکن ابھی بمشکل میں نے پہلا قدم ہی پانی کی طرف بڑھایا تھا جب اُسی دوست کی آواز عقب سے سنائی دی۔

"نہیں جناب۔ ہمیں افسوس ہے کہ مہمانوں کو تکلیف دے رہے ہیں۔ اب یہ سمندر ہمارے لیے محفوظ نہیں رہا۔"

مجھے فوراً اس کی بات سمجھ آگئی، اس نے واقعی ٹھیک ہی تو کہا تھا بھلا اتنی دیر میں یہ کیسے ممکن تھا کہ دشمنوں نے ہمارے فرار کی تمام راہیں مسدود نہ کر رکھی ہوں۔ "اوہ! شکریہ" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

ان میں سے ایک لانچ میں داخل ہوا اور بمشکل ڈیڑھ دو منٹ بعد اس کی واپسی دو خوراک کے ایمرجنسی تھیلوں اور ایک ایمونیشن کے تھیلے کے ساتھ ہوئی۔ دونوں تھیلے میں تھما کر وہ لانچ میں دوبارہ داخل ہو گیا۔ پھر میں نے انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سُنی اور اس کے ساتھ ہی سماعت سے اس سے ملتی جلتی ایک اور آواز ٹکرائی۔ میرے کانوں نے دونوں آوازیں ذہن کو منتقل کر دیں اور دوسرے ہی لمحے میں سناٹے میں آگیا: ذہن کا فیصلہ کچھ ایسا ہی خوفناک تھا۔

جی ہاں۔ وہ کوئی عام سمندری لانچ نہیں تھی۔ بحریہ کی گن بوٹ تھی۔ ان گن بوٹس میں سے ایک جو ہمیں گھیرے میں لینے کے لیے اس ساحلی علاقے کی طرف آ رہی تھیں۔ لانچ کا رُخ ہمارے ساتھی نے کھلے پانیوں کی طرف کر دیا تھا۔ جیسے ہی انجنوں نے طاقت پکڑی میں نے اسے چھلانگ لگا کر پانی میں گرتے دیکھا۔ چند منٹ بعد وہ ہمارے قریب موجود تھا۔



لانچ منہ اٹھائے سیدھی بھاگی جا رہی تھی۔ قریب پہنچتے ہی وہ بھی ہمارے ساتھ ساحلی جھاڑیوں میں دبک کر بیٹھ رہا۔ ان کے منصوبے کی مجھے فوراً سمجھ آگئی تھی اور میں دل ہی دل میں اس پر عش عش کر اٹھا۔ ابھی لانچ بمشکل سو ڈیڑھ سو گز دُور ہی پہنچی تھی۔ جب ہم نے اسکی مخالف سمت سے سمندر کے پانیوں میں ایک گن بوٹ کو ابھرتے دیکھا۔ روشنی میں نہائی ہوئی گن بوٹ کے اگلے حصے میں نیوی کے جوان پوزیشنیں سنبھالے کھڑے تھے اور اس کے پہلوؤں سے مشین گنوں کی قہر برسانے والی نالیاں جھانکتی دکھائی دے رہی تھیں۔

گن بوٹ کے سائرن چیخنے لگے۔ یہ وارننگ تھی جو وہ لانچ والوں کو رُکنے کے لیے دے رہے تھے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ لانچ والوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگی تو وہ تیزی سے اس کی سمت بڑھے۔ میں اور عثمان اندھیرے میں نظریں جمائے اس نظارے میں محو تھے جب کہ ہمارے دونوں مقامی دوست بار بار اپنے بازوؤں سے بندھی گھڑیوں میں ناچتی سوئیوں کا نظّارا کر رہے تھے۔

گن بوٹ اب لانچ کے انتہائی قریب پہنچ گئی تھی۔ اتنی نزدیک کہ ہم نے نیوی کے چست چالاک جوانوں کو چھلانگیں لگا کر اس پر کودتے دیکھا۔ وہ لانچ پر پہنچ چکے تھے جب کہ گن بوٹ اس کے پہلو سے لگی اس کے سامنے سے نیم دائرے میں چکر کاٹ کر اسے روکنے کی فکر کر رہی تھی۔ ابھی وہ لانچ کے سامنے ہی پہنچی تھی اور ہم لانچ کے ساتھ اسکے ٹکراؤ کے منتظر تھے کہ ایک قیامت گزر گئی۔

وہ دھماکا اتنا ہی زوردار تھا جیسے کسی بحری جہاز کی بڑی توپ نے فائر کیا ہو۔ دھماکہ لانچ میں لگے اس ٹائم بم کا کرشمہ تھا۔ جس پر چند منٹ کا ٹائم لگا کر ہمارا دوست یہاں بیٹھا تھا۔ لانچ کے ساتھ ہی گن بوٹ کے بھی پرخچے اڑے تھے۔ ہم نے نیوی کے جوانوں کو فضا میں گیند کی طرح اچھلتے اور سمندر میں گرتے دیکھا ——— اب ہم وہی نظّارا سمندر میں دیکھ رہے تھے جو چند منٹ پہلے خشکی پر دیکھ چکے تھے۔ خوشی سے بے قابو ہو کر باری باری ایک

صرف ہمارے مقامی ساتھی ہی تھے جن کے اشارے پر ہم آنکھیں بند کیے عمل کر رہے تھے سپیدۂ سحر نمودار ہونے تک ہمارا یہ اندھا سفر جاری رہا۔ ہم نے شاید پندرہ بیس میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا اور اب تک راستے میں بمشکل دو دفعہ ہی کسی آبادی کے قریب سے گزرے تھے ـــــــ اگر وہ واقعی آبادی تھی۔

یہ آبادیاں جھونپڑوں کی شکل میں ہوتی تھیں۔ شاید ماہی گیروں کی بستیاں تھیں۔

ـــــــ پو پھٹنے تک ہم ایک محفوظ ٹھکانے پر پہنچ چکے تھے۔ یہ ایک خشک قطعہ زمین تھا جس تک پہنچنے کے لیے ہمیں کمر کمر تک پانی سے گزر کر یہاں آنا پڑا تھا۔ راستے میں بھی کئی جگہ گھٹنوں گھٹنوں پانی سے گزر کر یہاں تک پہنچے تھے لیکن اس مرتبہ معاملہ ذرا مختلف تھا۔ پانی میں قدم رکھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کانٹوں کی سیج پر چل رہا ہوں یقیناً باقی دوستوں کا بھی یہی حال ہوگا ـــــــ یہ کانٹے پاؤں سے اب اوپر کی طرف چلنے لگے تھے اور اپنے ساتھ وہ ایسی ٹیسیں بھی لیے ہوئے تھے جو میری ٹانگوں سے اٹھ رہی تھیں۔ یہ تکلیف اب کمر تک آ پہنچی تھی لیکن خوش قسمتی سے پانی کے اندر ہی تھی پانی سے باہر والا جسمانی حصہ اس آفت سے محفوظ رہا۔

میرے ساتھیوں نے کئی مرتبہ بے چینی سے اپنے ہاتھ جسموں پر مارے تھے لیکن اس چکر میں جب ایک تھیلا گرتے گرتے بچا تو وہ بھی استقامت سے میری تقلید کرنے لگے۔ خوراک والا تھیلا میں نے اٹھا رکھا تھا جب کہ ایمونیشن والا ایک مقامی دوست نے، عثمان اور دوسرے دوست نے اسٹین گنیں سروں سے اوپر کر رکھی تھیں۔ یہ عذاب ہم نے تقریباً گھنٹہ بھر تک جھیلا۔ خدا خدا کر کے اس جان لیوا مہم کا آخر خاتمہ ہوا۔

جزیرے پر پہنچتے ہی میرے ساتھی بے دم ہو کر گر پڑے میرے اوسان البتہ بحال تھے۔

ـــــــ صبح کی آمد کا مژدہ سناتی روپہلی کرنیں پانیوں کو چوم چوم کر ان پر مچل رہی



دوسرے سے لپٹ گئے۔

"NOW COME ON SIR" ہمارے ساتھی نے ہمیں حقائق کی دنیا میں واپس لاتے ہوئے کہا۔

وہ آگے آگے تھا اور ہم اس کی تقلید میں اس کے پیچھے! جھاڑیاں، درخت، ریت، کیچڑ، پانی، سرکنڈے، بے آب و گیاہ پتھریلا پہاڑی سلسلہ ہمیں کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی۔ ہم تو بس اپنی جان بچانے کے لیے دیوانہ وار چلے جا رہے تھے۔ بقا کا جذبہ تمام تکالیف پر حاوی تھا۔ قریباً پون گھنٹہ چلنے کے بعد ہمارے عقب میں سیاہی مائل اندھیارے آسمان کے سینے سے دھاڑیں مارتے دو ہیلی کاپٹر برآمد ہوئے۔ جن کے پہلوؤں سے سُرخ لائیٹس کی تیز روشنیاں بھی ہماری سمت لپک رہی تھیں۔

یہ گن شپ ہیلی کاپٹر تھے جو ہمیں کھوجنے چلے آئے تھے۔ اس سے پہلے کچھ "ایلائنز" جہازوں کو ہم نے سمندر کے کھلے پانیوں پر مغز ماری کرتے بھی دیکھا تھا۔ دشمن نے آبدوز کے ذریعے ہمارے فرار کے امکانات کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔ یہ جہاز خصوصی طور پر آبدوزوں کا پتہ لگانے کے لیے پرواز کرتے ہیں۔

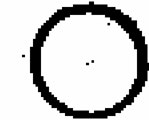
ہم اس وقت ایک جزیرہ نما پر موجود تھے۔ جہاں آسمان سے باتیں کرتی جنگلی گھاس تھی اور بڑے بڑے نوکیلے پتوں والے درخت جن میں سے دن کے وقت بھی روشنی بمشکل چھن کر اندر آتی تھی۔ ہمارے اردگرد ہیلی کاپٹر اپنی بے سود روشنیاں پھینک رہے تھے۔ ہم گھاس کے جھنڈ میں ایک دوسرے سے لگے دبک کر بیٹھے اسی کا ایک حصہ دکھائی دے رہے تھے ـــــــ دو تین چکر کاٹ کر اور اپنا اچھا خاصا پٹرول پھونکنے کے بعد ہیلی کاپٹر واپس اسی طرف چلے گئے جس طرف سے آئے تھے۔

ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا۔

میری طرح عثمان کی معلومات بھی اس علاقے کے متعلق نہ ہونے کے برابر تھیں۔

تھیں اور دُور دُور تک پھیلا پانی اب موتیوں کا ایسا جزیرہ دکھائی دینے لگا تھا جس کی لہریں نگینوں سے تراشی گئی ہوں ـــــ ہمارے جھلملاتے عکس پانی میں لرزتے، سنبھلتے، ہمارے ساتھ ساتھ یہاں تک چلے آئے تھے۔

درختوں کے ایک جھنڈ میں ہم دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے۔ دونوں تھیلے ہمارے سامنے رکھے تھے۔ میں نے خوراک کا تھیلا کھولا جس میں دو بوتل پانی، خشک گوشت کے کچھ پارچے، شکاری چاقو، ایک ٹارچ، ماچس، زہر سے تدارک کی گولیاں اور سگریٹ کا ایک ٹن موجود تھا۔ گویا کہ ہمارے پاس پینے کے لیے پانی کی دو بوتلیں ہی تھیں، کھانے کو گوشت کے کچھ پارچے! اور چند سو گولیاں تھیں اسٹین گن کی ـــــ یہاں ہمارا قیام ان حالات میں کب تک رہے گا؟ اس کے متعلق کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ ہمارا وائرلیس لانچ کے ساتھ ہی تباہ ہو چکا تھا اور ٹیلی پیتھی کا ماہر ہم میں کوئی نہیں تھا کہ دوسری طرف کوئی پیغام پہنچا سکے۔ نہ ہی ہمارے کلکتہ کے ساتھیوں میں کوئی ایسا صاحبِ کشف و کرامات موجود تھا جو اپنے علم کے زور سے ہماری کسمپرسی اور دربدری کی خبر لا سکتا۔



ان سب میں چونکہ سینئر میں ہی تھا اس لیے مجھے ہی اس خستہ حال کارواں کی کمان سنبھالنی تھی۔

اب تک ہم نے مقامی دوستوں پر صرف اس لیے انحصار کیا تھا کہ وہ اس علاقے کے محل وقوع سے کسی حد تک واقف تھے۔ آئندہ کے لیے لائحہ عمل بہرحال مجھے ہی طے کرنا تھا ـــــ بظاہر دو ہی صورتیں نظر آ رہی تھیں: یا تو ہم واپس لوٹیں اور چھپتے چھپاتے ہماری تلاش میں سرگرداں سیکورٹی والوں کے ہاتھ لگ جائیں یا پھر اسی طرح مفروری کی حالت میں بھوک پیاس کے ہاتھوں مر جائیں کیونکہ ابھی تک میں نے کسی جگہ انسانی صحت کے لیے قابلِ استعمال پانی نہیں دیکھا ـــــ یہاں تو صرف سمندر کا پانی تھا جس



کے درمیان خشکی کے کچھ کٹاؤ سے بن گئے تھے۔ جن پر ہم بھٹکتے پھر رہے تھے۔

سب سے پہلے ہم نے ایک ایک گھونٹ پانی کے ساتھ مختلف قسم کی دو دو تین تین گولیاں نگلیں پھر گوشت کے ایک پارچے پر باری باری طبع آزمائی کرنے کے بعد ایک ایک سگریٹ سلگا کر ہم ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے

ـــــ نیند کا نام و نشان بھی ہمارے ارد گرد نظر نہیں آ رہا تھا کم از کم اپنے متعلق تو میں یہی کچھ کہہ سکتا ہوں کہ خشک گوشت کو معدے میں اتارتے ہی میں خود کو تازہ دم محسوس کرنے لگا تھا۔

"اس جگہ کے متعلق آپ لوگوں کو کس حد تک معلومات حاصل ہیں؟" میں نے سگریٹ کا کش لے کر اپنے مقامی ساتھیوں سے دریافت کیا۔

"ہم لوگ کلکتہ کے ساحلی علاقوں میں بھٹک رہے ہیں۔ اس طرف، چونکہ ماہی گیری کھلا سمندر نہ ہونے کی وجہ سے کچھ کم ہوتی ہے۔ اس لیے گشتی بحری پولیس کی آمد کا خطرہ ذرا کم ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ پولیس اس طرف ہمارے فرار کے امکانات پر غور نہ کرے۔ وہ یہ اندازہ قائم کر سکتے ہیں کہ ہم اس دلدلی علاقے میں کہیں روپوش ہو گئے ہیں۔" ایک دوست نے بڑی صاف گوئی سے لگی لپٹی رکھے بغیر حقائق سے آگاہ کر دیا۔

"مقامی ماہی گیر آبادیوں سے کسی مدد کی توقع ہے؟ ـــــ میرا مطلب ہے اگر انہیں لالچ دے کر....."

"اس کا کبھی تصور بھی نہ کیجیے صاحب۔" مقامی دوست نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ان بستیوں میں زیادہ تر اسمگلنگ کا مال آتا ہے اور آدھے سے زیادہ پولیس اور انٹیلی جنس کے ٹاؤٹ یہاں ہوتے ہیں، اس لیے ـــــ دونوں ہی صورتیں ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوں گی اگر ہم اپنا تعارف کسی نئی پارٹی کی حیثیت سے کروائیں گے

تو مقامی "دادا" ہمیں جمنے کا موقع نہیں دیں گے ــــــ فوراً پولیس کو اطلاع ہو جائے گی اور اگر ہم نے مفرور کی حیثیت سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی تو یہ لوگ مال و متاع پر قبضہ بھی کر لیں گے اور پولیس کو خبردار بھی کر دیں گے"۔ دوسرے نے خبردار کیا۔

"پھر تیسری صورت کیا ہو سکتی ہے"؟ عثمان نے ذرا پریشان سے لہجے میں ان سے پوچھا۔ دونوں دوستوں نے سر جھکا لیے۔ غالباً وہ عثمان کے سوال کا کوئی مثبت جواب تلاش کر رہے تھے۔

"وہ میرے پیش نظر ہے"۔ بمل[redacted]ن کے میں نے عثمان کو جواب دیا۔

تینوں کی پُرامید نظریں میری طرف اٹھیں۔

"یہاں سے نزدیک ترین ماہی گیروں کی بستی کتنی دور ہے"؟ میں نے اُن کی آنکھوں میں جھانکا۔

"شاید ڈیڑھ دو میل آگے اور پیچھے بھی اتنے فاصلے پر"۔ جواب ملا۔

"ساحل سے وہ لوگ کتنے دور رہتے ہیں ؟"

"بہت قریب زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ فرلانگ"۔

"ان کے اپنے اسٹیمر اور لانچیں وغیرہ بھی ہوتی ہوں گی ؟"

"کیا مطلب جناب ؟" میرے دونوں ساتھی حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔

"ان کی رات کے وقت حفاظت بھی کی جاتی ہے کیا ؟" میں نے بجائے ان کے سوال کا جواب دینے کے اُن پر اگلا سوال داغا ــــــ غالباً اب انھیں میرے ذہن میں ترتیب پانے والے منصوبے کی کچھ کچھ سمجھ آنے لگی تھی۔

"آپ کے سوال کا جواب مثبت بھی ہو سکتا ہے منفی بھی ــــ ویسے ہماری اطلاعات کے مطابق شاید ہی کبھی کسی نے یہاں سے اسٹیمر چوری کر کے بھاگنے کی کوشش کی ہو"۔

"ٹھیک ہے! فی الحال ہمارا منصوبہ کوئی اسٹیمر چوری کر کے فرار ہونے کا ہی ہے ــــ



لیکن یہ کوئی حتمی بات نہیں اس میں تبدیلی بھی ہو سکتی ہے ــــــ میرے خیال میں تین چار میل کے سمندری علاقے کو تیر کر عبور کرنا کم از کم ان حالات میں ممکن نہیں"۔ میں نے اپنا منصوبہ کھول کر بیان کر دیا۔

تینوں کے چہرے کھل اٹھے ــــــ! عثمان سے تو خوشی کے جذبات چھپائے نہ چھپتے تھے۔ اسے علم تھا کہ میں جو بات کہہ رہا ہوں اسے انجام دینے کا حوصلہ بھی رکھتا ہوں۔

ابھی تک ہماری گفتگو پیش آمدہ حالات سے نمٹنے سے متعلق ہی ہو رہی تھی۔ ہم میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے کے متعلق جاننے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ عثمان نے البتہ کچھ تجسّس کا اظہار کیا۔ کیونکہ وہ بہرحال سویلین تھا لیکن دوسری طرف سے جب کسی قسم کی حوصلہ افزائی نہ ہوئی، تو وہ بھی چپکا ہو رہا۔

مجھے علم تھا کہ: یہ دونوں بھی میرے وطن کے جیالے ہیں، ان کی تربیت بھی میرے "سر" جیسے "سروں" نے کی تھی۔ راز کی پاسداری وہ بھی میری طرح "امانت" سمجھ کر کرتے ہیں۔ انھیں بھی میری طرح یہی سکھایا گیا تھا کہ "خائن" کہلانے سے مر جانا زیادہ احسن ہے ــــــ یہ لوگ اس وقت تک اپنی شخصیت بے نقاب نہیں کرتے جب تک انھیں یہ گمان نہ گزرنے لگے کہ ــــــ اب زندہ بچنے کے امکانات ایک فی صد بھی باقی نہیں رہے اور ایسا موقع کبھی نہیں آتا۔

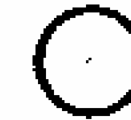
انھیں یہ ضرور بتایا گیا تھا کہ میں ان کا "سینئر" ہوں۔ میرے احکام کی تابعداری میں وہ اپنی جان سے گزر سکتے تھے لیکن میرے ہر سوال کا جواب دینے کے وہ پابند نہیں تھے۔ اس سلسلے میں انھیں مقامی "اسپائی ماسٹر" کی ہدایات ہی پر عمل پیرا ہونا تھا۔ جس میں یہ پہلا اصول تھا کہ ــــــ وہ اپنی مقامی تنظیم اور شخصیات کے متعلق صرف اس حد تک ہی مجھے بتا سکتے تھے جس حد تک معلومات مجھے حاصل ہونا ضروری تھیں اس سے آگے ہرگز نہیں۔

"او کے مائی ڈیئر فرینڈز فی الحال تو استراحت فرمائیے ممکن ہے سوتے میں ہمیں غیب

سے کوئی اشارہ موصول ہو جائے۔" مَیں نے ماحول کو غیر سنجیدہ بنانے کی انتہائی کوشش کی تھی۔ مجھے علم تھا کہ وقتی اثر سے نجات آسان ہے لیکن کسی بھی عمل کے مابعد اثرات سے چھٹکارہ پانا اتنا آسان نہیں۔ ہم لوگ مسلسل ایک دباؤ کی کیفیت کا شکار تھے۔ وطن سے دُور دشمن کے بالکل نرغے میں آئے ہُوئے، اس کی آمد کا خطرہ ہر وقت سر پر موجود اور سب سے بڑھ کر یہ کہ۔ بے دست و پا!

بھلا ایک دو ہینڈ گرینیڈز یا چند سو گولیوں کے ساتھ، ہم یہاں کیا انقلاب برپا کر سکتے تھے؟ ہماری حیثیت تو ان شکاریوں کی سی تھی جنھیں معمولی چھرے والی بندوقیں دے کر شیروں کے کچھار میں دھکیل دیا جائے ——— سب سے زیادہ خطرہ مجھے عثمان کی طرف سے تھا۔ مَیں پیشہ ور کمانڈو تھا اور میرے دوست تربیت یافتہ ایجنٹ۔ ہم تینوں کے لیے ان حالات کی اہمیت کوئی اتنی زیادہ بھی نہیں تھی کہ اسے دل و دماغ پر طاری کر لیں جبکہ عثمان کا معاملہ ہم سے الگ تھا۔

انسانی فطرت کے اس کمزور پہلو کو نظر انداز کرنے کا حوصلہ بھی مجھ میں نہیں تھا کہ ہم میں سے کسی ایک کی بزدلی، باقی سب کو بھی مروا دے گی۔ میری کوشش یہی رہی تھی کہ میرے پیارے موجودہ حالات پر دماغ سوزی کرنے کے بجائے فی الحال صرف ریسٹ کریں اور ذہن کو خالی کر کے کسی طرح تھوڑی بہت نیند لے لیں۔



ہم نے شکاری چاقو کی مدد سے لمبی لمبی جنگلی گھاس کاٹ کر اسے درختوں کے جھنڈ میں بچھا کر بستر بنا لیے تھے۔ کپڑے جنھوں نے چیتھڑوں کی شکل اختیار کر لی تھی، ہمارے جسموں سے اُتر کر سوکھنے کے لیے دھوپ میں بکھرے پڑے تھے۔ ہم صرف انڈرویئر اور بنیانیں پہنے لیٹنے کی تیاری کر رہے تھے۔

تربیت کے مطابق ایک مقامی دوست اور عثمان تو وہاں لیٹ گئے جبکہ دوسرا مقامی



دوست اور میں پہرے پر دو مخالف سمتوں میں بیٹھ رہے۔

مَیں سطحِ سمندر سے کچھ اونچائی پر ایک درخت سے ٹیک لگائے سمندر کی اس ننھے منے سے جزیرے کے ساحلوں سے اٹھکیلیاں کرتی لہروں پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ جب بل کھاتی لہروں سے ابھر کر آلسنہ میرے نہاں خانۂ دل تک دَر آئی۔ تب سمندر کی لہریں ساکت ہو گئیں۔ درختوں کے جھنڈ اس کی تعظیم میں چپ چاپ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور ہوا دھیرے دھیرے پچھم کے رُخ بہنے لگی ——— ایک خوابیدہ سی سرسراہٹ وہاں گونج پیدا کرنے لگی تھی۔

"یہ مَیں ہوں لیفٹیننٹ علی! مَیں جو غنائیت ہوں۔ زندگی کے ساز پر گایا جانے والا ابدی گیت ——— جسے دیکھ کر یوں گمان گزرتا ہے جیسے بھکشوؤں کی کسی پرانی عبادت گاہ کے اندھیرے میں اچانک تیز، سرخ، روشن، جاندار، مخملیں گلاب جگمگانے لگے ہوں۔

——— مَیں جو الف لیلوی دنیا کی محرابوں سے نکل کر اچانک تمھاری زندگی کے ریگزاروں میں چلی آئی ہوں۔ میری آنکھوں کی گہرائیوں میں مت جھانکو۔ ان میں ہستی کے وہ سارے اسرار خوابیدہ ہیں جو انسانوں کی نظروں سے ہمیشہ اوجھل رہے ——— میں کیپری کا وہ تصوراتی جزیرہ ہوں جس تک اول تو کوئی پہنچ ہی نہیں پاتا اور اگر کوئی یہاں تک آ بھی جائے تو میرے گرد اگرد پھیلے اتھاہ سمندر کی لہریں مارتی اونچی اونچی موجوں کو عبور کر کے مجھ تک کبھی رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔

——— میری تلاش میں کئی جٹ دھاری صدیوں سے سفر میں ہیں۔ مَیں ہمالیہ کی ان چوٹیوں پر محو خرام ہوں جہاں پہنچنے سے پہلے کسی رشی منی کو مکتی (نجات) نہیں ملتی ——— لیکن جہاں کوئی پہنچ نہیں پاتا۔

——— مجھ تک پہنچنے کا سفر صدیوں سے جاری ہے اور قرنوں تک جاری رہے گا۔ میرے لیے ازل سے جوگی سنیاس لیتے آئے ہیں۔ مَیں جنگلوں میں گھومنے والی پُراسرار

خوشبو ہوں جسے محسوس تو سبھی کرسکتے ہیں لیکن جس کا سراغ کوئی نہیں لگا سکتا۔ تم مجھے کیا کھوجو گے ؟ تم! جسے اپنی قوتِ ارادی پر بڑا مان ہے۔ میری یادوں سے کبھی فرار بھی حاصل نہیں کرسکتے اور ہاں! یہ بھی سُن لو مجھ تک پہنچنے کی سعی بھی لاحاصل ہے! آخر آگ کے کتنے دریا پاٹ لو گے تم؟ تمھارے پاؤں جل نہ جائیں گے کیا؟"

جانے وہ مجھ سے کیا کیا کہتی رہی ـــــ وہ کہتی رہی اور میں سنتا رہا۔ چپ چاپ سا! مبہوت سا!

ساحلی علاقوں پر پائے جانے والے کچھ پرندے میری دائیں سمت سے آتے اور سمندر کے فراخ سینے پر دُور ہی دور میری نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے! پھر ایک عجیب تماشہ ہوا۔ ایک پرندوں کا جوڑا جو کافی دُور سے پر سے پر ملائے اڑتا چلا آرہا تھا میرے قریب آکر ایک دوسرے سے الگ ہوگیا ـــــ ایک دائیں سمت مڑ گیا اور دوسرا بائیں سمت!

ـــــ اس لمحے مجھے اپنے حلق میں ایک کڑواہٹ سی اترتی محسوس ہوئی۔ منہ کا ذائقہ پہلے پھیکا پھیکا پھر کڑوا محسوس ہونے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے میرے گرد اگرد اچانک زہریلی ہواؤں کا رقص شروع ہوگیا۔ ابھی تک میرے کانوں میں ہواؤں کی سرسراہٹ یا پھر لہروں کے بے ہنگم شور کی آوازیں ہی ناچ رہی تھیں کہ سمندر کے پیٹ نے انتہائے نظر پر دو نقطے آسمان کی طرف اچھال دیے اور لہروں کے شور پر مہیب دھاڑیں غالب آنے لگیں۔

میں اپنی جگہ سے کسی میکانکی عمل کے تابع کی طرح اُچھلا اور بھاگتا ہُوا آنے والی قیامت سے بے خبر اپنے ساتھیوں کو جگانے چل دیا۔ وہ مجھ سے پہلے ہی میرے دوسرے پہریدار ساتھی کے جگانے پر خبردار ہو چکے تھے۔ ہم نے اپنے بکھرے چیتھڑے سمیٹ کر گٹھڑی کی شکل میں جھاڑیوں میں چھپائے اور خود گنیں تھام کر پہلے سے ہنگامی حالت کے لیے منتخب



شدہ جگہوں میں مورچہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ ہم نے خود کو اس قدر کیموفلاج کر رکھا تھا کہ انتہائی قریب سے بھی یہاں پر اگنے والی خودرو جنگلی گھاس کا حصّہ دکھائی دیتے ـــــ نقطے اب دو ہیلی کاپٹروں کا روپ اختیار کر چکے تھے جو سطح سمندر کے بالکل اوپر اڑتے ہوئے اس سمت آرہے تھے۔

شاید ہماری تلاش کی مہم میں نکلے تھے۔

ایک ہیلی کاپٹر تو ہمارے سروں پر سے چکر کاٹ کر آگے نکل گیا اور یہاں سے کچھ فاصلے پر موجود درختوں کے ایک جھنڈ میں اترنے لگا۔ شاید یہ کوئی اسی طرح کا جزیرہ تھا جس پر ہم قیام پذیر تھے اور دوسرا ہیلی کاپٹر ہمارے گرداگرد گھوم کر ہمارے جزیرے کے طواف میں مشغول ہوگیا۔

ـــــ اس وقت تو ہم نے شکر گزارا کہ چلو بلا ٹلی "! اگر انھیں ہمارے یہاں موجود ہونے کا شک ہوتا تو اس جزیرے کی بجائے یہاں اترتے "! لیکن پھر دل کی دھڑکنیں رُکتی ہُوئی محسوس ہوئیں وہ کم بخت ہیلی کاپٹر جو ابھی تک طواف میں مشغول تھا اسے نجانے کیا سوجھی کہ اپنے پیشرو کا سا عمل دہرانے لگا : اترنے کے لیے انھوں نے جزیرے کا دوسرا کنارہ منتخب کیا تھا۔ ـــــ ہیلی کاپٹر کے یہاں اترنے کے امکانات تو انتہائی کم تھے البتہ اس میں سے چار مسلّح فوجی ضرور کُود کر باہر نکلے۔ جب کہ ہیلی کاپٹر اونچا اٹھ کر جزیرے کے سر پہ معلق ہو رہا تھا۔

ہم لوگ ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر بیٹھے تھے لیکن پوزیشن کچھ ایسی تھی کہ ایک دوسرے کو اپنا پیغام بھی بآسانی منتقل کرسکتے تھے! بڑا کڑا وقت آن پڑا تھا، سچی بات ہے : اگر میرے ساتھی میری کمپنی کے تین جوان ہوتے تو ہم فوراً ان سب کو مار کر ہیلی کاپٹر لے کر فرار ہو جاتے کیونکہ ایک کے بعد دوسری چال چلنا اور جنگی منصوبہ بندی کر کے اس پر تیزی سے عمل پیرا ہوتا ہماری ایک طرح سے SECOND NATURE بن چکا تھا۔

یہ بات نہیں کہ مجھے اپنے ہمراہیوں کی صلاحیتوں پر اعتماد نہیں تھا ——— دونوں مقامی دوست ہر طرح سے تربیت یافتہ اور پلک جھپکنے میں کسی بھی حکم پر عمل پیرا ہونے اور مطلوبہ نتائج فراہم کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور تھے۔ عثمان بھی تین چار کو مارے بغیر کبھی نہ مرتا لیکن یہ ایک طرح سے ایسی صورتِ حال تھی، جیسے کسی کپتان کو اچانک ایک نئی ٹیم کے ساتھ میدان میں اترنا پڑ جائے! میرے اپنے جوان میرے ہر اشارے کو فوراً سمجھ لیتے جبکہ انھیں سب کچھ بتانا پڑتا۔

میں نے انھیں آگاہ کر دیا کہ: جب تک میں گولی نہ چلاؤں وہ کسی بھی حالت میں فائرنگ نہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے بغیر آواز پیدا کیے بکھر کر اس طرح پوزیشن لے لی تھی کہ آنے والوں کو ہمارے درمیانی فاصلے سے بہرحال گزر کر آنا پڑتا۔

میرے دائیں بائیں چھپے میرے ساتھی مجھ پر نظریں جمائے ٹریگروں پر انگلیاں رکھے میرے اشارے کے منتظر تھے اور میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا: خدایا! یہ مصیبت بھی بس ٹل ہی جائے!! اگر مقابلے کی نوبت آ گئی تو وقتی طور پر یقیناً ہم غالب آ جائیں گے لیکن ہماری موجودگی کا انکشاف ہونے کے بعد شاید دُنیا کی کوئی طاقت ہمیں دشمن کے شکنجے سے نہ بچا سکے گی۔

جس جگہ ہم پوزیشن میں لیٹے تھے، وہ عام سطحِ زمین سے کچھ اُونچی تھی۔ یہ ایک طرح کی پہاڑی سی تھی جس پر گھاس اتنی گھنی اگی ہوئی تھی کہ یہاں چھپنے والے کے نظر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جب تک کہ ان جھاڑیوں میں گھس کر اسے نہ ڈھونڈا جائے۔

ہیلی کاپٹر سے اترنے والوں کی تعداد چار تھی اور وہ ایس۔ایس۔جی کے تربیت یافتہ کمانڈوز تھے۔ یہ بڑی عجیب ستم ظریفی ہے کہ کمانڈو سے نمٹنے کے لیے بھی کمانڈو ہی کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ایس۔ایس۔جی (اسپیشل سروس گروپ) کے جوانوں کو نہ صرف یہ کہ تخریبی کارروائیاں کرنے کی تربیت دی جاتی ہے بلکہ انھیں تخریب کاروں سے نمٹنے کی بھی خصوصی تربیت حاصل ہوتی ہے۔

نو وارد ہوشیار کمانڈوز کی طرح انتہائی چوکنے ہو کر جزیرے میں ہماری آمد کے نشانات تلاش کر رہے تھے۔ ہم نے تو اپنی دانست میں یہاں اپنی موجودگی کے ہر امکان کو ختم کر دیا تھا اور بطورِ خاص اس بات کی احتیاط برتی تھی کہ ہماری کوئی چیز حتیٰ کہ سگریٹوں کے جلے ہوئے ٹکڑے بھی ان کی نظر میں نہ آ سکیں ——— ہم نے یہ ٹکڑے بھی زمین میں ایک طرح سے دبا دیے تھے پھر بھی آخر ہم انسان تھے: کوئی بھی بھول ممکن ہے ہم تینوں سے نہ ہوئی ہو، عثمان ہی چوک گیا ہو؟

جزیرے کو اپنے گھیرے میں لیے زمین کے چپے چپے کو سونگھتے اب آہستہ آہستہ وہ ہماری سمت بڑھ رہے تھے۔ بڑا ڈراؤنا اور سنسنی خیز ماحول انھوں نے یہاں طاری کر رکھا تھا: ہمارے سروں پر معلق ہیلی کاپٹر کے پہلوؤں سے جھانکتی طاقتور گنوں کی نالیاں اور بے ہنگم شور، یہاں زمین پر ہمارے گرد اگرد منڈلاتے فوجیوں کے بوٹوں تلے آنے والے سرکنڈوں کے چُرمُر ہونے اور ان کے حلق سے برآمد ہونے والی وہ آوازیں جن سے کمانڈو محصورین کو اپنی غلط سمت کی نشاندہی کراتے ہیں تاکہ وہ دھوکے میں آ کر اس طرف نکل آئیں یا جنبش کر کے اپنی موجودگی کی نشاندہی کر دیں! پھر لمحہ بہ لمحہ ہماری دھڑکنوں میں اضافہ کرتے وہ ہمارے نزدیک آنے لگے۔

سب سے پہلے میری ہی نظر ان پر پڑی تھی۔ اس لمحے اپنی بے بسی کا احساس مجھے رُلا گیا اگر کوئی اور موقع ہوتا تو میری اسٹین گن کا محض ایک برسٹ ان چاروں کے لیے کافی ہوتا لیکن اب تو ہم اتنے مجبور تھے کہ ہاتھ آئے دشمن سے بھی جان بچانے کی فکر کر رہے تھے۔

"میرے مولا! شرم رکھنا!" میرے دل سے دعا نکلی۔ عین اسی لمحے نجانے کیسے میں یکسر اس ماحول سے بے گانہ ہو گیا۔ ایک عجیب سی سوچ نے مجھے اٹھایا اور سمندر سے

پرواز کرواتی اپنے گاؤں میں لے گئی۔ وہ گاؤں جس کے ایک کونے میں بنے مکان کے کمرے میں مصلّے پر بیٹھی میری ماں ہماری جان کی سلامتی مانگ رہی تھی۔ میری بہن کے ننھے ننھے اٹھے ہاتھ اللہ میاں سے گڑیاں پٹولے کی بجائے اپنے ویر کی جان کی امان طلب کر رہے تھے پھر منظر بدلا اور میں اپنے پورلو پاکستان میں چلا آیا۔ ڈھاکہ کی ایک بستی میں مجھے چاچی اور آنسو کے پھیلے ہوئے دامن دکھائی دیئے۔ وہ ہماری زندگی ہی کی بھیک مانگ رہی تھیں کتنے عظیم تھے وہ لوگ جو کسی کے لیے جی رہے تھے۔ عبادتیں وہ کرتے تھے پیشانیاں ان کی خدا کے حضور جھکتی تھیں اور ان کی دعائیں صرف ہمارے لیے مختص تھیں۔ انھوں نے اپنے لیے کبھی باری تعالیٰ سے کچھ نہ مانگا! کبھی بھی تو نہیں!

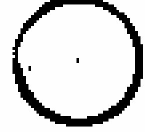
اس لمحے طمانیت کی ایک لہر میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ میں جیسے کسی اور ہی عالم میں پرواز کرنے لگا جہاں کوئی بار بار میرے کان میں کہہ رہا تھا: "لیفٹیننٹ علی! گھبراؤ مت ــ جن کے لیے ان کے پیارے یوں دعائیں مانگیں، قدرت انھیں سب آفتوں سے بچائے رکھتی ہے ـــــ وہ مصیبتوں سے یوں باہر نکل آتے ہیں جیسے مکھن میں سے بال۔"

جب عالمِ حقائق میں میری واپسی ہوئی تو بھارتی فوجی ہمارے درمیان سے گزر کر دوسری طرف چلے گئے تھے۔ انھوں نے جزیرے کے گرداگرد اپنا چکر مکمل کر لیا تھا اور ہیلی کاپٹر کو اپنی ناکامی کی اطلاع دے کر نیچے آنے کا اشارہ کرنے لگے تھے! جس لمحے ان کا ہیلی کاپٹر نیچے اتر رہا تھا عین اُسی وقت قریبی جزیرے پہ ہماری تلاش سے ناکام ہو کر دوسرا ہیلی کاپٹر بھی ہمارے گرداگرد ایسے ہی کسی ٹاپو کی طرف محوِ پرواز تھا۔ ان کا "سرچنگ آپریشن" بمشکل پندرہ بیس منٹ میں اختتام پذیر ہو گیا۔

اور جیسے ہی ہیلی کاپٹر اڑ کر کچھ دُور پہنچا۔ میرے ساتھی تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر باہر نکل آئے۔ مجھے بھی ان کی تقلید میں با دلِ نخواستہ باہر آنا پڑا، حالانکہ تربیت کے مطابق ابھی کچھ دیر تک ہمیں اسی حالت میں رہنا چاہیئے تھا۔ بے پناہ مسرت ان کے انگ انگ



سے پھوٹ رہی تھی۔ شدتِ جذبات سے ان کے چہرے گلنار ہو رہے تھے۔ قدرت نے خصوصی کرم کیا اور بہت بڑی بلا ہمارے سر سے ٹال دی گئی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے لپٹ کر اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔



فی الحال اس ایریا سے جہاں ہم موجود تھے۔ وہ لوگ مطمئن ہو چکے تھے اور اب انھوں نے اس سے آگے ہماری کھنگال شروع کر دی ہوگی۔

ـــــ اب وقت تھا کہ ہم کسی بھی طرح اس خلا میں سے جو دشمن نے ہمیں بہم پہنچایا تھا ـــــ ساحل کے اس طرف مہذب لوگوں میں پہنچ کر اپنے لیے جائے امان ڈھونڈ سکتے لیکن ان پہ پہنچا جائے تو کیسے؟"

ـــــ میں سوچنے لگا یہی سوال رہ رہ کے مجھے پریشان کر رہا تھا۔ میں اکیلا تو ابھی جھاڑیوں کا ایک گٹھا بنا کر پار نکل جاتا لیکن میرے ہمراہی ـ؟ انھیں حالات کے رحم و کرم پہ بھی تو چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔!

بچپن سے اب تک ایک بات میرے لاشعور میں رچی بسی تھی: کہ ایک مبارک ساعت ایسی ضرور آتی ہے جس لمحے دعائیں مستجاب ہو جاتی ہیں۔

ـــــ میری ماں مجھے بُری بات منہ سے نکالنے پر بچپن میں ڈانٹ پلاتے ہوئے ڈرایا کرتی تھی کہ اگر کہیں اس گھڑی میرے منہ سے وہ بات نکلی جب دعائیں اور بد دعائیں دونوں کے قبول ہونے کا وقت ہوتا ہے تو میری خیر نہیں۔

حالات اچھے بھلے عقل انسان کو بھی کبھی کبھی قنوطی بنا دیتے ہیں۔ وہ ان چھوٹے چھوٹے ڈھکوسلوں میں ہی پناہ ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اس لمحے جب میرے ساتھی پردۂ غیب سے کسی اسٹیمر کے ظہور میں آنے کی دعائیں مانگ رہے تھے تو ممکن ہے میری طرح کسی اور کے لاشعور میں بھی یہ بات ہو کہ یہ دعائیں باریاب ہونے کی گھڑی بھی تو ہو سکتی ہے۔ تب میری

مال کے کہے لفظوں کی صداقت کا گواہ بن کر سمندر کی لہروں پر ماہی گیروں کا وہ اسٹیمر ابھرا جو شاید اس طرف شکار کرنے آرہا تھا۔ عموماً ماہی گیری کھلے سمندر ہی میں کی جاتی ہے لیکن میرے ساتھیوں نے بتایا تھا کہ اس علاقے میں ابھر آنے والے ان ٹاپوؤں کے قریب ایک ایسی شاندار مچھلی پائی جاتی ہے جو اپنی لذّت میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے اور جس کے دام بھی منڈیوں میں ماہی گیروں کو عام مچھلی سے زیادہ ہی ملتے ہیں کیونکہ کلکتہ کے شوقین مزاج رئیس اس کے منتظر رہتے ہیں۔

اگر کوئی اور وقت ہوتا تو ہم خود اس مچھلی کا شکار کرتے اور اسے وہیں بھون کر اسکی لذّت سے آشنائی پاتے لیکن اب تو ہم ڈانواں ڈول، دلوں میں اُمید کی شمعیں جلائے ماہی گیروں کی کسی ایسی کشتی یا اسٹیمر کے منتظر تھے، جو اس طرف شکار کرنے آئے اور ہم اسے شکار کر لیں —

—— جب ہماری زندگی بھر کی ریاضتوں کا ثمر بن کر وہ اسٹیمر اس طرف آتا دکھائی دیا۔

"پلان بدل گیا دوستو — ! قدرت نے ہمیں ماہی گیروں کی کسی بستی تک جانے اور وہاں سے اسٹیمر حاصل کرنے کی زحمت سے بچالیا ہے اور ہماری مطلوبہ شے خود ہی ہم تک آرہی ہے۔" میں مسکرایا۔

ہم دبک کر آنے والوں کے استقبال کو تیار بیٹھے تھے وہ دو ملاّح تھے اور وہ سیدھے اسی طرف لنگر انداز ہونے کے چکر میں تھے جس طرف ہمارا ڈیرہ تھا۔

—— اسٹیمر کو کنارے سے لگا کر انھوں نے ایک ربڑ کا بلیڈر بغل میں دبایا اور باہر کنارے پر آکر بیٹھ گئے۔ وہ تو کسی اور ہی موڈ میں نظر آرہے تھے اس بلیڈر میں گھٹیا قسم کی شراب تھی جو وہ لوگ خود نکالتے اور جو کلکتہ میں سرِعام فروخت ہوتی تھی۔ شراب ان کی زندگی کا جزو لاینفک تھی جس کے بغیر وہ ایک قدم بھی نہیں چل پاتے تھے ہر اچھے اور بُرے کام کا آغاز ان کے معاشرے میں شراب خانہ خراب سے کیا جاتا تھا۔ دو تانبے کے



گلاس اور ربڑ کے ایک بلیڈر کے ساتھ وہ شغلِ مے نوشی میں مشغول ہو گئے۔ میرے ساتھیوں نے نظروں ہی نظروں میں اجازت طلب کی میں نے انھیں فی الحال منع کر دیا۔ اصل میں میں چاہتا تھا کہ بے چارے کم از کم اپنے دل کے ارمان تو نکال لیں۔

لیکن جب میں نے دیکھا کہ یہ کم بخت تو "گھڑا نوش" قسم کے شرابی ہیں اور شام تک پینے کے بعد بھی آؤٹ نہیں ہو سکتے تو کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کیا! ہم بغیر آواز پیدا کیے ان کے سروں پر پہنچ گئے اور عین اسی لمحے جب ہم موت کے فرشتوں کی طرح ان کے سروں پر براجمان تھے ان میں سے ایک کی نظر ہم پر پڑ گئی۔

"اے کیا ہے سالا۔ کون لوگ ہے تم؟" اس نے بڑی اکڑ سے پولیس والوں کا لہجہ اختیار کیا۔

—— اور اُس کی بات کا جواب زبانی کے بجائے میں نے عملی طور پر دیا اکھڑی ہتھیلی کی زوردار ضرب نے اس کی کنپٹی کو چٹخا دیا وہ بغیر آواز نکالے سیدھا لیٹ گیا! اس کا ساتھی پھٹی پھٹی نظروں سے ابھی اس کے گرنے کا نظارہ ہی کر رہا تھا، جب ہمارے ایک مقامی ساتھی نے دونوں ہاتھ پوری طاقت سے اس کے سر کی مخالف سمتوں میں بجا دیے — اس کا انجام بھی اپنے ساتھی سے کچھ مختلف نہ ہوا۔

دونوں بے ہوش ماہی گیروں کو اپنی پیٹھ پر لاد کر ہم وہیں لے آئے جہاں تھوڑی دیر پہلے تک ہمارا قیام تھا اور چند سیکنڈ میں ان کے جسم کپڑوں سے بے نیاز کر کے ہم نے اپنے چیتھڑوں کی رسیاں بٹ کر ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور خود ان کے کپڑے میں نے اور عثمان نے پہن لیے۔

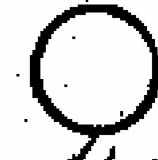
—— ہمارے مقامی دوستوں کے کپڑے کسی حد تک محفوظ تھے۔ اپنا بچا کھچا کھانا اور پانی کی ایک بوتل ہم نے ان کے قریب رکھ دی۔

ان کے دو ڈھائی گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے کا امکان نہیں تھا اور اتنے عرصے

میں ہم سمندر کے تو کیا اُفق کے اُس پار اُتر سکتے تھے۔

جب ہم اسلحہ سمیت اسٹیمر میں سوار ہو رہے تھے تو یہ باعثِ اطمینان خیال ہمارے حوصلے ضرور بڑھا رہا تھا کہ؛ دشمن ابھی ابھی اس ایریا کو کھنگال چکا ہے وہ کم از کم یہاں نہیں ہو گا۔ اس کے اردگرد کہیں ہو تو ہو البتہ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم بے پروا تھے ——— ہماری لوڈاسٹین گنیں کسی بھی وقت چند لمحوں کے نوٹس پر حرکت میں آسکتی تھیں۔

بمشکل آدھ گھنٹے بعد ہم ساحل کے ایک ویران کنارے سے جا لگے۔ اس دوران راستے میں ہم سے کچھ فاصلے پر ماہی گیروں کے اسٹیمر اور لانچیں گزرتی چلی گئیں ——— لیکن ہم سے کسی نے کوئی تعرض نہ کیا۔



کنارے لگتے ہی ہم نے اپنا اسلحہ ضائع کر دیا۔

——— اب اگر وہ ہمارے کام کا نہیں تھا تو دشمن بھی اس سے کوئی فائدہ کیوں اٹھاتا؟ پھر وہ اسلحہ تو سمندر میں غرق ہو گیا اور اسٹیمر جس میں ہم نے پندرہ بیس منٹ کی جان توڑ مشقت کے بعد ایک سوراخ پانی داخل ہونے کے لیے بنا دیا تھا۔ نذرِ سمندر کر دیا ——— اسٹیمر لہروں کے دوش پر ہماری نظروں کے سامنے ڈوبتا ہوا دور ہی دور ہٹتا چلا جا رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ غرق ہو گیا۔

ہماری حالت اس وقت صحرائے گوبی عبور کرنے والے ان مہم جوؤں کی سی تھی جو صحرا میں اپنے راستے سے بھٹک گئے ہوں ——— دھوپ میں جلتی ریت اور آگ میں تپتی بے آب و گیاہ پتھریلی پہاڑیاں تنور کی طرح دہک رہی تھیں، ہم اس جہنم زار کا ایندھن بنے اس کے اندر ہی اندر گھستے چلے جا رہے تھے۔

——— صحرا میں سفر کرنے والوں کو تو کسی نخلستان کی امید بھی ہوتی ہو گی لیکن یہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس لمحے میرا دل اپنے استادوں کے لیے عقیدت کے جذبات



سے لبریز ہو گیا مجھے احساس ہوا کہ وہ طویل صحرائی مشقیں جن سے ہمیں گزرنا ہوتا تھا بے سود نہیں تھیں۔ کمانڈو کو کبھی وہ حالات پیش نہیں آتے جن کی امید کی جا سکتی ہو۔ وہاں تو سب کچھ اچانک اور سوچے سمجھے منصوبے کے خلاف پیش آتا ہے ——— حالات اس طرح یکسر پلٹا کھاتے ہیں کہ بڑے بڑے سورما بھی چکرا کر رہ جائیں پھر یہی اذیت ناک مشقیں جن کی بھٹی سے کمانڈو کو کندن بنا کر نکالا جاتا ہے اور جنھیں دوران تربیت ہم بسا اوقات فضول سی چیز سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں، اُسے اس کڑے امتحان سے بامراد کر کے باہر نکالتی ہیں

جس قیامت کی کڑی دھوپ سے ہم گزر رہے تھے اس کا احساس مجھے تو کچھ خاص نہیں ہو رہا تھا لیکن اپنے ساتھیوں پر ٹوٹنے والے عذاب کو میں بخوبی محسوس کر سکتا تھا ——— سورج کا قہر برساتا دیوتا عین ان کے سروں پر دہک رہا تھا۔ اس کی شعاعوں سے اٹھنے والی لپٹوں سے ان کی ہڈیاں بھی سلگ رہی ہوں گی لیکن آفرین ہے ان صدق کے پتلوں پر کیا مجال جو انھوں نے اُف تک کی ہو۔ ہم چاروں چپ چاپ آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ماحول کچھ عجیب پُراسرار اور سنجیدہ سا ہو گیا تھا۔ پہل عثمان نے کی۔

"علی بھائی! جہنم کی آگ یقیناً اسی طرح کی ہو گی۔" اس نے یہ فقرہ کچھ ایسے انداز سے کہا کہ بے اختیار ہم سب ہنس پڑے۔

"چلو اچھا ہے دُنیا میں ہی اس کا مزا چکھ لیا۔" اب مقامی دوست کی باری تھی پھر ہم آپس میں اسی طرح ایک دوسرے کی طرف فقرے اچھالتے رہے۔ اس سے ماحول کے تناؤ میں کچھ کمی ضرور واقع ہو گئی تھی یا پھر کم از کم ہماری توجہ بٹ گئی تھی۔

——— تقریباً ایک گھنٹے بعد جب اس جان لیوا سفر کا اختتام ایک سڑک کے نزدیک ہوا تو ہمارے ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی تھیں۔ حلق خشک ہو چکے تھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے جسم سے نمی کی آخری رمق بھی نچوڑ لی ہو۔ عثمان کی حالت تو ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔ یہ اس کی قوتِ ارادی تھی یا پھر انانیت کہ اس نے ہمارے سامنے شرمندہ ہونا

گوارا نہ کیا۔ مجھے ڈر تھا کہیں اسے "سن اسٹروک" نہ ہو جائے۔

یہ سڑک جس تک ہم نے رسائی کی تھی شہر سے بندرگاہ کی طرف جا رہی تھی۔ سڑک کے کناروں درختوں تلے بے دم ہو کر میرے ساتھی قریب قریب گر پڑے تھے! دُور دُور تک کسی ذی روح کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا، ہماری سب سے پہلی ضرورت پانی تھی ــــ بہر صورت میں میرے ساتھیوں کو پانی چاہیئے تھا ورنہ کسی بھی لمحے کسی کے تڑخ جانے کا خطرہ پیدا ہو چلا تھا۔

سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ پانی آخر لاؤں کہاں سے۔ کبھی کبھی کوئی ٹرک بندرگاہ سے شہر کی طرف یا شہر سے بندرگاہ کی طرف جاتا دکھائی پڑتا تھا۔ ان کو ہاتھ دے کر روکنے کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اوّل تو یہاں دن دہاڑے ہی لوٹ مار کی ایسی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں کہ کوئی ٹرک ڈرائیور رکنے کا خطرہ ہرگز مول نہ لیتا پھر ہمارے حلیے بھی کچھ ایسے شریفانہ نہ تھے کہ کوئی ہم پر ترس کھانے کا رسک لے سکے۔

شام کے وقت اس سڑک پر ٹریفک بہت بڑھ جاتا تھا کیونکہ سمندر کنارے بنے عیاشی کے اڈوں، نائٹ کلبوں اور جوا خانوں کی دنیا رات میں ہی آباد ہوتی تھی اور شام کے بعد پولیس کی گشتی گاڑیوں میں بھی اسی رفتار سے اضافہ ہو جاتا تھا! ادھر میرے ساتھیوں کی پتلی حالت مجھے شام ڈھلنے کا انتظار کرنے کی مہلت دینے کو ہرگز تیار نہیں تھی ــــ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا فوراً اور ابھی کرنا تھا؛ مجھے بیقراری سے کسی بھی ایسی گاڑی کا انتظار تھا جس پر سوار ہو کر ہم شہر کو جا سکتے۔

دو تین ٹرک مزید گزر گئے ہم ہاتھ ہلا ہلا کر رہ جاتے کوئی ہماری فریاد پر کان نہ دھرتا۔ ہر مرتبہ جب کوئی گاڑی دُور سے آتی دکھائی دیتی میرے ساتھیوں کے چہروں پر امید کی ایک لہر دوڑنے لگتی اور جب کوئی ٹرک ہمیں نظر انداز کر کے فراٹے بھرتا گزر جاتا تو اپنے آپ سے دم توڑ دیتی۔



ــــ اس مرتبہ دور سے ایک کار دکھائی دی۔ مَیں نے اپنے ساتھیوں کو درختوں کی اوٹ میں چھپ جانے کا اشارہ کیا اور خود سڑک کے کنارے پہنچ گیا۔ یہ کوئی پرائیویٹ کار تھی جو مالک کی بدقسمتی سے کسی کام سے شہر سے بندرگاہ کی سمت آ رہی تھی۔ جب اس کا اور میرا فاصلہ کم ہو گیا تو مَیں نے نفسیاتی حربہ آزمایا اور سڑک کے عین درمیان آ کر اسے رُکنے کے لیے ہاتھ ہلانے لگا۔ کار ڈرائیور اس اچانک آفت سے گڑبڑا گیا۔ اس نے بہت تیز بریک لگائے تھے۔ مَیں بھی گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

"مرنے کا ارادہ ہے کیا؟" اس نے گردن باہر نکال کر غصّے سے چلاتے ہوئے کہا۔

"معاف کیجئے گا جناب ہم بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں!" مَیں نے اس کی حیثیت کا اندازہ لگاتے ہوئے یہ فقرہ نہایت عاجزی سے انگریزی زبان میں ادا کیا تھا۔

"ہم کیا کرے؟" اس نے بدستور اسی لہجے میں جواب دیا۔

مَیں اب آہستہ آہستہ کھڑکی کے نزدیک اس کے بہت ہی قریب آ گیا تھا۔

"دیکھیے صاحب ادھر ہمارا لانچ ڈوب گیا۔ بڑی مشکل سے ہم جان بچا کر یہاں تک آیا ہے۔ ہمارے ساتھیوں کا حالت بہت نازک ہے!" مَیں نے ایک ہاتھ سے سمندر کی طرف اشارہ کیا۔

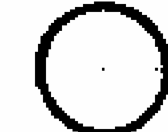
گاڑی کا انجن بند تھا اس سے پہلے کہ مَیں اس کا جواب سنوں۔ مَیں نے پاؤں زمین پر جمایا اور دروازے کا لاک دبا کر اتنی پھرتی سے کھولا کہ کار سوار جس کا ایک بازو بھی گردن سمیت باہر لٹک رہا تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی باہر آ گرا۔

"اے ــــ اے ــــ داداگیری کاہے کو کرتا ہے!" اس نے زمین پر لیٹے لیٹے چلانا چاہا۔

مَیں نے گردن سے پکڑ کر اسے اوپر اٹھایا۔ دھان پان سا آدمی تھا بے چارا۔ ایک ہلکی سی چپت ہی سے پاؤں چھوڑ گیا۔ میرے ساتھی دوسرے ہی لمحے سر پر موجود تھے۔

بے ہوش کار مالک کو انھوں نے پچھلی سیٹ پر اپنے درمیان اس طرح بٹھا لیا کہ وہ دُور سے نارمل ہی دکھائی دے رہا تھا۔ ڈرائیور کی سیٹ میں نے خود سنبھالی۔ میرے ساتھ آگے ایک مقامی دوست بیٹھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے ہم فراٹے بھرتے نتائج سے بے پروا شہر کی طرف اڑے چلے جا رہے تھے۔

——سڑک کے کنارے ایک جگہ پانی مل گیا۔ میرے "صبر، صبر" کہتے کہتے میرے تینوں محافظوں نے انتہائی بے صبری کا مظاہرہ کیا تھا۔ پانی نے آبِ حیات کا کام کیا۔ ہم نے منہ ہاتھ دھو کر کچھ حلیہ وغیرہ درست کیا۔ عثمان کی حالت بھی خاصی سنبھل چکی تھی۔



اب ہم شہر کے نزدیکی چیک پوسٹ تک پہنچ چکے تھے۔ چیک پوسٹ سے کچھ فاصلے پر ہم رک گئے۔ کار کو اس کے مالک سمیت سڑک سے کچھ فاصلے پر ایک طرف کھڑا کر دیا۔ اور ہم پیدل ایک شارٹ کٹ سے شہر میں داخل ہو گئے۔

ابھی خاصی کرنسی میرے پاس موجود تھی۔ پہلے ہم نے اپنے حلیے بدلے۔ حجام کی دکان سے باری باری اپنی اصل شکل میں واپس لوٹے اور ریڈی میڈ کپڑے پہن کر اگلے لائحہ عمل پر غور کرنے لگے۔

ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ سے میرے مقامی ساتھی نے مخصوص نمبر گھما کر اپنے مقامی لوگوں سے رابطہ قائم کیا۔ وہ بے چارے ہمارے لیے ابھی تک ملکشمی کا نتا پور کے قرب و جوار میں دھکے کھا رہے تھے۔ جب انھیں ہمارے بخیر و عافیت ہونے کی اطلاع ملی تو انھوں نے یقیناً سجدۂ شکر گزارا ہوگا—— ہمیں وہیں ٹھہرنے کا کہا گیا جبکہ ہمارے دونوں مقامی دوست رخصت ہو گئے۔

اپنوں سے علاحدہ ہونے کا لمحہ خاصا دلگداز ہوتا ہے۔ خصوصاً ان حالات میں جب ہم موت کی شاہراہ پہ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر سنگ سنگ چلے تھے۔



پچھلے کچھ گھنٹوں کی رفاقت میں ہم ایک دوسرے کو اپنا برسوں کا شناسا جاننے لگے تھے۔ جدا ہوتے وقت ہم سب کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔ لیکن ہم جانتے تھے کہ ایسا ازل سے ہوتا آیا ہے اور ابد تک ہوتا رہے گا۔ ہمارا بس اتنا ہی سنگ ہوتا ہے —— ہم ایک دوسرے سے چند گھنٹوں کے لیے ملتے ہیں۔ ایک دوسرے پر جان نچھاور کرتے ہیں اور اپنی امر یادیں چھوڑ کر ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں پھر قسمت ہی سے ہم کبھی زندگی کے کسی موڑ پر آپس میں دوبارہ پرانی یادیں زندہ کرنے کو ملتے ہیں کیونکہ انٹیلی جنس کا طریقِ کار یہی ہے کہ دو ایجنٹوں کا آپس میں کم سے کم ملاپ ہو۔ ممکن ہے وہ اپنی فطرت یا تجسّس کی عادت سے مجبور ہو کر ایک دوسرے کی اصلیت جاننے کی کوشش کریں جو دونوں ہی کے لیے نہیں بلکہ وہاں موجود سارے گینگ کے لیے تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔

دراصل انٹیلی جنس کا طریقِ کار ہی کچھ ایسا پیچیدہ اور عجیب سا ہوتا ہے کہ یہاں کڑی سے کڑی مل کر زنجیر تو بنتی ہے لیکن ایک کڑی کی معلومات بس اپنے حد تک ہی ہوتی ہیں اگر اس کو خود سے آگے یا پیچھے تانک جھانک کرنے کا موقع تفننِ طبع کے لیے بھی دیا جائے تو وہ آگے پیچھے سب کو لے ڈوبے۔

——یہاں لوگ اپنی سلامتی کے لیے بھی دوسروں سے متعلق جانکاری حاصل کرنے سے گریز برتتے ہیں۔ ہاں! ایک جانثاری اور جاں سپاری کا جذبہ ایسا ضرور ہے جو ان میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا جاتا ہے۔ وہ سب اپنے آپ کو ایک جسم اور ایک جان سمجھ کر کام کرتے ہیں، انھیں خود سے زیادہ اپنے ساتھیوں کی زندگیوں کی فکر ہوتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد ایک شاندار کار ہمارے قریب آ کر ٹھہر گئی۔ اس میں سے ایک وجیہہ اور بارُعب نوجوان اُتر کر ہماری طرف آیا۔ ہم نے باتوں ہی باتوں میں کوڈ ورڈز کا تبادلہ کر کے ایک دوسرے کو اپنی آشنائی بہم پہنچائی۔ پھر ہم دونوں، نووارد کی آرام دہ گاڑی میں بیٹھ کر

ایک شاندار ہوٹل کی طرف رَوانہ ہو گئے۔ ہوٹل سے پہلے ہماری کار ایک بارونق اسٹور پر رکی جوان لوگوں کا ہی شاید کوئی اڈہ تھا۔ نوجوان نے بڑے مودّب لہجے میں ہمیں نیچے اترنے کا اشارہ کیا اور ہمیں ساتھ لے کر وہ اس اسٹور میں گھس گیا۔ شاید وہ اس اسٹور کا مالک تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہاں موجود تمام لوگ مودّب ہو گئے۔

ایک بات میں نے خاص طور سے محسوس کی کہ کسی نے ہماری طرف آنکھ بھر کر دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ شاید یہاں کا یہی اصول تھا یا پھر وہ سارے اس کے اپنے آدمی ہی ہوں گے۔ نوجوان ہمیں دکان کے ایک کونے میں بنے چھوٹے سے لیکن خاصے بڑے خوبصورت کیبن میں لے آیا۔ یہ اس کا دفتر تھا جس کے باہر اسٹول پر ایک گورکھا ہاتھ میں ڈنڈا پکڑے بیٹھا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی مودّب ہو گیا۔ پھر اس نے ہی ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا اور ہم تینوں بڑی تمکنت سے چلتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔

"سب سے پہلے تو جناب آپ صاحبان کپڑے تبدیل کر لیں۔" اس نے ایک کونے میں لگی الماری کی طرف اشارہ کیا جس میں بڑی نفاست سے مختلف سائز کے قیمتی جوڑے لٹک رہے تھے۔ شاید یہ جگہ خصوصی طور پر انہی مقاصد کے لیے تھی۔ ہم نے ایک کونے میں کھڑے ہو کر باری باری کپڑے بدلے۔ اس دوران وہ میری اور عثمان کی موجودگی سے بے پروا مختلف فون نمبروں پر انگلیاں گھماتا اور مختلف لوگوں سے رابطہ قائم کرتا رہا۔

"آپ لوگ کچھ پینا پسند کریں گے؟" ہمارے فارغ ہوتے ہی اُس نے دریافت کیا۔

"او کے اٹ از آل رائٹ۔" میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ اب تک خاصا الم غلم ہمارے معدوں میں پہنچ چکا تھا۔ عثمان کی طرف سے تو ابھی تک مجھے تشویش تھی۔

"ٹھیک ہے سر! اپنے بریف کیس اٹھا لیجیے۔" اس نے میز کے ایک کونے میں رکھے دو بریف کیسوں کی طرف اشارہ کیا۔



ہم نے باری باری "شکریہ" کہہ کر بریف کیس تھام لیے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم دوسرے اور خاصے مہذب حلیے میں کیبن سے برآمد ہوئے تھے لیکن اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہ بات یہاں کے معمولات کا حصہ ہے کسی نے حیرت ظاہر نہیں کی تھی۔ نہ ہی پہلے کی طرح اس مرتبہ کسی نے ہماری طرف دیکھنے کی زحمت گوارا کی تھی۔ البتہ وہ سب دوبارہ پہلے کی طرح باادب ضرور ہو گئے تھے۔

اس مرتبہ ہماری گاڑی کلکتہ کے انتہائی شاندار ہوٹل کی طرف جا رہی تھی۔ یہ ہوٹل سمندر کے کنارے بنا ہوا تھا اور ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہم اسی سڑک سے ہوٹل کی طرف محوِ خرام تھے جس راستے سے تھوڑی دیر پہلے کار چھین کر گزر رہے تھے ——— وہی چیک پوسٹ تھی جس کے کچھ فاصلے ہی سے ہم واپس پلٹ گئے تھے۔

——— وہاں پہنچ کر ہمارے ساتھی نے کار کو بریک ضرور لگائے تھے لیکن کیا مجال جو کسی نے اس کے نزدیک پھٹکنے کی کوشش کی ہو۔ شاید وہ اسے پہلے ہی سے جانتے تھے۔

"جائیے صاحب۔" ایک باوردی گدھے نے اسے قریباً سلیوٹ کرتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ایک مسکراہٹ اس جگہ سے گزرتے ہوئے خود بخود ہم دونوں کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ جہاں ہم نے تھوڑی دیر پہلے کار اور اس کے مالک کو چھوڑا تھا۔ کار اپنے مالک سمیت غائب تھی۔ شاید اسے جلد ہی ہوش آ گیا تھا۔ میں نے "بیہوشی کا انجکشن" بھی تو معمولی سا ہی دیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے جہاں ہم جان چھپانے کے لیے مارے مارے پھر رہے تھے۔ اب وہیں لوگ ہمارے لیے دیدہ دل فرشِ راہ کیے کھڑے تھے پھر مجھے جلد ہی اس کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔

——— ابھی ہم چیک پوسٹ سے بمشکل ڈیڑھ دو میل دُور ہی پہنچے تھے جب ہمارے عقب میں پولیس کی تیز رفتار جیپ کا سائرن گونجنے لگا۔

پہلے تو میں نے یہی سمجھا کہ شاید کسی نے چیک پوسٹ سے گزرتے ہوئے ہمیں

پہچان لیا ہے اور اب پولیس ہمارے استقبال کو آرہی ہے لیکن جب ہمارے میزبان نے ہارن کی آواز پہ گاڑی کی رفتار دھیمی کر دی اور ایک پُراسرار مسکراہٹ بھی اس کے ہونٹوں پہ اٹکھیلیاں کرنے لگی تو میں مطمئن ہو گیا۔

ہمارے میزبان نے گاڑی سڑک کے ایک کنارے پہ پارک کر دی اور پولیس کی جیپ کا انتظار کرنے لگا ـــــ جیپ بھی اس کے قریب ہی آکر رُک گئی۔ اس میں سے ایک سب انسپکٹر نکل کر آرہا تھا۔

"ہیلو مسٹر پاٹل ـ ہاؤ آر یو سر!" اس نے خاصی بے تکلفی سے ہمارے میزبان سے جھک کر مصافحہ کیا جو ابھی تک ایک شانِ بے نیازی سے ایک ہاتھ سٹیئرنگ پہ رکھے اور دوسرا کار سے باہر نکالے اُس کی آمد کا منتظر تھا۔

"او۔ کے۔ فائن" مسٹر پاٹل نے جو ہمارا میزبان تھا۔ مختصر سا جواب دیا۔

"سر ـــ" انسپکٹر نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہمارے میزبان نے اس کے منہ سے اس کی بات چھین لی :

"مسٹر سکسینہ۔ آپ کا تحفہ ڈگی میں موجود ہے" اس کے ساتھ ہی اُس نے ڈیش بورڈ سے چابی نکال کر اسے تھما دی ـــــ خود وہ ابھی تک اپنی سیٹ پر جا بیٹھا تھا! انسپکٹر چابی تھام کر سر جھکاتا پیچھے ہٹا اور گاڑی کی ڈگی کھول کر جب وہ واپس پلٹا تو اس کے کان کی لویں بھی خوشی سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں شمپین کی ایک بوتل تھی جسے "تھینک یو" کہہ کر اس نے اب تک دو تین مرتبہ چوما تھا۔ وہ ندیدے بچوں کی طرح جو مٹھائی لے کر خوشی سے ناچنے لگتے ہیں۔ خوش ہو رہا تھا۔

"یو آر گریٹ مسٹر پاٹل" اس نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

"ہم یاروں کے ہیں یار مسٹر سکسینہ۔ یہ اپنے جوانوں کو بھی دے دو" اس نے جیب سے سو سو کے دو تین نوٹ نکال کر اسے تھما دیے۔



"کیا ضرورت ہے مسٹر پاٹل" انسپکٹر نے پیشہ ور عورتوں کی طرح نوٹ تھامتے ہوئے دانت نکال دیے۔

اس کے جوان، اس دوران جیپ میں بیٹھے گردنیں موڑے ٹکٹکی باندھے مسٹر پاٹل کی طرف للچائی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ اکثر کتوں کو اسی طرح ہڈی پھینکتا رہتا تھا۔ اپنا حصہ پا کر ان کی باچھیں بھی کھل گئیں اور جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو وہ سب ایک قطار میں کھڑے باجماعت ہمیں سلام کر رہے تھے۔

"فائن" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"اوہ! یہ تو کچھ بھی نہیں جناب" اس نے انکسار سے گردن جھکا دی۔ اور ہمیں لے کر وہ سیدھا اُس شاندار ہوٹل کے پارکنگ لاؤنج میں جا پہنچا۔ جہاں اسپائی ماسٹر ہمارے منتظر تھے۔

ان کی نظریں کمرے کے دروازے پر ہی جمی تھیں۔ گہری گندمی رنگت، آدھے سر میں چمکتی چاندی، آنکھوں پر سیاہ گہرے رنگ کے شیشوں کا چشمہ جس نے کلوں کی ہڈیاں بھی چھپا رکھی تھیں۔ شاندار سوٹ اور ہاتھوں کی انگلیوں میں پہنی ہوئی قیمتی ہیرے کی انگوٹھیاں اور ان میں پھنسا سگار۔ ایک مرتبہ سے زیادہ ان کی طرف نظر بھر کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گہرے شیشے کی دیوار کے پیچھے سے جھانکتی آنکھیں مقابل کے جسم سے آر پار ہو جائیں گی جب انھوں نے "السلام وعلیکم" کہہ کر مجھ سے ہاتھ ملایا تو ایک سنسناہٹ سی میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ میں نے دوبارہ ان کے چہرے کا پہلے کی سے بھرپور انداز میں جائزہ لینے کی ہمت نہ کی۔

"مسٹر علی کیسے ہیں آپ؟" انھوں نے مجھے اور عثمان کو سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"فی الحال تو ویسے ہی ہیں جناب!" میں نے احترام ملحوظِ خاطر رکھا۔

جواب میں ان کا ہلکا سا قہقہہ بلند ہوا۔ میں ابھی تک اسی سوچ میں غلطاں تھا کہ یہ

کیا وہی صاحب ہیں جو اس سے پہلے ایک فقیر کے روپ میں مجھے دیدار بخش چکے تھے؟ تھوڑی دیر تک رسمی باتیں ہوتی رہیں۔ پاٹل ایک کونے میں بیٹھا اگلے حکم کا منتظر تھا پھر کافی آگئی اور کافی پینے کے بعد انھوں نے پاٹل سے کہا:

"مسٹر عثمان کو ان کا کمرہ دکھا دیں۔ آپ فی الحال صرف آرام کیجئے۔" پہلی دفعہ وہ براہِ راست عثمان سے مخاطب ہوئے تھے۔ اصل میں ہم اب جو گفتگو کرنے والے تھے اس میں عثمان کی موجودگی مانع تھی۔ انھوں نے اتنے شائستہ طریقے سے عثمان کو رخصت کیا کہ میں نے ہی نہیں عثمان نے بھی بالکل محسوس نہ کیا۔ خود عثمان بھی یہاں خاصی الجھن محسوس کر رہا تھا۔ اس کو ہلکی ہلکی حرارت بھی تھی۔ بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ کمرے میں جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی ایک ڈاکٹر نے اس کا چیک اپ کیا تھا۔

کلکتہ میں یہ میری اور عثمان کی آخری ملاقات تھی۔

—— عثمان کے جاتے ہی انھوں نے اپنا بریف کیس کھولا اور ایک انتہائی حفاظت سے رکھا کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ یہ ہیڈ کوارٹر سے میرے نام تازہ ہدایات اور اگلے مشن سے متعلق خط تھا۔ جس کے اوپر اور نیچے سرخ روشنائی سے ہدایت کی گئی تھی کہ اسے پڑھتے ہی فوراً ضائع کر دیا جائے —— عثمان کو واپس بلا لیا گیا تھا اور یوں بھی اب اس کی یہاں موجودگی کا جواز باقی نہیں رہا تھا مجھے مقامی دوستوں سے منسلک رہ کر کام کرنے کے احکامات موصول ہوئے تھے۔ نئے مشن وقتاً فوقتاً مجھے یہیں بریف کیے جانے تھے! میں نے احکامات پڑھتے ہی باتھ روم میں جا کر سگریٹ لائیٹر کی مدد سے کاغذ کو جلایا اور فلش میں بہا دیا۔

"آتما سنگھ تمہارا بہترین کور COVER ثابت ہوگا مسٹر علی" میرے باہر نکلتے ہی اسپائی ماسٹر مجھ سے گویا ہوئے۔ مجھے ان کی اس بات پر قطعاً حیرانی نہ ہوئی کیونکہ مجھے علم تھا کہ وہ میرے بارے میں پل پل کی خبر رکھتے ہیں۔ یہ ان کے لیے بے حد ضروری بھی تھا۔ اس لیے کہ مجھے کوئی نقصان پہنچنے کی صورت میں انھیں خاصی شرمندگی اُٹھانا پڑتی۔



"تم بہت خوش قسمت ہو جو اچانک اس سے ٹکرا کر اس کی ہمدردیاں حاصل کر چکے ہو۔ وہ بہت قیمتی مہرہ ہے مسٹر علی۔ ہم نے دو تین مرتبہ اس کے گرد جال بُنا لیکن ہر دفعہ کسی چکنی مچھلی کی طرح وہ ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا۔ تم نے نادانستگی میں بہت بڑا معرکہ سر کیا ہے۔ یہ شخص ہمارے لیے مضبوط قلعے کی مانند ثابت ہوگا جس میں پناہ لینے کے بعد ہم تمام بیرونی خدشات سے بے نیاز ہو سکتے ہیں۔ تم نے سکھوں کے امور پر خصوصی مہارت دورانِ تربیت حاصل کی ہے —— آج تمہاری صلاحیتیں بروئے کار لانے کا وقت آیا ہے۔ آتما سنگھ تمہاری کمین گاہ ہے مسٹر علی۔ تم وہیں سے نکل کر شکار پر جھپٹو اور وہیں واپس چلے آؤ۔ اس کے دل میں گھر کرنے کے لیے بہت کچھ کر گزرو۔ یہ ملک و قوم کے لیے بہت ضروری ہے، بہت ہی ضروری۔ انھوں نے بڑی چابکدستی سے پاٹل کی اصل شخصیت کو چھپا لیا تھا۔

"سر! مجھے آپ انشاءاللہ ہمیشہ ایسا ہی پائیں گے۔" میں نے انھیں یقین دلانے کی کوشش کی۔

"تھینک یو مائی لوائے۔" انھوں نے میرے انسٹرکٹر کی طرح میری پیٹھ تھپکی اس لمحے وہ مجھے واقعی اپنے "سر" محسوس ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک ہم اپنا لائحہ عمل طے کرتے رہے پھر وہ فون اٹھا کر پاٹل کو ہدایات دینے لگے۔ دوسرے ہی لمحے وہ ہمارے کمرے میں تھا۔

"تمہارا دوست بخیریت ہے اور انشاءاللہ دو تین روز تک ڈھاکہ پہنچ جائے گا۔ ابھی اسے آرام کی بھی ضرورت ہے۔ تم بہرحال 'سولجر' ہو۔" انھوں نے جاتے جاتے مجھے تشفی دی۔ یہ ان کی مہربانی تھی کہ انھوں نے جانے سے پہلے مجھے عثمان سے ملاقات کا موقع فراہم کر دیا تھا اگر وہ ایسا نہ بھی کرتے تو یہ کوئی خلافِ توقع بات نہ ہوتی، بلکہ توقعات کے عین مطابق ہوتا۔

"مسٹر پاٹل تمہارے بہترین دوست ثابت ہوں گے مسٹر امرجیت سنگھ۔" انھوں نے

نے پاٹل کا اور میرا نیا تعارف کرایا۔

"ویل کم ٹو یو سر۔" پاٹل نے گرمجوشی سے میرا ہاتھ دبایا۔

ان کے اس فقرے میں بہت کچھ پوشیدہ تھا۔ اب میں پاٹل پر ہر طرح اعتماد کر سکتا تھا۔ پھر "اسپائی ماسٹر" رخصت ہو گئے اور ہم دونوں وہیں رہ گئے۔ میں اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ اس سے عثمان کے متعلق دریافت کروں یا نہ کروں کہ اس نے خود ہی میرے منہ کی بات چھین لی۔

"آئیے مسٹر عثمان سے ملتے ہیں۔" اور میرا ہاتھ بے تکلفی سے پکڑ کر وہ مجھے کمروں کی اس قطار کے سامنے سے گزارتا عثمان کے کمرے کے سامنے آ گیا۔ دروازے پر مخصوص دستک دے کر ہم نے دروازہ کھلوایا۔ عثمان کو ڈاکٹر انجکشن اور کچھ دوائیں دے کر آرام کی ہدایت کے ساتھ واپس چلا گیا تھا۔ وہ بھی سونے کے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔

"مسٹر عثمان آج یہیں آرام کریں گے کل واپس جائیں گے۔" پاٹل کے منہ سے عثمان نے غالباً پہلی مرتبہ یہ اطلاع وصول کی تھی۔ یہ سنتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات اچانک بدل گئے ——— وہ اس خبر سے خاصا غم زدہ ہو گیا تھا لیکن میرے لیے معمول کی کارروائی تھی پھر بھی نجانے کیوں اس سے الگ ہوتے ہوئے میں ایک خلش سی محسوس کر رہا تھا۔

"شکریہ میرے دوست! تم نے واقعی اپنا حق ادا کیا۔ میرے خیال سے اُس طرف تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔" میں نے اس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر اسے حوصلہ دیا۔

"علی بھائی! ہم سب تمہارے منتظر رہیں گے۔" ایک ایک لمحہ غنیمت تھا۔ وہ بالآخر کہہ ہی گیا۔

"میں ضرور آؤں گا۔ تم سب سے ملنے آؤں گا۔ میں تم لوگوں کو کبھی نہیں بھلا سکوں گا عثمان بھائی۔" اس وقت مجھے اپنا لہجہ خود اپنے لیے اجنبی سا لگا۔

"اچھا میرا خیال ہے اب تم عیاشی کرو۔" میں نے آرام دہ بستر اور ایئر کنڈیشنر



کی طرف اشارہ کر کے ماحول کو غیر سنجیدہ کرنا چاہا۔ میرے ساتھ ہی پاٹل نے بھی ہلکا سا قہقہہ لگا کر میرا ساتھ دیا۔ ایک زخمی سی مسکراہٹ عثمان کے ہونٹوں سے پھسل گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر رخصت ہو گئے۔

"گھر میں سب تک میری نیک تمنائیں پہنچا دینا۔ خدا حافظ۔" میں نے دروازے میں پہنچ کر مڑتے ہوئے کہا۔ اس لمحے میں اس کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسوؤں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں باہر نکل گیا اور آہستہ آہستہ کمروں کی قطار کے سامنے سے گزرنے لگا۔ پاٹل کی آمد تقریباً ایک ڈیڑھ منٹ بعد ہوئی تھی وہ غالباً عثمان کو آخری ہدایات دے کر آیا تھا ——— اب ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ اصولاً مجھے عثمان کو اور عثمان کو مجھے بھول جانا چاہیئے تھا، نہ تو ہم ایک دوسرے سے رابطہ پیدا کر سکتے تھے۔ نہ ہی ایک دوسرے سے کلکتہ میں اب مل سکتے تھے۔

# ایک پہیلی

ہوٹل سے واپسی پر بھی پاٹل کے ساتھ ملازمین کا رویّہ خاصا مہذبانہ اور شناسا قسم کا دکھائی دیتا تھا۔

اسپائی ماسٹر اور پاٹل کے تعلقات سے مَیں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اسے اسپائی ماسٹر کا خصوصی قرب حاصل ہے لیکن مجھے ابھی تک اس نے "جناب" ہی سے مخاطب کیا تھا۔ جس کا مطلب یہی تھا کہ مَیں اس کا سینئر ہوں۔ پھر مجھے خود ہی اس بات کی سمجھ آگئی؛ ممکن ہے یہ ڈھونگ بھی اس کی شخصیت پر پردہ ڈالنے کے لیے رچایا گیا ہو۔

یہ ان لوگوں کی بڑی فراخدلی تھی کہ انھوں نے ایک نئے ایجنٹ کو جس کے قدم ابھی تک کہیں نہیں جمے تھے اپنے ایک دو انتہائی اہم ٹھکانوں سے آگاہ کر دیا تھا۔ ایسا عموماً اسی صورت میں کیا جاتا ہے جب یا تو حالات انتہائی سنگین نوعیت کے ہوں یا پھر "زلف کے سر ہونے تک" کے انتظار کی مہلت نصیب نہ ہو۔ کیونکہ کسی ایجنٹ کے متضاد معاشرے میں اسٹیبلش ہونے میں خاصا وقت لگتا ہے۔ غیر مذہب، نیا ماحول، نئے لوگ جن کی محبتوں اور نفرتوں کا انداز بھی یکسر مختلف ہو۔ ان میں خود کو کھپانا، ان کی توجہ حاصل کرنا۔ ان کی شناخت اپنانا کوئی ایسا آسان بھی نہیں۔ دورانِ تربیت ہمیں جن حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے عملی میدان میں حالات اس سے اکثر مختلف پیش آتے ہیں۔ تب سکھلائے



گئے لگے بندھے اصولوں کو ایک طرف رکھ کر اپنی بصیرت کے مطابق بڑے اہم اور خطرناک فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔ مجھے ابھی تک اپنے محسن "سر" کے وہ الفاظ نہیں بھولے تھے جو انھوں نے کراچی سے روانگی کے وقت مجھ سے کہے تھے کہ حالات تربیت کے مطابق ہی پیش نہیں آتے! میرے ذہن میں جاسوسی کی کلاس کے محترم استاد کا وہ فرمان ہمیشہ زندہ رہا: "اچھا جاسوس مواقع خود پیدا کرتا ہے پیدا شدہ مواقع سے فائدہ اٹھانا کچھ اتنا بڑا کارنامہ نہیں۔"

مَیں پاٹل کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور وہ مجھے کلکتہ کے گلی کوچوں، مختلف حساس مقامات، جہاں عموماً سیکورٹی والے موجود رہتے تھے، اچانک خطرے میں گھر جانے کی صورت میں قریبی سیف ہاؤس تک رسائی کا طریقہ اور اپنے بزنس سے متعلق مختلف نوعیت کی معلومات بہم پہنچا رہا تھا۔

"آپ ضرورت محسوس کریں تو آتما سنگھ سے میرا تعارف اپنے بہترین دوست کی حیثیت سے کروا سکتے ہیں۔ اس طرح آپ کا تعارف بھی مکمل ہو جائے گا کیونکہ اس کی اطلاعات کے مطابق ہم لوگ بھی اسی قسم کا دھندا کرتے ہیں جس قسم کا آتما سنگھ۔ ویسے ہمارا زون اس سے بالکل علاحدہ ہے، اتنا الگ کہ ہمارے آپس میں ٹکراؤ کے امکانات شاید کبھی پیدا نہ ہو سکیں پھر ہم بہترین دوست بھی تو ہیں۔" اس نے میرے کندھے کو کسی قدر بے تکلفی سے تھپتھپایا۔

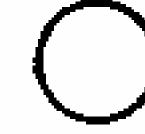
"شکریہ مسٹر پاٹل۔" مَیں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مسٹر امرجیت سنگھ۔ میرے خیال سے آپ کو یہاں ڈراپ کر دیا جائے۔ اس سے آگے کا سفر آپ خود کریں۔ گیانی جی آپ کے اچانک غائب ہونے پر شاید پریشان ہوں۔ اور ہاں!" بات کرتے کرتے جیسے اُسے کچھ یاد آ گیا: "آتما سے بچے رہیے۔ اس کے کئی روپ ہیں، ممکن ہے کسی روپ میں وہ آپ سے مل بھی چکی ہو!"

مَیں اسے اس بات کا کیا جواب دیتا۔ اسے کیسے بتاتا کہ ہمارا بھرپور تعارف ہوتے

ہونے بچاہے۔ وہ بھی قدرت کی مہربانی سے ورنہ اوما نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

"اوکے مسٹر امرجیت گڈ لک" ایک جگہ کار کھڑی کر کے اس نے مجھے اتار دیا۔



سورج اجالوں سے ظلمتوں کی طرف اپنے سفر کا آغاز کر چکا تھا۔ جب میں کلکتہ کی ماڈرن آبادی میں بنے گیانی آتما سنگھ کے بنگلے کے دروازے پر لگی گھنٹی بجا کر اندر سے کسی کی آمد کا منتظر تھا۔ دروازہ کھولنے والی شخصیت کو اگر کوئی تھوڑے دل والا دیکھ لیتا تو بجائے کچھ کہنے کے فوراً بھاگ جاتا۔ اس کا قد بلا مبالغہ ساڑھے چھ فٹ کے قریب تھا۔ سیاہ رنگ اور چوڑے چکلے سینے پر رکھے فٹ بال نما سر میں مہارت سے فٹ کی ہوئی سفید گول گول آنکھیں حلقوں سے اُبلی پڑتی تھیں۔

"کیا ہے؟" اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں دھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"گیانی جی سے ملنا ہے۔" میں نے بغیر اس کے رعب میں آئے جواب دیا۔

"بھاگ جا۔" اس نے اپنے لمبے بازو سے ایک طرف اشارہ کیا۔

"اندر دفع ہو جاؤ اور امرجیت سنگھ کی آمد کی خبر دو۔" میں نے اپنے لہجے کو خاصا بارعب بنا لیا تھا۔

اس نے بڑی حیرت سے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا ـــــ شاید وہ میری دماغی حالت جاننا چاہتا تھا۔

"سنتے نہیں۔" میں نے دوبارہ اسے ڈانٹا۔

"ٹھہرو۔" اس نے کھٹاک سے دروازہ دوبارہ بند کرتے ہوئے کہا۔

دوبارہ اس کی واپسی اسی دشمنِ ایمان اوما کے ساتھ ہوئی تھی۔ جس کے متعلق پاٹل نے مجھے خصوصی ہدایات دی تھیں اور جس کی آتش فشانیوں کا دور ہی سے سہی، تھوڑا بہت تو میں بھی نظارہ کر چکا تھا۔



"آپ ـــ آئیے مہاراج جی! آئیے۔" اس کا چہرہ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔

اس روز مہذب لباس میں میں خاصا شریف آدمی دکھائی دے رہا تھا۔ اتنا بھلا کہ کلکتہ ایسے شہر میں کوئی بھی خاتون مجھ سے متعارف ہونے میں فخر محسوس کر سکتی تھی۔

"کیسی ہو؟" میں نے بڑے غیر سنجیدہ سے لہجے میں دریافت کیا۔

"تھینک یو سر۔" اس کا لہجہ پہلے سے خاصا مختلف تھا۔

ـــــ اس ملاقات میں تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میری کوئی زر خرید لونڈی ہو۔ "شاید گیانی نے اسے خاص ہدایات دی تھیں؟" ہم دونوں ایک دوسرے کی ہمراہی میں اس پُرتکلف ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔ اس نے بڑی دلربائی سے جھکتے ہوئے اپنے تمام نقوش با اگر کر کے مجھے سامنے صوفے پر بیٹھنے کی دعوت دی۔

"کیا پئیں گے مہاراج؟" وہ اپنی اصلیت کی طرف لوٹ رہی تھی۔

"گیانی جی کہاں ہیں؟" میں نے اس کی پیش کش کو جیسے نظر انداز کر دیا۔

"امرجیت جی اس گھر میں تو کیا ـــــ سارے شہر میں بھی شاید کوئی آپ کو اس سوال کا جواب نہ دے سکے بلکہ یہاں کوئی ایسا سوال پوچھتا ہی نہیں۔" اس کا لہجہ کچھ سنجیدہ ہو چلا تھا۔

"اچھا ـــ پھر چائے لے آؤ۔" میں نے ہنکارہ بھرتے ہوئے کہا اور وہ مسکراتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی جہاں میز پر رکھے انٹرکام پر اس نے کسی کو چائے لانے کو کہا اور واپس آگئی۔

"بیٹھ جاؤ۔" میں نے اسے سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"شکریہ جناب۔" اس نے صوفے پر بیٹھنے کے بجائے ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

"ایک بات پوچھوں؟" میں نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اسے قابو کرنا چاہا۔

"ہاں! لیکن مجھے معافی چاہتے ہوئے کہنے دیجیے کہ ممکن ہے آپ کی ہر بات کا میں

جواب نہ دے سکوں ——— اصل میں آپ ابھی نئے نئے ہیں، جلد ہی آپ کو یہ علم بھی ہو جائے گا کہ یہاں سوال جواب بھی مخصوص قسم کے ہی ہو سکتے ہیں۔" اس نے یہ بات ہنستے ہنستے کہی تھی لیکن اس کی ہنسی میں چھپے خطرے کو میں نے بخوبی بھانپ لیا تھا اور وہ مجھے اشاروں کنائے میں، وہ سب کچھ بتا دینا چاہتی تھی جو شاید وہ اپنے ہونٹوں پر کبھی بھی نہ لا سکتی تھی۔

"گیانی جی کے ساتھ تم کب سے ہو؟" میں نے اس کی وارننگ کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"پچھلے چار یا پانچ سال سے۔"

"تمہارے فرائض کی نوعیت کیا ہے؟"

"سوری!"

"او۔کے ممکن ہے یہ کچھ پرائیویٹ قسم کی بات ہو۔" میں نے اسے چڑا کر جواب حاصل کرنا چاہا لیکن وہ تو ٹھس ہو کر بیٹھی رہی۔ پھر اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔" اچھا گھر والوں کو میرے آنے کی اطلاع تو دو۔" میں نے اس سے کہا۔

"جناب اس طرف صرف دو ملازمین کو جانے کی اجازت ہے جیسے ہی وہ یہاں آتے ہیں۔ میں آپ کا پیغام پہنچا دوں گی۔"

بس یہی میں جاننا چاہتا تھا۔ گیانی واقعی خاصا پُراسرار ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی شخصیت پیاز کے چھلکوں کی طرح تہہ در تہہ تھی۔ ہر نئے پرت کے نیچے سے اس کا نیا روپ نمودار ہوتا تھا کبھی وہ وحشی درندہ دکھائی دیتا تو کبھی سچائی کا روپ دھار لیتا۔ وہ ایک دکھی دل، غم زدہ باپ بھی تھا اور بچوں سے ان کے ماں باپ چھین لینے میں کوئی قباحت بھی محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ روزانہ گرنتھ صاحب کا پاٹھ کرتا تھا اور اوما جیسی داشتائیں بھی اس کے ہاں پل رہی تھیں۔ اس کی بیوی اور امرت کور کو دیکھ کر عقیدت سے انسانی نظریں جھک جاتی



تھیں۔ ایک تقدس مآب سا رعب دوسرے پر طاری ہونے لگتا تھا اور ایک یہ گیانی تھا جس نے اپنے نوابانہ ٹھاٹھ باٹھ والے ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں نیم عریاں عورتوں کے بت سجا رکھے تھے اور دوسرے کونے میں گرو نانک اور گرو گوبند سنگھ کے قد آدم پورٹریٹ جس کے نیچے اکثر عود سلگتا رہتا تھا۔

کیسا جابر تھا یہ شخص کہ اس کی غیر موجودگی میں بھی اس کے ملازمین اس کے حکم کے مطابق ہی بات کرتے تھے۔ میری اس سے دو مختصر سی ملاقاتیں ہوئی تھیں اور ابھی تک میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اس سے محبت کروں یا نفرت؟

"کہاں کھو گئے مہاراج۔" اوما نے مجھے سوچوں کے بھنور سے باہر کھینچا۔

"ہوں۔ کہیں نہیں! تمہارے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔" میں نے "ہوں" ذرا زیادہ ہی لمبی کر دی تھی۔

"جھوٹ۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"مطلب۔" میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ پاٹل کا وہ فقرہ میرے ذہن میں چکرانے لگا: "اس کے کئی روپ ہیں" ——— جانے پاٹل نے اس کا کون سا روپ دیکھ لیا تھا؟ اسے واقعی گیانی جیسے آدمی کی سیکرٹری ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اس کی طرح کئی روپ رکھنے والی اور اسی کی طرح پُراسرار۔ عجیب و غریب ——— نہ سمجھ آنے والی۔"

"مطلب کچھ نہیں ——— بس یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ جب کوئی مرد جھوٹ بولے مجھے پتہ لگ جاتا ہے۔" اس نے میری بات ہنسی میں اڑا دی۔ اتنے میں ایک نہنگ سکھ اس طرف آتا دکھائی دیا۔ ہم دونوں اسی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ بیس بائیس سال کا نوجوان لڑکا تھا۔

"بابا جی۔ اندر پیغام پہنچا دیں سردار امر جیت سنگھ آئے ہیں۔" اس نے نہنگ سکھ کو مخاطب کرتے ہوئے حکم دیا۔

"آؤ شے (ضرور)"۔ کہہ کر وہ انہی قدموں لوٹ گیا۔

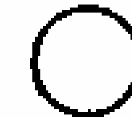
ہم دونوں ہی چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائے کچھ سوچ رہے تھے۔ غالباً وہ بھی میرے متعلق سوچ رہی ہو گی۔ اس کے چہرے پر وہی دعوت نما مسکراہٹ ابھی تک سرسراری تھی۔ شاید بعض معاملات میں گیانی جی نے اسے کھلی چھٹی دے رکھی تھی ——— اب میرا اندازہ غلط ثابت ہونے لگا تھا: گیانی آتما سنگھ نے اسے میرے متعلق "تارا" ہو۔

"ایک بات ہے مسٹر امرجیت۔ اگر آپ نے یہاں رہنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو آپ کو یہاں کی ہر شے سے واسطہ پڑے گا۔ مجھ سے بھی"۔ اس مرتبہ اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ نمایاں تھی۔ اس کی جگہ کوئی بھی عورت ہوتی تو یہی لہجہ اختیار کرتی۔ شاید انانیت کی جنگ ہارنا عورت کو کبھی قبول نہیں رہا۔

"شریمتی اوما دیوی جی ——— میں نے آج سے پہلے زندگی اپنی مرضی سے نباہی ہے اور آج کے بعد بھی ایسے ہی عزائم رکھتا ہوں"۔ میرے لہجے میں چیلنج کی کاٹ تھی لیکن وہ کمال چالاکی سے طرح دے گئی۔ شاید اس مرحلے پر مجھ سے الجھنا اسے گوارا نہیں تھا۔

"بہت سے لوگ یہاں آنے سے پہلے بڑی بڑی خوش فہمیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ خیر وقت بہر حال بہترین منصف ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا"۔ اس نے یہ فقرہ قدرے مسکرا کر ادا کیا تھا ——— اس میں چھپے مفہوم سے مجھے بہت پہلے سے آشنائی حاصل تھی۔ نہنگ سکھ واپس آ گیا تھا۔

"آئیے مہاراج جی"۔ اس نے قدرے جھک کر مجھے ایک دروازے کی طرف متوجہ کیا۔



ایک مرتبہ پھر میں اس آنگن میں کھڑا تھا۔ جس میں داخل ہوتے ہی مانوس سی اپنائیت کا احساس ہونے لگتا تھا ——— جس میں قدم رکھتے ہی اپنے گاؤں کی ہریالیوں سے سجی پگڈنڈیوں پر بھاگنے لگتا اور اس دوڑ کا اختتام ایک ایسے ہی گھر کے آنگن میں ہوتا تھا۔



بالکل ایسا ہی گھر جس میں ایک فوجی کسان تھا۔ ایک ماں تھی اور ایک بہن۔

——— اس گھر کی طرح ان کے آنگن کا دیپ بھی اپنی روشنیاں لیے کہیں دور ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔ وہ بھی اس گھر کی "ماں" کی طرح اپنی آنکھوں کی جوت جگائے اپنے نورِ بصیرت کے منتظر تھے ——— ان کا امرجیت بھی ان سے دُور تھا اور جن ماؤں کے امرجیت ان سے دُور رہوں ان کے کلیجوں سے کیسی کیسی ہوک اٹھتی ہے اس کا اندازہ مجھے گیانی آتما سنگھ کے گھر والی کی آغوش میں سما کر ہوا۔

"پیریں پیناں ماں جی (پاؤں لگتا ہوں ماں جی)"۔ میں نے جھک کر ہندو رسوم کے مطابق اس کے پاؤں چھو کر اسے پرنام کرنا چاہا لیکن ماں جی نے لپک کر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

"میرا لال، میرا شیر، میرا امرجیت سیہاں"۔ ہر لفظ میں اس کا خونِ جگر شامل تھا۔ کتنا بولنا ہوتا ہے وچھوڑے کا روگ اور کتنا وشال سینہ ہوتا ہے ماؤں کا جو اتنے بڑے غم کو اندر سمائے رکھتا ہے۔ اس لمحے مجھے اپنی ماں بہت ہی یاد آئی اور ساتھ ہی اس بات کا افسوس ہوا کہ میں نے یہاں اپنا تعارف آخر "امرجیت" ہی کے نام سے کیوں کرایا تھا؟ گیانی آتما سنگھ کو بتانے کے لیے میرے پاس ایسے سینکڑوں نام اور بھی موجود تھے لیکن قدرت بھی تو کوئی عامل ہے سا سے اپنے عمل کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے بھی تو اسباب درکار ہوتے ہیں اور اس نے اس ڈرامے میں ایک کردار ادا کرنے کے لیے لیفٹیننٹ علی کو بھی نہ جانے کب سے چُن رکھا تھا ——— اگر ہم اس طرح نہ ملتے تو ممکن ہے کسی اور طریقے سے مل جاتے، بہر حال ہمارا ملاپ ضرور ہوتا۔

"کہاں رہا بیٹا تو اتنے روز؟ ہم تو تیرے اس وقت سے منتظر ہیں ——— بچہ! تجھے کیا میرے ماں ہونے کا یقین نہیں آیا؟"

میرے پاس اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"ویرجی ست سری اکال" دائیں طرف سے امرت کور نے پرنام کیا۔

"ست سری اکال" میں نے بھی ہاتھ باندھ دیئے۔ امرت کور کا بھرپور جائزہ میں نے آج ایک مرد کی حیثیت سے لیا تھا میری نظروں نے، اس ماجھے کی جٹی کو ضمیر کی کسوٹی پر پرکھا تو وہاں ایک ہی رزلٹ ابھرا۔ جیسے بسا اوقات طوطے کو چار مرتبہ چوریاں دے کر بھی ہم بار بار قسمت کے حال والا ایک ہی کارڈ جواب میں وصول کرتے ہیں۔ میرے شعور کے کمپیوٹر کی ٹک ٹک اور کھٹاک کھٹاک سے ایک ہی فقرہ ابھرا تھا "میں ایک بہن ہوں"۔

وہ ایسی ہی عفت مآب لڑکی تھی جسے دیکھ کر صرف "بہن" کا تصور ہی جنم لے سکتا تھا۔ اُس کی آنکھیں اتنی ہی خوبصورت تھیں جتنی غزال کی لیکن ان میں ایک حجاب تھا۔ ایک پُرتقدس جھجک موجود تھی۔ ایک ایسا عزّت مآب قسم کا تاثر وہاں موجود تھا کہ غلیظ نگاہیں بھی ان سے ٹکرائیں تو احترام کو جھک جائیں۔

——— ضرور گیانی آتما سنگھ نے کسی جنم میں کوئی بہت بڑا پُن کیا ہوگا ورنہ بدمعاشوں کی اولادیں اتنی تقدس مآب نہیں ہوتیں کہ انھیں دیکھتے ہی یُوں احترام خود بخود اندر سے جنم لینے لگے۔

"ویرجی آپ .....؟" اس نے بھی اپنی ماں والا سوال ہی دہرانا تھا۔

"میں تمھارے پاس ہوں بہن! میں تمھارے پاس رہوں گا" اس سے زیادہ میں کچھ نہ کر سکا۔ اس سے مصلحتاً بھی جھوٹا وعدہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"ویرجی میں کھانا لاؤں؟"

——— رات ہو چلی تھی اور وہ میرا جواب سُنے بغیر کھانا لینے چلی گئی۔ میں ماتا جی کے چرنوں میں بیٹھ گیا۔ وہ مجھ سے عجیب عجیب باتیں پُوچھنے لگیں۔ میرے ماں باپ کی باتیں، بہن بھائیوں کی باتیں! اور جب میں نے انھیں بتایا کہ میرا واہگورو کے سوا اس دنیا میں اور کوئی نہیں تو وہ تڑپ اٹھیں۔



"ہائے پتّر ایسے شبد منہ سے کیوں نکالتا ہے ہم کیا مر گئے ہیں"

"پرماتما نہ کرے ماں جی" میں نے ان کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

"چھیندے! تو اب کہیں نہ جایا کر۔ یہیں رہ ہمارے پاس۔ ہمارا امرجیت بن کر"

"اچھا ماں جی" مجھے اس لمحے خود سے بڑی شرم محسوس ہوئی۔ امرت کور کھانا لے آئی تھی۔ اس نے روایتی انداز میں میری "تھالی" الگ بنائی تھی۔ وہاں سوائے چاہت کی گرمی کے اور کسی شئے کا حبس محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن وہ میرے سامنے پنکھا لے کر بیٹھی رہی، حالانکہ کمرہ ایئرکنڈیشنڈ تھا۔

گیانی آتما سنگھ اندر داخل ہوا تو امرت کور میری تھالی میں تازہ پُھلکا رکھ رہی تھی اور ماتا جی پیتل کے گلاس میں دودھ ملی لسّی اُنڈیل کر میری طرف بڑھا رہی تھیں۔ وہ حیرت سے ٹکٹکی باندھے یہ منظر دیکھتا رہا اور اس وقت تک جب تک کہ میں نے خود کھڑے ہو کر اُسے پرنام نہ کر لیا۔

"ست سری اکال پتّر" اس نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ اس لمحے وہ بین الاقوامی اسمگلر نہیں صرف ایک باپ تھا۔ ماں بیٹی نے اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جن میں ایک عجیب سی شکایت چھپی تھی۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے گلہ کر رہی تھیں کہ اس نے یہ طلسم کیوں توڑ ڈالا۔ ہماری آپس کی اپنائیت سے جس ماحول نے جنم لیا تھا اس میں گیانی جی کی آمد سے وہ پہلے والی بے تکلفی باقی نہ رہی تھی۔

"کھا پُتّر کھا" اُس نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور خود بھی ہماری طرح وہیں چٹائی پر بیٹھ گیا۔

"کب آئے ہو پُتّر؟"

"ابھی آیا ہے" میری بجائے ماتا جی نے جواب دیا۔

"آنے کی اطلاع تو کر دی ہوتی پُتّر۔" اس نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کیوں، اپنے گھر بھلا کوئی اطلاع کر کے آتا ہے بالو جی۔" اس مرتبہ جواب دینے کی باری امرت کور کی تھی۔

گیانی خاموش ہو رہا وہ چالاک بدمعاش کے بجائے کوئی گھامڑ قسم کا بڈھا نظر آ رہا تھا۔ شاید میری ملاقات اپنے گھر والوں سے کرواتے وقت اُسے اتنے شدید ردِّ عمل کی توقع نہیں تھی۔ ان سب کی کمزوری ایک امرجیت سنگھ تھا جس کی شکل اتفاق سے کچھ مجھ سے ملتی جلتی تھی اور میری طرح وہ بھی "مونا سکھ" تھا۔ اُس نے تو شاید یہی سوچا ہوگا کہ ممتا کے بھڑکیلے جذبات پر میری آمد کی اوس کوئی ٹھنڈک پیدا کر دے گی لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا —— اس کی تپش تو پہلے سے کئی گناہ بڑھ گئی تھی۔

یہ گیانی آتما سنگھ کی بہت بڑی کمزوری تھی جو اتفاق سے میرے ہاتھ آ گئی تھی جس طرح اتفاق سے میں اس سے ٹکرا گیا تھا —— یہ اتفاقات ہم دونوں ہی کے لیے بڑے ہنگامہ خیز ثابت ہوئے تھے! کھانے سے فارغ ہو کر میں اٹھ کھڑا ہُوا۔ میرے قدم "معمول" کی طرح گیانی جی کے تعاقب میں اُٹھے تھے۔ ہم دونوں گھر ہی کے ایک دوسرے کمرے میں بیٹھ گئے۔ گیانی گہری سوچوں میں کھویا ہوا تھا۔ "پتّر یا تو تم قسمت کے دھنی ہو یا پھر بہت ہوشیار۔ تم نے گیانی آتما سنگھ کو بھی پابند کر دیا ہے۔"

"قسمت کا دھنی ہوں گیانی جی! بہت چھوٹا تھا تو ماتا، پتا دشمن کے ہاتھوں مارے گئے جوان ہوا تو مہربان چاچے سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ ایک بیٹا تھا چاچے کا وہ بھی میری بھینٹ چڑھ گیا۔ دشمن نے اُسے امرجیت جان کر مار ڈالا۔ قسمت اچھی ہے جو میں سالے بیاروں کو چاٹ کر ابھی تک زندہ ہوں۔" میرا لہجہ مکمل طنزیہ تھا اور اس لمحے اپنی شاندار اداکاری پر مجھے خود پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔

"کون سا ضلع ہے تمھارا؟"



"گورداسپور۔"

"تحصیل؟"

"بٹالہ"

"گاؤں؟"

"میرا خیال ہے گیانی جی ہمارے درمیان کوئی شریفانہ معاہدہ طے پا چکا ہے۔ مجھے ہر سوال کے جواب کا پابند نہ کیجیے۔" میں نے ذرا اکھڑے سے لہجے میں کہا۔

"پُتّر وہ تب کی بات تھی۔ اب تم ہماری کمزوری بن چکے ہو۔" اس نے لفظ "ہماری" پر کچھ زیادہ ہی زور دیا تھا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟" میں نے سب کچھ جانتے بوجھتے وضاحت چاہی۔

"دیکھ پُتّر۔ میرے جسم پر اٹھارہ زخموں کے نشان ہیں۔ عمر کے اس حصے میں لوگ "یاترا" کو چلے جایا کرتے ہیں! اس دھندے نے اگرچہ مجھے کروڑپتی ضرور بنا دیا ہے لیکن اسے اپنانے سے پہلے میں بھوکا نہیں مر رہا تھا اور اگر وہ سب کچھ جو تم کہہ رہے ہو سچ ہے تو اس بات کے یقیناً قائل ہو چکے ہوگے کہ بندہ پرماتما کے سامنے مجبورِ محض ہے۔ موم کی گڑیا کی طرح! وہ جیسے چاہے ہمیں ناک پکڑ کر دوسری طرف گھما دے —— مجھے یہ کہنا تو نہیں چاہیے لیکن مجھے اپنے بازوؤں پر آج بھی اتنا ہی بھروسہ ہے جتنا تمھیں اسوقت۔ تین چار گولیوں سے مرنے والا میں نہیں۔ لیکن میری بیوی اور بچی میری بہت بڑی کمزوری ہیں۔ اس کمزوری کو کبھی "ایکسپلائٹ" نہ کرنا...."

"گیانی جی" —— میں نے اس کی بات درمیان ہی سے کاٹ دی۔

—— مجھے آخری فقرے سے زوردار جھٹکا لگا تھا بالکل یوں محسوس ہوا تھا، جیسے اچانک میرا ہاتھ بجلی کے ننگے تاروں سے چھو گیا ہو۔ "مجھے اپنے نسب اور خون پر مان ہے گیانی جی۔ میں مر سکتا ہوں لیکن گھٹیا زندگی کا تصور نہیں کر سکتا —— میں

آپ کو اپنے متعلق سب کچھ بتاؤں گا لیکن ابھی ایک قرض مجھ پر باقی ہے ــــــ میں نے ایک وچن کا پالن کرنا ہے گیانی جی۔ میں اپنے انتقام میں کسی کی شراکت نہیں چاہتا۔ میں نے اپنے دشمنوں کو اپنے ہاتھوں مارا ہے اور بچے ہوئے کو بھی خود ماروں گا۔ فی الوقت مجھے آسرا درکار ہے۔ مختصر مدت کے لیے! میں امرت کور اور ماں جی کو اپنی بہن اور ماں کے سمان جانتا ہوں۔ یہ مرد کی زبان ہے۔ پنجاب کے غیرت مند گبھرو کی۔"

میں بول رہا تھا اور گیانی جی کی جہاں دیدہ نظریں میرے لفظوں کو ٹٹول رہی تھیں۔

جب میں نے بات ختم کی تو اس کے چہرے کے کھچے کھنچے نقوش ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ وہ پُرسکون ہو گیا تھا۔ اس کے تجربے نے اُسے بتا دیا تھا کہ: یہ امرجیت سنگھ کوئی عام قسم کا جوان نہیں اور نہ ہی کوئی گرا پڑا عام سا انسان ہے۔

"پُتّر تو قلعے میں آگیا ہے۔ فولاد کے قلعے میں، یہاں تتی ہوا بھی تجھ تک نہیں آسکتی۔ یہ گیانی آتما سنگھ کی زبان ہے اور آتما سنگھ کے پران جائیں تو جائیں اس کے وچن کبھی جھوٹے نہیں پڑ سکتے۔" اس نے جھک کر میرے کندھوں کو تھپتھپایا۔

"گیانی جی یہ پناہ مشروط قسم کی ہے۔ اس کے بدلے میری خدمات حاضر ہیں اور اگر آپ نے جان بوجھ کر ان سے استفادہ نہ کیا تو میری مردانگی کے لیے طعنہ ہو گا۔ تب میں جس طرح آیا ہوں اسی طرح چپ چاپ واپس لوٹ جاؤں گا۔ میں اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میں کسی کا زیرِ بار نہیں رہ سکتا۔ یہ بات مجھے کھا جاتی ہے کہ میں کسی کا احسان مند ہو رہا ہوں۔"

میں نے بڑے اعتماد سے اُسے آگاہی دی۔

اس بات کا جواب دینے کے بجائے وہ براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکتا رہا ــــ اس کی آنکھوں سے ایک مقناطیسی قوّت خارج ہو کر میرے نظامِ تنفس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ جس سے میری سانسوں کی ترتیب بگڑنے لگی! پھر قوّتِ ارادی آڑے آئی اور میں سنبھل گیا۔

گیانی کا ہر روپ نرالا تھا۔ "ٹھیک ہے پُتّر۔ میں بھی ہیرے کو پرکھ کر مول لگاتا ہوں۔"



میری شاندار کور اسٹوری تیار تھی اور اس پر گیانی آتما سنگھ کے ایمان لانے کے حالات قدرت نے خود پیدا کر دیے تھے پہلے ہی مرحلے پر بڑی کامیابی نصیب ہوئی میں نے دل میں ہزار مرتبہ قدرت کا شکر ادا کیا۔

"میرے گینگ کے کچھ اصول ہیں پُتّر۔ اس میں شمولیت کرنے والوں کو ان کا پابند رہنا پڑتا ہے۔ ویسے بھی ہم کسی شے کو مکمل طور پر اپناتے ہیں۔ اس کی خوبیوں اور خامیوں سمیت۔"

"لیکن....." میں نے اس کی بات اچکنی چاہی۔

"ٹھہرو" گیانی جی نے ہاتھ اٹھا کر مجھے ٹوکا۔ اس مرتبہ اس کا لہجہ بالکل "باس" والا تھا۔ "پہلی بات تو یہ ہے، جو تم کبھی نہ بھولنا ــــ گیانی آتما سنگھ کی بات سُنتے وقت اس میں دخل اندازی برداشت نہیں ہو گی اور دوسری اہم بات یہ کہ یہاں حکم صرف کانوں سے سنا جاتا ہے اور ہاتھوں سے اس کی تعمیل کی جاتی ہے۔ اس کے پس منظر یا پیش منظر کو جاننے کی کبھی کوشش نہ کرنا۔"

ــــ اور وہ خاموش ہو کر اپنی بات کا ردِّ عمل میرے چہرے پر تلاش کرنے لگا۔

"گیانی جی مہاراج۔ میری آپ کے گروہ میں شمولیت بھی مشروط ہو گی۔ میں کسی کا حکم ٹالوں گا نہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ بعض احکامات کی وضاحت ضرور چاہوں گا۔ میرے اندر ابھی ضمیر کی کچہری پوری آن بان سے سجی ہے اور اس کے سامنے مجھے بہرحال جواب دہ ہونا پڑتا ہے۔" اس لمحے گیانی کی حالت دیدنی تھی۔

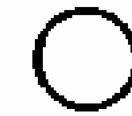
"پُتّر تجھے کسی شُبھ گھڑی میں کسی کرموں والی نے جنا ہے۔ ابھی اس شہر میں کوئی مائی کا لال ایسا پیدا نہیں ہوا جو گیانی آتما سنگھ سے اسکی بات کی وضاحتیں طلب کرتا پھرے۔"

ــــ صاف دکھائی دے رہا تھا اس کے اندر ایک شدید جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ اُسے اپنے آپ کو مارنے کے لیے خود سے بڑی خطرناک ڈوئل لڑنا پڑ رہی تھی اور اس لڑائی کے آثار اس کے چہرے کے بنتے بگڑتے نقوش سے پوری طرح عیاں ہو رہے تھے۔

وہاں ایک گھمبیر سناٹا طاری تھا۔ ہم دونوں ہی خاموش تھے۔ پھر گیانی آتما سنگھ نے ہی مخاطب کیا۔

"تمہارے لیے کمرے کا بندوبست اوما کر دے گی۔ یہاں کے انتظامی معاملات کی نگران وہی ہے۔ یہ دو گھر ہیں۔ جہاں ہم بیٹھے ہیں وہ گیانی آتما سنگھ کا گھر اور جہاں سے تم آئے ہو وہ اس کا ڈیرہ! دونوں کے مسائل الگ الگ ہیں ـــــ ڈیرے پر تم میرے کارندے ہو گے صرف کارندے۔ اور یہاں سردار امرجیت سنگھ صرف سردار امرجیت سنگھ۔ اس بات کا خیال رکھنا۔" میرا جواب سنے بغیر وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

میں بھی ایک حد تک ہی اپنے آپ کو منوانا چاہتا تھا۔ اسے زیادہ مجبور کرنا خطرناک تھا۔ ورنہ کسی بھی لمحے کلکتہ کی بارونق سڑکوں پر پیدل چلتے کوئی بھی کار مجھے اپنے ٹائروں تلے روندتی ہوئی چلی جاتی یا کسی بھی ویرانے میں اندھیرے سے آنے والا گرم گرم سیسہ میرے جسم کے اندر اتر جاتا۔ یہ لوگ اپنے "معتوب" کو مارنے کے لیے بڑا نیچرل طریقہ اپناتے۔ جس سے مقتول کی موت طبعی ہی نظر آیا کرتی تھی حالانکہ حقیقتاً اس کے برعکس ہوتی۔



گیانی کے جانے کے پندرہ بیس منٹ بعد تک بھی جب کوئی گھر والا وہاں نہ آیا تو میں بھی اُٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ جہاں ایک صوفے پر نیم دراز اوما میری منتظر تھی شاید اسے پہلے ہی سے بتا دیا گیا تھا کہ میرا "واسطہ" بہرحال اس سے پڑنے والا ہے۔ اس لمحے وہ خود سے بالکل بے نیاز نظر آ رہی تھی۔ اس کی ساڑی اور بال دونوں بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے لیکن اس بے ترتیبی میں بھی اس نے ایک حُسن پیدا کر رکھا تھا شکار کرنے والا حسن۔!

اُسے اپنے جسم پر واقعی ناز کرنا چاہیئے تھا۔ یہاں گیانی کے گینگ میں اسے ایک اہم حیثیت حاصل تھی۔ اس کے ایک اشارے پر کئی دُم چھلے نثار ہونے کو تیار تھے تو اس



کی وجہ صرف ان کا گیانی کے لیے نیازمندانہ جذبہ نہیں تھا۔ اس تابعداری کے پس پردہ اوما کا حسنِ جہاں سوز بھی کارفرما تھا۔ اس کی محبت کے لیے وہاں ہر شخص جان سے گزرنے کو تیار تھا۔ عموماً گروہ کے ارکان کو ہدایات اور احکام اوما ہی کے ذریعے ملا کرتے تھے کیونکہ گیانی خود کسی کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ کوئی براہِ راست اس کے منہ لگے اور گروہ کے تمام پالتو غنڈے اوما کے ایک اشارے پر جہنم میں کود جانے کو تیار رہتے تھے۔

میرے ایمان کے خلاف وہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ خم ٹھونک کر میدان میں اتری۔ اس نے پہلے روز کی بھرپور شکست کو ابھی تک ذہنی طور پر قبول نہیں کیا تھا۔ اس کے نزدیک شاید وہ محض ایک راؤنڈ ہارنے والی بات تھی جب کہ اس کے خیال میں ابھی ہمارا مقابلہ کئی راؤنڈ تک جاری رہنا تھا۔ میرے ذہن میں اس لمحے صرف ایک ہی خیال جاگزیں تھا جس طرح میں نے گیانی کی ایک کمزوری، امرجیت بن کر حاصل کرلی ہے اس طرح وہ بھی میری کوئی کمزوری ضرور حاصل کرنا چاہے گا۔

ـــــ اور کسی بھی گبھرو کی سب سے بڑی کمزوری اوما ہی ہو سکتی تھی ـــــ اوما دیوی جس کا وار کبھی خالی نہیں گیا تھا اور جس کی صلاحیتوں پر گیانی آتما سنگھ فخر کر سکتا تھا۔

گیانی سے پہلی ملاقات کے بعد مجھے یہی گمان گزر رہا تھا کہ اس نے اوما سے یہی کہا ہوگا کہ میں "ساتواں گھر" ہوں اور "سات گھر" تو ڈائن بھی چھوڑ دیتی ہے۔ لیکن اب اس کے کرتوت دیکھ کر مجھے یہی گمان گزرنے لگا تھا کہ میری توقعات کے بالکل برعکس اُسے میرے متعلق خصوصی ہدایات دی گئی ہوں گی ـــــ اس نے حسین ناگن سے ضرور کہا ہوگا کہ مجھے بہرصورت ڈسنا ہے اور وہ زہر بھی معمولی قسم کا نہیں ہونا چاہیئے۔

مجھے آتے دیکھ کر اس دشمن ایمان نے یوں اشتعال انگیز انگڑائی لی کر خود مجھے اپنے جسم کا بند بند ٹوٹتا دکھائی دیا۔ اس نے اپنی بے ترتیب ساڑی کو سنبھالنے کا تکلف بالکل نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے سانولے سراپا سے بالکل بے نیاز تھی۔

"آؤ مسٹر امرجیت۔ میرے خیال سے تم نے کھانا تو کھا لیا ہوگا۔" اس کا ایک دم "آپ" سے تم پر اتر آنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی کیونکہ اس سے پہلے مجھے گیانی آتما سنگھ کے مہمان کی حیثیت حاصل تھی جب کہ اب میں ان کا ایک معمولی کارندہ تھا اور ایسے گروہوں میں صرف دو ہی رشتے ایک دوسرے کی پہچان کرواتے ہیں ——— کارندے اور باس کا۔

میں اوما کے اندازِ تخاطب پر محض مسکرا کر رہ گیا۔

"ہاں کھا لیا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"قیام کا کمرہ تھوڑی دیر بعد دکھا دیا جائے گا۔ ایک بات کا خیال رہے، جو لوگ صبح کے وقت یہاں موجود ہوں انھیں "پاٹھ" میں شرکت کرنا پڑتی ہے۔ صرف مہمان اس پابندی سے مستثنیٰ ہیں۔"

"او۔ کے اوما۔" میں نے ذرا بے تکلفی سے جواب دیا۔

"اوما نہیں اوما دیوی، بلکہ صرف دیوی جی۔ مجھے گینگ کے تمام کتے اسی نام سے پکارتے ہیں۔" اس نے بڑے غصے اور نخوت بھرے لہجے میں کہا۔ اس لمحے ہزار ضبط کے باوجود میرا خون کھول اٹھا۔

"شٹ اپ۔" میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ "تم عورت ہو اس لیے پہلی دفعہ معاف کر رہا ہوں۔ آئندہ کبھی مجھے گھٹیا لفظ سے مخاطب نہ کرنا! یقیناً تمہارا واسطہ آج تک کتوں ہی سے رہا ہے اور وہ بھی شاید ایسے جو پچکارنے پر صرف حکم کی تعمیل کرنے والے تھے ——— اگر کسی نے پلٹ کر کاٹا ہوتا تو تمھیں انسانوں سے گفتگو کا سلیقہ آ گیا ہوتا۔"

اوما کے لیے یہ سلوک بالکل غیر متوقع تھا۔ اس کا واسطہ واقعی آج تک اشارے پر دم ہلانے والے کتوں سے پڑا تھا، وہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے دوسری مرتبہ اُسے ذلیل کیا تھا اور یہ معمولی بات نہیں تھی۔ آتما سنگھ کے گروہ سے منسلک ہونے والوں کو آتما سنگھ کے بعد اوما کی تابعداری کا ہی درس دیا جاتا تھا۔



"امرجیت۔ میں اگر چاہوں تو ابھی تمھاری زبان نکال کر ہتھیلی پر رکھ دوں لیکن نہ جانے کیوں کوئی طاقت مجھے بار بار روک رہی ہے ——— نہ جانے کیوں!" اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ نمایاں تھی اور اس لمحے وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق دکھائی دے رہی تھی۔

"ایسا کبھی سوچنا بھی نہیں! میں عزّتِ نفس کے لیے بہت کچھ قربان کر سکتا ہوں!" میں نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

بات مکمل ہوتے ہی اگر میں اچانک چھٹی حس کے خبردار کرنے پر ایک طرف نہ جھک جاتا تو میرے یقیناً چودہ طبق روشن ہو جاتے وہ بات تھی ہی کچھ ایسی ——— بالکل غیر متوقع اور اچانک۔ وہ اتنی تیزی سے اپنی جگہ سے اچھلی تھی کہ ٹریگر دبانے کے بعد شاید گولی کی بھی وہ رفتار نہ رہی ہو۔ بجلی کے کوندے کی طرح میں نے اس کی ایک جھلک ہی دیکھی، دوسرے ہی لمحے وہ زن کرتی ہوئی میرے قریب سے گزر کر میری مخالف سمت جا گری۔

اس کا نشانہ ہرگز غلط نہیں تھا بس ایک معجزہ تھا کہ ہدف اپنی جگہ سے اچانک ہل گیا۔ عموماً اتنی طاقت اور اونچائی سے گرنے کے بعد بڑے بڑے شہ زور ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی پہلوان کسی پر داؤ لگائے اور خود ہی اپنے داؤ کا شکار ہو جائے۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی ——— وہ تو پلک جھپکتے میں الٹے قدموں مجھ پر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں نے اُسے یوں فضا میں اچھالا تھا۔ جیسے وہ گوشت پوست کی عورت کے بجائے ربڑ کی کوئی گیند ہو۔ لیکن اتنی دیر میں میں سنبھل چکا تھا۔ فری اسٹائل ریسلنگ کا شوق مجھے اسکول کے زمانے ہی سے جنون کی حد تک تھا۔ میرا وجود دیکھ کر میرے جمناسٹک کے ٹیچر کہا کرتے تھے، تمھیں تو فضا میں اڑنا چاہیئے۔

دورانِ تربیت جب مارشل آرٹ سکھائے جا رہے تھے تو میرا نمبر اس لحاظ سے پہلا ہوتا تھا کہ میں اپنے گروپ کے تمام لڑکوں سے پہلے سکھایا جانے والا داؤ رواں کر لیتا تھا۔ اکیڈیمی میں ایک روز میرے اسٹاف نے مجھے شاباش دیتے ہوئے کہا تھا، جتنی دیر میں ایک

داؤ میری سیکنڈ نیچر بن جاتا ہے اتنی دیر میں شاید اس داؤ کے موجد نے بھی اس پر گرفت نہ حاصل کی ہوگی۔

بلاشبہ اوما کے جسم میں بجلیاں بھری تھیں وہ جمناسٹک کی بہترین کھلاڑی نظر آرہی تھی۔ اپنے وجود کو اتنی جلدی دوبارہ حملے کے لیے سمیٹنا اتنا آسان ہرگز نہیں تھا۔ ضرور وہ کسی استاد کی "چنڈی" ہوئی تھی۔

وہ اُلٹے قدموں فضا میں اُچھل کر مجھ پر آئی ضرور تھی لیکن یہ الگ بات کہ سیدھے قدموں پر کھڑی ہوگئی کیونکہ اُس کے پاؤں کے نیچے میرا جسم نہیں بلکہ قالین تھا۔ میں تو پیشہ ور ریسلرز کی طرح زمین سے چپک گیا تھا۔ اب وہاں جمپ لینے کے لیے رستے تو موجود تھے نہیں۔ نہ ہی میں اسے اتنی مہلت دینے کو تیار تھا کہ وہ دوبارہ بکھرے اوسان سمیٹ کر مجھ پر حملہ آور ہو۔ جیسے ہی اس کے پاؤں زمین پر ٹکے میں نے گھٹنے اپنے پیٹ سے لگا کر دونوں پاؤں کے پنجے اس کی پنڈلیوں پر مارے۔ اوما نے اچھل کر میرا داؤ خالی ضرور کر دیا تھا لیکن ایسا بھی نہیں کہ میری ٹانگیں صرف فضا میں چل کر رہ جائیں۔ اس کی چھلانگ فضا میں ادھوری ہی رہی تھی اور وہ آدھے راستے ہی سے زمین پر واپس آگئی۔۔۔ اس اثنا میں میں الٹی قلابازی کھا کر اس کے مقابل کھڑا تھا۔

ہم دونوں بپھرے ہوئے چیتوں کی طرح ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔

اُس نے حملہ کرنے کا خطرناک انداز اپنا رکھا تھا۔ وہ بالکل ایسے ہی کھڑی تھی جیسے موقع ملتے ہی میری ہنسلی کی ہڈی پر کھڑی ہتھیلی کا زوردار وار کر کے اسے توڑ ڈالے گی یا پھر انگلیاں میری آنکھوں میں مارے گی۔ ہم دونوں میں صرف ایک ہی فرق تھا جس نے مجھے اس پر ممتاز رکھا؛ وہ اپنے داؤ خطا جانے پر جھنجلاہٹ کا شکار تھی جب کہ میں ٹھنڈے دل و دماغ سے اس کے مقابل کھڑا تھا۔

اس مرتبہ اُس نے منہ سے کراٹے کے حملہ آوروں جیسی خطرناک آواز نکالتے ہوئے



نئی چال چلی تھی ۔۔۔۔ وہ اپنے لمبے لمبے ناخنوں والی دونوں انگلیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح مضبوطی سے تانے مجھ پر جھپٹی ۔۔۔۔ ممکن ہے اس کا ارادہ میری آنکھیں نکالنے کا نہ رہا ہو لیکن اس بات میں کوئی شک بھی نظر نہیں آتا تھا کہ اس کا حملہ بڑا جارحانہ اور زوردار تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ میرے بازو پر سے لہراتی ہوئی سامنے صوفے سے جا ٹکرائی۔ میں نے اچانک زمین پر بیٹھتے ہوئے اسے اپنے بازوؤں پر لیا اور ایک ہاتھ سے اس کی پشت کو ہلکا سا دھکا دے دیا۔

میرے خیال سے اس کا دم خم اب ٹوٹ جانا چاہیئے تھا لیکن پھر مجھے واقعی سنجیدہ ہونا پڑا۔ وہ تو انہی قدموں واپس پلٹی۔ اس مرتبہ اس نے ماہر کھلاڑیوں کی طرح میری نظروں کے سامنے دو تین بار ہاتھوں کی پوزیشنیں بدل بدل کر مجھے دھوکا دینا چاہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پنجوں کی شکل اختیار کر گئے تھے اور وہ خونخوار سامی النسل بلیوں کی طرح میرا منہ نوچ لینا چاہتی تھی۔

عین اسی لمحے جب وہ مجھ پر حملہ آور ہونے لگی تھی۔ دروازے سے گیانی جی کا نزول ہوا۔

"ویل ڈن" اس نے تالی بجاتے ہوئے کہا "معلوم نہیں یہ داد کس کو ملی تھی۔

گیانی آتما سنگھ کو دیکھتے ہی جس حیرت انگیز تیزی کے ساتھ اوما نے اپنی حالت پہ قابو پایا۔ میں اس پر عش عش کر اٹھا۔ وہ کمال کی ایکٹرس تھی۔ چہرے کے تمام خدوخال واپس آگئے تھے۔ سختی کی جگہ مکمل نرمی نے لے لی تھی۔ گیانی کو دیکھتے ہی وہ بڑے ادب سے سر جھکائے ایک طرف کھڑی ہوگئی۔

"پُتر وہ اپنی جگہ سچی ہے اُسے ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا۔ اصل میں غلطی میری ہی تھی۔ میں اسے بتانا بھول گیا تھا کہ تم صرف میرے تنخواہ دار ملازم ہی نہیں امرت کور اور اس کی ماں کے امرجیت سنگھ بھی ہو۔" اتنا کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

ادما نے گیانی کو کبھی اس موڈ میں نہیں دیکھا تھا وہ کچھ خجالت سی محسوس کرنے لگی لیکن چونکا دینے والا انداز نہیں بدلا تھا۔

"آیئے مسٹر امرجیت سنگھ آپ کا کمرہ آپ کو دکھا دوں۔" اس نے یہ فقرہ بالکل اسی طرح ادا کیا تھا جیسے تھوڑی دیر پہلے تک ہم کسی ڈرامے کی ریہرسل کرتے رہے ہوں۔

"چلو۔" میں بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

کمرہ خاصا آرام دہ اور پرتعیش تھا۔ ایئرکنڈیشنر، شاندار فوم بیڈ، سرہانے تپائی پر خوبصورت ٹیلی فون سیٹ، ٹیلی ویژن، ٹیپ ریکارڈر اور پلنگ کے دوسری طرف سجے لیمپ کے نیچے ایک اخروٹ کی میز پر نفاست سے رکھا انٹرکام۔

"رات کے کسی بھی پہر میں میری یا کسی اور کی ضرورت محسوس کرو تو بلا لینا۔" اس نے انگلی سے انٹرکام کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں؟" جانے کیسے میرے منہ سے بے ساختہ یہ تیز طرار لفظ سرک گیا۔

"لوری دینے یا کہانی سنانے کے لیے۔ بعض بچے اس کے عادی ہوتے ہیں نا!" اس نے جگر پاش نظروں سے میری سمت دیکھا۔

"ناؤ گیٹ آؤٹ پلیز۔" مجھے اس کی بات ہی سے شرم آ گئی۔

"گڈ نائٹ۔" اس نے اچانک تیزی سے گھوم کر خود کو چھلکایا۔ بڑا زوردار حملہ تھا یہ ——— کوئی چیز ٹھک سے میرے کلیجے میں لگی اور میرے خون کی حدت دوچند کر گئی۔

——— کولہوں پر ہاتھ رکھے وہ پلکیں جھپکائے بغیر، اپنے حملے کے ردِعمل کا جائزہ چند ثانیوں تک ٹکٹکی باندھے لیتی رہی۔ پھر قیامت کی چال چلتی دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

○

ادما گئی اور مہلت نصیب ہوئی تو ذہن کے کھلے دریچوں سے دل کی دھڑکنوں پر



ہلکورے لیتی آنسہ وہاں در آئی ——— اس کی آنکھوں میں جلتی حیرت اور ہونٹوں پر لرزتے لفظ ایک ہی مفہوم لیے ہوئے تھے۔

"تم آئے نہیں علی؟"

——— واقعی میں نے اُس سے جلد لوٹ آنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن جہاں اگلا پل اپنے بس میں نہ ہو۔ جہاں ساری ریاضتیں سارے تجربات مات کھا جائیں وہاں وعدہ کیا اور اُس کی پاسداری چہ معنی؟

مجھے کیا علم تھا کہ صبح میرے لیے کیسے احکام موجود ہوں گے۔ "شاید مجھے یہاں سے بہت آگے ——— آنسہ سے بہت دور جانے کا حکم مل جائے۔" میں اسے اپنی بے گناہی کا یقین دلاتا رہا۔ اسے بتاتا رہا کہ میں نے اُسے فراموش نہیں کیا۔ اس سے ملنے کے بعد کوئی اسے بھلا ہی نہیں سکتا۔

——— اُس کی یاد مجھے لوریاں دیتی رہی اور نیند کی مہربان دیوی اپنے پر پھیلائے آہستہ آہستہ میری سمت دبے پاؤں بڑھی۔ جب میں نے اس کے بازوؤں میں پناہ لی تو رات کا ایک پہر بیت چلا تھا۔

صبح میں نے غسل کر کے کمرے ہی میں دل ہی دل میں نماز ادا کی اور گیانی کے پاٹھ میں شمولیت کے لیے ڈرائنگ روم میں آ گیا جہاں پہلے ہی کئی "چیلے" موجود تھے۔ ایک مرتبہ پھر مجھے پہلے کے سے حالات سے گزرنا پڑا۔ پاٹھ کے خاتمے پر سب نے مل کر "ارداس" کی اور سب ایک ایک کر کے چلے گئے ——— آخر میں وہاں ادما اور میں ہی رہ گئے۔

"تم دونوں ناشتہ ہوٹل میں کرنا۔" یہ کہہ کر گیانی چلا گیا۔

"یہ ہوٹل کیا بلا ہے؟" میں نے اس کے جاتے ہی ادما سے پوچھا۔

"دیکھ کر خود ہی سمجھ لینا۔"

اور یہ کہتے ہی اُس نے مجھے اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم ایک باوردی شوفر کے ساتھ ہوٹل جا رہے تھے۔ ہوٹل کا نام "شوبرا" تھا، اور کلکتہ کے درجہ اول کے ہوٹلوں میں سے ایک ــــــ یہ گیانی آتما سنگھ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

ہمیں یہاں بلا کر جانے وہ خود کہاں غائب ہو گیا البتہ ایک پیغام میرے لیے موجود تھا۔

"شام چھ بجے یہاں آجانا" ــــــ!

O

میں نے فرصت کو غنیمت جانا اور ناشتہ کرتے ہی اوما سے جان چھڑائی۔ ہوٹل سے میں ایک کار میں باہر نکلا جو میرے لیے وہاں پہلے سے موجود تھی۔ کار ڈرائیور کو تو میں نے چھٹی دے دی اور خود کار چلاتا ہوا باہر لایا۔ پھر میں مسلسل ایک گھنٹے تک کلکتہ کی مختلف سڑکوں پر چکرا تا رہا کہیں میرا تعاقب نہ کیا جا رہا ہو؟ کار میں نے ایک مارکیٹ کے نزدیک پارک کر دی اور خود مختلف رکشوں اور ٹیکسیوں کے ذریعے گھومتا گھماتا پاٹل کے اسٹور پہنچ گیا۔ اس نے یوں بغل گیر ہو کر مجھے خوش آمدید کہا تھا جیسے ہم جنم جنم کے بچھڑے دوبارہ ملے ہوں۔

چند منٹ بعد "اسپائی ماسٹر" سے فون پر ہم کلام تھا۔ میری اس "اچیومنٹ" پر انھوں نے دل کھول کر مجھے داد دی۔ اگلے احکامات کی وضاحت چاہی تو ان کا جواب موصول ہوا۔

"فی الحال گیانی آتما سنگھ ہی کو اپنا ماسٹر سمجھو۔ اس کے ہر اشارے پر پُتلی کی طرح ناچتے رہو۔ لیکن اس ناگن سے خبردار رہنا جو آتما سنگھ کے دودھ پر پل رہی ہے۔"

ــــــ ان کا اشارہ غالباً اوما کی طرف تھا۔ خدا جانے وہ کمبخت تھی کیا چیز اور ابھی اس کا کون سا روپ دیکھنا باقی تھا؟



دوپہر کا کھانا ہم نے وہیں کھایا۔ اس دوران پاٹل مجھے "فیڈ" کرتا رہا۔ وہ واقعی ایک منجھا ہوا ایجنٹ، ایک قابلِ اعتماد دوست اور ایک جاں نثار ساتھی تھا۔ چھ بجے تک میں وہیں جھک مارتا رہا پھر ہوٹل کی طرف چل دیا جہاں ایک کمرے میں گیانی اور اوما میرے منتظر تھے۔

گیانی نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میرے بیٹھتے ہی وہاں چائے آ گئی ــــــ اوما نے چائے بنائی۔

اس نے بغیر کوئی تمہید باندھے بات شروع کر دی "اوما کے ساتھ مال پہنچانا اور وصول کرنا ہے۔ تم پڑھے لکھے ہو، غیر ملکی مہمانوں سے بات کرنے کا ڈھنگ بھی جانتے ہو گے! اپنے تجربے اور بازوؤں پر کبھی فخر نہ کرنا۔ یہ دونوں، بندے کو کتے کی موت مروا دیتے ہیں، تم گیانی آتما سنگھ کے نمائندے بن کر جا رہے ہو یہ بات ملحوظ خاطر رہے۔ اپنے دوسرے رشتے کے حوالے سے تمہیں یہ بتا دوں کہ پتر! فی الوقت میں وہاں کسی اعلیٰ افسر سے گٹھ جوڑ پیدا نہیں کر سکا۔ ابھی ایمانداری کے کچھ نیم مردہ جراثیم اس ملک کے لوگوں کے دماغوں میں کلبلا رہے ہیں۔ میں ان کیڑوں کا علاج بھی جانتا ہوں لیکن وقت آنے پر ــــــ آتما سنگھ ہمیشہ وقت کا انتظار کرتا ہے۔"

"او۔ کے باس!" میں نے ان کے ہاتھوں سے بریف کیس تھامتے ہی سر کو قدرے خم دے کر کہا۔

ہوٹل کے نیچے ایک تیز رفتار اسپورٹ کار ہماری منتظر تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ اوما نے سنبھال لی۔ بریف کیس میرے پیروں میں رکھا تھا۔ نجانے اس سمے کیوں مجھے ایک انجانا سا خوف اپنے ذہن کے پردوں پر سرسراتا محسوس ہوا، حالانکہ میرے لیے یہ مہم نہ ہونے کے برابر تھی۔ مجھے علم تھا کہ، اس بریف کیس میں کوئی مقدس صحیفہ نہیں خطرناک چیز ہی رکھی ہو گی ــــــ یہ خطرناک چیز کوئی ٹائم بم بھی ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ جب ہم مطلوبہ مقام پر

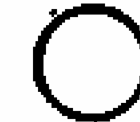
پہنچیں تو اس کا وقت پورا ہو چکا ہو اور پھر ایک زوردار دھماکہ کار سمیت ہم دونوں کے پرخچے اڑا دے۔

—— گیانی آتما سنگھ ایسا ہی آدمی تھا جس سے کسی بھی لمحے کسی بھی ناگہانی سلوک کی اُمید کی جاسکتی تھی۔

"ظاہر ہے تم یہ نہیں بتاؤ گی کہ اس بریف کیس میں ہیرے ہیں یا کوکین" میں کار اڑتی اوما سے مخاطب ہوا۔

"جس سوال کا کوئی جواب نہ ہو وہ سوال نہیں کیا کرتے مسٹر امرجیت سنگھ" وہ اُس لمحے کافی سنجیدہ نظر آرہی تھی۔ پہلے سے بالکل مختلف۔ اس کی چلبلاہٹ، شوخیاں، دعوت دیتی مسکراہٹ سب جانے کہاں کھو گئی تھیں۔ اس کے چہرے پر ایک کھچاؤ سا دکھائی دے رہا تھا۔ بالکل ایسے ہی لگتا تھا جیسے کسی کانونٹ کی استانی کو ڈرامے میں جلاد صفت قاتلہ کا رول ادا کرنے کو کہہ دیا گیا ہو۔

صورتِ حال کی نزاکت کو جانتے ہوئے میں بھی چپکا ہو رہا۔ یہ سب لوگ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ انسانی زندگی کی حیثیت ان کے نزدیک کیا تھی؟ اس کا مشاہدہ مجھے ہو چکا تھا —— وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے میرے جسم میں زہریلی سوئی داخل کرکے سارا کھیل ختم کرسکتی تھی اور اسے اس بات کا مکمل اختیار حاصل تھا کیونکہ بہرحال مجھ سے سینئر تھی۔



ہم ابھی تک کلکتہ کی مصروف ترین سڑکوں سے گزر رہے تھے لیکن ایکسیلیٹر پر اس کا دباؤ گھٹنے کے بجائے بڑھتا ہی جارہا تھا۔ شہری آبادی آہستہ آہستہ کم ہوتی جارہی تھی۔ ہم اب سمندر کی طرف جانے والی سڑک پر رواں تھے۔ پھر اُس سڑک سے اچانک ایک موڑ پر اوما نے اتنی تیزی سے گاڑی گھمائی —— کہ میرا سر ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

"واٹ اے نان سنس" اس نے ایک طرح سے مجھے ڈانٹ پلائی۔



"شاکرنا" میں بھی کچھ خجالت محسوس کررہا تھا۔

"سنبھل کر بیٹھو" دوبارہ ڈانٹ پڑی اور میں نے سعادت مند بچوں کی طرح یوں کندھے اُچکائے جیسے وہ میری استانی ہو۔

ہم جس بغلی سڑک پر سفر کررہے تھے وہ اب کچے راستے پر اتر گئی تھی۔ کار کی رفتار میں اب اُس نے کچھ کمی کردی تھی لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ میں اُسے محسوس کرسکوں۔ اس کی مہارت دیکھ کر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا تھا۔ میں نے آج تک کسی مرد کو بھی اتنی ہوشیاری سے ڈرائیونگ کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ہم لوگ اب قدرے ناہموار اور ٹیڑھے میڑھے راستے پر چل رہے تھے۔ کھڑکیوں کے راستے ایک مانوس قسم کی بُو اندر در آئی تھی۔ اور بوجھل اور چپچپاتی ہوا نے مجھے احساس دلا دیا تھا کہ ہم ساحل کے نزدیک کہیں جھک مار رہے ہیں۔

یہاں دُور دُور تک رات کے سناٹے میں گونجنے والی جھینگروں کے بین کرنے کی آوازیں تھیں یا پھر کسی نامعلوم جانور کے ٹرانے کا شور جو کسی حد تک مینڈک کی آواز سے مشابہ تھا۔ اب لمبی لمبی نوک دار گھاس گاڑی کی باڈی پر نقش و نگار بنانے لگی تھی۔ میں نے اپنی سمت کھڑکی کا شیشہ چڑھا رکھا تھا۔ جب کہ اوما بالکل بے پروا تھی۔ ہمارے اردگرد اتنی لمبی لمبی گھاس پھیلی ہوئی تھی کہ ہم اس میں دھنستے ہی چلے گئے۔ ایک قدرے محفوظ کُنج میں پہنچ کر اس نے گاڑی کھڑی کردی۔

میں نے تو یہی خیال کیا تھا کہ اب وہ اچانک اپنا روپ بدل لے گی اور پہلے والے موڈ میں واپس آجائے گی —— یہ ویرانی، تنہائی، سمندر کا کنارہ یہ سب کچھ ہی تو اُسے درکار تھا۔ میں خود کو اس کے ناگہانی حملے سے بچانے کے لیے پر تولنے لگا لیکن وہ اوما ہی کیا جو میری توقع پر پوری اُترے۔ وہ تو سیماب صفت عورت تھی۔ پل میں کچھ پل میں کچھ۔

"کم آن" اُس نے دروازہ کھول کر مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ مجھے اس لمحے بجانے

کیوں اس کے اس رویّے پر افسوس سا ہوا حالانکہ اس کے جادو کا توڑ ہر دفعہ شاید ممکن نہ ہوتا۔

مَیں بجائے اپنی طرف کا دروازہ کھولنے کے اسی کی سمت سے رینگ کر باہر نکل آیا۔ اوما نے میری اس حرکت کو نظر انداز کر دیا۔ کھٹ سے دروازہ بند کر کے وہ میرے آگے آگے چل دی۔ باہر نکلنے سے پہلے وہ اپنا ننھا سا پستول لینا نہیں بھولی تھی پستول محفوظ ہولسٹر میں منتقل ہو کر اس کے جسم ہی کا حصّہ بن گیا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ننھی سی لیکن خاصی طاقتور ٹارچ تھی۔

ہم دونوں نوک دار گھاس کے بیچوں بیچ چلنے لگے۔ وہ چُست کپڑے پہنے میرے آگے آگے تھی اور مَیں اس کے پیچھے پیچھے!

اس ہنگامہ خیز سفر کا اختتام سمندر کے کنارے ایک پہاڑی کے نزدیک ہوا۔ ہم وہیں بیٹھ گئے۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ اوما نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

"آدھ گھنٹہ"۔ اس نے سنجیدگی سے کہا اور اپنی نظریں سمندر پر جمادیں۔ جہاں شور مچاتی، بل کھاتی چیختی چلاّتی لہروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک کونے سے اُبھر کر چاند اپنی ٹھنڈی کرنیں سمندر پر نچھاور کر رہا تھا۔ ہم آدھ گھنٹہ وہیں بیٹھے رہے۔ اس دوران اُس نے میری موجودگی کو بالکل نظر انداز کر رکھا تھا۔ وہ ماہر نفسیات تھی۔ مردوں کو توڑنے کا فن خوب جانتی تھی۔ اس نے مسلسل اتنے نفسیاتی جھٹکے دیے تھے کہ میری جگہ پتھر کے اعصاب رکھنے والا کوئی اور مرد بھی ہوتا تو بوکھلا کر اس کی جھولی میں گر پڑتا لیکن مجھے اپنی تعمیر پر فخر تھا۔ یہ میری ماں کی دھاروں کی تاثیر تھی کہ میرا خون مصفّا تھا اور ایمان سلامت۔

ساڑھے گیارہ بجتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں اب پہاڑی کی اوٹ سے نکل کر سمندر کے نزدیک آن کھڑے ہوئے تھے۔

میری بے چین آنکھیں وہاں کچھ فاصلے پر لہروں کے دوش پر ڈولتے اور اپنی سمت



بڑھتے ایک تیز رفتار سٹیمر کا نظارہ کر رہی تھیں۔ اوما کے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ نے تین دفعہ سامنے کی طرف سگنل دیا۔ جواب میں مخالف سمت سے بھی روشنیاں جل کر بجھیں۔

"پہاڑی کی اوٹ میں چلے جاؤ اور آواز دینے سے پہلے باہر نہ آنا"۔ اس کی خوشبودار سرگوشی میرے کانوں کے قریب گونجی میں بریف کیس سمیت کہنیوں کے بل پیچھے ہٹتا اُسی جگہ آ گیا جہاں ہم پہلے بیٹھے تھے۔ اسٹیمر اب ساحل سے آن لگا تھا۔ مَیں نے تین سائے اس میں سے کود کر باہر آتے دیکھے۔ وہ ایک خاص تربیت سے اوما کی طرف بڑھ رہے تھے مَیں فوجی تھا اُس ترتیب کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا اور اُس لمحے تو مَیں دہل کر ہی رہ گیا جب اچانک ان تینوں نے پستول نکال کر اوما کو ہاتھ اٹھانے کے لیے للکارا ـــــ! اوما کے ہاتھ اٹھنے کا نظّارہ دیکھنے کی تاب مجھ میں کہاں تھی؟

پہلے تو مَیں نے دم دبا کر بھاگ جانے کا ارادہ کیا لیکن پھر جیسے زمین نے میرے پاؤں پکڑ لیے: اگر گیانی آتما سنگھ کسی سازش کا شکار ہو چکا ہے اور اوما اس وقت پولیس کی گرفت میں ہے تو یقیناً ان لوگوں نے ہمارے فرار کے امکانات کا جائزہ لے کر پہلے ہی سے پیش بندی بھی کر رکھی ہو گی۔

یہ خیال آتے ہی مَیں نے رینگ کر نزدیکی پتھریلی پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا ـــــ اوما کو اُس وقت تینوں سپاہیوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

ابھی مَیں آدھی پہاڑی تک پہنچ پایا تھا کہ میرے پیچھے دھاڑ سنائی دی:

"کہاں ہے تمہارا دوسرا ساتھی؟" ان میں سے کسی نے غصّے سے چلاّتے ہوئے اوما سے دریافت کیا۔

"کون ساتھی؟ میرا کوئی ساتھی نہیں ہے مَیں اکیلی ہوں! ایک دم اکیلی"۔ اس نے شرابیوں کے سے لہجے میں لڑکھڑاتے ہوئے جواب دیا۔ مَیں اس کی شاندار اداکاری پر عش عش کر اٹھا۔ کتنے پینترے بدلے تھے اب تک اُس نے۔ شاید کوئی منصوبہ فوراً اس

کے ذہن میں ترتیب پاگیا تھا اور اب وہ اس پر عمل پیرا تھی۔

اب میں پہاڑی کی اوپری سطح سے چپکا ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے میں بریف کیس تھامے ٹکٹکی باندھے جھومتی ہوئی اوما اور سٹپٹاتے ہوئے بحری پولیس کے جوانوں کا نظارہ کر رہا تھا۔

"شٹ اپ" وہی آواز دوبارہ گونجی۔

"اے چیختا کاہے کو ہے بابا! اپن کو پیار سے بولونا!" اس مرتبہ اس کا لہجہ خالص پیشہ ور قسم کی عورتوں کا سا تھا۔

"بولتی ہے یا...." اسی آواز نے اُسے گالی دے کر کہا۔

"کیا بولے گا پہلے تم لوگ ہمیں یہاں لے آیا اب دھونس جماتا ہے۔" اس نے اس مرتبہ بظاہر لڑکھڑاتے ہوئے اس کی طرف بڑھنا چاہا تھا۔ شاید وہ کسی منصوبے پر عمل پیرا ہونا چاہتی تھی، لیکن مخالف بھی خاصا ہوشیار دکھائی دے رہا تھا۔

"شٹ اپ" کہہ کر اس نے اوما کا ہاتھ جھٹک دیا اور اس کے ساتھ اس کی زوردار لات اوما کی کُنپٹی سے ٹکرائی۔

پھر تو جیسے ان تینوں پر جنون طاری ہو گیا۔ انہوں نے عورت مرد کی تمیز بھُلا کر اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا اور یہی ان کی خطرناک غلطی تھی جو ان پر ستم ڈھا گئی، انھوں نے اپنی دانست میں اوما کو فٹ بال سمجھ لیا تھا لیکن جیسے ہی دوسرا راؤنڈ شروع ہوا اوما زوردار لات کھا کر آگے کو گرنے کے بجائے اچانک نیچے بیٹھ گئی۔ حملہ آور اپنی ہی جھونک میں اس پر آ رہا لیکن پلک جھپکتے میں اوما نے اسے اپنی ڈھال بنا لیا۔

——اس طرح وہ باقی دونوں بحری پولیس والوں کی گولیوں کی زد سے نکل چکی تھی اب اگر وہ فائر بھی کرتے تو گولی اوما کے بجائے ان کے اپنے ساتھی کو لگنے کا خطرہ تھا۔ وہ ہکے بکے سے ٹھٹھک کر رہ گئے اوما نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے شکار کو سر پر



سے اوپر اٹھاتے ہوئے دونوں پر دے مارا۔ وہ آدمی اوما سے کم از کم تین گنا بھاری ہوگا، لیکن اوما نے تو اسے اس طرح سر سے اونچا اٹھا کر پٹخا تھا جیسے وہ پیار سے کسی بچّے کو اچھال کر محظوظ ہو رہی ہو، دونوں حیران پریشان پولیس والے اس کے بھاری بھرکم جسم کے نیچے دبے اوما کو گالیاں بک رہے تھے۔ جو جنگلی ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی ان سے دور ہی دور ہٹتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے بھاگنے کا انداز پیشہ ور کمانڈوز کا سا ہی تھا اور بجائے سیدھا بھاگنے کے زگ زیگ پوزیشن میں بھاگ رہی تھی —— جیسے ہی وہ تینوں اٹھ کر کھڑے ہوئے اور ریوالور تان کر اس کی طرف لپکے اُس نے اچانک رُک کر گھومتے ہوئے اپنے گریبان سے پستول نکال کر ان کی طرف فائر کر دیا۔

سب سے اگلا پولیس والا جو خاصا تیز رفتار اور پھرتیلا دکھائی دیتا تھا اور اس کے قریب پہنچنے والا تھا چیخ کر پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ اس کے دونوں ساتھی دہشت زدہ سے ہو کر گر پڑے پھر بجائے اوما کے پیچھے بھاگنے کے دونوں اپنے زخمی ساتھی کو سنبھالنے لگے ——اوما اندھیرے کی چادر میں گم ہو گئی تھی۔

میں نے ان لمحوں کو غنیمت جانا اور اسی طرح سرکتا ہوا دوبارہ نیچے آ گیا۔ پھر پنجوں کے بل میں مخالف سمت میں چلنے لگا۔ یہ ایک طرح سے اوما کی بھی مخالف سمت تھی کیونکہ وہ اسی طرف بھاگی تھی جہاں ہم نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔ میری معلومات اس علاقے کے متعلق صفر تھیں۔ بس میں ایک ہی سمت میں سمندر کے کنارے کنارے سیدھا بھاگا جا رہا تھا۔

ابھی تک مجھے اپنے تعاقب میں کسی کے بھاگنے کا احساس نہیں ہوا تھا شاید ان لوگوں کو میری وہاں موجودگی کا سرے سے علم ہی نہیں تھا۔ یا پھر وہ میری تلاش میں ابھی تک اسی علاقے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ قریباً دو ڈھائی میل بھاگنے کے بعد میں رک گیا اور وہیں سرکنڈوں کی اوٹ میں بیٹھ کر اپنی سانس درست کرنے لگا۔

اُس وقت رہ رہ کر ایک ہی خیال مجھے ستانے لگا تھا: "اسپائی ماسٹر نے آخر مجھے کیوں گیانی آتما سنگھ کے ساتھ اسی حد تک نتھی کر دیا ہے کہ ـــــ میں اس کے گروہ کے کارندوں والے کام کا ہی کل پرزہ بن کے رہ گیا ہوں ـــــ؟"

"کیا سمگلنگ اور میرے پیشے میں کوئی فرق نہیں؟ ایک خلش سی کبھی کبھی مجھے بے کل کر دیتی۔

اصل میں میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یہی سوچتا لیکن جنہیں "اسپائی ماسٹر" بنایا جاتا ہے وہ میرے جیسے ذہن کے لوگ نہیں ہوتے۔ یقیناً ان کے ذہن کسی اور ہی سانچے میں ڈھلے ہوتے ہیں اور قدرت نے ان کی بناوٹ میں بھی بالکل الگ سے ہٹ کر کوئی ترکیب آزمائی ہوگی۔ اس بات کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب اچانک ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔

"کہیں گیانی آتما سنگھ بھی اسمگلنگ کی آڑ میں ہمارے والا کھیل ہی تو نہیں کھیل رہا؟"

پھر مجھے خود پر افسوس سا ہونے لگا کہ ابھی تک میں نے ان خطوط پر کیوں نہ سوچا میں کوئی دودھ پیتا بچہ تو تھا نہیں کہ مجھے انگلی سے پکڑ کر چلایا جاتا، بہت سی باتیں اور فیصلے ان لوگوں نے مجھ پہ بھی چھوڑ رکھے تھے۔ جب ذہن نے ان خطوط پر سوچنا شروع کیا تو فطری تجسس بھی طبیعت میں عود کر آیا اور میں نے سوچا: "اس بریف کیس میں کیا ہو سکتا ہے؟ پھر ذہن نے خود بخود اس کا جواب بھی بتا دیا؛ دستاویزات۔ شاید کوئی خطرناک قسم کے ڈاکومنٹس۔ کوئی اہم ملکی راز جو وہ میرے ذریعے انتہائی بے ضرر طریقے سے "محفوظ ہاتھوں" تک پہنچانا چاہتا تھا۔

کتنا مکار آدمی ہے وہ۔ اگر اس بریف کیس میں وہی کچھ ہے جو میں نے سوچا ہے تو گیانی میری سوچوں سے بھی کہیں بڑا فراڈ تھا ـــــ اس نے میری جولانیوں کو بروئے کار لانے کا کتنا معصومانہ انداز اپنایا؟"



ابھی میں اپنے انہی خیالوں میں سرگرداں تھا جب اچانک میرے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی، دُور کچھ فاصلے پر مجھے ٹارچ چمکتی دکھائی دی تھی اور اس کے ساتھ ہی سیکورٹی کے سدھائے ہوئے کتوں کی مخصوص "عف۔ عف" کی آواز۔ اس آواز کو سننے اور محسوس کرنے کی مجھے خاص تربیت حاصل تھی۔ وہ لوگ اپنے سدھائے ہوئے کتوں کے ساتھ میرا تعاقب کر رہے تھے۔ ریت پر میرے قدموں سے بننے والے نشانات یقیناً ابھی تک تازہ تھے اور انہی قدموں پر چل کر یہ تربیت یافتہ کتے ماہر کھوجیوں کی طرح چند منٹ بعد ہی شکار کے سر پہ پہنچ جاتے ہیں۔

"بھاگو"۔ ایک چیخ میرے اندر سے اٹھی اور دوسرے ہی لمحے میری تمام حسیات سمٹ کر میری ٹانگوں میں جمع ہو گئیں۔ میں دیوانہ وار بھاگنے لگا۔ اب اندازے سے میں نے اپنا رُخ تمام خطرات کو بالائے طاق رکھ کر سڑک کی جانب موڑ دیا تھا۔ کم از کم اس طرح میں سمندر میں ڈوب کر مچھلیوں کی خوراک بننے سے محفوظ رہتا۔ کتے میرا نرخرہ ادھیڑ پاتے ہیں یا نہیں؟ یہ بعد کی بات تھی۔

میرے راستے میں جو کچھ اب آنے لگا تھا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ میرا رُخ سڑک کی سمت ہرگز نہیں، اور یہ تلخ بھی حقیقت۔ میں ایک طرح سے نیم دائرے کی شکل میں بھاگا تھا اور بجائے ساحل سمندر کی بالکل مخالف سمت میں جانے کے کسی اور ہی سمت جا نکلا تھا۔ سمندر اب آہستہ آہستہ میری نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا پھر اس کا شور بھی جیسے تعاقب میں آنے والوں کی سیٹیوں کی آواز میں دب کر رہ گیا۔

"وہ میرے سر پہ پہنچنے والے ہیں کیا؟" جانے کس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

اور میں نے اس سوال کا جواب دینے کی بجائے اپنے ٹریننگ کلاس روم کا رُخ کیا جہاں میرے خضر صورت انسٹرکٹر چہرے پر گہرے شیشوں کی عینک سجائے ہاتھ میں

سفید چاک کا ٹکڑا پکڑے بلیک بورڈ پر آڑی ترچھی لکیریں لگا رہے تھے: "بھاگتے ہوئے 8 (آٹھ) کا ہندسہ بناؤ۔ اور بناتے چلے جاؤ، اگر تمھاری مہک کتے کے ذہن میں محفوظ نہیں تو قدموں کے نشان پڑ دہ کبھی تمہارا پیچھا نہ کر پائے گا۔"

جب مجھے ٹریننگ کا یہ بھولا بسرا سبق یاد آیا تو میرے چاروں اطراف سایہ فگن آسمان سے طلوعِ آفتاب سے پہلے کی لہو رنگ روشنیاں بکھرنے لگی تھیں، اب وہ لوگ زمین پر روشنی ڈالے بغیر میرے قدموں کے پیچھے آسکتے تھے ایسے عالم میں اِس داؤ کا یاد آنا یقیناً تائیدِ غیبی تھا اور اس امر کا اشارہ بھی کہ میری لاکھ سیاہ کاریوں کے باوجود اس مالکِ حقیقی نے مجھے بھلایا ہرگز نہیں۔ درِ رحمت میرے لیے وا تھا۔ اس احساس نے زندگی کی نئی لہر میرے تن بدن میں دوڑا دی، مَیں ایک نئے عزم، ایک ولولۂ تازہ کے ساتھ اپنے سامنے گھاس اور درختوں سے ڈھکے اور قدم بہ قدم بلند ہوتے اس راستے کی طرف بھاگ رہا تھا جس کے پار ابھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا مَیں ایک طرح نشیب میں تھا اور قدرت نے اس لمحے جیسے خاص طور سے میرے لیے وہ پہاڑی نما ڈھلوان زمین کے سینے پر بچھا دی ـــــ مَیں نے وہاں قدرے نم زمین میں تین چار 8 کے چکّر بنائے، پھر زمین سے کود کر ایک پتّھر پہ پیر ٹکا دیے۔ اور پتّھروں ہی پتّھروں پر بھاگتا چڑھائی چڑھنے لگا۔ جب مَیں اس ٹیلے نما پہاڑی یا شاید پہاڑی نما ٹیلے کی چوٹی پہ اُگی لمبی لمبی گھاس کی آغوش میں سمایا اپنی بنتی بگڑتی سانسوں کا تانا بانا باندھ رہا تھا تو میرے قدموں کا اپنے مالکوں سمیت طواف کرتے وہ دو عدد کتّے بھی مجھے بخوبی دکھائی دے رہے تھے جن کے ساتھ درجن بھر رائفل بردار سپاہی موجود تھے ان لوگوں کا تعلق شاید کسی کنسٹیبلری سے تھا اور مَیں کلکتہ کے ساحلی علاقے کے کسی "حساس مقام" پر ان کی زد میں آگیا تھا۔ ان لوگوں کو میرے خیال سے اس بات کی اطلاع تو پہلے ہی سے ہوگی کہ کوئی مشتبہ یا مفرور اس علاقے میں موجود ہے اور اپنی تربیّت کے مطابق زمین پر روشنیاں بچھاتے بالآخر



وہ میرے بھاگتے قدموں کے تعاقب میں یہاں تک چلے آئے تھے۔

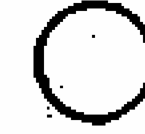
کتّے خاصے غصّے میں دکھائی دے رہے تھے۔ بالکل اپنے مالکوں کی طرح، ان کا بس چلتا یا وہ کوئی گھٹیا قسم کے احسان فراموش کتّے ہوتے تو جس جھنجلاہٹ کا شکار تھے اپنے ایک آدھ مالک کو چٹ کر سکتے تھے لیکن بندوں کی صحبت نے ان میں کچھ انسانیت پیدا کر دی تھی، پہلے تو وہ بے چینی سے اپنے مالکوں کو رسّوں سمیت وہیں کھینچا کیے پھر انھوں نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ بالآخر ایک جگہ رُک کر آسمان کی سمت منہ کرکے بھونکنے لگے، شاید قدرت سے اپنی محنت کے اکارت جانے کا گلہ کر رہے تھے یا پھر اپنے مالکوں کو بتانا چاہتے تھے کہ ان کا شکار آسمان کی طرف پرواز کر گیا ہے۔

ان کے ساتھی بھی ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے، شاید ایسے خطرناک قسم کے مجرم سے ان کا واسطہ اس سے پہلے کبھی نہ پڑا ہوگا، جو انسانوں کو تو کیا کتّوں کو بھی جُل دے کر نکل گیا تھا۔ اب ان میں گرما گرم بحث شروع ہو گئی تھی مجھے ان کی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں، کیونکہ ہمارے درمیان خاصا فاصلہ تھا لیکن جس جوش و خروش سے وہ لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کر رہے تھے۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ سب ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرا رہے تھے۔

جب قدرت کو بچانا مقصود ہو تو وہ موت کے جبڑوں میں پھنسے اپنے بندے کو بھی اس طرح باہر کھینچ لیتی ہے جیسے مکھّن میں سے بال۔ مجھے اس لمحے صرف اپنی خطائیں ہی یاد آ رہی تھیں، ایسی کوئی نیکی میرے گمان میں نہیں تھی جو اس صلۂ رحمی کا سبب بنتی، لے دے کر ایک ہی طرف نظر جاتی تھی اور وہ تھیں میری ماں کی دعائیں: "شالا اتی ہوا نہ لگی!" وہ جب مجھ پر بہت کچھ پڑھ کر پھونکتی تو اس کے بعد ہمیشہ یہی فقرہ دہرایا کرتی تھی۔ یا تو وہ لوگ عقل سے بالکل ہی پیدل تھے یا پھر ان کی مت ماری گئی تھی کہ بجائے اسی پہاڑی کی طرف فرار کے امکانات پر غور کرنے کے انھوں نے اپنا رُخ بدلا اور کتّوں

کو ہانکتے ہوئے سمندر کی طرف بھاگنے لگے۔ ان کی دانست میں، میں شاید وہیں کہیں چھپا صبح کی آمد کا منتظر تھا اور اب وہ کسی کارنامے کی امید میں اسی طرف دوڑے چلے جا رہے تھے۔

یہاں سے سڑک تک کا فاصلہ بخیر و خوبی طے ہو گیا۔ ٹریفک کی آمدورفت جاری تھی۔ میں نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور اُس میں بیٹھ کر سکون کی ایک لمبی سانس لی۔



ٹیکسی میں نے بمشکل دو ڈھائی میل چلنے کے بعد چھوڑ دی۔ تھوڑی دُور پیدل چلا اور دوسری ٹیکسی بدل لی۔ ٹیکسیاں بدلنے کا یہ عمل جاری رہا اور گیانی آتما سنگھ کے ہیڈکوارٹر پہنچنے تک میں نے ساتویں ٹیکسی پکڑی تھی۔ اب اگر کسی کو شک ہو بھی جاتا تو میری بلا سے، میں نے چیکنگ اور تعاقب کے تمام امکانات ختم کر دیے تھے۔

صبح کے قریباً نو بجے تھے۔ جب میں ہوٹل میں داخل ہوا۔ میری آمد کی اطلاع گیانی کو میرے ہوٹل میں قدم رکھتے ہی ہو گئی۔ کیونکہ کاؤنٹر پر کھڑی تارا نے مجھے دیکھتے ہی میری راہنمائی اس خاص کمرے کی طرف کی تھی جہاں گیانی کے حکم کے بغیر چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔

کمرے میں پہنچتے ہی جس ہستی سے میرا سب سے پہلے سامنا ہوا وہ اوما تھی!

"خیریت" اس نے اندر گھستے ہی دریافت کیا۔ وہ اطمینان سے سگریٹ سلگائے ایک آرام دہ صوفے پر نیم دراز تھی۔

"ہاں تم نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی" میں نے ان کے سامنے والی کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے مسٹر امرجیت پہلی ہی مہم پر بدشگونی ہو گئی" اس نے دھوئیں کے مرغولے اچھالتے ہوئے کہا۔

"بدشگونی؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔



"ہاں یہی سمجھ لو، اصل میں، میں تھوڑی سی آرتھوڈکس ہوں"

"کمال ہے تم جیسی تہذیب یافتہ خاتون اور وہم پرستی" میں نے اٹھ کر میز پر لگے پش بٹن پر انگلی رکھی۔

اس پش بٹن کو دبانے سے صرف ان چند لوگوں میں سے ایک ہی اندر آ سکتا تھا جو گیانی آتما سنگھ کے خصوصی اسکواڈ میں شامل تھے اور دوسرے ہی لمحے ایک لمبا تڑنگا حبشی اندر گھس آیا۔ یہ وہی ذاتِ شریف تھے جن کی میں اس سے پہلے ٹھکائی کر چکا تھا۔ اس نے آتے ہی جھک کر مجھے اور اوما کو تعظیم دی۔

"چائے لاؤ" میرا حکم سنتے ہی وہ الٹے پیروں مڑ گیا۔

"کوئی خاص تکلیف تو نہیں ہوئی" اس کے جاتے ہی اوما نے مجھے مخاطب کیا۔

"اوما دیوی میرے لیے یہ نیا کھیل نہیں" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے خاصے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"بریف کیس نے کچھ تنگ تو کیا ہو گا؟" اس نے بڑے عجیب سے لہجے میں دریافت کیا۔

"اوہ۔ نو!" میں نے بے پروائی سے کہہ دیا۔

اور اتنی دیر میں حبشی غلام چائے لے آیا۔ اوما نے خود اٹھ کر چائے بنائی اور ایک کپ میری جانب بڑھا دیا لیکن ابھی میں نے پہلا ہی گھونٹ بھرا تھا جب بڑی سی میز کے عقب میں دیوار میں خلا نمودار ہوا اور گیانی آتما سنگھ اندر آ گیا، اس کے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ غائب ہو کر دیوار کا حصہ بن گیا۔

ہم دونوں ہی اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور دونوں نے ہاتھ باندھ کر اسے "ست سری اکال" کہا۔

"ست سری اکال" گیانی آتما سنگھ نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آ گئے پُتّر" اس نے اوما سے کچھ کہے بغیر مجھے مخاطب کیا۔

"میری ماں نے میرا نام امرجیت رکھا تھا گیانی جی۔ میں کبھی نہیں ہارتا، جس روز ہارا زندگی سے ہار جاؤں گا" مَیں نے بڑے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔

"کسی کرموں والی کا جنا ہے تو" اُس نے ہمیشہ کی طرح بہت بڑی سچائی کی گواہی دی۔

"ایسے لطیفے اس کھیل میں نہ ہوں گیانی جی تو اس کا مزا ہی کیا؟" مَیں نے مسکراتے ہوئے بات بڑھائی۔

"مجھے اپنے انتخاب پر فخر ہے پُتّر" اس نے بڑی رعونت سے یہ بات کہی تھی لیکن میں دل ہی دل میں اس کی بے وقوفی پر مسکرا دیا۔

"لیکن مہاراج آپ نے تو اشارتاً بھی اس خطرے کا ذکر نہ کیا؟" مَیں نے دبی دبی زبان سے گلہ کر ہی دیا۔

"مَیں چُوک گیا تھا پُتّر۔ اس مرتبہ بڑی بھول ہوئی تھی مجھ سے۔ آتما سیہاں کبھی کچا کام نہیں کرتا لیکن باسو نے ..." اس نے "باسو" کا لفظ خاصا چبا کر کہا تھا اور ادھوری بات کہہ کر چپ ہو گیا۔

گیانی نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر اس لمبی سی میز کے گرد اگرد ایک چکر لگایا۔ ——یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ اپنے بے تحاشہ غصّے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو—— اس دوران اس کی نظریں مجھ سے ہٹ کر میز کے ایک کونے میں رکھے ٹیلیفون پر بار بار ٹھہرتیں کہ اتنی دیر میں فون کی گھنٹی ٹرانے لگی۔

"ہاں" گیانی فون پر دھاڑا۔

پھر دوسری طرف ہونے والی بات پر اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا نہ "ہوں" نہ "ہاں" اور آخر اچانک اس نے یہ کہہ کر ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

"مجھے صرف "باسو" چاہیئے —— باسو اور اسے ہر صورت میں ایک گھنٹے سے پہلے میرے



سامنے پیش کرو۔ اس کے علاوہ میں کچھ سُننا نہیں چاہتا۔" جب وہ فون پر دھاڑ رہا تھا تو اس کی شکل انگریزی فلموں کے اس ڈریکولا سے ملتی جلتی تھی جو رات کے پچھلے پہر اپنے تابوت میں سے نکل کر انسانی خون پینے نکلا ہو اور جسے ابھی تک اپنی پیاس بجھانے کے لیے کوئی شکار میسّر نہ آسکا ہو۔

"مَیں ایک غدّار کو مارنے کے لیے اپنا پورا گروہ داؤ پر لگا سکتا ہوں لیکن یہ ناممکن ہے کہ آستین کا کوئی سانپ میری آنکھوں کے سامنے زندہ پھرے۔" اس نے بڑے ڈرامائی لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

اس لمحے وہ بالکل اصلی والا گیانی آتما سنگھ نظر آ رہا تھا —— خونخوار انسان دشمن اسمگلر، جس کے سامنے آدمی کی حیثیت بے ضرر کیڑے سے زیادہ نہ تھی! اوما کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا وہ اپنی جگہ پتھر کی مورت بنی بیٹھی تھی۔ مَیں نے بھی خاموش رہنے میں مصلحت جانی۔

اب تو مجھے بھی خاصا محتاط رہنا تھا گیانی بڑا گھاگ تھا۔ مجھے اس کے قریب رہتے ہوئے بھی اس پر نظر رکھنی تھی —— کبھی میری کوئی معمولی سی لغزش بھی اس کی نظروں میں آ گئی تو چھٹی ——

○

قریباً پندرہ بیس منٹ بعد دوبارہ ٹیلیفون گنگنایا۔ گیانی نے جھپٹ کر ریسیور اٹھایا: "بکو" —— شاید لائن پر سوائے مخصوص لوگوں کے اور کوئی اس سے بات نہیں کر سکتا تھا تبھی تو وہ اس طرح خطاب کر رہا تھا۔

دوسری طرف سے چند لمحے بات سُننے کے بعد ایک سفاک مسکراہٹ اس کی مونچھوں کے گھنے بالوں میں چھپے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"شاباش۔ مَیں تمہارا منتظر ہوں" کہہ کر اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

"غدار آ رہا ہے۔" یہ فقرہ اُس نے پہلی مرتبہ اوما سے مخاطب ہو کر کہا۔

اوما اپنی جگہ سے اچانک اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ شدّتِ جذبات سے چمک اٹھا جیسے اُسے بہت بڑی خوش خبری ملی ہو۔ مجھے ابھی تک اس بات کی سمجھ نہیں آئی تھی کہ آخر وہ اس خبر پر اتنی خوش کیوں ہو گئی؟

اور ـــــ جب باسو آیا تو مجھے اس کی وہ حرکت سمجھ میں آ گئی۔

باسو ناٹے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا ایک بنگالی تھا جس کے چہرے پر لکھا تھا کہ وہ انسانوں کی کسی بدترین نسل کا نمائندہ ہے۔

ـــــ گیانی کے ساتھی اسے کھلے ہاتھوں یہاں لائے تھے۔ گیانی کے گروہ کے کسی آدمی کو محض اتنا حکم پہنچ جانا ہی کافی تھا کہ گیانی جی نے اُسے یاد کیا ہے۔ خواہ اسے اس بات کا علم بھی ہو کہ وہاں جانا جان سے ہاتھ دھونے کے مترادف ہو گا، پھر بھی کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کے حکم کے آگے دم مار سکے۔

آنے والے کے چہرے سے خونخواری ٹپکتی تھی لیکن جیسے ہی گیانی کے آدمی اسے اندر دھکیل کر باہر نکلے اور اُس کی نظریں گیانی سے ٹکرائیں یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی روح قبض کر لی ہو۔

"تم نے ہی بھاٹیہ کو خبر دی؟" گیانی کے لہجے سے خونخواری صاف عیاں تھی۔

"نہ نہ نہ نہیں گیانی جی۔ م م مَیں تو ....." اس کے منہ سے لفظ بھی ٹھیک سے نکل نہیں پا رہے تھے۔

اوما اس کے اندر آتے ہی اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ پھر اس نے باسو کے گرد ایک چکر اس طرح کاٹا جیسے کوئی آدم خور چڑیل کسی دہشت زدہ بچّے کا خون پینے سے پہلے اس کے خوف سے لُطف اندوز ہو رہی ہو۔

"شٹ اپ" گیانی کی ایک ہی دھاڑ نے اسے جیسے مفلوج کر دیا تھا۔



"اوما دیوی" گیانی نے اس مرتبہ بڑے نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"مہاراج جی" اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"اس کی زبان سے سچ اگلواؤ۔"

جوں ہی یہ فقرہ گیانی کے منہ سے نکلا۔ باسو کے اندر جیسے کوئی ٹیپ ریکارڈر چلنے لگا۔ "نہیں نہیں۔ پرماتما کی سوگند۔ کالی کی سوگند یہ جھوٹ ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔" اس کی گھگھیاہٹ پر گیانی اور اوما کے یکے بعد دیگرے گونجنے والے سفاک قہقہے غالب آ گئے۔

ـــــ اور مَیں نے ایک مرتبہ پھر بجلی کڑکنے کا منظر دیکھا۔

اوما ماہر جمناسٹروں کی طرح اُس کے کندھوں پر دونوں ہاتھ جما کر اس کے سر پر سے گزرتی اس کے سامنے آ گئی۔ اس نے بجلی کی سی پھُرتی سے بار بار پینترے بدل کر مختلف ایکشن دکھائے۔ ہر مرتبہ جب وہ پوز بدلتی باسو سہم کر پیچھے ہٹ جاتا۔

ـــــ پیچھے ہٹتا ہٹتا اب وہ کمرے کی دیوار سے آ لگا تھا۔ مجھے تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ مَیں اپنی کرسی میں دھنسا حیرت سے یہ نظّارہ کر رہا تھا۔ گیانی بھی چوہے بلّی کے اس کھیل سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ "جے کالی ـــ" اوما کی غیر مانوس سی آواز سنائی دی۔

ـــــ اور اس کے ساتھ ہی باسو کے منہ سے ایسی کراہ نکلی جیسے اسے ذبح کیا جا رہا ہو، خدا کی پناہ! مَیں تو نظر بھر کر اس کے چہرے کو بھی نہ دیکھ سکا، اس کے سیاہ چہرے پر سرخ گاڑھے خون کی لکیریں تیر رہی تھیں۔ اوما کے ناخن رنگین ہو رہے تھے۔ وہ واقعی اس وقت خون پینے والی کالی ماتا نظر آ رہی تھی۔ باسو کا منہ نوچنے کا یہ عمل اس نے یکے بعد دیگرے دو تین مرتبہ دہرایا۔ شاید یہ کمرہ خصوصی ساؤنڈ پروف تھا ورنہ گیانی بھی اس طرح مطمئن ہو کر نہ بیٹھا رہتا۔

"سچ بتاؤ۔ سچ۔ ورنہ اوما تمھاری جان سِسکا سِسکا کر نکالے گی۔" گیانی اپنی جگہ

بیٹھا بیٹھا دھاڑا۔

"مجھے معاف کردو، بھگوان کے لیے۔ بھگوان کے لیے۔" باسو نے چاہا کہ زمین پر جھک کر اوما کے پاؤں چھو لے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اُلٹ کر دوسری طرف جا گرا۔ اوما نے اس کے چہرے پر زوردار لات جمائی تھی۔ خون سے اس کے کپڑے بھیگنے لگے تھے۔ اب شاید اس پر دیوانگی کا دورہ پڑا تھا کیونکہ وہ چیختا چلاتا دونوں ہاتھ آگے کی سمت پھیلائے اوما کا گلا گھونٹنے کے لیے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لیکن وہ کوئی زمینی مخلوق تو تھی نہیں ـــــ نظر اس پر کیسے ٹھہرتی۔

"جے کالی" دوبارہ اس کی خونی للکار گونجی۔

باسو کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ اس مرتبہ اوما نے زوردار پنچ اس کے پیٹ میں مارا تھا۔

"اور مارو۔ اور مارو۔ مار ڈالو اسے۔" اوما کی ہر ضرب پر گیانی کے منہ سے نفرت کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا۔

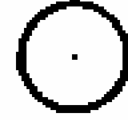
یہ خونیں ڈرامہ بطور ایک انسان میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا لیکن جن لوگوں کے درمیان میں بیٹھا تھا وہ شاید ایسے کھیل رچانے کے عادی تھے ـــــ باسو نے بھی اپنی زندگی میں جانے خود کتنے بے گناہوں کو سسکا سسکا کر یوں مارا ہوگا جو اب قدرت اسے اس اذیت ناک موت سے دوچار کر رہی تھی۔

میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ گیانی آتما سنگھ نے میری موجودگی میں آخر یہ سب کچھ کیوں کیا تھا؟ ظاہر ہے اس کی بھی کوئی وجہ ہوگی ـــــ اگر اسے میری شخصیت پر کوئی شک ہو گیا تھا اور اس نے کمزور انسانی فطرت کو ایکسپلائٹ کر کے کوئی اندازہ قائم کرنا چاہا تھا تب بھی میرے لیے خاموش اور لاتعلق رہنا ہی بہتر تھا۔ دوسری صورت میں



ممکن ہے اس نے مجھے جانچنے کے لیے ہی یہ تماشا یہاں کروایا ہو۔ اور میرے ممکنہ ردِّ عمل سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا چاہتا ہو، اگر ایسی بات تھی تب بھی میں اسے اپنے کمزور ہونے کا احساس کیوں ہونے دیتا۔

یہ تھیں وہ مصلحتیں جنھوں نے میری زبان اور ہاتھوں پر تالا لگا دیا تھا اور میں بھی بظاہر گیانی آتما سنگھ کی طرح اس سفّاکی سے محظوظ ہونے لگا۔



باسو کے منہ سے اب مغلظات کا طوفان ابل رہا تھا وہ اوما اور گیانی کو وحشیوں کی طرح گالیاں بک رہا تھا۔ جواب میں دونوں درندوں کے قہقہوں میں مزید شدت آگئی تھی۔ انھیں اس کھیل میں شاید اب زیادہ مزا آنے لگا تھا۔

اچانک اوما پھر اپنی جگہ سے اچھلی! اس مرتبہ وہ باسو کے کندھوں پر سوار ہو گئی۔ اس کی ٹانگیں کسی آکٹوپس کی طرح باسو کے جسم میں گڑ گئی تھیں، اپنے دونوں پاؤں اس کے کندھوں پر بیٹھے بیٹھے اس نے موڑ کر باسو کی پسلیوں میں گاڑ دیے۔ شاید وہ اس کے گردوں پر دباؤ ڈال رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس نے باسو کے سر کو دونوں ہاتھوں سے سختی سے دبانا شروع کر دیا۔

اس نے باسو کی کچھ مخصوص رگوں کو دبا کر اسے مکمل بے بس کر دیا تھا۔ اس کے منہ سے آواز نکلنی بند ہو گئی۔ پھر اس کے ہوا میں لہراتے ہاتھ بھی بے بسی سے ڈھلک گئے۔

اگلا منظر دیکھ کر میں نے واقعی چند سیکنڈ کے لیے آنکھیں بند کر لیں "کڑک" کی آواز سنائی دی اور باسو کٹے ہوئے درخت کے تنے کی طرح زمین پر گر گیا۔ اس کی گردن کی ہڈی خونی ڈائن نے جھٹکا دے کر توڑ ڈالی تھی۔ یہ مخصوص داؤ عموماً کمانڈوز ہی جانتے ہیں اور بہت کم مارشل آرٹس کے ماہرین کو اس کا علم ہوتا ہے لیکن وہ یہ داؤ بھی جانتی تھی ـــــ اس بات کا تو میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔

باسو کے زمین پر ڈھیر ہونے سے پہلے اس کے جسم سے لپٹی وہ ناگن اس سے الگ ہو کر زمین پر آ رہی، اس نے فاتح کھلاڑیوں کی طرح گردن کو ہلکا سا خم دے کر اپنے گرو گھنشال کو پرنام کیا۔

"ویل ڈن" گیانی تالیاں بجانے لگا۔

پھر دونوں نے ہل کر فتح" بلائی۔ مجھے بھی بادلِ نخواستہ "سری واہگورو جی کا خالصہ، سری واہگورو جی کی فتح" کہنا پڑا۔

باسو کی لاش فرش پر پڑی تھی اس کے مکروہ چہرے پر پھیلی خون کی سیاہ لکیروں نے اسے خاصا ڈراؤنا بنا دیا تھا فرش پر اس کی لاش کے ارد گرد اب خون کا تالاب سا بننے لگا تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اس طرف نہ صرف دیکھنا پڑا بلکہ گیانی کی طرف دیکھ کر مسکرانا بھی پڑا۔ اوما ٹائیلٹ میں جا گھسی تھی۔ میں ابھی تک یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ اس بھرے پرے ہوٹل میں گیانی نے کتنی بے دردی سے اس شخص کو مروا دیا۔ لاش کیسے غائب ہوگی۔ کسی کو شک نہیں ہوگا کیا؟

ــــ لیکن یہ سب میرے ذاتی خیالات تھے۔ یہ بے بنیاد وسوسے تھے۔ میرا واسطہ بڑے کائیاں اور مکار شخص سے پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ ہمارے تصوّر سے بھی زیادہ لمبے۔

قریباً پانچ منٹ تک اس ناقابلِ بیان اذیت ناک ماحول میں گیانی مجھ سے بالکل نارمل لہجے میں باتیں کرتا رہا۔

ــــ اس نے بریف کیس کو اب ہاتھ لگایا تھا ــــ

ــــ مجھ سے اس نے اب مختصراً پچھلے واقعات سنے تھے۔ اس سے پہلے اسے جیسے کوئی بات یاد ہی نہیں تھی ــــ سوائے "باسو" کے اور اب اسے اس بات



کا جیسے احساس ہی نہیں تھا کہ اس کے سامنے اس بھرے پرے ہوٹل میں خون میں لتھڑی ایک لاش بھی موجود ہے۔

تھوڑی دیر بعد اوما ٹائیلٹ سے برآمد ہوئی ــــ اس نے کپڑے بدل لیے تھے۔ خونی غسل تو وہ پہلے ہی کر چکی تھی، لیکن اب شاید خون کے دھبے مٹا کر آئی تھی۔ اس کے متناسب اعضاء پر منڈھے چست کپڑے اور خوبصورت چہرے کو دیکھ کر کسی کو اس پر شک کرنے کی ہمت ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ باہر آ کر وہ دوبارہ اسی صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔

ــــ گیانی نے پش بٹن دبایا تو وہی بدشکل حبشی اندر داخل ہوا۔

"ویر پارسل بھاٹیہ کو بھیج دو" اس نے باسو کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ آنے والے نے سر جھکایا اور باہر نکل گیا۔

"آؤ چلیں۔" اس نے مجھے اور اوما کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

گیانی کے اپنی جگہ سے اٹھتے ہی وہی خلا دوبارہ نمودار ہوا اس سے گزر کر جیسے ہی ہم تینوں دوسرے کمرے میں پہنچے۔ دیوار اپنی جگہ واپس آ گئی۔ اس لمحے مجھے ان ڈھلوں سے گھن محسوس ہو رہی تھی۔ خدا ہی جانتا ہے کس طرح میں نے وہ جان لیوا گھڑیاں گزاریں۔

دوسرے کمرے میں ہمیں پہنچے بمشکل چند منٹ ہی گزرے تھے جب ایک خوبصورت ویٹرس ٹرالی دھکیلتی اندر داخل ہوئی۔ ٹرالی پر شراب کی مختلف بوتلیں اور گلاس بڑی نفاست سے سجا کر رکھے گئے تھے۔ ویٹرس نے میز پر گلاس سجائے اور تین جام تیار کر دیے۔ پہلے اس نے گیانی کو اور پھر اوما کو جام پیش کیے۔ لیکن جب میری باری آئی تو میں نے انکار کر دیا تو تینوں نے اس طرح میری طرف دیکھا تھا جیسے میں کسی دوسری دنیا کا باشندہ ہوں۔

"میں شراب نہیں پیتا" ان کے پوچھنے سے قبل میں نے کہہ دیا۔

"حیرت ہے" اوما نے کندھے اچکائے۔

"تم جاؤ" گیانی آتما سنگھ نے میرے مزید کچھ کہنے سے قبل ہی ویٹرس کو اشارہ کیا وہ الٹے پاؤں بغیر آواز پیدا کیے دروازہ بند کر کے باہر نکل گئی۔

"حیرت کی کیا بات ہے اوما دیوی" میں باوجود کوشش کے اپنی نفرت نہ چھپا سکا۔

"اس پیشے میں ایسے لوگ نہ دیکھے نہ سُنے"

گیانی اس دوران ہم دونوں سے لاتعلق شغلِ مے نوشی میں مصروف رہا۔

"میرا خیال ہے آج کے بعد شاید تم اپنا خیال بدل لوگی" میں نے یہ فقرہ کچھ ایسا چبا کر کہا تھا کہ اوما محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔ ممکن ہے اس نے کچھ کہنا چاہا ہو لیکن گیانی کی موجودگی نے اسے مانع رکھا۔

"اگر اجازت ہو تو اب میں چلا جاؤں" میں نے گیانی کو مخاطب کیا۔

"ٹھیک ہے ہم رات کو دوبارہ ملیں گے۔ ہوٹل میں ہمارے ساتھ ہی ڈنر کرنا"

اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

شکریہ کہہ کر میں باہر نکل آیا۔

O

کل رات سے اب تک کی مسلسل بھاگ دوڑ نے مجھے خاصا تھکا ڈالا تھا۔ مجھ میں ایک لمحے کے لیے بھی مزید کوئی رسک لینے کی تاب نہیں تھی۔ کم از کم ان حالات میں اپنے دوستوں سے رابطہ پیدا کرنے کی عیاشی کا متحمل ہونے سے تو رہا ——— میں جسمانی طور پر تو زیادہ نہیں روحانی طور پر البتہ ضرور خود کو مکمل تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ میری آنکھوں نے جو کچھ تھوڑی دیر پہلے دیکھ لیا تھا وہ شاید میں کبھی بھلا نہ پاؤں۔

کہاں جاؤں؟ بار بار یہی ایک سوال مجھے کچوکے دے رہا تھا۔



پھر ایک سمت دل و دماغ نے مشترکہ رہنمائی کی ——— ماتا جی اور امرت کور کے پاس! ہاں اس مذبح خانے میں وہ دو پناہ گاہیں مجھے بہر صورت میسر تھیں ——— معصوم اور متبرک پناہ گاہیں جو بدقسمتی سے اس شیطان سے متعلق ہی تھیں لیکن ——— اس سے بالکل الگ تھلگ۔ بالکل علاحدہ۔

اور یہ سوچتے ہی میں نے گھر کا رُخ کیا ——— چوکیدار نے مجھے دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا شاید اب وہ مجھے اچھی طرح پہچاننے لگا تھا۔ میں ڈرائنگ روم سے گزر کر سیدھا مکان کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔

حسبِ معمول اس ننگ سکھ نے جس کی یہاں ڈیوٹی تھی ماتا اور امرت کور کو میری آمد سے آگاہ کیا اور اجازت ملنے پر مجھے اندر لے گیا۔ مہر و وفا کی دونوں پتلیاں مجھے دیکھتے ہی لپک کر میرے قریب آ گئیں۔

"پاؤں لاگوں ماتا جی" میں نے جھک کر ان کے پاؤں چھوتے ہوئے پرنام کیا۔

"میرا امرجیت، میرا شیر" کہہ کر ماتا نے مجھے اپنی آغوش میں سمو لیا۔ اس تقدس مآب آغوش میں پہنچتے ہی مجھے ایک طمانیت کا احساس ہوا اور یوں لگا جیسے میرے وجود کے گرد لپٹا سارا بوجھ اتر گیا ہے اور میں ہلکا ہو کر اڑنے لگا ہوں۔

"میرا ویر" کہتے ہوئے امرت کور کے چہرے پر بھی انبساط سے سُرخی پھیل گئی۔

ماتا تو "لنگر پانی" کا بندوبست کرنے چلی گئی۔ امرت کور وہیں میرے پاس بیٹھی رہی، آج اسکی جھجک کافی حد تک ختم ہو چکی تھی۔ دورانِ گفتگو جب کبھی اس کا دوپٹہ سر سے سرکنے لگتا وہ دوبارہ سلیقے سے اپنا سر ڈھانپ لیتی۔

آپ کے ماتا پتا کیسے ہیں؟

بہن بھائی؟

گھر بار؟

ڈھونڈنگر؟ یہی تھے وہ روایتی سوالات جن کا سامنا مجھے بار بار کرنا پڑ رہا تھا۔ میں اس کے ہر سوال کا جواب اپنی دانست میں تسلی بخش طریقے سے دیا کرتا تھا لیکن ہر پہلے کے بعد دوسرا سوال وہ متجسس ہو کر کرتی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے متعلق بہت کچھ سوچنے لگے۔ اس لیے میرے جوابات بھی مختصر ہوتے تھے۔

ماتا جی بھوجن لے آئیں ـــــ تو نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے تھوڑا بہت کھا لیا حالانکہ گزشتہ واقعات نے ـــــ میری نیند ہی نہیں، بھوک پیاس بھی مجھ سے چھین لی تھی۔

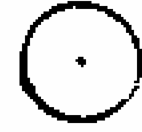
"ذرا دم لے لے بیٹا!" بھوجن کھانے کے بعد ماتا جی محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگیں ـــــ شاید انھوں نے میرے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار پہچان لیے تھے! ـــــ جسمانی نہ سہی، روحانی طور پر تو ہم ایک دوسرے سے گہرا تعلق قائم کر چکے تھے ـــــ اور میں نے بھی ان لمحات کو غنیمت جانا؛
ـــــ ستانے کے ارادے سے لیٹ گیا۔

امرت کور بے چاری کا جی نہیں بھرا تھا، وہ ابھی بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن مجھے لیٹتے دیکھ کر ـــــ اس نے بھی میرے آرام میں مخل ہونا گوارا نہ کیا اور بادلِ نخواستہ باہر چلی گئی۔

کمرے کے ایک کونے میں بچھی ہوئی بان کی چارپائی پر لیٹا، میں دن بھر کے واقعات کو کریدنے کی کوششیں کرنے لگا ـــــ

اور یہ شاید اسی ماحول کی کرامت تھی یا وہ روحانی سکون ـــــ جو مجھے ہمیشہ یہاں آکر نصیب ہوتا تھا کہ میں جلد ہی نیند کی آغوش میں سما گیا۔
ـــــ وہی گہری نیند مجھے لوریاں دینے لگی تھی جو چپکے چپکے، آخر ـــــ مجھے یہاں سے نکال کر پورلو پاکستان میں لے گئی۔





میرا پورلو پاکستان مجھ سے چھن رہا تھا ـــــ اپنے پرائے ہو رہے تھے۔ محبتیں اپنا اثر کھونے لگی تھیں ـــــ ہم سب جو ایک ہی وقت میں شہید تیتو میرؒ اور سید احمد شہیدؒ کے سپاہی تھے! ہم نے سنہرے ریشے اور روپہلے خوشے سے محبتوں کے ایوان سجائے تھے! ایک دوسرے پر اپنا حق تسلیم کرنے کا آسمانی معاہدہ کیا تھا۔ ہمارے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے۔

پھر یکایک یہ کیا ہو گیا۔ نفرتوں کی یہ فصل کس نے بوئی اور کسے کاٹنی پڑی؟ کون زہریلے لوگ تھے وہ جن کے سانسوں نے ہماری مقدس ہواؤں کو ڈسا۔ کس نے محبت سے مہکتی فضاؤں میں بدگمانی کا زہر گھولا۔ کس نے آناً فاناً صدیوں سے ایک لڑی میں بندھے ایک رشتے سے پہچانے جانے والوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا۔ اس زہر کا تریاق کیا کوئی نہ تھا۔

اس بچھو کے ڈنک پر رکھنے کے لیے "زہر مہرہ" کا کوئی منکا کسی کو نصیب نہ تھا کوئی مسیحا ایسا نہ تھا کہ آنے والے عذابوں کی بشارت دے کر زخمی چاہتوں پر پھایا رکھ سکتا۔ تجدیدِ محبت کی کوئی صورت کسی کو یاد نہ تھی۔ بھولے عہد، بسرے پیمان، کسی نے کسی کو یاد نہ دلائے.....!

خدایا! یہ کیسا اندھیر مچ گیا تھا۔ کوئی یوں بھی اپنی پہچان بھلاتا ہے۔ کوئی یوں بھی ایک دوسرے سے بچھڑا کرتا ہے۔ فلک نے کبھی پہلے بھی محبتوں کے ایسے جنازے اٹھتے دیکھے! عہد نامے یوں بھی کبھی لوٹے تھے!

یہ عقدہ کبھی کسی پر نہ کھلا! کئی سر مراقبوں میں جھکے، کسی پر کشف نہ ہوا، بس سب کھڑے منہ دیکھا کیے اور زمانہ قیامت کی چال چل گیا۔
وہاں کے لہلہاتے کھیتوں سے کرودھ کی ایسی آگ اٹھی کہ لہریں مارتے دریا بے آب

دگیاہ خشک صحراؤں میں بدل گئے۔ ہر طرف نفرت تھی۔ نفرت!

مارڈالو۔ جلا دو۔ بھسم کردو!

"پنجابی ہمارا دشمن ہے ——— پٹھان نے ہمارا خون پیا ہے ——— بلوچ ہمارے خون پسینے پر عیش کر رہا ہے ——— سندھیوں نے ہمارے خون سے اپنی زمینوں کو سیرابی بخشی ہے۔"

ہر طرف یہی ایک شور تھا چار عالم میں یہی آواز گونج پیدا کر رہی تھی۔

کیا بچے کیا بڑے سب کے ذہنوں میں ایک ہی سودا سمایا تھا "بنگلہ دیش" خواہ اس کی تعمیر میں تخریب کی کوئی صورت بھی کارفرما رہی ہو، سب باؤلے ہوئے جارہے تھے۔ ملک دوستوں کی لاشوں کو نشانِ عبرت بنا کر وہ چوراہوں میں لٹکا دیتے۔ ان کے چہرے مسخ کردیے جاتے، جب کبھی فوج شرپسندوں کے خلاف حرکت میں آتی ساری دنیا میں ہاہاکار مچ جاتی:

"نہتے شہریوں پر گولیاں چل رہی ہیں۔"

"بے گناہ لوگوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔"

"عزتیں لٹ رہی ہیں!" جیسی زہریلی سرخیاں دنیا بھر کے اخبارات کی زینت بن جاتیں۔ طوفانوں کے ہاتھوں اجڑنے والوں، سیلابوں کے ہاتھوں تباہ برباد ہونے والوں کے لیے تو کبھی کسی کا دل نہ پسیجا، سوائے بین الاقوامی خیرات کے اور کچھ ان کے حصّے میں نہ آیا۔ انسانی ضمیر نے سوائے چند بوسیدہ کپڑوں اور مضرِ صحت دالوں کے اور کوئی شے ان بدنصیبوں کو دینی گوارا نہ کی!

لیکن ——— جب انھوں نے "سنگرام" کا نعرہ بلند کیا۔ جب وہ اپنے بھائیوں کے خون کے پیاسے ہونے لگے دیکھتے ہی دیکھتے ان کے ہمدرد "محافظوں" کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہونے لگا۔ مخصوص نظریات کے حامل اپنے ضمیروں کا سودا چکانے والے دانشورول



کی فوج ظفر موج ان کی مدد کو امڈ پڑی۔ ایئرکنڈیشنڈ کمروں میں بند نازک مزاج کروڑپتی سانپوں نے اپنا اپنا زہر اگلنا شروع کردیا۔

دشمن کے کامیاب سفارت کاروں نے خزانوں کا منہ کھول دیا۔ "را" کی تربیت یافتہ فاحشاؤں نے بڑے بڑے پارساؤں کے بخیئے ادھیڑ دیے۔ انھوں نے بلا تمیز ملک و ملت دنیا کے کونے کونے میں پہنچ کر اپنے مطلب کے لوگ ڈھونڈے۔ انھیں، تن، دھن، من کی نذر گزاری۔ ان کے پوپلے منہ میں اپنے بھیانک عزائم کی شوگر کوٹیڈ گولیاں انڈیلیں اور انھیں اپنی مقصد برآری کے لیے تیار کرلیا۔

مقامی سفارت خانہ انھیں پروگرام دیتا اور وہ دل و دماغ کے دروازے بند کرکے اس پر عمل کردیتے، پروپیگنڈہ بڑا مؤثر ہتھیار ہے۔ اور اس کا استعمال ان سے زیادہ اور کون جان سکتا تھا جن کی سیاست و سفارت کی بنیاد ہی مکاری اور دجل و فریب پر رکھی گئی ہو۔

اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے پاس تھا ہی کیا؟ صفائیاں اور وہ بھی بلا جواز، بے مقصد، لاحاصل، کس کے پاس مہلت تھی کہ ہماری عقل کے بادام تڑوانے کے لیے اپنا سر پیش کردے۔ لوہے کو لوہے سے کاٹا جاتا ہے۔ جادو کا توڑ اس سے بڑا جادو ہے۔ جب ایک پہلوان دوسرے کی گردن میں اڑنگا لگالے تو دوسرے کی فصاحت و بلاغت وہاں کچھ کام نہیں آتی۔ وہاں تو داؤ کا توڑ داؤ سے کرنا پڑتا ہے۔ دشمن نے ترپ کی چال چلی تھی۔ اس کے نہلے پر صرف دہلا چل سکتا تھا۔ باقی سب کچھ بیکار تھا۔

قریباً تین گھنٹے تک مَیں نے لاشعور کا یہ عذاب بھگتا۔

——— تب آنسہ امید کی ایک ننھی سی کرن بن کر میرے خوابوں میں آ جگمگائی۔

"مَیں جگنو کی روشنی ہوں" وہ مجھ سے ایک ہی بات کہتی رہی۔

"تم ننھا سا ٹمٹماتا دیا ہو ——— ہوا کا معمولی تھپیڑا ہی تمھارا بھرم توڑ دے گا" مَیں

نے اسے ہمیشہ ایک سا جواب دیا۔

یہ تھی بھی حقیقت۔ آنسہ، عثمان، چاچا، چاچی اور ایسے ہی دوسرے لوگوں کی حیثیت تھی ہی کیا؟

——— انھیں تو اپنی بقا کی فکر دامن گیر تھی۔ وہ لوگ تو کسی فطری تقاضے کے تحت محض اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے ایک مشترکہ دشمن کے خلاف صف آرا تھے۔ ان کی صف بندی کے پیچھے کوئی منصوبہ بندی نہیں تھی۔ کوئی واضح مقصد نہیں تھا۔

"ان کے عزائم ناقابلِ تسخیر!
ان کی نیتوں پر فرشتے گواہ!
ان کی جراتوں کو سلام!
ان کے ولولے ایمان افروز!

لیکن ان سب کچھ کے باوجود وہ صرف "مدافعت" کر رہے تھے۔ صرف "مدافعت" اور وقت کے تقاضے کچھ اور تھے۔ وہاں "ایگریشن" درکار تھی۔ اپنی ہمتوں کی قلعہ بندیوں میں مورچہ زن ہو کر آخر وہ کب تک چڑھتی آندھیوں کے سامنے سینہ سپر ہوتے۔ دشمن کو آگے بڑھ کر محاصرے کی حالت سے نکل کر منہ توڑ جواب دینے کی ضرورت تھی۔

لیکن ہائے رے ہماری امن پسندی! تو نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا۔

جگنو اور دیے کی اس لڑائی کا اختتام بہرحال میری نیند کھلنے پر ہوا۔ لاشعور نے میری زنجیریں شعور کو تھمائیں اور میں مرتی مارتی دنیا میں واپس آگیا۔ جہاں کمرے کے ایک کونے میں رکھی میز پر ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ امرت کور نے آ کر فون اٹنڈ کیا۔

"ہیلو" ویر جی تو سو رہے ہیں" اس نے شاید یہی دو فقرے فون پر کہے۔ دوسری طرف سے ہونے والی گفتگو پر "ہوں ہاں" کرنے کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔ میں



نے بھی اس اثنا میں کروٹ بدل لی۔ کئی گھنٹوں کی نیند نے ذہنی اور جسمانی تناؤ خاصی حد تک کم کر دیا تھا۔

امرت کور نے میری آنکھوں میں براہِ راست جھانکا:

"میں چائے لے آؤں آپ کے لیے؟"

"ہاں! پہلے میں نہا دوں گا ———" کہہ کر میں باتھ روم میں گھس گیا۔

اور جب نہا کر باہر نکلا تو دونوں ماں بیٹیاں میرا انتظار کر رہی تھیں ——— چائے بنا کر انھوں نے پاس ہی رکھی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی امرت کور چائے بنانے لگی اور ماں جی پیار بھری نظروں سے میرے چہرے کے نشیب و فراز میں گم ہو گئیں ——— پھر بولیں:

"بیٹے کے دل میں ابھی کوئی تردّد باقی ہے ——— ماں سے اپنا سینہ کب تک چھپاؤ گے؟"

"نہیں! نہیں! ماتا جی ——— میں بالکل ٹھیک ہوں" کہتے ہی میں نے اُن کے چرنوں میں ماتھا ٹیک دیا ———

انھوں نے پیار بھرا ہاتھ میرے جسم پر پھیرا ——— میں کھڑا ہو گیا اور سلام کر کے اُن سے رخصت ہو گیا۔

# ہش کے اُوپترا

گھر سے نکلتے ہی مَیں نے سُکھ کا سانس لیا ـــــ ماں، بیٹی کی گھورتی نظروں کو جو مَیں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

جانے، وہ دونوں کیوں ـــــ ؟ ہر وقت میرا سینہ ٹٹولتی رہتیں۔ اور سچّی بات ہے، اب مَیں ان سے ڈرنے بھی لگا تھا: "میرے سینے میں پور لو پاکستان کے جو شعلے فروزاں تھے، کہیں اُن کی ـــ ان کو بھنک نہ پڑ جائے۔"

ذرا اطمینان نصیب ہوا تو مَیں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا: کتنی گہما گہمی تھی اُس وقت کلکتے کے بازاروں میں ـــــ کاریں، بگھیاں اور سائیکل رکشا فراٹے بھرتے، اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر دوڑتے بھاگتے نظر آ رہے تھے۔

ـــــ ان سے بچتا بچاتا، مَیں سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا اور بالآخر ایک ٹیلی فون بُوتھ کے سامنے جا رُکا۔

ـــــ دُور نزدیک جھانکا: "کہیں کوئی میرا تعاقب تو نہیں کر رہا؟"

اور جب مجھے خطرہ کی کوئی علامت دکھائی نہ دی تو اپنے اسپائی ماسٹر سے رابطہ قائم کر کے، اُن کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

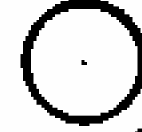
میری باتیں سُن کر انھوں نے ایک ہی جواب دیا: "ابھی تمہیں گیانی سے ہی



رابطہ قائم رکھنا ہوگا! اُس کے احکامات کی تعمیل کرنا ہوگی ـــــ

مَیں حیران و پریشان کھڑا سوچنے لگا: "اب مَیں کون رُخ اختیار کروں؟"

لیکن میرے قدم میری سوچوں سے تیز تر نکلے ـــــ وہ اُسی ہوٹل کا رُخ کر رہے تھے جہاں اس وقت گیانی میرا انتظار کر رہا تھا۔



ہوٹل میں پہنچتے ہی، کسی سے کچھ کہے بغیر ـــــ میں سیدھا اس کمرے کے سامنے پہنچ گیا جہاں صبح مَیں نے رومن اکھاڑہ دیکھا تھا۔

میری شکل دیکھتے ہی، دروازے پر کھڑا چوکیدار اندر اطلاع دینے چلا گیا اور باہر نکلتے ہی، اُس نے بڑے مؤدب انداز میں اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا جہاں گیانی جی پاٹھ میں مصروف تھے۔

مَیں لاتعلق سا صوفے پر دوسری جانب منہ کر کے بیٹھ گیا۔ کمرے میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ کمرے کی حالت میں بالکل کوئی فرق دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مَیں کسی کو قسم کھا کر بتاتا کہ: "یہاں صبح خونی ڈراما کھیلا گیا ہے!" تو کوئی میری بات پر یقین نہ کرتا۔ وہاں فرش پر خون کے دھبّے کا تو کیا کسی ذرّے تک کا نام و نشان نظر نہیں آتا تھا اور گیانی کی گونج دار آواز میں ہونے والے پاٹھ نے یہاں ایک پُرسوز سی فضا طاری کر رکھی تھی ـــــ وہ پاپی ارداس (دعا) بہت گڑگڑاتے ہوئے کر رہا تھا۔ اس کا یہ روپ اتنا کامیاب تھا کہ بڑے سے بڑا چالاک بھی دھوکا کھا جائے اور اس کے تقدّس کا قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔ اس نے جنکارہ بلند کیا:

"بولے سو نہال ست سری اکال!"

"سری واہگورو جی کا خالصہ۔ سری واہگورو جی کی فتح!" ہم نے اکٹھے ہی پاٹھ کے خاتمے پر فتح بلائی تھی۔

"کام اس مرتبہ ذرا کچھ زیادہ ہی خطرناک ہے پُتّر! بھاٹیہ غصّے سے تلملا رہا ہوگا۔ لیکن کل کی ملاقات مَیں نے منسوخ کر دی تو سارا بھرم ٹوٹ جائے گا میرے پاس یُوں تو کارندوں کی کوئی کمی نہیں لیکن سچ پوچھو تو انسانوں کی بہت کمی ہے المیہ تو یہ ہے کہ تم واحد کام کے آدمی ہو اور اس مرتبہ بھی تم ہی کو داؤ پر لگا رہا ہوں مجھے یہ کہنا تو نہیں چاہیئے لیکن اگر تمہیں اطلاع کر ہی دوں تو زیادہ اچھا ہے کہ: اس مرتبہ گیانی آتما سنگھ تم پر کوئی آنچ نہ آنے دے گا۔ خواہ سارے بھارت کی پولیس ہی تمہارے پیچھے کیوں نہ لگ جائے، مگر "ڈیل" ٹھیک سے کرنا ہوگا۔" ہم دونوں کمرے میں باتیں کر رہے تھے۔

—"پُتّر!! ہمارا واسطہ نئے لوگوں سے ہے اور کسی نئے آدمی پر گیانی آتما سنگھ کبھی اعتبار نہیں کرتا، تمہاری البتہ اور بات ہے۔"

اس نے بغیر کوئی تمہید باندھے بات مکمل کر دی، اور مجھے سوچنے کے لیے چھوڑ دیا۔

"جانا کب ہوگا باس؟"

"صبح دس بجے۔"

"آل رائٹ سر۔"

"ڈنر ہمارے ساتھ کرنا آج پارٹی ہے۔ مَیں نے نئے کمشنر کی دعوت کی ہے۔" اس نے گفتگو سمیٹتے ہوئے کہا۔

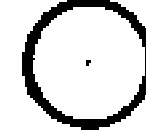
"او۔ کے باس۔"

اور گیانی اسی خلا کے راستے باہر نکل گیا۔

—اس نے اپنی آمد اور نکاسی کے لیے اب تک یہی راستہ اختیار کیا تھا۔ یقیناً اس میں کوئی مصلحت ہی رہی ہوگی۔ میرا جی تو چاہا کہ آگے بڑھ کر میز کے آس پاس کہیں وہ لیور تلاش کر لوں جسے دبا کر دیوار میں خلا پیدا کیا جاتا ہے لیکن پھر احتیاط



ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے چپکا ہو رہا:— مبادا کوئی خفیہ کیمرہ میری حرکات و سکنات چیک کر رہا ہو۔ اور ہولے سے باہر نکل گیا۔



ڈیڑھ دو گھنٹے میرے پاس خالی تھے— ان کے کسی خصوصی استعمال کا مَیں پابند نہیں تھا اور یہی وہ وقت تھا جب مَیں یہ نئی اطلاع اپنے دوستوں کو دے سکتا تھا! مَیں ٹہلتا ہوا ہوٹل سے باہر آ گیا لیکن اتنا بے فکر بھی نہیں تھا کہ اپنے ساتھ ہی باہر آنے والے اس نوجوان کو نظر انداز کر دیتا جو اغلباً میری نگرانی پر مامور تھا۔

مَیں اسے ہوٹل کے اردگرد چکر دیتا رہا پھر ایک چلتی بس سے لٹک کر اگلے سگنل پر اتر گیا! میرے اُترنے کے بمشکل ایک آدھ منٹ بعد ہی مَیں نے اُسے لپک کر اُسی بس میں سوار ہوتے دیکھا۔ بس کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے اس کا سانس پھولنے لگا تھا— مَیں نے ایک بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر بس کو گزر جانے دیا اور پھر سامنے بنے ایک سپر اسٹور میں جا گھسا۔

یہیں سے فون پر مَیں نے دوستوں کو اگلے پروگرام سے آگاہ کیا اور وہاں سے ہدایات موصول ہونے پر باہر نکل آیا— اب میرا رُخ واپس ہوٹل کی طرف تھا، دل ہی دل میں مجھے اس بیوقوف پر ہنسی آ رہی تھی اور اس کو اس غلطی پر جو جھڑکا ر پڑنی تھی۔ اس پر رونا بھی آ رہا تھا۔

ہوٹل میں پہنچتے ہی اپنے لیے مخصوص آرام دہ کمرے میں، مَیں بستر پر دراز ہو گیا اور میری سوچوں پر مستقبل کی بے رحم پرچھائیں رقص کرنے لگیں۔ قریباً ایک گھنٹہ مَیں —انہی خیالوں میں کھویا رہا پھر سرہانے رکھے فون پر مشروب طلب کیا۔ مشروب لانے والی وہی خوب صورت ویٹرس تھی جو صبح ہمارے لیے شراب لائی تھی۔ شاید اس کے ذمّے صرف گروہ ہی کے آدمیوں کو سرو کرنا تھا۔ اس نے کپسا کولا کی بوتل کھول کر مجھے

پیش کر دی اور خود مودب سی ہو کر ایک طرف کھڑی ہو گئی ــــــ بوتل مجھے تھمانے سے دوبارہ پلٹنے تک اس نے میرے کس بل نکال دیے تھے۔

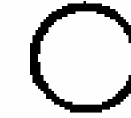
"او۔ کے تم جاؤ۔" میں نے آنے والے طوفان سے بچنے کی راہ تلاش کی۔

"کوئی اور خدمت سرکار؟" اس نے پھر بجلیاں گرائیں۔

"نو تھینکس۔" میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"او۔ کے سر۔" اس نے جسم کو جھٹکا دے کر بل کھایا۔ دروازے پر پہنچنے تک اس نے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی ــــــ

آداب بجا لاتی وہ باہر نکل گئی۔



ڈنر پر میں، جان بوجھ کر ذرا دیر سے اس وقت پہنچا، جب وہ لوگ شغلِ مے نوشی سے نجات پا کر اب کھانے پر وحشیوں کی طرح لوٹتے ہوئے تھے ــــــ میں بھی ایک کونے میں کھڑا ہو کر کھانے لگا! پھر اچانک چونک پڑا، میرے بالکل سامنے ایک خاصے معزز جہاشے جی کے ساتھ جو یہاں کی مقامی اسٹاک ایکسچینج کے چیئرمین تھے، میرے لسپائی ماسٹر قہقہے لگاتے کھانے میں مشغول تھے۔

ہم دونوں کی نظریں آپس میں ٹکرائی ضرور تھیں لیکن کیا مجال جو ان کے چہرے پر یا آنکھوں میں شناسائی کا ذرا سا شائبہ تک دکھائی پڑا ہو ــــــ میں بظاہر لاتعلق سا کھڑا رہا! قریباً قریباً کلکتہ کی تمام شخصیتیں یہاں موجود تھیں اور ہر کسی کے گرد اگرد گیانی کے گروہ کی تربیت یافتہ "فاحشائیں" گھیرا ڈالے کھڑی تھیں۔

ادما نے کمشنر کو نشانے پر لے رکھا تھا جس بدنصیب کی آنکھوں میں ابھرنے والے ڈورے اس کی آنے والی بدبختی کی نشاندہی کر رہے تھے! گیانی کا ایک تربیت یافتہ فوٹوگرافر اس تقریب کی تصویر کشی کر رہا تھا اور جس طرح ادما اور دوسری لڑکیوں نے



ہوشیاری سے پوز بدل بدل کر کمشنر اور دوسرے وی۔ آئی۔ پی کے ساتھ تصاویر اتروائی تھیں۔ وہ بے چارے قیامت تک اُن کی اس چالاکی سے آگاہی نہیں پا سکتے تھے۔ ادما نے تو ایک دفعہ ہنستے ہنستے کمشنر کے گلے میں بانہیں ڈال کر قریباً جھولا جھولتے ہوئے تصویر کھنچوائی۔

میں بخوبی سمجھ رہا تھا کہ یہ تصاویر کیوں اتاری جا رہی ہیں؟ اور ان کا آخر مصرف کیا ہو گا؟ بلیک میلنگ۔

اب شاید ساری زندگی وہ بیوقوف کمشنر گیانی کے کسی معمولی پلے پر بھی ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا! اور اسی ایک کمشنر پہ کیا موقوف ان مکارانہ حربوں سے اُس نے سارے کلکتہ کے افسران کو اپنی مٹھی میں لے رکھا تھا۔

اپنے اسپائی ماسٹر کی اس اہم دعوت میں شمولیت سے میں نے اس امر کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کے ہاتھ اس معاشرے میں کتنے لمبے ہیں ــــــ کبھی وہ ایک میز پر براجمان ہوتے اور کبھی دوسری پر جا بیٹھتے۔

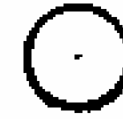
ڈنر کے بعد رقص کا دور شروع ہوا۔

ــــــ ان معززین کے اعزاز میں گیانی نے خصوصی ڈسکو ڈانس کا اہتمام کیا تھا! ہال کے ایک کونے میں سجے شاندار اسٹیج سے رقص کا اعلان نشر ہوتے ہی تمام لوگ اپنے اپنے ساتھیوں کو آغوش میں لیے اپنے لیے پہلے سے مخصوص کرسیوں پر جم کر بیٹھ گئے۔ اس کے ساتھ ہی سٹیج کا پردہ ہٹا اور ہال کی تمام لائٹیں قریباً آف ہو گئیں۔

ــــــ اسٹیج پر ایک مشہور رقاصہ بجلیاں گرا رہی تھی۔! اس کا ہیجان خیز رقص جلد ہی نقطۂ عروج کو چھونے لگا۔ اس سے زیادہ حوا زادی کی تذلیل دیکھنے کا روادار میں نہ ہو سکا۔ اور چپ چاپ ہال سے باہر نکل آیا۔

وہ رات میں نے اسی ہوٹل میں بسر کی نہ جانے کیوں؟ اس لمحے شاید میرا دل گیانی

کے گھر جا کر ان لوگوں کا سامنا کرنے سے گھبرا رہا تھا۔



کمرے کے دروازے کو لاک کر کے مَیں بے سدھ ہو کر سو رہا! علی الصباح اٹھ کر مَیں نے اٹیچڈ باتھ سے غسل کیا اور تیار ہو کر وہیں کمرے میں ناشتہ منگوا لیا۔ حسبِ سابق وہی دشمنِ ایمان ویٹرس ہی میرے لیے مطلوبہ ناشتہ لے کر آئی تھی۔

اس دفعہ مَیں اسے خود سے کھیلنے کا موقع دینے کو تیار نہیں تھا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" مَیں نے ایک سلائس پر جام لگاتے ہوئے پُوچھا۔

"رُوپا سر!"

"صرف رُوپا یا رُوپا سر"

"رُوپا" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ تمھاری ڈیوٹی کیا چوبیس گھنٹے کی ہے؟" مَیں نے چائے کپ میں انڈیلتے ہوئے پُوچھا۔

"آپ کہیں تو چوبیس گھنٹے آپ کی خدمت کر سکتی ہوں جناب!" اس نے لچکتے ہوئے کہا۔ شاید بے چاری یہی سمجھ رہی تھی کہ مَیں شیشے میں اتر گیا ہوں اور یہ یقیناً اس کے لیے بہت بڑا اعزاز ہوتا۔

"ہوں" مَیں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں بے حیائی اپنے عروج پر تھی۔ اس کا سارا وجود "دعوت" بن کر اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔

"تو تم چوبیس گھنٹے میری خدمت کر سکتی ہو......"

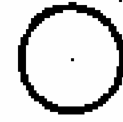
"یس سر!"

"ناؤ یو گٹ آؤٹ" مَیں اچانک اپنی جگہ سے اُٹھ کر چلایا۔

یہ اتنا اچانک اور بھرپور نفسیاتی حملہ تھا کہ وہ تھرا کر رہ گئی۔ تقریباً روہانسی ہو کر



وہ وہاں سے چلی گئی۔



تھوڑی دیر بعد ہی میں گیانی آتما سنگھ کے خصوصی کمرے میں موجود تھا ـــــ اس مرتبہ اس کی دستِ راست ادعا بھی اس کے پہلو میں موجود تھی۔ مجھے تو اب ان سے گھن آنے لگی تھی۔

"ست سری اکال"۔ مَیں نے گیانی کو پرنام کیا۔

میز پر اسی طرح کا ایک بریف کیس رکھا تھا جس سے مجھے پہلے واسطہ پڑ چکا تھا۔

ـــــ گیانی نے مجھے مختلف کوڈ ورڈز سے آگاہ کیا جن کے ذریعے آنے والے نے مجھ سے تعارف حاصل کرنا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے اجنبی تھے۔ صرف مخصوص نشانیوں کے ذریعے ہی ہمیں ایک دوسرے سے متعارف ہونا اور اپنے بریف کیس کا تبادلہ کرنا تھا۔

اس مرتبہ ہمارے ملاپ کے لیے کلکتہ کا ایک بارونق بس اسٹینڈ منتخب ہوا تھا۔

گیانی آتما سنگھ شاید زیادہ خطرہ مول لینے کے موڈ میں نہیں تھا! عموماً ایسی بارونق جگہوں سے فریقین یکساں فوائد حاصل کرتے ہیں ـــــ پولیس بھی اور ملزمان بھی، جہاں پولیس کی دانست میں ایسے اہم مقامات سے فرار کے مواقع ملزمان کو کم ملتے ہیں وہاں ملزمان کے نزدیک ایسے بھرے پڑے مجمعے میں سے لوگوں کی آڑ میں غائب ہونے کے امکانات عام جگہوں کی نسبت زیادہ ہوتے ہیں۔ میں مقررہ وقت سے تھوڑی دیر پہلے مختلف ٹیکسیاں بدل بدل کر اس مقام پر پہنچ گیا۔

بس اسٹاپ کے ایک کونے میں کھڑا میں آنے والے کا منتظر تھا اور گھڑی کی سوئیاں اب اس مقام سے آگے کھسکنے لگی تھیں جہاں اُن کے پہنچنے پر میرے ساتھی نے مجھ سے یاد اللہ کرنی تھی۔

——اس پیشے کے اپنے کچھ اصول ہیں جن سے معمولی سا انحراف بھی میرے پیشے کی طرح بڑا نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا اور یہ نقصان جان کا زیاں بھی قرار پا سکتا تھا! مجھے حیرت ہوئی۔ گیانی آتما سنگھ کوئی ایسی کچی گولیاں کھیلے ہوئے تو نہیں تھا کہ مجھے دوبارہ جہنم میں جھونک دیتا۔

پھر اچانک ایک دوسری سوچ میرے ذہن پر غالب آنے لگی۔ میرے دماغ میں یہ خیال سا گیا کہ: یہ بھی تو ممکن ہے میری پہلی آزمائش نے اسے میری غیر معمولی صلاحیتوں کا معترف کر دیا ہو۔ اور وہ مجھے جان بوجھ کر یا "یکّا بندہ" جان کر ہی ایسی خطرناک جگہوں پر بھیج رہا ہو۔

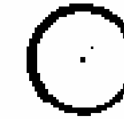
اور میں یہ بھی سوچنے لگا تھا: کہ یہ حقیقت تو بہر حال اپنی جگہ موجود تھی کہ گیانی کے گروہ میں نقب لگ چکی ہے اور جب مداخلت کے لیے تھوڑا سا "گیپ" بھی مل جائے تو حملہ آور باقی کام خود ہی کر لیتے ہیں —— گیانی آتما سنگھ نے شاید باسو کو مروا کر خود کو محفوظ جان لیا ہو لیکن وہ اب بھی اتنا ہی غیر محفوظ تھا جتنا اب سے کچھ دیر پہلے تک —— جس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا کہ دوسرے گروہ کا ساتھی ابھی تک نہیں آیا تھا۔

اس روز نجانے مجھے عقل اتنی دیر سے کیوں آئی؟ اور جب آئی تو پانی سر سے اونچا ہونے ہی والا تھا۔ بجائے دوسرے آدمی کے بس اسٹاپ کے مختلف کونوں میں کھڑے خفیہ پولیس والے اب ایک ایک نمایاں ہونے لگے تھے اور اب تک میری محض یہ خوش قسمتی رہی تھی کہ میں نے کسی پیش آمدہ خطرے کے سدِباب کے لیے عین اس مقام پر کھڑے ہونے سے احتراز برتا تھا جو میرے لیے مخصوص تھا۔ اس کے بجائے میں ذرا ہٹ کر اس مقام پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ جہاں دوسرے شخص کو آنا تھا۔

—— یہ احتیاط میری ذاتی تربیت کی مرہونِ منت تھی! اگر میں صرف اسمگلر ہی



ہوتا تو اپنی لاکھ کوشش اور ہوشیاری کے باوجود اب تک قابو آ چکا ہوتا۔



اب سب سے بڑا مسئلہ ان نشانیوں سے نجات حاصل کرنا تھی جو میری پہچان کا باعث بنتیں —— میرا ہاتھ فوراً پتلون کی جیب میں رینگ گیا اور دوبارہ برآمد ہوا تو اس پر چڑھا جعلی پلاسٹر غائب ہو چکا تھا! اس کے ساتھ ہی میری جیب سے سگریٹ کی ڈبی برآمد ہوئی اور جب میں بس اسٹاپ کے ایک کونے میں جھک کر یوں ظاہر کرتے ہوئے جیسے ہوا کی زد سے بچنا چاہتا ہوں ماچس کی تیلی جلا رہا تھا تو وہاں رکھے کچرے کے ڈرم میں وہ جعلی پلاسٹر بھی غائب ہو چکا تھا۔

اب دوسرے ہاتھ کی انگلی میں پہنی ایک انگوٹھی کا مسئلہ باقی تھا لیکن اس پر بڑے غور کرنے ہی سے کسی کی نظر پڑ سکتی تھی —— اپنی دانست میں اب میں کافی حد تک محفوظ ہو چکا تھا۔

—— میں نے آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے چلنا شروع کیا، میرا رُخ اس خالی رکشہ کی طرف تھا جس میں بیٹھ کر میں یہاں سے کہیں دُور جا سکتا تھا! رکشہ تک پہنچنے کے لیے مجھے ایک سڑک عبور کرنا تھی —— یہ سڑک خاصی ٹیڑھی کھیر نظر آ رہی تھی اور ابھی میں سڑک کے ایک کنارے رک کر گرین سگنل کا منتظر ہی تھا جب عقب سے آنے والی آواز نے میرے شریانوں میں سنسناہٹ دوڑا دی۔

"معاف کیجئے گا صاحب" بولنے والے کا لہجہ خاصا شریفانہ تھا۔ ہوتا بھی کیوں نہیں اس کا واسطہ بھی بہر حال ایک معزز اور خوش پوش نوجوان سے تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی، میرے دل میں کوئی چور تو تھا نہیں کہ پلٹ کر دیکھوں، یہ بھی تو ممکن تھا اس نے یہی نفسیاتی حربہ آزمایا ہو۔

حسبِ توقع ری ایکشن نہ ہونے پر اس ذاتِ شریف نے بڑی آہستگی سے میرے

کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"فرمائیے؟" میں نے مڑتے ہوئے نارمل لہجے میں لیکن ذرا حیرت کا تاثر چہرے پر لیے اس کی طرف دیکھا۔ اتفاق سے ہم دونوں کے علاوہ وہاں کوئی نہیں تھا، کیونکہ اس دوران گرین سگنل ملنے پر تقریباً سب لوگ سڑک عبور کر چکے تھے۔

"اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو برائے مہربانی ذرا اس طرف تشریف لے آئیں۔" اُس نے اپنی شائستگی برقرار رکھی۔

"یار! ہم بہت مصروف آدمی ہیں! کوئی کام ہو تو کل دفتر میں مل لینا۔" میں نے بالکل ایسے ہی لہجے میں اُسے مخاطب کیا جیسے وہ مجھ سے کسی "چیرٹی پروگرام" کے لیے چندہ مانگ رہا ہو ——— یا پھر مجھ سے اپنے کسی عزیز کی سفارش کروانے آیا ہو۔

"میرا نام انسپکٹر ڈورما ہے؟" اُس نے جیب میں غالباً شناخت نامہ نکالنے کے لیے ہاتھ ڈالا تھا۔

"ٹھیک ہے ——— ٹھیک ہے۔ پھر آپ دفتر میں گیارہ بجے کے بعد مل لیں تو بہتر ہوگا۔" میں نے پھر سہارا لیا۔

"مسٹر مجھے آپ سے کچھ سرکاری معاملات پر بات کرنا ہے۔" اس مرتبہ وہ کچھ زچ سا ہو رہا تھا۔

"اُوہ ——— سرکار اور ہم! ارے بابا! ایسے اپنے بھاگ کہاں؟" میں نے طنز و مزاح سے ملا جُلا فقرہ اُس کی طرف اُچھالا۔

"آپ کا شبھ نام" اس نے ایک طرف ہٹ کر مجھے بھی اسی طرف ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے پُوچھا۔

"خیریت ہے ——— آپ تو واقعی سیریس ہونے لگے۔" اپنے آپ کو نارمل ثابت



کرنے کے لیے مجھے خود سے زبردست اعصابی جنگ لڑنا پڑ رہی تھی۔

"دیکھو مسٹر۔ مجھے پولیس مین بننے پر مجبور نہ کرو۔" اس مرتبہ اس کا لہجہ کافی تلخ تھا۔

"ٹھیک ہے انسپکٹر صاحب مجھے پولیس اسٹیشن لے چلیں۔ میں بھی یہاں تماشہ بننا نہیں چاہتا۔ کسی کے باپ کی دھونس ہے کہ پولیس جس شریف آدمی کی چاہے سرِ راہ پگڑی اُچھالتی پھرے۔" اس مرتبہ میں نے بھی اپنی خوش پوشاکی سے فائدہ اٹھایا تھا۔ یہاں تو اس سے جھگڑنا ٹوٹے کا گھاٹا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے چاروں طرف سے اس جگہ کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور اس طرح ان کی گرفت سے بچ نکلنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ میرے لیے صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا تھا؛ کہ اگر وہ مجھے چیک کرنے پر تل ہی گیا ہے تو بجائے اس کے سوالات و جوابات کا سلسلہ سُننے کے لیے اس کے کچھ اور ساتھی بھی وہاں آجائیں وہ مجھے پولیس اسٹیشن لے جائے۔ اور اس دوران، اگر قسمت ہمیشہ کی طرح یاوری کرے تو ممکن ہے مجھے فرار کا موقع ہی مل جائے۔"

اُس نے پہلے تو نظروں ہی نظروں میں مجھے تولا اور پھر بولا:

"ٹھیک ہے جیسی آپ کی مرضی! بہرحال ہمیں اپنا فرض پورا کرنا ہے۔" اس مرتبہ اُس کا لہجہ خاصا محتاط تھا۔

میں نے اُسے اگلی بات کہنے کا موقع ہی نہ دیا، سڑک سے گزرتی ایک خالی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا اور پچھلا دروازہ کھول کر اندر دھنس گیا۔ میرا یہ فعل اتنا اچانک اور بھرپور تھا کہ وہ بھی مجبوراً اگلا دروازہ کھول کر اگلی ہی سیٹ پر بیٹھ گیا اور اپنے کسی ساتھی کو اس نے مدد کے لیے بلانا بھی گوارا نہ کیا۔

"آپ کو یہ حرکت بڑی مہنگی پڑے گی مسٹر۔" میں اسے سنبھلنے کا موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھا، اتنی مہلت دینے کے لیے بھی نہیں کہ اس کا ذہن کسی اور خطرے کی سمت اس کی راہنمائی کر سکے۔

—— اور یہ میری تنبیہ کا اثر تھا یا وہ خود بخود دُنغے میں آگیا جو اس نے میری طرف سے نفسیاتی دباؤ قبول کر ہی لیا۔ اس مرتبہ اس کا لہجہ خالص پولیس والا تھا:

"ابے چپکا بیٹھا رہ ——!"

"ک ک کیا مطلب؟" میں اس طرح ہکلایا جیسے اس کے اس فقرے نے میرا دماغ گرم کر کے پارہ آسمان پر چڑھا دیا ہو۔

"مطلب بھی تم جلدی سمجھ جاؤ گے۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

اور یہی میں چاہتا تھا کہ —— کس طرح اُسے آپ سیٹ کردوں۔

○

ہم لوگ ایک بھری پُری شاہراہ پر ٹریفک سگنل گرین ہونے کے انتظار میں گاڑیوں کی ایک لمبی قطار میں پھنسے ہوئے تھے —— میں نے پولیس افسر کی جانب سے توجہ بالکل ہٹالی تھی اور اس پر یہی ظاہر کیا تھا، جیسے میں تھانے پہنچ کر ہی اُسے مزا چکھاؤں گا۔

اور وہ بھی میری ہی طرح بے نیازی کا مظاہرہ کر رہا تھا، بلکہ اب تو اس نے کھڑکی سے باہر ہماری ٹیکسی سے لگی ایک کار میں ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھی کنیا پر آنکھیں گاڑ رکھی تھیں جبکہ ہمارے ڈرائیور کی نظریں ونڈ اسکرین کے باہر گاڑیوں کے رینگنے کے منتظر سیلاب کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"خوش قسمتی ہمیشہ دبے پاؤں آتی ہے اور اس کی چاپ صرف وہی خوش بخت سُن پاتے ہیں، جن کا مقدر وہ بننے والی ہو ورنہ تو اسی طرح دبے پاؤں آگے بڑھ جاتی ہے۔"

کسی سیانے کا کہا یہ قول اس لمحے میرے اندر سنسناہٹ پیدا کرنے لگا! یہاں بچنے اور بھاگنے کے مواقع ففٹی ففٹی تھے لیکن بہرحال یہ فرار کا ایک شاندار لمحہ تھا جس سے فائدہ نہ اٹھا کر شاید مجھے زندگی بھر پچھتانا پڑتا —— میں نے دروازے کا لاک کھولا تو مختلف کاروں کے ہارنوں کے شور میں انسپکٹر ورما کو اس کا احساس تک نہ ہوا۔



پھر جیسے ہی سگنل گرین ہوا اور ٹیکسی نے ٹریفک کے اژدھام میں رینگنا شروع کیا —— میں پھرتی سے گاڑی کے باہر سرک گیا —— کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

سڑک پر قدم جماتے ہی میں نے گردن ذراسی موڑی —— گاڑی چوک کراس کر چکی تھی اور میں سوچنے لگا:

کاروں کے ہجوم کے درمیان پھنسی ہوئی گاڑی کو ایک دم کنارے پر تو لگایا نہیں جاسکتا! اور اگر، تیز طرار ڈرائیور بھی ایسا کرنا چاہے —— تو وہ، کم ازکم تین چار منٹ لے گا۔ انہی تین چار منٹوں میں دراصل، میں نے نہ صرف وہ تینوں سڑکیں عبور کرنی تھیں، جو میری راہ میں حائل تھیں بلکہ —— موقع پاتے ہی مجھے اُن مارکیٹوں میں سے کسی ایک میں چھپنے کی کوشش بھی کرنا تھی جو پھن پھیلائے ان سڑکوں کے چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔

—— ٹھیک اُسی وقت جب میں نے دوکانوں کی ایک لمبی قطار سے گزر کر، ایک گلی میں گھومنا چاہا، ایک مضبوط و توانا ہاتھ نے میرے کندھے پر دباؤ ڈالا اور اس کے ساتھ ہی میرے کانوں میں آواز آئی:

"ہیلو مسٹر امرجیت ——!"

ایک لمحے کو تو میرے سارے وجود میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی لیکن چند ثانیے بعد ہی مجھے احساس ہوا کہ: "یہ آواز تو میری جانی پہچانی ہے۔ ورنہ میں اس طرح اطمینان سے اُس سمت نہ گھومتا بلکہ میرا بریف کیس بھی میرے ساتھ ہی حرکت کرتا ہوا انوارد کے منہ پر لگتا اور اس کے چودہ طبق روشن ہو جاتے!"

—— گھومنے پر جس شخصیت سے میرا سامنا ہوا اُس کے اچانک اس طرح ٹکراؤ پر پہلے تو میں کچھ گھبراہٹ کا شکار ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے ذرا سنبھل گیا —— میرے سامنے میرے اسپائی ماسٹر کھڑے تھے۔

"کیسے ہو؟" انھوں نے مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھا۔
ابھی تک شاید میری حیرت رفع نہیں ہوئی تھی ——

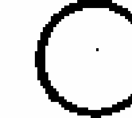
"فائن"

کہہ کر مَیں اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا تھا کہ انھوں نے جھنجوڑا!
"کم آن لوائے" ——

یہ کہہ کر اُنھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے مجھے سڑک کی دوسری جانب لے گئے جہاں سفید رنگ کی ایک مرسیڈیز کھڑی تھی جس کے پہلو میں ایک باوردی ڈرائیور ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

انھوں نے مجھے گاڑی میں دھکیل دیا اور ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا — یہ سارا کھیل چشمِ زدن میں اختتام پذیر ہُوا۔

مَیں نے سوالیہ نظروں سے اسپائی ماسٹر کو ٹٹولا —— لیکن، اُنھوں نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر، مجھ پر واضح کر دیا: "ابھی بولنے کی فرصت نہیں۔"



گاڑی دو تین موڑ کاٹنے کے بعد چلتے چلتے آخر رک گئی —— اسپائی ماسٹر باہر نکلے اور مجھے ایک سمت چلنے کا اشارہ کر کے ڈرائیور سے کہنے لگے: "جس راستے سے آئے ہو، اُسی راستے سے واپس چلے جاؤ۔"

—— گاڑی نے رُخ بدلا، تو انھوں نے میرے ساتھ آ قدم ملائے: "تیز ہو جاؤ لوائے اور سامنے کھڑی سیاہ رنگ کی "ٹو اکسی" میں سوار ہو جاؤ —— ہم دونوں تقریباً بیک وقت گاڑی تک پہنچے تھے —— انھوں نے پھُرتی سے ڈرائیور کی سیٹ سنبھالی اُس وقت اُنھوں نے گہرے رنگ کے شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی اور سر پر پی قسم کا ہیٹ سجا لیا تھا۔



میرے بیٹھتے ہی انھوں نے اُسی طرح کی عینک اور ایک ہیٹ مجھے بھی تھما دیا!
"اس روپ میں اب ہم دونوں مختلف لگیں گے۔"
اور یہ رنگ کسی کو دِکھانے پر۔۔۔۔؟
"بھُول گئے ہو تم" وہ بولے: کیا گیانی نے تمھیں نہیں کہا تھا۔
"اس مرتبہ گیانی آتما سنگھ تم پر کوئی آنچ نہ آنے دے گا —— خواہ سارے بھارت کی پولیس ہی تمہارے پیچھے کیوں نہ پڑ جائے۔" مَیں سمجھ گیا کہ گیانی کا کوئی نزدیک ترین آدمی بھی ان کے لیے کام کر رہا ہے۔ وہ رُوپا ویٹرس بھی ہو سکتی تھی یا کوئی اور بھی۔ مَیں اُن کی جانب دیکھ رہا تھا اور وہ بول رہے تھے:
"اس لیے تو مَیں نے اپنی سفید مرسیڈیز واپس بھیج دی" اب گیانی کے آدمی اُس میں تمہیں اور تمہارے بریف کیس کو تلاش کرتے پھریں گے۔

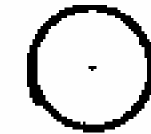
اور اس سارے کھیل کا مطلب؟
—— مَیں حیرت زدہ ہو کر اسپائی ماسٹر کی طرف دیکھنے لگا تو وہ مسکرا دیئے:
"کم آن لوائے" —— اُنھوں نے اگلی کوئی بات کہے بغیر میرا ہاتھ پکڑ لیا گاڑی روکی اور چند منٹ بعد ہی ہم ایک شاندار ریستوران کے محفوظ اور آرام دہ کیبن میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔
"ہم نے تمھیں مِس تو نہیں کیا بس ذرا ایک مرحلے پر ایک دوست سے غلطی ہو گئی جس کی وجہ سے تمھیں کچھ دیر کے لیے پریشان ہونا پڑا۔" انھوں نے بیرے کو مشروبات کا حکم دیتے ہی میری جانب رُخ کیا۔
"مَیں سمجھ نہیں پایا سر!" مَیں نے بات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ان سے دریافت کیا۔
"تمہارے دوست کو ہم نے راستے ہی میں غائب کر دیا تھا مسٹر امر جیت! اور اس کی ضرورت شاید کبھی بھی پیش نہ آتی۔ لیکن اُسے ٹریس کرنے میں اتنا وقت لگ گیا کہ اب اُسے

درمیان سے غائب کیے بغیر کوئی چارہ ہی باقی نہیں رہ گیا تھا اور کہانی میں حقیقت کا رنگ پیدا کرنے کے لیے پولیس کا ڈراما رچانا بھی ضروری تھا۔

——پولیس کو صرف اتنی اطلاع دی گئی تھی کہ: "ہیروئن کے دو اسمگلر اس علاقے میں مال کا تبادلہ کریں گے۔" اس کے باوجود ہمارے انتظامات ایسے تھے کہ پولیس تم پر ہاتھ نہ ڈال سکتی۔ لیکن ہمارے ایجنٹ نے تم تک رسائی حاصل کرنے میں کچھ دیر لگا دی۔ اور وہ اس وقت تمھیں پہچان پایا جب پولیس نے علاقے کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ مائی بوائے —— ملک کو تم پر ہمیشہ فخر رہے گا۔ میں نے تمھیں جہنّم میں جھونک رکھا ہے اس کا احساس مجھے بخوبی ہے۔ لیکن مادرِ وطن کے لیے یہ کچھ بھی نہیں، کمانڈو بہادر سے جان دینے کے لیے تیار کیے جاتے ہیں اور تم نے اپنے پیشے کی لاج رکھّی ہے۔"

ان کے آخری فقرے نے میرا قد دس فٹ بلند کر دیا تھا۔

اب مجھے سارے کھیل کی سمجھ آ گئی تھی: اس مرتبہ بریف کیس میں چھپی دولت پر ہمارے اسپائی ماسٹر نے ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ کیا تھا کیونکہ اس پر ان سے زیادہ اور کسی کا حق تھا بھی نہیں! قدرت نے ہماری مدد اس طرح کی کہ اب اس ڈرامے میں صد فی صد حقیقت کا رنگ بھرا جا چکا تھا اور گیانی آتما سنگھ کا ہم پر شک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔



بیرے کے مشروب لانے سے پہلے ہی وہ کاؤنٹر سے کسی کو ٹیلیفون کرنے چلے گئے اور جب ان کی واپسی ہوئی تو سارے معاملات طے پا چکے تھے! مشروبات سے فارغ ہوتے ہی انھوں نے بل ادا کیا اور ہم ایک دوسرے کا تعاقب کرتے باہر نکل آئے۔

اسپائی ماسٹر مجھے وہیں مختلف گلیوں میں دس پندرہ منٹ گھماتے رہے بالآخر ہم ایک بڑی بلڈنگ میں جا گھسے۔ اس بلڈنگ میں بے شمار دفتر بنے ہوئے تھے اور افراتفری کا



یہ عالم تھا کہ اگر کوئی یہاں مر بھی جاتا تو لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر اپنے کام میں مصروف رہتے۔ اس بلڈنگ میں ایک شاندار اور خوبصورت ہوٹل بھی موجود تھا جہاں پاٹل ہمارا پہلے ہی سے منتظر تھا۔

"کم اِن جنٹل مین۔" اُس نے ہمیں خوش آمدید کہتے ہوئے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہم ایک شاندار کمرے میں پہنچ گئے جہاں پاٹل کا ایک اور ساتھی بھی موجود تھا۔ اگر میں نے اس شخص کو اب سے پہلے کبھی دیکھا ہوتا تو فوراً اُسے رابندر ناتھ ٹیگور کا کوئی رشتہ دار سمجھ لیتا کیونکہ اس کا حلیہ بالکل ویسا ہی تھا۔

اس سے ہم نے صرف ہاتھ ملایا اور کمرے کی کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہو گیا، وہ باہر جھانک کر شاید اس بات کا اندازہ لگا رہا تھا کہ —— کوئی ہمارے تعاقب میں تو نہیں؟

بریف کیس میں نے پاٹل کو تھما دیا۔ اس نے بڑی گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا: اُسے اس طرح ٹھونک بجا کر دیکھا جیسے کوئی قصائی بکرے کو ذبح کرنے سے پہلے اس کی اوقات جانچ رہا ہو پھر اس کی جیب سے عجیب و غریب قسم کے ہتھیار برآمد ہونے لگے۔ یہ بریف کیس نمبر والا اور ڈبل لاک سسٹم تھا لیکن میں حیرت زدہ رہ گیا جب پاٹل نے اُسے صرف پانچ منٹ میں کھول کر رکھ دیا۔ ہماری توقعات کے عین مطابق نیلے رنگ کے کاغذات ہمارے استقبال کو موجود تھے۔ پھر تیسرے دوست کے ہاتھ —— کا ننھا سا کیمرہ حرکت میں آ گیا اور دس منٹ تک ہم اس مرحلے سے بھی گزر گئے۔

یہ سب لوگ اپنے فن میں طاق تھے! کام کے لحاظ سے ان میں سے —— کسی سے پیچھے نہ تھا۔ پاٹل نے جس مشاقی کا مظاہرہ کیا تھا اس پر میں واقعی حیران رہ گیا کوئی بار کھول لینا ممکن ہے آسان ہو لیکن نمبر اور ڈبل لاک سسٹم بریف کیس کو اس طرح چٹکیوں میں کھول دینا اسی کا کام تھا۔ چند منٹ ہی میں بریف کیس میں موجود تمام کاغذات کی

نقول ہم نے حاصل کر لیں۔

——— یہ کاغذات انتہائی کانفیڈنشل تھے۔ گیانی نے کہاں سے اور کس طریقے سے حاصل کیے اس کا علم مجھے بھی نہیں تھا نہ ہی میں نے اسپائی ماسٹر سے پوچھنا مناسب سمجھا کہ یہ بات میرے بزنس کے اصولوں سے لگا نہیں کھاتی تھی لیکن اتنی عقل مجھے بہر حال تھی کہ میں یہ اندازہ لگا پاتا کہ گیانی اپنے یہ مکمل راز چرا کر کسی دوسری طاقت کو سپلائی کر رہا تھا اور میرے عظیم اسپائی ماسٹر نے درمیان سے ان پر ہاتھ صاف کر لیا۔ مجھے ان کی صلاحیتوں کا معترف ہونا پڑا۔

"مائی فرینڈ! یہ صرف تمہاری وجہ سے ممکن ہوا۔ قسمت مدد کرے تو اس طرح راہیں کھلتی ہیں! گیانی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے نہ جانے ہمیں کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے لیکن تم اس طرح اچانک اس سے ٹکرا جاؤ گے یہ تو کبھی ہمارے گمان میں بھی نہ آیا تھا۔ واقعی قدرت ہماری مدد کر رہی ہے۔"

——— میرے اسپائی ماسٹر نے اعتراف کر لیا۔

جیسے جیسے ان کی شخصیت کے اسرار مجھ پر کھلتے جاتے تھے، اُن کے لیے میرے دل میں اور جگہ پیدا ہوتی جا رہی تھی ——— کتنے عظیم تھے وہ سب لوگ! اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر وہ آگ کے دریا میں کودے تھے اور کبھی انھوں نے اپنے کسی کارنامے پر مان نہ کیا۔ ہر بار سر کرنے پر وہ بارگاہِ ایزدی میں سجدہ ریز ہوتے تھے کہ: "یہ سب کچھ تو اس کی عنایتوں کے سبب تھا۔ اس کی کرم گستری شامل حال نہ ہوتی تو شاید ہم اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہ جاتے۔"

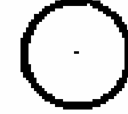
میں اپنے خیالوں میں گم تھا کہ اسپائی ماسٹر میری طرف متوجہ ہوئے:

"او کے بوائے! اب تم جلدی سے اپنے گورو گھنٹال کی طرف پہنچو، اُسے تمہارا سخت انتظار ہو گا اور ——— عین ممکن ہے کہ، اس وقت اُس کے آدمی بھی ہمارے



اردگرد، یہاں کہیں موجود ہوں۔"

یہ کہتے ہی، وہ اُٹھ کھڑے ہوئے ——— میں اُن سے علاحدہ ہوٹل سے برآمد ہوا تھا۔



"بجائے گیانی کے پاس براہِ راست پہنچنے کے، میں اُسے ایک بار فون نہ کر لوں؟"

یہ خیال آتے ہی، میں ایک دوکان کی طرف بڑھا اور جب رابطہ قائم ہوا تو اُوما نے اٹینڈ کیا! میرا نام سنتے ہی فوراً گیانی آتما سنگھ لائن پہ آ گئے:

"ہش کے اُدپُترا ——— میں نے تم پہ غلط بھروسہ تو نہیں کیا تھا! کہاں سے بول رہے ہو؟"

اُس نے بجائے میری بات سننے کے، فوراً خود ہی سلسلۂ گفتگو شروع کر دیا۔

"اس دفعہ تو قسمت سے ہی بچا ہوں بالو جی ———" میں نے جواب دیا اور اسے اپنی پوزیشن سے آگاہ کر دیا۔

"ٹھیک ہے باہر کھڑے ہو جاؤ ابھی سفید رنگ کی فیٹ گاڑی اُوما لے کر آ رہی ہے" اور اس کے ساتھ ہی فون بند کر دیا۔

میں نے پانچ چھ منٹ وہاں لگا دیے پھر باہر برآمدے میں آ گیا جہاں بمشکل چند منٹ بعد اُوما کی منحوس صورت کار سمیت دکھائی دی ——— وہ اس وقت کسی بوڑھے جرنیل کی جوان بیوی بنی بیٹھی تھی۔ رے بین کی قیمتی عینک آنکھوں پر چڑھائے گلے میں سفید موتیوں کا قیمتی ہار ڈالے وہ کسی ریاست کی شہزادی نظر آ رہی تھی۔ سچی بات ہے اگر اس روز اُوما نے مجھے اپنا وہ بھیانک روپ نہ دکھایا ہوتا تو ممکن ہے میرے دل کے کسی نرم گوشے میں اس کے لیے آج کوئی جگہ نکل آتی لیکن اب میرے پاس اس کے لیے نفرت کے سوا کچھ باقی نہیں رہا تھا۔

میں اُسے ایسی بدروح جاننے لگا تھا جو دن کے اُجالے میں دوشیزہ کا روپ دھار کر شکار پھنساتی اور رات کے اندھیرے میں اس کی شاہ رگ پر دانت گاڑ دیتی تھی۔ بہرحال میں پُروقار چال چلتا اگلا دروازہ کھول کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"ونڈرفل" اس نے میرے بیٹھتے ہی مجھے داد دی۔

"شکریہ" میں نے سنجیدگی برقرار رکھی۔

کار سڑک پر رینگنے لگی اور جلد ہی ہم اس ہنگامہ خیز شاہراہ کو چھوڑ کر قدرے سنسان جگہ پر آ گئے تھے۔

"مسٹر امرجیت! اگر آپ محض کل والے واقعے کی وجہ سے مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں تو باور کریں آپ سے بڑا بیوقوف اس دنیا میں شاید کوئی اور نہ ہوگا ——— اگر اس کے علاوہ کوئی اور وجہ ہے تو ٹھیک ہے۔" اس نے اچانک مجھے بوکھلا دیا۔

"میں نہ تو اتنی جلدی کسی سے محبت کرنے لگتا ہوں نہ نفرت! میں صرف اپنے کام سے کام رکھتا ہوں ——— کون کیا کرتا ہے، کیوں کرتا ہے؟ میری طرف سے یہ سب کچھ جائے جہنم میں۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"مسٹر امرجیت! میں اس دنیا میں اتنی دُور تک آ گئی ہوں اب کبھی مجھے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے جواز تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ تم نئے نئے ہو شاید ابھی اس مرحلے تک نہیں پہنچے۔" اُس نے سڑک پر نظریں دوڑائیں۔

"ہاں! ظاہر ہے اتنی دیر بعد ضمیر نام کی کوئی شے باقی تو رہتی نہیں۔" میں نے اپنی دانست میں بڑا تیر چلایا تھا لیکن اُدھر اس بات کا ذرا برابر اثر بھی قبول نہ کیا۔

"ٹھیک کہتے ہو تم! وہ بولی، لیکن ایک آخری بات میری سُن لو ——— اس کے بعد شاید پھر کبھی میں اس موضوع پر بات نہ کروں۔"

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور کہنے لگی: "باسو کو میں نے سڑک سے



اٹھا کر عرش پر پہنچا دیا تھا۔ کلکتہ کا کوئی دادا اس کا وجود برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کیونکہ وہ ماضی میں پولیس کا ٹاؤٹ تھا۔ اس نے گڑگڑا کر مجھ سے التجا کی تھی کہ مجھے پاؤں پر کھڑا کر دو، محض اس کی جان بچانے کے لیے ہمیں اپنے تین بہترین آدمیوں کی جان سے ہاتھ دھونے پڑے کیونکہ باسو پر آئے دن حملے ہوتے رہتے تھے۔ اس نے اس احسان کا انعام یہ دیا کہ نہ صرف مجھے اور تمہیں مروانے پر تل گیا بلکہ ہمارے ایک ٹھکانے کی نشاندہی کر کے چار بے گناہ لوگوں کو بھی مروا ڈالا۔ اس نے پولیس کو گیانی جی کی ایک فیکٹری کا پتہ بتا دیا اور اس درندے پولیس کپتان بھاٹیہ نے وہاں پہرے پر متعین تین محافظوں کو مار ڈالا، کیونکہ وہ خطرناک مجرموں کو زندہ رہنے کا حق دینے کے لیے تیار نہیں، جانتے ہو ان میں سے ایک پٹھان چوکیدار مجھے بیٹی کہا کرتا تھا، ان بیچاروں کو ہماری اصلیت کا علم تو تھا ہی نہیں۔!"

تھوڑی دیر کے لیے وہ رُکی اور پھر اُس نے اپنی گفتگو جاری کر دی:

"مجھ جیسی ذلیل عورت اس قابل ہرگز نہیں کہ اس سے کوئی تقدّس مآب رشتہ استوار کرے لیکن وہ پٹھان دُنیا کا واحد انسان تھا جس نے میرے منع کرنے کے باوجود مجھے بیٹی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ میں اس کے قاتل کا خون خود کیوں نہ پی سکی۔؟ مجھے ساری زندگی اس بات کا افسوس رہتا!! میں تمہارے سامنے اپنے اس فعل کی وضاحت کبھی نہ کرتی ——— میرا کام ہی یہی ہے کہ: گروہ کے باغیوں کو اذیتیں پہنچاؤں لیکن اس سلسلے میں میرے ہاتھوں یہ کسی کی پہلی موت تھی۔"

اس کی اس بات نے مجھے اس لیے بھی الجھن میں ڈال دیا کہ گفتگو کے خاتمے پر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے عینک ڈیش بورڈ پر رکھ دی تھی اور رومال سے اپنی آنکھیں صاف کر کے ان پر پھر عینک جمائی۔

"آئی ایم سوری اوما۔ لیکن پہلے بھی میں نے تمہارے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی

تھی۔

"تم میرے متعلق کوئی انوکھی رائے تو قائم کرو گے نہیں، ایک فاحشہ اور بُری عورت کو سوائے ویشیا کے کیا سمجھے گا کوئی ——— پھر میں نے بھی کبھی یہ خواہش نہیں کی کہ مجھے اچھا سمجھا جائے۔ لیکن یہ ضرور چاہا ہے کہ کوئی ایسا منصف ضرور ہو جو میرے کیس کو سمجھ کر مجھے سزا کا حکم سنائے۔ کوئی تو ایسا ہو مسٹر امرجیت۔"

خدا جانے وہ اداکاری کر رہی تھی یا آج اس کے سوئے ضمیر نے واقعی انگڑائی لے لی تھی، بہر حال مجھے اس پر رحم آنے لگا۔

ہم نے سڑک کے کنارے بنی کوک بار سے بوتلیں پیئں اور گیانی آتما سنگھ کے حضور پہنچ گئے۔

"میں زندگی میں کبھی کسی کے سامنے شرمندہ نہیں ہوا، لیکن تمہارے سامنے مجھے شرم آ رہی ہے پُتّر۔ اب مجھے خود میدان میں اُترنا ہوگا۔ خود دیکھنا ہوگا مجھے اس معاملے کو۔"

میں نے بریف کیس اس کے سامنے میز پر رکھ دیا! گیانی آتما سنگھ مسکرایا اور اُس نے میز کی دراز سے ایک بڑا سا لفافہ نکال کر مجھے تھما دیا۔

"اسے رکھ لے پُتّر اور تین چار روز کے لیے چھٹی۔"

"کیا ہے یہ مہاراج جی؟" میں نے جانتے بوجھتے بھی پوچھ لیا۔

"کچھ پیسے ہیں پُتّر۔ انھیں مکمل نہ سمجھ لینا۔ جب ضرورت ہو صرف اشارہ کر دینا۔"

گیانی جی! میں نے ابھی تک کوئی مہم تو سر کی نہیں اور بھیک مجھے منظور نہیں ———

ل!! اگر ایک مرتبہ بھی آپ کا مال ٹھکانے پر پہنچ جاتا تو دوسری بات تھی۔"

——— میں نے چاہا رقم لوٹا دوں۔

"یہ تیرا حقیر سا انعام ہے پتّر۔ تیری ہمت اور بہادری کا معمولی سا نذرانہ ہے اسے رکھ لے، میرا تجھ سے کوئی اور رشتہ بھی ہے۔"



——— اس نے میز سے چند قدم آگے بڑھائے غالباً واپس جا رہا تھا اور جاتے جاتے میری طرف ایکدم وہ پھر دیکھنے لگے تھے؛

"مجھے علم ہے پتّر تیرے پیچھے بھی آنکھیں لگی ہیں، تیرے نہ چاہتے ہوئے بھی میرے بندے صرف تیری حفاظت کے لیے نگرانی کرتے ہیں ——— اب تو چھٹیوں پر جا رہا ہے تو یہ تیری صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ تیرے ساتھ ساتھ رہیں یا الگ ہو جائیں۔

وہ میری جانب پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور میرے ہونٹ لرزنے لگے؛

"میرے لیے سب سے بڑا انعام یہی ہے مہاراج جی کہ ——— ان تین چار دنوں میں مجھے بالکل نہ چھیڑا جائے۔"

میں نے درخواست کی تو وہ تھپکی دینے لگے،

جیسی تیری مرضی! گو میرا دل نہیں چاہتا تجھے اکیلا چھوڑوں۔" کہہ کر گیانی خلا میں غائب ہو گیا۔

# سپائی ماسٹر

لفافے میں پانچ ہزار روپے کے کرنسی نوٹ تھے۔ میں نے دو گھنٹے تک کلکتہ کی سڑکوں پر مسلسل آوارہ گردی کی محض یہ دیکھنے کے لیے کہ میرا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا مطمئن ہو کر اپنے دوستوں سے رابطہ قائم کر لیا۔

"ٹھیک ہے یہیں ٹھیرو۔" جواب ملا۔

اور تقریباً آدھ گھنٹے بعد میں اور پاٹل ایک کار میں اڑے چلے جا رہے تھے۔ اس نے ہیڈکوارٹر کا ایک ضروری پیغام مجھے تھما دیا تھا۔ لفافے پر لکھا تھا: "جس سے متعلق ہے صرف وہی پڑھے، خصوصی..... انتہائی خفیہ.... پڑھنے کے بعد فوراً ضائع کر دو..... ونگ (ونگ کمانڈر)

باٹلا..... ملنے کے امکانات...... (آگے تفصیل درج تھی).... گھر سے فائلیں حاصل کرو.... فوراً....

اسے ضائع کر دو.... اسے ضائع کر دو.... اسے ضائع کر دو۔

میں نے پاٹل کے سگریٹ لائیٹر سے کاغذ جلا دیا۔

"ماسٹر آپ کا منتظر ہے۔" اس نے کار کا رُخ ایک مضافاتی آبادی کی طرف موڑ دیا۔

ہم نے گاڑی بستی کے باہر ہی پارک کر دی اور خود پیدل اس مکان کی طرف چل



دیئے جہاں اسپائی ماسٹر میرے منتظر تھے۔ میرے وہاں پہنچتے ہی انھوں نے ایک نقشہ میرے سامنے پھیلا دیا جس پر ائرفورس آفیسر کالونی میں بنے ونگ کمانڈر باٹلا کے گھر کی نشان دہی کی گئی تھی۔

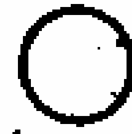
"آج رات میٹنگ سے اس کی واپسی دس بجے ہوگی۔ ہماری اطلاعات کے مطابق اس کے ذاتی بریف کیس میں بڑے اہم ڈاکومنٹس ہوں گے اور کل علی الصباح وہ ائرہیڈ کوارٹر ان کاغذات سمیت پرواز کر جائے گا! ہمارے پاس بس ایک ہی رات ہے۔" انھوں نے میرے چہرے پر نظریں جمائے کہا۔

"ٹھیک ہے سر۔" میں نے گردن ہلا کر رضامندی ظاہر کی۔

"ہم دونوں اس گیم کے پارٹنر ہوں گے۔" انھوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"ڈیل" ہم دونوں کے منہ سے نکلا۔

"آؤ کچھ انتظامات کا جائزہ بھی لینا ہے۔" انھوں نے حفاظتِ خود اختیاری کے لیے ایک ننھا سا پستول مجھے تھما دیا: "فی الحال اسی پر قناعت کرو۔" انھوں نے ہنستے ہوئے کہا کیونکہ وہ بخوبی جانتے تھے کہ اس کی حیثیت کسی کمانڈو کے نزدیک معمولی سے کھلونے سے زیادہ ہرگز نہیں۔ جب میں نے انھیں گیانی کے "انعام" کے متعلق بتایا تو انھوں نے ہنستے ہوئے وہ پیکٹ مجھے لوٹا دیا۔ "اس کے مستحق صرف اور صرف تم ہو۔"



ہم دونوں اس کار تک آئے۔ اب پاٹل کے بجائے میرے اسپائی ماسٹر گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے اور جیسے ہی ہم ذیلی سڑک سے گھوم کر بڑی سڑک تک پہنچے۔ میں نے ایک گاڑی کو درختوں کے جھنڈ سے اپنے تعاقب میں نکلتے دیکھ لیا۔ اندرونی شیشے میں وہ گاڑی ہم سے چپٹی نظر آ رہی تھی۔

"فرینڈز" سر میری طرف دیکھ کر مسکرائے: کمال کے آدمی تھے وہ۔

——— دھوپ اپنا بستر سمیٹ رہی تھی سا جالوں پر اب تاریکی نے یلغار شروع کر دی تھی۔ سورج ہمارے عقب میں ڈوب رہا تھا ——— ہم لوگ اب اس سڑک پر آ گئے تھے جو آفیسرز کالونی کو جاتی تھی، تعاقب میں آنے والوں نے فاصلہ بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ اس سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔

ہم لوگ جیسے ہی ایک موڑ گھومے سڑک کے کنارے کھڑی پولیس کی جیپ سے ہمیں رکنے کا اشارہ ملا۔ محض چند ثانیے کو میں نے اسپائی ماسٹر کو چونکتے دیکھا، پھر وہ مطمئن ہو گئے۔ جیپ کے نزدیک انھوں نے بریک لگا دیے۔ ہماری کار کے رُکتے ہی جیپ کی آڑ میں کھڑے چار مسلح فوجی سامنے آ گئے۔ ہمیں دھوکہ دینے کے لیے انھوں نے پولیس کے بھیس میں ٹریفک چیکنگ پارٹی کا روپ دھار کر چھاپہ مارا تھا۔! "کیا یہ لوگ ہمیں جانتے ہیں؟" سب سے پہلا یہی سوال میرے ذہن میں پیدا ہوُا اور پھر اس کا جواب بھی فوراً مل گیا۔

"ہینڈز اپ" انھوں نے اسٹین گنز ہماری طرف تان کر للکارا۔

ہم دونوں نے فوراً ہاتھ اٹھا دیے۔

"پاگل ہو گئے ہو کیا تم لوگ؟" میرے سر نے انگریزی میں انھیں ڈانٹ پلائی، ان کا لہجہ کچھ ایسا ہی تھا کہ وہ لوگ ایک دفعہ تو ٹھٹھک گئے۔

"کون ہو تم؟" ان کے کمانڈر نے انگریزی میں دریافت کیا۔

جواب میں میرے اسپائی ماسٹر نے جو کچھ کہا اس پر کم از کم میں تو ایک دفعہ دہل ہی گیا۔ انھوں نے آرمی کوڈ کے ذریعے اپنا تعلق بھارتی آرمی انٹیلی جنس کے ایک خصوصی یونٹ سے ظاہر کیا تھا۔

"کوئی پہچان؟" وہ لوگ کچھ زیادہ ہی چالاک تھے۔

"شٹ اپ" میں پہچان جیب میں لیے پھرتا ہوں، تم خود چیک کر و۔" وہ ہاتھ اٹھائے اٹھائے دھاڑے۔ کمانڈر نے اپنے ساتھیوں کو چوکنا رہنے کا اشارہ کیا اور خود وہ جیپ کی



طرف لپکا تاکہ وائرلیس ٹرنسمٹر کے متعلق انکواری کرے۔

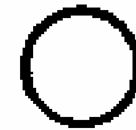
ابھی وہ بمشکل چند قدم ہی چلا تھا جب میں نے بڑی تیز رفتاری سے اپنی سمت بڑھتی اس کار کو دیکھا جسے ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ سپاہی ہم پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔ ویسے بھی یہ ایک عام سی سڑک تھی یہاں سے کاروں کو گزرنا ہی تھا۔ اسی لیے شاید کسی نے اس بات کا نوٹس نہ لیا۔

"ڈاؤن" سر چلائے اور اس کے ساتھ ہی ہم دونوں زمین پر بچھ گئے۔

——— کار کی کھڑکیوں سے شعلے اگلتی دو اسٹین گنوں نے کھڑے چاروں فوجیوں کو ان کے کمانڈر سمیت بھون کر رکھ دیا ——— وہ لوگ چھلانگیں لگا کر دوڑتے ہوئے ہماری طرف آ رہے تھے۔

اپنا مطلوبہ کھیل شروع ہوتے ہی میں اپنے آپ میں واپس آ گیا ——— زمین پر لیٹے لیٹے سب سے پہلے میں نے اس سپاہی کی اسٹین گن کو ٹھوکر مار کر اس کی پہنچ سے دور کر دیا جس میں ابھی کچھ سکت باقی تھی اور وہ اپنی گن اٹھانے کی فکر کر رہا تھا۔ اس اثنا میں اسپائی ماسٹر کا پستول بھی ان کے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا۔ انھوں نے لیٹے لیٹے اس کے سر میں سیسہ اتار دیا۔

اسپائی ماسٹر نے بڑے مطمئن لہجے میں انھیں ہدایات جاری کیں اور مجھ سمیت پولیس کی اس جیپ میں بیٹھ گئے جو اپنے سواروں سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے ایک ساتھی نے ہماری کار کے پٹرول ٹینک کا ڈھکن کھول کر اندر جلتا ہوا سگریٹ لائیٹر پھینک دیا۔ ان کی کار اور ہماری جیپ وہاں سے پرے ہٹ گئی تھیں۔ چند سیکنڈ بعد ہمارے ایک ساتھی نے ایک اسٹین گن اور کچھ میگزینیں میری طرف اچھالیں تو "سر" نے ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ ہمارے پیچھے جلتی کار میں دھماکے ہونے لگے۔



کار آگے آگے تھی اور ہم اس کے پیچھے پیچھے۔ قریباً ایک ڈیڑھ میل چلنے کے بعد ہم رک گئے۔ کار پیچھے آگئی۔ اسپائی ماسٹر نے ان لوگوں کو نئے احکامات دیئے اور اس کے ساتھ ہی انھیں گڈلک کہہ کر آگے بڑھا دیا۔ خود انھوں نے بڑی پھرتی سے جیپ کو موڑا اور ایک کچے راستے پر ڈال دیا ہم لوگ جھاڑیوں سے الجھتے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اس دوران میں جیپ کے ریڈیو ٹرانسمیٹر نے ٹرانا شروع کر دیا تھا۔ شاید ان کا رابطہ کنٹرول روم تھا جہاں کوئی چیخ چیخ کر مختلف گشتی کاروں کو پوزیشن الاٹ کر رہا تھا۔ میرے اسپائی ماسٹر کے چہرے پر پریشانی کا نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ انھوں نے ایک جگہ جیپ روک دی اس اثنا میں وہ ریڈیو سے نشر ہونے والے احکام بھی شاید ذہن نشین کرتے رہے تھے پھر انھوں نے مسکراتے ہوئے میری سمت دیکھا اور جیپ کا بونٹ اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔

"جنٹل مین ویری سوری گن تو یہاں چھوڑنی پڑے گی۔" انھوں نے قریباً ہنستے ہوئے کہا۔

میں نے ان کا ارادہ جان لیا تھا۔ اسٹین گن میں نے وہیں جیپ میں رکھ دی ہم نے انجن کی پٹرول سپلائی کرنے والی نالیاں توڑ دیں جس سے انجن میں پٹرول گرنے لگا۔ میرے "سر" نے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر اپنا سگریٹ لائیٹر سلگایا۔ "بھاگو" انھوں نے مجھے حکم دیا اور جیسے ہی میں بھاگا انھوں نے جلتا ہوا لائیٹر جیپ کے انجن پر پھینک دیا ابھی ہم دونوں بمشکل پندرہ بیس گز دور پہنچے تھے جب فضا ہمارے عقب میں زوردار دھماکے کی آواز سے لرز اٹھی ہم دونوں کسی لاشعوری فعل کے محتاج ہو کر چند لمحوں کو زمین پر گرے ضرور تھے لیکن فوراً اٹھے اور چل دیئے قریباً آدھ گھنٹہ ہمارا سفر جاری رہا۔ اندھیرا اب آہستہ آہستہ اجالے نگلنے لگا تھا ہم لوگ قریباً غیر آباد علاقے میں پہنچ چکے تھے۔

ایسے مقامات ہوائی اڈوں کے اردگرد ہوتے ہیں سب مجھے یہاں کی مصنوعی ویرانی اور



کسی حد تک کیموفلاج سسٹم نے اس بات کا احساس دلا دیا تھا کہ منزل اب دُور نہیں ہم ایڈمن ایریا کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس دوران میں میرے اسپائی ماسٹر کی کوشش یہی رہی کہ کوئی ہم سے ٹکرانے نہ پائے۔ ہم سڑک کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں سفر کر رہے تھے۔ یہ سڑک کچھ زیادہ بارونق نہیں تھی لیکن اسے بے رونق بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ہر تین چار منٹ بعد کوئی تیز رفتار سواری تارکول کی سیاہی پر پیلی روشنیاں پھیلاتی زن سے ہمارے قریب سے گزر جاتی۔ ہم گاڑیوں کی روشنی کی زد سے بچنے کے لیے درختوں کی اوٹ میں چھپ جاتے تھے کبھی کبھی کوئی پیدل شخص بھی ہم سے ٹکرا جاتا لیکن عموماً ہمیں نظر انداز کر کے گزر جاتا کیونکہ یہ کوئی ممنوعہ علاقہ تو تھا نہیں البتہ اس بات کے امکانات سو فیصد تھے کہ سیکورٹی نے خصوصاً ان حالات میں یہاں کے چپے چپے پر ضرور نظر رکھی ہو گی

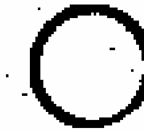
——— اب ہم جس جگہ پہنچے تھے، وہاں آفیسرز کے بنگلوں کی قطاریں شروع ہو گئی تھیں۔ بڑی سڑک کے ساتھ ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ایک ذیلی سڑک اندر کو گھومتی جس کے دونوں اطراف افسران کی رہائش گاہیں تھیں۔ ایسے ہر سلسلے کے آغاز پر ایک سنگِ میل پر اس قطار میں موجود بنگلوں کے نمبر لکھے ہوتے تھے۔ اسپائی ماسٹر ان کے نزدیک کھڑے ہو کر اندھیرے میں قریب سے نمبروں کا جائزہ لیتے اور آگے بڑھتے جاتے۔ بالآخر گوہرِ مقصود ہاتھ آ گیا۔ ہم اس سٹریٹ کے کونے پر پہنچ چکے تھے جہاں بنگلوں کی دو رویہ قطاروں میں سے ایک قطار کے آخر میں ونگ کمانڈر باٹلا کا بنگلہ واقع تھا۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ صرف دو بنگلوں کے سامنے افسران کی بیگمات ڈنر ہضم کرنے یا بچے ہوا خوری کے لیے ٹہل رہی تھیں۔

ہمارے حلیے خاصے شریفانہ تھے خصوصاً اسپائی ماسٹر تو پہلی نظر میں ایئر فورس ہی کے کوئی افسر دکھائی دیتے تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف کچھ فاصلے پر بجلی کے بلب بھی پھانسی پر لٹکے دکھائی پڑتے تھے جن میں سے پچھتر فی صد تو فیوز تھے اور بلے دے کے صرف

پچیس فیصد بلبوں کی بیمار روشنی الیکٹرک پولز کے ارد گرد پھیلے اندھیرے سے جہاد میں مصروف تھی۔

ہم جان بوجھ کر اس سمت سفر کر رہے تھے جہاں الیکٹرک پولز کے زیادہ تر بلب فیوز تھے۔ میں نے اپنے اسپائی ماسٹر کا عندیہ بھانپ لیا اصل میں وہ چیل قدمی کرتی بیگمات سے کنی کترا کر گزر جانا چاہتے تھے۔

عورت فطرتاً کچھ زیادہ ہی تجسس پسند واقع ہوتی ہے۔ عین ممکن ہے سیکیورٹی کے کسی تربیت یافتہ ملازم کو تو آپ پر شک نہ گزرے لیکن کوئی معمولی ذہن کی عورت آپ کا حلیہ ضرور اپنے لاشعور میں محفوظ کر لے گی۔ "اپنے ٹارگٹ کے ارد گرد پائے جانے والے وجودِ زن کو شجر ممنوعہ جانیے۔ ان کے نزدیک بھی نہ پھٹکیے۔" میرے خضر صورت انسٹرکٹر نے میرا ہاتھ تھاما اور ٹریننگ کا سبق دہرایا۔



ہم ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو اس طرح چل رہے تھے کہ غور کرنے پر بھی ہمارے چہرے ایک دوسرے کی اوٹ میں چھپے دکھائی پڑتے پھر وہ مرحلہ بھی بخیر و خوبی طے پا گیا اور اگلے چند منٹ کے بعد ہم اس بنگلے کے سامنے گھنے درختوں کے جھنڈ میں کھڑے تھے۔ جس کے گیٹ سے باہر لگی کال بیل سے منسلک پلاسٹک کی تختی اپنے پیچھے جلتے بلب کی روشنی میں اسے ونگ کمانڈر باٹلا کی رہائش گاہ بتا رہی تھی۔

عمارت ایک منزلہ تھی۔ یہاں قریباً تمام عمارتیں احتیاطی تدابیر کے پیش نظر ایک منزلہ ہی بنائی گئی تھیں۔ بنگلوں کی اس قطار کی پشت پر خالی میدان میں اُگی جھاڑیاں کسی بھی فوج کی پناہ گاہ کا کام دے سکتی تھیں۔ دشمن نے یہ اقدامات یقیناً اس ایریا کو کیموفلاج کرنے کے لیے کیے تھے لیکن چانسز دونوں کے لیے ففٹی ففٹی تھے۔ ہم نے بھی انہی جھاڑیوں کی اوٹ سے یلغار کرنا تھی ـــــ بنگلے کے گیٹ سے ملحق باغ میں کسی مسلح سنتری کی موجودگی



کے امکانات بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے تھے۔

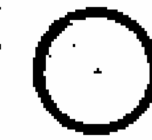
ابھی رات کے بمشکل نو بجے تھے اور اندر جگمگاتی روشنیوں کے عقب سے ویسٹرن میوزک کی ہلکی ہلکی آوازیں اُبھر کر یہاں مقیم لوگوں کے ذوق کا پتہ دے رہی تھیں۔ آج سنیچر کی رات تھی اور سنیچر کی رات کی بھارتی سوسائٹی میں کیا حیثیت ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں خوب تھا۔ ہمارے اندازے کے مطابق ونگ کمانڈر باٹلا ابھی گھر نہیں پہنچا تھا، کیونکہ برآمدے کے سامنے ہمیں کسی گاڑی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ شاید ابھی میٹنگ میں مصروف تھا یا پھر نائٹ کلب میں دادِ عیش دے رہا تھا جبکہ ادھر بھی یہی حال تھا۔ آفیسرز کالونی کے تقریباً سبھی بنگلوں میں اس وقت شیطانیت رقص فرما تھی۔ درختوں کے جھنڈ سے اور پھر مین گیٹ کے اوپر سے جھانک کر ہم نے جغرافیائی اور معاشرتی حالات کا ایک سرسری سا جائزہ لیا تھا پھر ہم گھوم کر بنگلے کی پشت پر چلے آئے جہاں بڑی بڑی خودرو گھاس اپنی آغوش وا کیے ہماری منتظر تھی۔ انہی جھاڑیوں کی اوٹ میں ہم نے اپنا شریفانہ لباس نائلن کے ایک تھیلے میں منتقل کیا اور اسے اسپائی ماسٹر نے اپنی پشت پر کٹ کی طرح باندھ لیا۔ یہ اقدام خالصتاً احتیاطی تدابیر کے پیش نظر کیا گیا تھا: مبادا کہیں دوبدو مقابلے یا مشن کے دوران کسی اور چکر میں ہمارے کپڑے پھٹ جائیں تو ان کا متبادل موجود رہے پھر دوسری بات یہ بھی تھی کہ ہمیں یہاں سے فرار ہونے کے لیے بھی شرفا کا حلیہ اپنانا تھا اور سفید پوشوں کے کپڑے بے داغ ہوتے ہیں۔

ہمارے پاس دو آٹومیٹک پستول، ایک چھوٹی سی کلوروفارم کی شیشی اور اپنے اپنے نام سے وجود اور ٹریننگ کے سوا بظاہر اور کچھ نہیں تھا ـــــ جو ہمیں ایسے کام کرنے کے لیے خصوصی طور پر دی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس قدر کافی ہرگز نہ تھا کہ ہم اسی کے بل بوتے پر اس دہکتے جہنم کا ایندھن بننے چلے آتے، لیکن وہ کوئی اور ہی جذبہ تھا جو ہمارا مان بڑھا رہا تھا ـــــ ہمارا سب سے مؤثر

خدا کے بزرگ و برتر کی ذات پر بے پایاں اور غیر متزلزل اعتقاد ہمیں ہر ڈگمگاتے لمحے میں طاقتور ستون کی طرح سہارا دے کر کھڑا کیے رکھتا اور ہم بے سروسامان، ناچیز سے بندے بسا اوقات وہ کچھ کر گزرتے کہ ایک عالم انگشت بدنداں رہ جاتا۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں بھی لوہے کا وہ موٹا پائپ ہلکورے لیتا دکھائی دے رہا تھا جس کے ذریعے ہمیں چھت تک پہنچنا تھا اور وہاں لیٹ کر اس ہنگامۂ ناؤ نوش کے سرد ہونے کا انتظار کرنا تھا جس کے بعد ہی کچھ ممکن تھا ــــ ہمیں بریف کیس ہی پر نہیں گھر کے زیورات اور نقدی پر بھی ہاتھ صاف کرنا تھا اور یہ سب کچھ اس ڈرامے کا حصہ تھا جس نے اس جاسوسی کارنامے کو محض "چوری" ظاہر کرنا تھا اور چوروں نے بریف کیس بھی اس میں موجود دولت یا کسی قیمتی شے کے لالچ میں اڑا لیا ہوگا۔"

ہمیں علم تھا کہ محض عام سی چوری کا شک ہونے پر اس معاملے کو زیادہ "سیریس" نہیں لیا جائے گا کیونکہ ایسی اکا دکا وارداتیں یہاں ہوتی ہی رہتی تھیں۔



ہم دونوں جھاڑیوں میں ٹکے پیش آمدہ حالات سے نبٹنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے گھڑی کی سوئیاں اب دس کے ہندسے کا طواف کرنے لگی تھیں لیکن ابھی تک اندر ہونے والی سرگرمیوں میں کوئی کمی واقع ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہماری طرف غالباً کچن تھا جس کی لائٹ تب سے اب تک مسلسل جل رہی تھی۔ اسپائی ماسٹر نے مجھے کچھ ہدایات دے کر وہیں رکنے کو کہا، پھر اپنی کمین گاہ سے باہر نکلے اور جھک کر تیزی سے چلتے بنگلے کی دیوار سے جا لگے۔ اُن کی جسمانی چستی اور پھرتی پر بے اختیار میرے منہ سے نعرۂ تحسین بلند ہوا۔ بلاشبہ وہ کسی سرکس کے منجھے ہوئے جمناسٹ نظر آتے تھے۔ اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں انھوں نے قریباً اپنے قد کے برابر دیوار پر جمائیں اور انہی ہتھیلیوں کے بل پر اپنا سارا جسم فضا میں بلند کیا۔ شاید وہ خطرہ مول لے کر اندر کے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ قریباً



ایک منٹ بعد وہ اپنی پہلی پوزیشن میں واپس آ گئے اب وہ دوبارہ اسی طرح جھکے جھکے میری طرف بھاگے چلے آ رہے تھے۔

"کم آن لوائے۔ ٹارگٹ پہنچ چکا ہے اور اسے ہر حال میں یہیں "ہٹ" کرنا ہے اگر یہ موقع نکل گیا تو شاید پھر کبھی ہاتھ نہ آئے۔" انھوں نے میرے نزدیک پہنچ کر سرگوشی کی۔

"او کے ماسٹر" میں نے اپنی جگہ سے رینگنا شروع کیا۔

میرا رخ اسی پائپ کی طرف تھا جس کے ذریعے بنگلے کی چھت پر پہنچنا تھا۔ ماسٹر مجھ سے کچھ فاصلے پر زمین پر کہنیوں کے بل لیٹے، ہاتھ میں پستول لیے، چھت پر نظریں جمائے ہوئے تھے تاکہ کسی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹ سکیں۔ محض دو منٹ میں نے چھت تک پہنچنے میں خرچ کیے تھے۔ چھت پر پہنچ کر میں نے لیٹے لیٹے چاروں اطراف کا جائزہ لیا۔ اردگرد تمام بنگلوں کی چھتیں ویران دکھائی پڑتی تھیں۔ اصل میں ان بنگلوں کی بناوٹ ہی کچھ اس طرح تھی کہ ان کی چھتیں زیرِ استعمال آتی ہی نہیں تھیں۔ الّا یہ کہ کوئی ہمارے جیسا ضرورت مند کسی اشد ضرورت کے تحت انھیں استعمال میں لائے۔

ہر طرح کے خطرات سے بے نیاز ہو کر میں نے چھت کے ایک کونے پر لیٹے لیٹے پنسل ٹارچ روشن کر کے ماسٹر کو "گرین سگنل پاس" کیا اور دوسرے ہی لمحے وہ پائپ کے نزدیک پہنچ چکے تھے اوپر پہنچنے میں حسبِ توقع انھوں نے مجھ سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر لیٹے آسمان پر تارے گنتے رہے خدا خدا کر کے رات کے بارہ بجے ہماری کالونی اندھیرے میں ڈوب گئی۔ اس کے بعد بھی ہم نے آدھ گھنٹہ مزید انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔

آدھے گھنٹے بعد اسپائی ماسٹر کا مضبوط ہاتھ میرا شانہ سہلا رہا تھا۔ یہ کچھ کر گزرنے کا اشارہ تھا۔ ہم نے منصوبہ بندی پہلے سے کر رکھی تھی اور اب اسی کے مطابق ہمیں حرکت میں آنا تھا۔

لیٹے لیٹے ہم نے گرمجوشی سے ایک دوسرے کا ہاتھ دبایا اور اسپائی ماسٹر کروٹ بدل کر چھت کے کنارے کی طرف بڑھنے لگے۔ اس چھت سے وہ باورچی خانے کی چھت پر پہنچ گئے۔ میں اس دوران ان پر نظریں جمائے وہیں لیٹا رہا پھر ماسٹر نے چند لمحے بعد مجھے اپنی جگہ پہنچنے کا اشارہ کیا اور جیسے ہی میں اس جگہ پہنچا وہ دیوار پر پہنچ گئے۔

اچانک میری چھٹی حس نے چلا کر کسی خطرے کی نشاندہی کی تھی۔ ابھی تک مجھے کچھ دکھائی نہیں پڑا تھا کیونکہ یہاں سے اس گلی نما راستے پر نظر ڈالنا ممکن نہیں تھا جو کمروں کی قطار اور چاردیواری کے درمیان واقع تھی۔ ماسٹر کو البتہ سب کچھ بآسانی نظر آ سکتا تھا میں نے ان کی طرف نظریں دوڑائیں تو وہ کسی آکٹوپس کی طرح دیوار سے لپٹے نظر آئے۔ وہ اس طرح بے حس و حرکت دیوار سے چپٹے ہوئے تھے کہ جب تک کوئی قریب آ کر انھیں نہ دیکھ لیتا نظر نہیں آ سکتے تھے۔

پھر مجھے وہ عفریت بھی نظر آ گیا جس نے انہیں دیکھنے پر مجبور کیا تھا یہ وہ کم بخت گن مین تھا جو شاید کسی ضرورت کے تحت اس طرف آ نکلا تھا ورنہ اتنا مستعد ہونے کی توقع اس سے نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ بنگلے میں گھوم پھر کر اس کی چوکیداری کر رہا ہو۔ تھری ناٹ تھری کی ایک رائفل اس کے کندھے سے لٹک رہی تھی اور وہ بغیر آواز پیدا کیے شاید باورچی خانے پر ہی نقب لگانے جا رہا تھا۔ میرا نیچے کا سانس نیچے اور اوپر کا اوپر رہ گیا وہ ذرا سی بھی نظر اوپر اٹھاتا تو ماسٹر اسے نظر آ جاتے۔ بات یہ نہیں تھی کہ وہ ہم پر غالب آ جاتا یا ہماری گرفتاری کا خطرہ تھا۔ ممکن ہے ایسا بھی رہا ہو لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کے ساتھ معمولی سے معرکے کی صورت میں بھی ہمارے سارے کیے کرائے پر پانی پھر سکتا تھا اور یہ نقصان ناقابلِ برداشت ہوتا۔ میں نے سانس روکے ہوئے ہی خود کو ایسی پوزیشن میں کر لیا تھا کہ کسی بھی خطرے کے پیشِ نظر یہاں سے جست لگا کر اس کا ٹینٹوا دبا دوں لیکن اس پوزیشن میں آنے کے لیے بھی مجھے محض چند سیکنڈ ہی



میں جن اعصاب شکن لمحات سے گزرنا پڑا وہ میرے لیے جان لیوا حد تک عذاب دہ تھے یہاں حرکت میں برکت نہیں موت تھی ـــــ موت!

میری آنکھیں بیک وقت گن مین اور "سر" پر ٹکی ہوئی تھیں۔ گن مین پر تو فطرتاً اور ماسٹر پر کسی بھی کاشن کے لیے۔ میں نے اس کمزور لمحے میں اپنی کمانڈ ان کے ہاتھ دے کر خود کو ایک طرح سے محفوظ تصور کر لیا اور آہستہ آہستہ پُرسکون ہو گیا۔

نووارد جب اس مقام سے آگے نکل گیا تو ایک طرح میرے تڑختے اعصاب کو نجات نصیب ہو گئی وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں چلتا کچن کی طرف آ رہا تھا۔ بچے کھچے شاندار کھانوں کی اشتہا اسے موت کے منہ میں کھینچ لائی تھی پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ باورچی خانے میں جا گھسا۔ اس کے اندر گھستے ہی ماسٹر نے دیوار پر لیٹے لیٹے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے انھیں ایک دوسرے کی مخالف سمت میں کاٹا۔ یہ اس امر کا اشارہ تھا کہ میں اسے یہیں دبوچ لوں۔ اس کے ساتھ ہی سر چھپکلی کی طرح دیوار سے چپٹے چپٹے زمین پر آ گئے اب وہ ایک کمرے کے داخلے کے دروازے کی اوٹ میں چپکے کھڑے تھے۔

میں تقریباً لوٹتا ہوا دیوار پر پہنچا اور بغیر آواز پیدا کیے کچن کی دیوار سے آ لگا۔ اسپائی ماسٹر ہاتھ میں پکڑے پستول پر سائیلنسر فٹ کر رہے تھے اب انھوں نے باورچی خانے کے اس دروازے کو کور کر رکھا تھا جس سے گن مین کی آمد متوقع تھی۔ میں بغیر آواز پیدا کیے قدم بہ قدم آگے بڑھتا اب اس کھلے دروازے کے ایک پٹ کی اوٹ میں کھڑا تھا جس سے وہ اندر داخل ہوا تھا اور جس سے اسے باہر بھی نکلنا تھا۔ دوسرے ہی لمحے پتلون کی بیلٹ میں اڑسی نائلن کی وہ ڈوری میرے ہاتھوں میں تھی جس نے اس کے لیے موت کا پھندا ثابت ہونا تھا۔

"سر" نے بائیں ہاتھ کی انگلی سے مجھے کسی انتہائی اقدام سے باز رہنے کا اشارہ

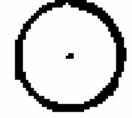
کیا وہ بہرحال سویلین تھے یا پھر کوئی مصلحت ان کے پیشِ نظر رہی ہوگی کیونکہ گن مین پر جو حربہ مَیں آزمانے جا رہا تھا اس سے فوراً یہ بات ثابت ہو جاتی کہ اس کی موت کسی چور اُچکے کے نہیں بلکہ کسی تربیت یافتہ کمانڈو کے ہاتھوں واقع ہوئی ہے جبکہ ہم اپنی موجودگی کا کوئی ثبوت یہاں چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ مَیں نے سر ہلا کر ان کے حکم پر رضامندی کا اظہار کیا۔ کمانڈر بہرکیف کمانڈر ہی ہوتا ہے۔ اسے ہر فیصلہ کافی سوچ سمجھ کر حالات کے تحت کرنا پڑتا ہے مجھے تو یہی بتایا گیا تھا کہ اپنے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو تہس نہس کر دو ورنہ خود تباہ ہو جاؤ گے لیکن انھوں نے مجھ سے زیادہ پڑھائی کی تھی مجھ سے کہیں بڑھ کر تجربہ کار اور جان سے گزرنے والے جیالے ان کی زیرِ کمان یہاں سرگرمِ عمل تھے۔

مَیں دروازے کی اوٹ میں کھڑا گن مین کے برآمد ہونے کا منتظر تھا۔ اس نے لائٹ جلانے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا اور ندیدے بچوّں کی طرح اندھیرے ہی میں ٹارچ روشن کیے مختلف النوع کھانوں پر لوٹ پڑا تھا۔

شاید چھ سات منٹ کے اعصاب شکن انتظار کے بعد وہ باہر نکلا اور دروازہ بغیر آواز پیدا کیے بند کر کے جونہی میری طرف گھوما میرے جسم کی تمام توانائیاں سمٹ کر ہاتھوں میں آگئیں پھر ایک ہاتھ اس کے منہ پر مضبوطی سے جما کر مَیں نے اس کی سانس کی آمد و رفت قریباً منقطع کرتے ہوئے اسے خود سے چمٹا لیا۔ دیوار سے ٹیک لگاتے ہی میرے دوسرے ہاتھ نے شکنجے کی شکل اختیار کرتے ہوئے اس کی کنپٹیوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ گرفتار تڑپا، مچلا لیکن کہاں تک۔ مخصوص رگوں پر پڑنے والے دباؤ نے اسے محض ایک آدھ منٹ ہی میں بے بس کر دیا اور وہ توری کی طرح لہرا کر میرے بازو پر جھک گیا۔ اسپائی ماسٹر ہمارے سر پر پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے کوئی خطرہ مول لینا نہ چاہا اور ٹیپ سے اس کا منہ بند کر دیا۔ مَیں نے اسے کندھے پر اٹھایا اور اسپائی ماسٹر نے آگے بڑھ کر کچن کا



دروازہ کھول دیا۔ ہم نے اسے رائفل سے بے نیاز کرنے کے بعد وہیں استراحت فرمانے کو لٹا دیا اور رائفل لے کر باہر آگئے پھر مَیں نے تو کچن کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی اور سر نے وہ ان لوڈ رائفل ہاتھ اونچا کر کے کچن کی چھت پر رکھ دی۔



"او کے کم آن" انھوں نے تیز سرگوشی کرتے ہوئے سائیلنسر لگا پستول مجھے تھما دیا۔ دروازہ لاک تھا میرے کندھوں پر چڑھ کر ماسٹر نے کھڑکی پر قسمت آزمائی کی اور تھوڑی دیر بعد ہم کھڑکی سے اندر کود گئے۔ یہ ڈرائنگ روم تھا۔ جس میں سے ابھی تک شراب کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ مَیں نے ایک ہاتھ سے پستول تھامے دوسرے ہاتھ سے پنسل ٹارچ روشن کی اور اس کی محدود روشنی میں پورے ڈرائنگ روم کا جائزہ لے لیا۔ ایک کارنس پر رکھا ایک ہار اور کچھ نقدی ہمارے ہاتھ لگی جو مَیں نے اپنی جیبوں میں ٹھونس لی۔ ڈرائنگ روم کے دروازے کے نزدیک پہنچتے ہی ہم نے ٹیلی فون کے تار کاٹ ڈالے اور باہر کوریڈور میں آگئے۔

ہمارے دونوں اطراف کمروں کی قطار تھی۔ ایک کمرے کی کھڑکی سے ہلکی روشنی کے بلب کی جھلک دکھائی پڑی۔ یہاں بھی ہمیں کھڑکی کے ذریعے اندر داخل ہونا پڑا۔ اچانک جیسے ماسٹر کو یاد آگیا۔ انھوں نے اپنی جیکٹ کی ایک جیب سے دو نقاب نکالے۔ اس جیکٹ کی جیب میں سے میرے دیکھتے ہی دیکھتے کئی چیزیں اب تک برآمد ہو چکی تھیں۔ ہم نے نقاب اپنے چہروں پر منڈھ لیے۔ اب سوائے ہماری ناک اور آنکھوں کے باقی سارا چہرہ چھپ چکا تھا ___ یہ ونگ کمانڈر بانلا کی خوابگاہ تھی۔

کمرے میں ہلکی لائٹ کا بلب روشن تھا اور بیڈ پر بانلا اور ایک نوجوان لڑکی اپنے آپ سے بے نیاز بے سدھ لیٹے ہوئے تھے۔ یہ لڑکی اس بڈھے کھوسٹ کی بیوی تو ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ کون تھی وہ؟ یہ سوچنا کیونکہ ہمارے منصوبے کا حصّہ نہیں تھا، اس لیے

میں نے بھی تردد نہ کیا۔

باٹلا کے سرہانے رکھی تپائی پر انگریزی شراب کی ایک قریب الختم بوتل اور دو پیالے رکھے تھے۔ جن میں سے ایک پر لپ اسٹک کے نشان نمایاں تھے۔ ایک کونے میں میز پر ایک بریف کیس دھرا تھا۔ جس سے منسلک ہینڈلاک اس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ اس میں ضرور اہم دستاویزات بند ہیں۔ میں تو سیدھا اسی طرف بڑھ گیا جب کہ اسپائی ماسٹر نے جیب سے اپنا بھیگا رومال نکال کر اسے باٹلا کے منہ پر جما دیا۔ اس نے صرف ایک دفعہ ذرا سی جنبش کی تھی لیکن وہ ماسٹر کی گرفت تھی اپنا اثر دکھا رہی تھی۔

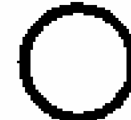
میں بریف کیس اٹھائے ان کے نزدیک آگیا پھر اچانک اگر میں ہوش میں نہ آجاتا تو شاید وہ بنگلہ ہمارا مرگھٹ بن جاتا ——— باٹلا کے مچلنے سے لڑکی کی آنکھ کھل گئی اس نے پٹ پٹا کر آنکھیں کھولیں اور خوف کے مارے چیخ بھی اس کے گلے میں گھٹی رہ گئی۔ انہی چند لمحات سے جو حیرت اور خوف نے اس کی آواز بند کر کے ہمیں مہیّا کیے تھے، فائدہ اٹھا کر میں اپنی جگہ سے اچھلا اور قریباً اڑتا ہوا اس پر آرہا میرا ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا لیکن اس میں نہ جانے اتنی طاقت کہاں سے آگئی کہ وہ مجھ سے زور آزمائی پر تل گئی۔ اس دوران خوف سے اس کی آنکھیں پھٹی پڑتی تھیں۔ کسی عورت پر میں نے زندگی میں اس سے پہلے ہاتھ نہیں اٹھایا تھا ——— اور اسے بھی صرف دفاعی جنگ لڑی تھی میں چند لمحوں کے لیے ذہنی الجھن کا شکار ہو گیا، کہ اس بلا کا کیا کروں ؟ ماسٹر نے یہ بات نوٹ کر لی اور دوسرے ہی لمحے ایک اور رومال اس تڑپتی مچلتی لڑکی کی ناک پر آرہا اور دو تین سانسوں نے ہی اس کے کس بل نکال دیے۔ ہم نے اس سے نمٹتے ہی اسے کانوں میں پہنے ہیرے کے ٹاپس سے بے نیاز کیا۔ اس کے سرہانے رکھے زیورات اٹھا لیے۔ اسپائی ماسٹر نے دونوں کے سرہانوں کے نیچے رکھے بٹوے بھی اڑا لیے اور دوسری میز پر رکھی ونگ کمانڈر باٹلا کی گھڑی بھی اپنی جیب میں ڈال لی۔



باٹلا اور اس کی داشتہ کو ان کے حال پر چھوڑ کر ہم باہر نکل آئے اور دوبارہ اسی راستے سے انہی جھاڑیوں تک پہنچ گئے۔ اسپائی ماسٹر کی پیٹھ پر بندھا نائلن کا تھیلا کھلا اور ہم اپنی پہلے والی حالت کو واپس لوٹ گئے۔ اب ہماری کامیاب مراجعت کا آغاز ہونے والا تھا۔

مجھے ان راستوں کا بالکل علم نہیں تھا۔ اس وقت قریباً ڈیڑھ بج رہا تھا اور ہمیں بمشکل دو اڑھائی گھنٹے کی مزید مہلت نصیب تھی۔ اس کے بعد ان میں سے کوئی نہ کوئی تو ضرور ہوش میں آجاتا زیورات کی ہم نے ایک پوٹلی سی باندھ لی تھی اور بریف کیس اسی نائلن کے تھیلے میں منتقل ہو چکا تھا۔ اب اسپائی ماسٹر آگے آگے تھا اور میں پیچھے پیچھے۔ سائیلنسر اتار کر اب میں نے کپڑوں میں چھپا لیا تھا۔

قریباً ڈیڑھ دو میل چلنے کے بعد ہم ایک نالے پر پہنچ گئے اور زیورات کی پوٹلی سے نجات حاصل کر لی۔ یہیں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اسپائی ماسٹر نے نائیلن کے تھیلے سے بریف کیس نکالا پھر ان کی جیکٹ سے عجیب وغریب اوزار برآمد ہونے لگے اور چند منٹ بعد انھوں نے تالوں کی دوسری سمت سے بریف کیس توڑ کر کھول لیا۔ پنسل ٹارچ کی روشنی میں ہم نے نیلے کاغذات کا جائزہ لیا ——— یہی ہمارا مقصود تھا۔ خوشی سے اسپائی ماسٹر کا چہرہ کھل اٹھا خود میری حالت ناقابلِ بیان تھی۔ محنتیں، ریاضتیں اور مجاہدے راس آجائیں تو ایک انبساط سا اندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔ خصوصاً ان حالات میں جب کبھی ہم "ٹارگٹ ہٹ" کرتے، اندھا کیف وسرور کی ایک کبھی نہ ختم ہونے والی کیفیت ہم پر چھا جاتی تب سارے دکھ تکلیفیں جیسے مٹی میں مل جاتے اور اس بات کا احساس ہی نہ رہتا کہ اب سے تھوڑی دیر پہلے ہم کس عذاب سے گزر رہے تھے۔



صبح صادق کے قریب ہم کلکتہ کے مضافات میں واقع اپنے ایک "سیف ہاؤس" تک

پہنچ چکے تھے جہاں ہمارے ساتھی بلے چینی سے ہمارے منتظر تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جو کل ہمارے لیے رحمت کے فرشتے بن کر نازل ہوئے تھے۔ سب سے پہلے اسپائی ماسٹر نے ان لوگوں کی خیریت ہی دریافت کی تھی۔ جب انھیں "سب اچھا" کی رپورٹ ملی تو ایک سکون بخش مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر آگئی۔

اگلے ہی لمحے ہم دونوں ایک ریڈیو سیٹ کے قریب کھڑے تھے۔ ماسٹر نے خود ہی ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا۔

"گرینڈ... گرینڈ..... دِس از لٹل ماسٹر اوور"

چند ثانیوں تک ہم دونوں ہی ریڈیو پر ٹکٹکی جمائے کھڑے رہے جیسے اس سے کسی معجزے کی توقع ہو لیکن دوسری طرف صرف "شوں شاں شوں شاں" ہی سنائی دے رہی تھی۔ دوبارہ ماسٹر نے ریسیور سوئچ آف کر کے رابطہ قائم کیا "گرینڈ.... گرینڈ... دِس از لٹل ماسٹر اوور" انھوں نے دو تین دفعہ تسلسل سے یہ فقرہ دہرایا تھا۔ اس دفعہ ہماری مراد بر آئی۔

"لٹل ماسٹر.... لٹل ماسٹر... گرینڈ ماسٹر اسٹینڈنگ بائی اوور" میں بلے چینی کا مظاہرہ کرتے قریباً سیٹ پر جھک گیا۔

"گرینڈ ماسٹر ٹارگیٹ ہٹ ہو گیا ہے اوور"

"لٹل ماسٹر۔ فائن۔ مبارک۔ صفر بجے۔ پوائنٹ گرین۔ سگنل فائیو۔ پانیوں سے دوست ابھریں گے۔ میسج ری پیٹ اوور"

"رات صفر بجے... پوائنٹ گرین..... سگنل فائیو.... پانیوں سے دوست ابھریں گے۔ اوور" اسپائی ماسٹر نے پیغام دہرایا۔

"گڈ لک۔ لٹل ماسٹر اوور اینڈ آل"

سلسلہ کٹ گیا۔



ہم باہر آئے جہاں مقامی دوستوں نے ہمارے لیے ناشتہ تیار کر رکھا تھا۔ ناشتے کی میز پر اسپائی ماسٹر اور میرے علاوہ دو اور دوست بھی براجمان تھے جنھیں ناشتے کے دوران ماسٹر نے بنگالی زبان میں بریفنگ کی تھی میرے تو کچھ پلے نہ پڑا۔ وہ شاید نامانوس زبان میں گفتگو ہی اسی لیے کر رہے تھے کہ میں ان کی باتیں نہ سمجھ سکوں پھر ایک ایک کر کے وہ سب لوگ وہاں سے رخصت ہو گئے صرف ایک جوان سیف ہاؤس کی حفاظت کے لیے یہاں رہ گیا۔ یہ مضافاتی علاقے کی ایک الگ تھلگ بستی تھی۔ جہاں مکانات ایک دوسرے سے ہٹ کر بنائے گئے تھے اس جگہ کا انتخاب خصوصی اہمیت کے پیش نظر عمل میں آیا ہوگا کیونکہ یہاں ریڈیو سیٹ رکھا گیا تھا اور بھرے پُرے علاقے میں کہیں بھی ہمارے پیغامات ڈیٹیکٹ ہونے کا خطرہ تھا۔

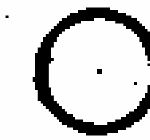
دوسری وجہ یہاں کی حفاظتی لوکیشن تھی۔ یہاں تک آنے کے لیے مین روڈ سے ایک بغلی سڑک کو مُڑنا پڑتا تھا۔ جس کے بعد ایک اور سڑک گھوم کر اس علاقے میں آتی تھی۔ کسی بھی سرچنگ پارٹی یا مشکوک گاڑی کی آمد کا فوراً پتہ چل جاتا تھا۔ اوّل تو وہ مین روڈ سے بغلی سڑک پر اترتے ہی نظر میں آجاتی تھی اگر وہاں سے بھی بچ نکلے تو اگلے موڑ پر، وہاں سے بھی نکل آنے پر بستی میں داخل ہونے والی سڑک پہ تو ان کے بچ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اور یہاں آتے ہوئے میں نے ہر موڑ پہ کہیں کسی کو چائے کا کھوکھا لگائے کہیں کسی کو پان سگریٹ کا خوانچہ سجائے اور کہیں کسی کو چھابڑی فروش کے روپ میں اسپائی ماسٹر کو "او۔کے" رپورٹ دیتے دیکھا تھا۔ یہ ہمارے اپنے لوگ تھے جو جانے کب سے مادرِ وطن کے لیے یہ روپ دھارن کیے بیٹھے تھے، کتنے عظیم تھے وہ لوگ جو اپنے ملک کی آنکھیں بنے دشمن کے قلب میں ان خطرات پر نظریں جمائے بیٹھے تھے جو ان کی دھرتی ماں پر کوئی بھی آنچ لا سکتے تھے۔ یہ گمنام آنکھیں کسی بھی طاغوتی لشکر کی یلغار سے پہلے اپنے لوگوں کو اس کی آمد سے باخبر کر دیتی تھیں۔ وہ دشمن کے منصوبوں کا بروقت پتہ چلا کر اس کے خطرناک

عزائم کا ستیاناس کر دیتے تھے۔

یہ کس قبیلے، کس شہر، کس گاؤں کے کون لوگ تھے۔ انھیں کوئی نہیں جان سکتا کوئی نہیں جان پائے گا۔ ان کی موت پر ان کی فائل کلوز ہو جائے گی۔ ایک تعزیت نامہ ان کے گھر والوں کو ملے گا، نہ کوئی ان پر بین کر کے دل کا خون آنکھوں کے راستے نکال پائے گا۔ نہ ہی ان کی کوئی خبر بنے گی۔ ان کے ماں، باپ، بیوی بچوں کے علاوہ اور کوئی نہیں جان پائے گا کہ وہ کون تھے؟ کہاں گئے؟ کہاں شہید ہوئے؟ کوئی نہیں جان پائے گا۔ کوئی بھی تو نہیں!

ان گمنام شہیدوں اور غازیوں کی عظمتوں کو لاکھوں سلام۔ ان راہوں کی دھول ہمارے لیے سُرمۂ چشم ہے جن سے وہ گزرے۔ جو ان میں سے زندہ ہیں، ہماری دھڑکنیں ان کے نام۔ جو شہید ہو گئے خدا کے مقرّب ٹھہرے۔ ان کے درجات بلند ہوئے، وہ بامُراد ہو گئے۔ ان کی امر یادیں کبھی نہیں مر پائیں گی۔ وہ جیئے تو وطن کے لیے، ان کو شہادت نصیب ہوئی تو وطن کے لیے۔ وہ سب لوگ جنھوں نے انھیں دیکھا، جانا، محسوس کیا وہ ان کی شریانوں میں دوڑتے خون کی طرح ان کے اندر ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

ہائے وہ عالی مرتبت، ذی وقار جیالے جو مرتے ہوئے بھی اپنی پہچان نہ دے پائے کہ ان کے مقدّس سینے رازوں کے امین تھے۔ وہ امانت دار تھے، جان سے گزر گئے لیکن خیانت کے مرتکب نہ ٹھہرے۔



"او کے رنگ مین تھوڑی دیر آرام کر لو۔" اسپائی ماسٹر نے دوستوں کے جاتے ہی مجھے زمین پر لگے ایک بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "لیکن ٹھہرو پہلے لباس تبدیل کر لو۔" انھوں نے ایک کونے میں رکھے عام سے لباس کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور قیمتی سوٹ سے نجات حاصل کر لی۔ یہ دو منزلہ



مکان تھا جس کی نچلی منزل میں ہم نے یہ گورکھ دھندا پھیلا رکھا تھا۔ اوپر کی منزل پر ہمارا واحد ساتھی موجود تھا۔

ونگ کمانڈر باٹلا کے ہاں سے چرائے کاغذات پولی تھین کے ایک محفوظ تھیلے میں پیک ہو کر میرے جسم کا ایک حصّہ بن چکے تھے۔ اب میرے مرنے کے بعد ہی ان کی مجھ سے علاحدگی ممکن تھی۔ یہاں آنے والے ہر ایجنٹ کو چوبیس گھنٹے مسلّح اور اسٹینڈ ٹو رہنے کا حکم تھا کیونکہ یہ خاصی حساس جگہ تھی اور کسی بھی لمحے کچھ بھی ظہور پذیر ہو سکتا تھا۔

ہر قسم کی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ان لوگوں نے منصوبہ بندی پہلے ہی سے کر رکھی تھی۔ جب اسپائی ماسٹر نے مجھے مختلف کونوں میں لگے ڈیٹونیٹروں کی پوزیشن سے آگاہ کیا اور بتایا کہ اچانک درپیش خطرے کی صورت میں کہاں کہاں تار منسلک کرنے ہیں تو میں ان کے اس حفاظتی نظام پر عش عش کر اٹھا۔ یہاں قیام کرنے والے کو سب سے پہلے غالباً یہ لوگ ممکنہ خطرات اور ان کے تدارک کے لیے بروئے کار لائی جانے والی تدابیر ہی سے آگاہ کرتے تھے۔ میں نے یہاں کی خصوصی اہمیت کے پیشِ نظر پستول اپنے پاس رکھنا ضروری خیال کیا اور پھر تمام خطرات کو ذہن سے جھٹک کر خود کو نیند کی دیوی کی آغوش میں دے دیا جو کب سے میری سمت امید بھری نظریں جمائے، اپنی بانہیں پھیلائے کھڑی تھی۔

جب شعور کی بند آنکھوں نے لاشعور کی اندھی پگڈنڈیوں پر دھکیلا تو میں لڑھکتا ہُوا ان جہانوں میں پہنچ گیا جہاں پل بھر کے لیے سہی، بہرحال میرے لیے امان تھی۔ اکثر زندگی کے صحرائے گوبی کا وہ نخلستان تھی جہاں درماندہ اور پیاس سے بے حال قافلے رک کر ستایا کرتے ہیں۔ اس جائے پناہ تک پہنچ جانے والے راہروِ سفر کی تمام کلفتوں، ابعد کو پیش آنے والے تمام عذابوں کو بھلا کر صرف اور صرف ان غنیمت لمحوں سے طمانیّت حاصل کرنا چاہتے ہیں جو خوش بختی سے انھیں میسّر آ جاتے ہیں۔ میری حالت کسی ایسے ہی مسافر جیسی

تھی جس کا مشکیزہ عین صحرا کے درمیان پہنچ کر خالی ہو گیا ہو اور جس کے اونٹ اسے اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئے ہوں۔ جو کچھ آنکھوں سے دیکھ لیا تھا، کانوں سے سُن لیا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محسوس کر لیا تھا، اس آگہی کے عذاب نے مجھے منتشر کر دیا تھا۔ میرے اندر شکست و ریخت کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ یہ میرا ہی نہیں مجھ جیسے تمام دردمندوں کا المیہ تھا۔

ہم بہر حال انسان تھے، آنکھیں بند کر کے کب تک سہانے سپنوں میں کھوئے رہتے۔ حقائق سے فرار بھی ایک حد تک ممکن تھا اور اب ہم اس حد سے گزر چکے تھے۔ اب تو تلخ حقیقتوں کے سیاہ ناگ ہمارے گرداگرد اپنی زہریلی پھنکاریں بکھیر رہے تھے اور ہمیں اس کسیلی سچائی کا سامنا کرنا تھا کہ بنا اس کے نجات کی راہ نہیں تھی۔

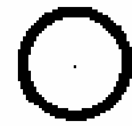
مَیں نے بڑے بڑے جیالے جرنیلوں کو جن کے سینے بہادری کے تمغوں سے بھرے پڑے تھے، تنہائی میں رو رو کر خدا کے حضور پیشانیاں رگڑتے دیکھا تھا۔ وہ بارگاہِ ایزدی میں بچّوں کی طرح سسکیاں لے کر التجائیں کرتے تھے کہ الٰہی یہ دن دیکھنا بھی ہمارا ہی مقدر تھا.....

پرائے دشمن کا وار سہنے کا بھی ایک اپنا لطف ہے۔ جب کوئی فوجی جوان اکیلا دس دشمنوں سے دست بدست جنگ میں جُت جائے تو جسم پر لگنے والی ہر سنگین اس کے غضب کو بڑھاتی ہے، بزدلی کی طرف مائل نہیں کرتی۔ وہ خون جو مادرِ وطن کی ہریالی کے لیے بہے، ارجمندوں کا خون ہوتا ہے۔ دشمن سے لڑنا مرنا ہمارا صرف پیشہ ہی نہیں، عشق بھی تھا۔ وہ جن کے سینے دشمن کی گولیوں سے چھلنی ہوئے، انھوں نے مسکرا کر جان جانِ آفریں کو سونپی، انھوں نے جہاں رزم گاہِ حق و باطل دیکھی، بڑھ چڑھ کر شہادت کی ہر صدا پر لبیک کہا صرف اس لیے کہ وہ سرخرو ہوئے۔ سرفراز ہوئے ——— لیکن ——— جب اچانک گھات میں لگے کسی اپنے کے ہاتھوں فائر ہونے والے لانچر نے کسی مجاہد کی جان لی تو کوئی ہے کہ کرب



کی اُن گھڑیوں کا اندازہ کر سکے کہ کتنا اندوہناک و دردناک ہوتا تھا وہ۔ دو بالشت کی کسی مکتی باہنی کی چلائی گولی جب کسی چھ فٹ کے کڑیل جوان کے بازو میں گھُس جاتی تو اس کی روحانی موت تو وہیں واقع ہو جاتی تھی۔ مَیں نے فیلڈ اسپتالوں میں وہ شیر دل جیالے ذہنی عذاب بھگتتے دیکھے تھے جو کسی بھی مرحلے پہ کسی بھی حالت میں دشمن کا منہ توڑنے کی ہمت رکھتے تھے، جنھیں بھوکے پیاسے رہ کر لمبی مدت تک لڑنے کا تجربہ حاصل تھا، جن کے چہروں سے موت بھی ہریالی نہ چھین سکی لیکن جواب پژمردہ چہرے لیے بادلِ نخواستہ غداروں سے جنگ میں مصروف تھے۔

عزم کی آہنی چٹانیں تڑخنے لگی تھیں۔ سربلند جذبے ڈگمگا رہے تھے انھیں اگر کوئی شے سرگرم رکھے ہوئے تھی تو صرف یہ کہ یہ زمین ان کی تھی۔ یہاں کی فضائیں، یہاں کے موسم، یہاں کے دریا، پہاڑ، کھیت، فصلیں سب کچھ ان کا تھا اور جیتے جی وہ اپنا یہ سب کچھ دشمن کو دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ مَیں بھی انہی میں سے ایک تھا۔ انہی کی طرح لڑنے مرنے والا، احساسات رکھنے والا لیکن اس معاملے میں اس حد تک خوش قسمت ضرور تھا کہ آئنسہ کی شکل میں مجھے محبت کی وہ سلیپنگ پِلز میسّر تھی کہ جب آگہی کا پھنکارتا عذاب مجھے ذہنی پٹخنیاں دینے لگتا تو مَیں چند منٹ ہی کے لیے سہی آئنسہ کی خوشگوار یادوں کے دامن میں پناہ لے لیتا۔



شاید دن کے بارہ ایک بجے کا وقت تھا۔ جب مَیں اچانک ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ باہر بادل گرج رہے تھے صبح مَیں نے کچھ آوارہ سی بدلیوں کے ٹکڑے ضرور آسمان پر منڈلاتے دیکھے تھے لیکن اب تو بادلوں نے رات کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی بے اختیار میرا ہاتھ سرہانے رکھے پستول پر پڑا۔ پہلے تو مَیں نے یہی سمجھا کہ شاید بادل گرجنے کی آواز سے میری آنکھ کھلی ہے لیکن میرے کندھے پر اسپائی ماسٹر کا ہاتھ تھا اور انھوں نے مجھے

جھنجوڑ کر بیدار کیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے صورتحال میری سمجھ میں آ گئی کیونکہ ہمارا تیسرا ساتھی اسٹین گن اور گولیوں کا بھرا تھیلا سنبھالتا تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"جلدی کھیل ختم کر کے باہر نکلو۔" اسپائی ماسٹر نے مجھے حکم دیا اور میں اپنے کام میں جُت گیا ساتھیوں نے کوڈ بک" اپنی جیب میں اڑس لی تھی اور وہاں موجود ہر ایسی چیز جس سے ہماری کوئی بھی پہچان ممکن ہو سکتی، کمرے کے وسط میں ڈھیر کرنے لگے۔ میں نے ڈیٹونٹر اس طرح فکس کر دیے تھے کہ دروازہ کھولتے ہی مکان اپنی تمام اشیا اور حملہ آوروں سمیت بھک سے اڑ جاتا۔ اس سارے عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے کے لیے شاید صرف دو منٹ اس لیے لگے تھے کہ یہاں ایک ترتیب اور تنظیم کارفرما تھی۔ میں تو تربیت یافتہ کمانڈو تھا ہی جسے ایسے حالات سے نمٹنے کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے لیکن اسپائی ماسٹر بھی منجھے ہوئے جرنیل کی طرح تمام حالات کو کنٹرول کیے ہوئے تھے۔ ورنہ تو ایسے مواقع پر بڑے بڑے جی داروں کا پتہ پانی ہونے لگتا تھا۔ ہاتھ پیر پھول جاتے ہیں اور اچھا بھلا کام بھی غلط ہو کر باعثِ مصیبت بن جاتا ہے۔

انھوں نے ایمرجنسی سے نمٹنے کے لیے جو شاندار پلاننگ کر رکھی تھی اسے دیکھ کر یہی گمان گزرا تھا کہ ہم کسی جاسوسی اڈے پر نہیں بلکہ آرمی کے ہیڈ کوارٹر میں بیٹھے ہیں۔ شاید کسی مقامی مخبر کو شک ہُوا تھا اور اس نے رپورٹ کر دی تھی۔ ویسے بھی ان دنوں آکاش وانی اپنے پروگراموں میں گاہے بگاہے ایسے اعلانات دہراتی رہتی تھی کہ پاکستانی گھس بیٹھیے اور جاسوس بھارت میں دَر آئے ہیں اگر آپ کو کسی پر شک گزرے تو فوراً انتظامیہ کے قریبی اڈے کو مطلع کر دیں اور اس کا زیادہ اثر یہی ہوا تھا کہ لوگوں نے نمبر بنانے کے چکّر میں اکثر پاگلوں کو جاسوس سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ جہاں کوئی ایسا مشتبہ پاگل ان کے ہتھے چڑھتا، پہلے وہ مار مار کر اس کا خود بھرکس نکالتے پھر پولیس یا فوج کے حوالے



کر دیتے ان دنوں سارے بھارت کے سی آئی ڈی کے تفتیشی مراکز انہی پاگلوں سے بھرے پڑے تھے۔ ایسا واقعہ شاذ ہی کبھی سننے یا دیکھنے کو ملا تھا کہ کوئی "اصلی گھس بیٹھیا" جنتا کی کوشش سے گرفتار ہو گیا ہو۔

ہم نے لمبی لمبی برساتیاں اوڑھ رکھی تھیں جنھوں نے ہمارے لباس کو بھی چھپا لیا تھا۔ ابھی بمشکل چند گز دُور ہی پہنچے تھے جب اچانک تیز بارش نے ہمیں آ لیا۔ یہ غیبی مدد کا اشارہ تھا جو مجھے ہر دفعہ کسی نہ کسی صورت مل جاتا اور میرے حوصلے دوچند ہو جاتے۔ بارش کی شدت کے ساتھ ہماری رفتار میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا میں اب تصور کی آنکھ سے پولیس یا فوج کی بے بسی کا نظارہ کر رہا تھا۔

وہ لوگ بھاگم بھاگ اس طرف آ رہے ہوں گے جہاں موت ان کی راہ میں آنکھیں بچھائے منتظر تھی۔ خیریت یہ گزری کہ ہمیں بستی سے باہر آنے تک کسی مقامی شخص سے واسطہ نہ پڑا۔ شدید بارش نے سب کو دبک جانے پر مجبور کر دیا تھا اور سب لوگ آنے والے طوفان کی ہولناکیوں سے بے خبر اپنے گھروں میں چھپے بارش کا نظارہ کر رہے تھے بستی کی آخری حد پر ہم نے چند منٹ کے لیے رک کر ایک بڑے درخت کے نیچے پناہ لی تھی۔ اسپائی ماسٹر کی جیب سے ایک ننھا سا ٹرانسیٹر برآمد ہوا۔ انھوں نے بنگالی زبان ہی میں کسی کو کچھ احکامات دیے تھے اور ابھی انھوں نے سیٹ بند کر کے بمشکل دوبارہ جیب میں رکھا ہی تھا جب ہمارے عقب میں تباہی مچ گئی۔ پہلا دھماکا اتنا زوردار تھا کہ بستی کے کئی مکانوں کی بنیادیں بھی لرز اٹھی ہوں گی۔ یہ اس ڈائنامیٹ کا کمال تھا جو پہلے ہی سے یہاں نصب کیا گیا تھا اور جس سے منسلک کئی تاروں میں سے کسی ایک کو بھی معمولی سا جھٹکا لگ جانے پر اس نے پھٹنا تھا۔

پولیس کے جوانوں نے پہلے تو دروازے پر زور آزمائی کی ہو گی پھر وہ اپنی دانست میں چارج کرتے اندر گھس آئے ہوں گے اور جیسے ہی دروازے کے پیچھے لگے یا

کھڑکیوں کے ساتھ منسلک تار کو ہلکا سا جھٹکا لگا اس نے اپنا کام دکھا دیا۔ اب وہاں سوائے خس و خاشاک کے ڈھیر یا پھر ان بدنصیب سپاہیوں کی لاشوں کے کچھ نہیں رہا تھا جو کسی کارنامے کی اُمید پر وہاں گئے تھے۔ اس کے بعد دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ وہ ٹائم بم تھے جو جگہ جگہ چھپائے گئے تھے تاکہ ڈائنامیٹ سسٹم فیل ہونے کی صورت میں اس کے متبادل کے طور پر کام شروع کر دیں۔ ہمارا سفر دھماکوں کی پس پردہ موسیقی میں جاری رہا اور جب دو ڈھائی گھنٹے کے بعد مختلف کھیتوں، پگڈنڈیوں، سڑکوں، ندی نالوں سے گزر کر ہم ایک بڑی سڑک کے نزدیک پہنچے تو بارش ختم ہو چکی تھی۔

ایک خالی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر ہم نے روکا اور شہر کے ایک بارونق چوک میں اُتر گئے برساتیاں تہہ کر کے ہم نے اپنے بازوؤں پر پھیلا لی تھیں۔ اس بارونق چوک سے ماسٹر نے اتنے چکر مجھے دیئے تھے کہ میں تو کیا کوئی کمپیوٹر بھی ہوتا تو ان راستوں کو اپنے ذہن میں محفوظ نہ رکھ سکتا۔ میری حیرت تو دوچند اس وقت ہوئی جب ایک جگہ سے فون کرنے کے بعد دو تین ایسی ہی بارونق گلیاں گھما کر ماسٹر مجھے ایک اسٹور پر لے آئے۔ یہ پاٹل کا وہی جنرل اسٹور تھا۔ جہاں میں اس سے پہلے بھی آ چکا تھا۔

پاٹل کے کمرے میں پہنچنے تک ہمیں گاہکوں کی بھیڑ میں سے گزر کر جانا پڑا۔ میں نے اور ماسٹر نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ لوگ ہماری طرف زیادہ توجہ نہ کریں اور کسی حد تک ہم اس میں کامیاب بھی رہے۔ پاٹل اپنی آرام دہ کرسی پر فون سامنے رکھے شاید ہمارا ہی منتظر تھا۔ اس نے ہمیں اُٹھ کر تعظیم دی۔

میں تو ٹائلٹ میں جا گھسا۔ جہاں تازہ پانی اور نئے کپڑوں کا جوڑا میرے منتظر تھے۔ جبکہ سر نے ٹیلیفون سنبھال لیا۔ غالباً وہ ہمارے بعد کے حالات کی جانکاری حاصل کر رہے تھے۔

دنیا بھر کے انٹیلی جنس محکموں کا طریق کار یہی ہے کہ وہ کبھی اپنے "بگ ماسٹرز" کو



داؤ پر نہیں لگاتے اور کسی بھی ایریا میں کام کرتے ایجنٹوں پر متمکن اسپائی ماسٹر اوّل تو کبھی اسکرین پر آتا ہی نہیں اور اگر آ بھی جائے تو کبھی حالات کی معمولی سی بگڑتی نوعیت دیکھ کر ہی وہ غائب ہو جاتا ہے کیونکہ ایک ماسٹر کی زندگی بہرحال بہت سے ایجنٹوں سے زیادہ قیمتی اور قابل قدر ہوتی ہے لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ پچھلے دو روز سے ماسٹر میرے ساتھ تھے اور ہم نے مل کر ٹارگٹ ہٹ کیا تھا جو میری اطلاع کی حد تک بالکل انوکھی بات تھی کیونکہ دُنیا بھر میں اسپائی ماسٹر صرف پس پردہ رہ کر ہی کمانڈ کرتے ہیں عملی طور پر میدان میں ہرگز نہیں اترتے۔ انھیں اپنے ہر ایجنٹ سے اتنی ہی محبت تھی جتنی کسی کو بھی اپنی جان سے ہو سکتی ہے۔ میں نے اب تک یہی بات خصوصی طور پر نوٹ کی تھی کہ وہ ہمیشہ خود سے زیادہ اپنے ساتھیوں کے متعلق فکرمند رہتے تھے جس کا سب سے بڑا ثبوت یہی تھا کہ یہاں بھی آتے ہی انھوں نے فون سنبھال لیا تھا اور اپنے ساتھیوں کی خیریت دریافت کی تھی۔

طبیعت کی ساری کسلمندی تو تھوڑی دیر پہلے ہونے والے ہنگامے ہی نے دُور کر دی تھی لیکن نہا کر تو میں خود کو بالکل تازہ دم محسوس کرنے لگا تھا۔ باہر نکلنے پر کافی کے گرما گرم کپ سے پاٹل نے میری تواضع کی۔ ماسٹر اب ٹائیلٹ میں جا گھسے تھے۔ ان کے باہر آتے ہی پاٹل نے باہر موجود چوکیدار کو اندر بلا کر کچھ ہدایات دیں اور کیبن کا دروازہ اندر سے لاک کر کے شیشوں کے سامنے پردے تان دیئے صرف ایک شیشہ اس کے سامنے والا ایسا ضرور تھا جو "بے پردہ" رہا کیونکہ یہ خاص قسم کا شیشہ تھا۔ جس میں سے اندر بیٹھے لوگ نظر نہیں آتے تھے جبکہ اندر والا باہر بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

دروازہ لاک ہوتے ہی ایک سفید چادر پاٹل کی میز کی دراز سے برآمد ہوئی۔ اس نے خود ہی چادر بچھائی تھی اور ماسٹر نے نماز کی نیّت باندھ لی ——— !

بھلا ایسے لوگوں کو کوئی جیت سکتا ہے ؟

میں نے بھی وہ گھڑیاں غنیمت جانیں اور ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ خدا کے دربار میں پہنچتے ہی پھر زخم کھلنے لگے۔ سچ ہے مسیحا سامنے ہو تو مریض کے لبا اوقات بھولے بسرے زخم بھی تازہ ہونے لگتے ہیں۔ دعا کو ہاتھ اٹھے تو اٹھے ہی رہ گئے۔ دل و دماغ نے زبان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ ایک گولہ سا حلق کے بیچ اٹک کر رہ گیا کچھ کہنا چاہا اور کہہ نہ پایا بس آنسو تھے کہ دل کا خون ان کے راستے بہہ بہہ کر گناہوں کے دھبے دھو رہا تھا۔

ہمیں خود سے ندامت تھی۔ یہ ہمارے کرموں کا پھل تھا جو ہم چکھ رہے تھے۔ یہ ہماری کرنی تھی جسے ہمی نے بھرنا تھا۔ یہ نفرتوں کی فصل جس کسی نے بھی بوئی، بہر حال ہم نے اسے کاٹنا تھا۔ التجائیں نوکِ زبان پر آ آ کر پھسل جاتیں۔ ضمیر کہتا، کس منہ سے خدا کے حضور کچھ مانگنے کا حوصلہ کر رہے ہو؟ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر جھانکو تم نے کیا نہیں کیا؟

تم نے خود کو پاکستانی سے زیادہ بنگالی، بہاری، پٹھان، پنجابی، سندھی اور بلوچی سمجھا۔۔۔۔ تم صوبائی تعصب میں اس حد تک ڈوبے کہ خود کو وہیں تک محدود کر لیا۔ مٹی پر صرف اپنا حق جتانے لگے۔ تمھیں اس بات سے بھی تکلیف پہنچتی تھی کہ تمھارے حصے سے بچ جانے والا فالتو نوالا تمھارے بھوکے اور مستحق بھائی کے منہ میں کیوں جا رہا ہے۔

تمھارے کرودھا تنے بڑھ گئے کہ تم اپنے درختوں کی چھایا میں بھی دوسرے کو پناہ لینے سے منع کرنے لگے۔

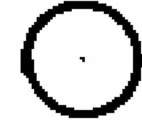
تم نے سب کچھ بھلا کر، صرف اور صرف۔۔۔۔ اپنے حقوق کی رٹ لگانی شروع کر دی اور فرائض کا لفظ تمھاری خود ساختہ ذہنی ڈکشنری سے یوں نکالا جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔

کیسے کیسے گھناؤنے نعروں کو تمھارے متعصب ذہنوں نے تمھاری سیاہ زبانوں کے راستے اگلا۔

تم نے پانی کے مسئلے کو، زبان کے مسئلے کو اپنی آن کا مسئلہ بنا لیا۔



اب بھگتو، اپنے کیے کی سزا بھگتو۔۔۔۔ بدنصیبو اب بھَصا دے کے آنسو کیوں بہاتے ہو۔ نہیں یہ مگر مچھ کا رونا ہے۔ ایسے رونے سے رحمتِ باری تعالیٰ جوش میں نہیں آئے گی۔ تب ایک ہی صدا روئیں روئیں سے بلند ہوتی۔ مولا رحم کر۔ رحم کر۔ ہم سے یوں منہ نہ موڑ۔ ہم لاکھ خطا کار سہی۔ آخر کو تیرے محبوبؐ کی امت ہیں۔ تیرے ماننے والے ہیں تیرے مقدس نام پر حاصل کیے ہوئے ملک کے باسی ہیں۔ پر در تو بہ تھا کہ وا ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ عبادت کے سکون سے کس کافر کو انکار ہے لیکن کچھ نمازیں زندگی میں ایسی پڑھی جاتی ہیں جو ذہن پر نقش ہو کر رہ جائیں وہ جو کسی نے نمازِ عشق کی ادائیگی تلواروں کے سائے میں بیان کی تھی، تو ٹھیک ہی کہا تھا۔ واقعی میدانِ جہاد میں کی گئی بندگی کا لطف کچھ اور ہی ہوتا ہے۔



نماز سے فارغ ہوا تو مجھے اپنا وجود ہلکا ہو کر ہوا میں اڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ سر کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ روحانی سکون کے جو مدارج طے کر رہے تھے، وہ کچھ انہی کا حصہ تھا۔ پاٹل پر بھی میں نے پہلی مرتبہ ایک مقدس سنجیدگی طاری دیکھی تھی۔ وہ آج تک مجھے ہنستا مسکراتا ہی نظر آیا تھا لیکن اب کھویا کھویا دکھائی پڑتا تھا۔ شاید وہ بھی میری طرح اسی جذباتی کیفیت کا شکار رہا ہو۔ جس سے مجھے اکثر سابقہ رہتا تھا۔

"بقیہ وقت ہم یہیں گزاریں گے۔" ماسٹر نے جائے نماز سمیٹتے ہوئے پاٹل سے کہا۔

"رائٹ سر" کہہ کر پاٹل وہاں سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔

میں نے ایک کونے میں رکھا انگریزی اخبار اٹھا لیا جبکہ ماسٹر نے ریڈیو کی خبروں ۔ل بہلانا چاہا لیکن جہاں کہیں آکاش وانی کے کسی سٹیشن پر سوئی ٹھہرتی جھوٹ اور کذب تر اکا طوفان سا باہر کو لپکتا۔ مجبور ہو کر انہوں نے ریڈیو بند کر دیا اور وہاں رکھے ۔ے رسائل میں سے ایک کا انتخاب کر کے اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔

پاٹل کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد چوکیدار کے ہمراہ ہوئی تھی جو اپنے ہاتھوں پر کھانے کی ٹرے اٹھائے اندر آ رہا تھا۔

یہاں ضرورت کی تقریباً ہر شے موجود تھی۔ چوکیدار نے خود ہی ایک الماری سے برتن نکال کر میز پر سجائے اور ہم کھانے میں مصروف ہو گئے۔ ماسٹر کی گہری آنکھیں سوچوں کی غماز تھیں وہ بظاہر تو ہمارے ساتھ کھانا کھا رہے تھے لیکن ان کا ذہن کہیں اور تھا لیکن —— اسپائی ماسٹر ہی پر کیا موقوف، وہاں تو ہم تینوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔

"میرا خیال ہے اب آپ دونوں صاحبان یہاں واپس ہی آ جائیں تو بہتر ہوگا، ہمیں بہرحال ایک سنجیدہ مسئلے پر بات کرنا ہے۔" انھوں نے کھانا ختم کر کے ہمیں مخاطب کیا۔

جواب میں کم از کم مَیں نے تو زبردستی دانت نکالنے پر اکتفا کیا تھا لیکن پاٹل مجھ سے زیادہ بہادر نکلا اس نے باقاعدہ ہلکا سا قہقہہ بھی لگایا تھا۔

پاٹل کے گھنٹی بجانے پر وہی چوکیدار اندر داخل ہوا اور برتن سمیٹ کر باہر چلا گیا۔ چند منٹ بعد ہی ہم لوگ قہوے کی پیالیاں سامنے رکھے آنے والے حالات کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

"رات کو بارہ بجے تمھیں آبدوز لینے آئے گی۔ وہاں تک پاٹل تمھارے ساتھ جائے گا۔" اسپائی ماسٹر نے مجھے جدائی کا سندیس دیا۔ پھر انھوں نے پاٹل کو خطرے کی صورت میں اٹھائے جانے والے اقدامات سے متعلق مقامی کوڈ ورڈز میں ہدایات دیں۔ میرے پلے خاک بھی نہیں پڑ رہا تھا، وہ صرف وہی بات انگریزی یا اُردو میں کرتے تھے۔ جس کا جاننا میرے لیے ضروری ہوتا۔ مقامی انتظام و انصرام سے متعلق کوئی بات بھی وہ بنگالی یا کوڈ ورڈز میں کرتے تھے۔ شام کے تقریباً پانچ بجے تک اسپائی ماسٹر ہمارے ساتھ رہے پھر شاید وہ ٹیلیفون آ گیا جس کے وہ منتظر تھے اور انھوں نے ہم سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا۔

میرے دل کو ایک جھٹکا سا لگا کیسے کیسے لوگ تھے جن سے راہ و رسم رہی، پچھلے



دو دن کی ملاقات نے میرے دل میں ان سے متعلق محبّت کے وہ جذبات پیدا کر دیے تھے کہ اب ان سے الگ ہونا بھی مصیبت دکھائی دیتا تھا۔

"لو اب تم آج یہاں سے چلے جاؤ گے۔ پھر تمھیں کہاں جانا ہے، اس کا مجھے بھی اتنا ہی علم ہے جتنا تمھیں۔ تم اس لحاظ سے خوش قسمت ہو کہ اپنی زمین پر ہر وقت تمھیں دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کے مواقع نصیب ہیں۔ ہمارا بزنس ذرا الگ قسم کا ہے۔ یہاں بہادر وہ ہے جو ڈاج دے کر بھاگ سکے۔ ہم دشمن سے ٹکرانے کی حسرت ہی دل میں لے کر رہ جاتے ہیں۔ خدا نے اگر یہ موقع دیا ہے تو اس سے خوب خوب فائدہ اٹھا لو کہ خوش بختی ہمیشہ کسی کا مقدر نہیں رہتی۔ تم نوجوان ہو۔ ممکن ہے کبھی جذباتی بھی ہو جاتے ہو لیکن سوچنا سپاہیوں کا نہیں سیاستدانوں کا کام ہے۔ تمھیں صرف لڑنا ہے نتائج سے بے پروا ہو کر دشمن سے ٹکرا جاؤ۔ اسے بتا دو کہ ہمارا خون اعلیٰ ہے۔" میرے سامنے کھڑے ہو کر انھوں نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر مجھے الوداعی پیغام دیا۔

مَیں نے اس کے بعد ان کا یہ سبق نہ بھلایا اور آخر دم تک نتائج سے بے پروا ہو کر لڑتا رہا۔ ایسے عظیم لوگ شاہراہِ حیات کے جانگسل سفر میں کبھی کبھی کسی موڑ پر خوش بختی سے نصیب ہوتے ہیں اور چند لمحوں ہی کے لیے سہی، اپنی امر یادیں دے کر رخصت ہو جاتے ہیں۔

انھوں نے مجھے ایسی بات بتائی تھی جس کا گیان شاید مَیں اپنے طور پہ کبھی حاصل نہ کر پاتا۔ پچھلے دو ماہ سے جس ذہنی کشمکش میں گرفتار تھا۔ اس سے دو منٹ میں انھوں نے مجھے نکال باہر کیا واقعی فوجی نتائج سے بے پروا ہو کر لڑتا ہے۔

مَیں انھیں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کچھ نہ کہہ پایا۔ شاید دُنیا میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کا اس سے بڑھ کر اور کوئی ذریعہ نہیں ہوتا کہ لفظ احساس بن کر چہرے پر پھیل جائیں۔

"گڈ لک مائی بوائے ۔۔۔ فی امان اللہ" انھوں نے مجھے سینے سے لگا کر الگ کیا اور میری طرف دیکھے بغیر ٹائیلٹ میں چلے گئے جہاں سے باہر نکلنے کا بغلی دروازہ ان کا منتظر تھا۔ پاٹل ان کے پیچھے ہی رہ گیا تھا۔ شاید انھیں باہر بھیج کر اس نے وہ دروازہ دوبارہ لاک کرنا تھا۔

یہ سارے "سر" بس ایسے ہی ہوتے ہیں۔ پہلے دوسروں سے محبت کرتے ہیں پھر انھیں خود سے محبت کرنے کی سزا دے کر کسی روز چپ چاپ الگ ہو جاتے ہیں۔



# بحری عقابوں میں

پاٹل نے واپس آ کر شام کے کچھ تازہ اخبارات میرے لیے منگوائے اور مجھے تھوڑی دیر بعد واپس آنے کا کہہ کر باہر نکل گیا۔ شاید وہ اپنے انتظامات کا جائزہ لینے گیا تھا۔ میں نے اخبارات سامنے پھیلا دیے یہ ذرا "سنسنی خیز" خبریں شائع کرنے والے اخبارات تھے۔ قریباً سبھی کی چیختی چلاتی سرخیاں مضافاتی بستی کے اس دھماکے کے متعلق تھیں۔ جس میں پولیس کے سات کرمچاری مارے گئے تھے اور ارد گرد کئی مقامات کو نقصان بھی پہنچا تھا یا پھر مکتی باہنی کے جعلی "بہادری کے کارنامے" تھے اور پاکستانی افواج کے متعلق فرسودہ اور گھڑے گھڑائے ظلم و ستم کی کہانیاں۔ ایک بات پر البتہ مجھے ضرور حیرت تھی کہ ونگ کمانڈر باٹلا کے ہاں ہونے والی چوری یا ڈاکے کے متعلق معمولی سی خبر بھی کسی اخبار میں نہیں چھپی تھی۔

خاصے ہشیار لوگ تھے وہ! اپنی دانست میں انھوں نے بغیر تشہیر کیے ڈاکوؤں کو قابو کرنے کا فیصلہ کیا تھا ۔۔۔۔۔۔ میں دل ہی دل میں اُن کی بے بسی پر مسکراتا رہا خدا شاہد ہے اگر ہمارا مقابلہ صرف بھارتی افواج یا انٹیلی جنس سے تھا تو ہم نے انھیں ناکوں چنے چبوا دیے تھے لیکن گھر کے وہ تمام بھیدی جن میں سے ہر ایک باون گز کا تھا خود ہی لنکا ڈھانے پر تلے ہوئے تھے۔ اس لیے ہمیں ان راولتوں کو سنبھالنا خاصا مشکل دکھائی پڑتا تھا۔

یہاں بیٹھے بٹھائے اب میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ گو کہ پاٹل نے اس سلسلے میں کوئی

خاص ہدایات نہیں دی تھیں لیکن میں نے کیبن کا دروازہ کھولا اور ٹہلتا ہوا اسٹور سے باہر آگیا۔ یہاں سے چند گز کے فاصلے پر میں نے ایک پان سگریٹ کا کھوکھا دیکھا تھا۔ وہیں سے عیاشی کے لیے ایک میٹھا پان خرید کر منہ میں رکھ لیا اور اسٹور کے سامنے ہی چہل قدمی کرنے لگا۔

—— ابھی مجھے باہر نکلے بمشکل چند منٹ ہی گزرے جب اپنی غلطی کا احساس بھی ہو گیا؛ سامنے سے گزرتی کاروں کی لمبی قطار میں سے ایک کار میں مجھے اوما کی شکل دکھائی پڑی۔ وہ خود ہی کار ڈرائیو کرتی جارہی تھی۔ خدا جانے اس نے مجھے دیکھا بھی تھا یا صرف میرا وہم ہی تھا کیونکہ تھوڑی دور جا کر میں نے اسے گاڑی سڑک کے ساتھ ساتھ پارک کرتے دیکھا لیکن اب مجھے عقل آ گئی تھی۔ میں الٹے قدموں اسٹور میں داخل ہوا اور سیدھا کیبن میں جا گھسا بطور احتیاط میں نے سارے پردے گرا دیے تھے اور دروازہ بھی اندر سے لاک کر دیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے اچانک یوں دکھائی دینے سے میں کچھ بوکھلا سا گیا تھا۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے دو، تین منٹ ہی ہوئے تھے کہ سامنے رکھے ٹیلیفون نے ٹرانا شروع کر دیا پہلے تو میں نے اسے بجنے دیا لیکن جب کسی طرح گھنٹی خاموش ہونے میں نہ آئی تو مجھے بادل نخواستہ ریسیور اٹھانا پڑا۔

"ہیلو۔" میں نے آواز بالکل بدل کر کہا۔

"پاٹل بول رہا ہوں مہاشے جی! خیر سے واپسی ہو گئی۔" دوسری طرف سے آنے والی آواز نے مجھے سکون بخشا اور میری ہنسی نکل گئی لیکن اس بات کا احساس بھی ہو گیا کہ یہاں بھی پُراسرار آنکھیں میری نگرانی کر رہی تھیں۔

"ہاں یار ہو گئی واپسی، لیکن بوریت کی بھی تو حد ہوتی ہے۔" میں نے سہارا لینا چاہا۔

"بوریت کا علم تو جناب کو تب ہوتا۔ جب وہ کار سے اتر کر سڑک پر آپ سے بغلگیر ہو جاتی۔" خدا کی پناہ کتنے خبردار لوگ تھے وہ۔ شاید اسٹور سے باہر نکلتے ہی میرا تعاقب

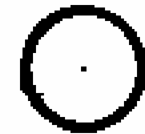


شروع ہو گیا تھا۔

"ونڈرفل" میں نے بے اختیار کہا۔

"شکریہ لیکن اب یہیں تشریف رکھیں تو مہربانی ہوگی اگر دل نہ بہلے تو چوکیدار کو اندر اکر اپنی ضرورت سے آگاہ فرمادیں۔"

میں جواب میں ہنس دیا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔



پاٹل قریباً رات کے آٹھ بجے واپس آیا۔ اس نے کیبن میں داخل ہوتے ہی ایک شناختی کارڈ میری طرف بڑھا دیا۔ اس پر میری تصویر لگی تھی اور مجھے خفیہ پولیس کا سب انسپکٹر نایا گیا تھا جس کی اسپیشل ڈیوٹی لگائی جاتی ہے۔ میں حیرت اور تحسین کے ملے جلے جذبات لیے س کا منہ دیکھنے کا دیکھتا ہی رہ گیا۔

یہ دراصل وہ تصویر تھی جو میری آمد سے پہلے ہی میری پہچان کے لیے مقامی دوستوں کو پہنچائی گئی تھی اور اب ایک سرکاری محکمے کے شناختی کارڈ پر مہروں اور سرکاری مخصوص نشانات کے ساتھ میرے سامنے موجود تھی۔

"سب انسپکٹر تریپاٹھی۔ گلیڈ ٹو میٹ یو۔" مسکراتے ہوئے پاٹل نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

"حیرت ہے مسٹر پاٹل۔" میں نے اسے داد دی۔

شناختی کارڈ پر درج اپنا اور والد کا جعلی نام، اپنے گھریلو ایڈریس اور جسمانی نشانات میں نے ایک نظر ڈالتے ہی حفظ کر لیے تھے اور کارڈ میں نے پتلون کی پچھلی جیب میں رکھ لیا۔

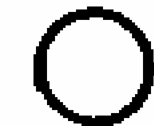
"دیر صرف اسی چکر میں زیادہ ہو گئی۔ باقی تو سب کام مکمل تھا۔" پاٹل نے صفائی پیش کی۔ اس تصویر میں میرے چہرے سے ڈاڑھی غائب تھی۔ میں نے سب سے پہلے وہیں شیو کر کے ڈاڑھی صاف کر ڈالی۔ پاٹل نے اپنے ملازمین کو اسٹور بند کرنے کی ہدایات دیں

اور ہم دونوں کار میں جا بیٹھے۔

کار ایک شاندار ہوٹل کے سامنے جا کر رُک گئی۔ ڈائننگ ہال میں پہنچ کر ہم نے لائٹ سا چائینز ڈنر کیا اور تیز قہوہ پی کر باہر آ گئے۔ اب پاٹل کا رُخ ایک سینما ہال کی طرف تھا جہاں اس نے اوّل درجے کی دو نشستیں محفوظ کروا رکھی تھیں۔

وہ اصل میں رات بارہ بجے تک کا وقت گزارنا چاہتا تھا۔ فلم تو نئی تھی لیکن کچھ رش زیادہ نہیں تھا حسبِ روایت فلم سے پہلے پاکستانی افواج کے جعلی ظلم و ستم کی ڈاکومنٹری چلائی گئی اور عوام کو بے وقوف بنانے کے بعد دو چار بے ہودہ اشتہارات دکھا کر فلم چلا دی گئی۔ دورانِ فلم مَیں ایک ہی بات سوچ رہا تھا؛ دُنیا میں کیا کوئی اتنی مکار قوم اور بھی ہو گی؟ مَیں نے یہودیوں کو دیکھا تو نہیں تھا لیکن ان کے متعلق بہت کچھ پڑھ سُن رکھا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم پر بننے والی فلموں میں نازیوں کے مظالم دیکھ دیکھ کر ایک زمانہ وہ تھا کہ مجھے نازیوں سے نفرت سی ہو چلی تھی ـــــ ہندوؤں کے متعلق اپنے بزرگوں سے کہاوتیں سُن رکھی تھیں۔ اپنے قائدِ اعظمؒ کے متعلق جانتا تھا کہ وہ کسی بھی مرحلے پر ایک لمحے کے لیے بھی کانگریس پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہوتے تھے لیکن انھیں دیکھنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کا موقع قدرت نے اب فراہم کر دیا تھا اور اس قوم کے ساتھ محض چند ہفتے گزار کر ہی یہ بات میرے ایمان کا حصہ بن چلی تھی کہ روئے زمین پر اس سے زیادہ مکار قوم اور کوئی نہیں۔

وہ لوگ جھوٹ اس شدت سے اور اتنے مؤثر انداز میں پیش کرتے کہ واقعی وہ سچ دکھائی دینے لگتا۔ اپنے ٹی وی، فلموں، ریڈیو، غرض ابلاغِ عامہ کے ہر میڈیم سے وہ دن رات تسلسل سے جھوٹ نشر کر رہے تھے۔ ایسا جھوٹ جس کے پاؤں بھی تھے جو اپنے قدموں پر چل کر سننے اور دیکھنے والے تک نہ صرف پہنچتا تھا بلکہ اسے ورغلاتا بھی تھا۔



فلم کے خاتمے پر ہم باہر نکلے تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اب ہمیں مزید ایک



گھنٹہ گزارنا تھا۔ اس مرتبہ پاٹل کی کار کا رخ سمندر کنارے بنے ایک شاندار نائٹ کلب کی طرف تھا۔ ایک لمبی قطار میں ہم نے بھی اپنی کار پارک کی اور مَیں اُتر کر داخلی دروازے کی طرف جانے لگا لیکن پاٹل لپک کر میرے پیچھے آیا۔

"ٹھہریئے جناب" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھہر گئے جناب" مَیں مسکرایا۔

پاٹل نے گاڑی کے دروازے لاک کیے اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

"اس طرف جناب!" اس نے مخالف سمت میں اشارہ کیا۔ "آپ کو الوداع کہہ کے میں یہاں ضرور آؤں گا۔ آپ تردّد نہ کیجیے۔ اب ہمیں ایک گھنٹے تک پیدل سفر کرنا ہے۔"

اس کی ذہانت پہ اب مجھے رشک آنے لگا تھا۔ ہم دونوں پیدل ہی سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگے۔

"اس ایریا میں کوسٹ گارڈز ڈیوٹی کرتے ہیں اور اپنا کوئی یار آج کل ادھر نہیں ہے۔ اس لیے زیادہ بوجھ آپ ہی کو اٹھانا ہو گا۔ اپنے عہدے کا رعب بے جھجک ہو کر ڈالیے وائرلیس پر انکوائری کرنے پر بھی جواب "ہاں" میں ہی ملے گا۔" اس نے چلتے چلتے مجھ سے کہا۔

ابھی ہم بمشکل ڈیڑھ دو میل دُور ہی پہنچے تھے جب اس کے اندازے کے مطابق سڑک پر دُور روشنی کا ایک فوارہ سا چھوٹا جس نے اب جیپ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ پاٹل روشنی دیکھتے ہی وہاں سے ہٹ گیا۔ اس کا رُخ ان خود رو جھاڑیوں کی طرف تھا جو سڑک کے سلسلے کے ساتھ ساتھ دُور دُور تک پھیلتی چلی گئی تھیں۔ مَیں اطمینان سے سیٹی پر ایک دُھن گنگناتا اپنی چال چلتا چلا گیا۔ میرے نزدیک آ کر جیپ ٹھہر گئی لیکن میں بدستور چلتا رہا۔

"اے رُکو" کی آواز پر مَیں ان کی سمت گھوم گیا۔ ایک ڈیپٹی افسر میری طرف منہ اٹھائے مجھے گھور رہا تھا۔

"تمھارا کمانڈر کون ہے؟" ان کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی میں نے سوال داغ دیا۔

"آپ کون ہیں؟" اس پیٹی افسر نے مجھے بڑی شائستگی سے مخاطب کیا۔

"پہلا سوال میرا تھا!" میں زیرِ لب مسکرایا۔

"مجھے ہی جانیے!" جواب ملا۔

"کس طرف سے پٹرول کر رہے ہو تم لوگ؟" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اپنی شناخت کرواؤ۔ ورنہ...!" اس نے ہولسٹر سے پستول نکال کر میری طرف تان لیا۔

"سب انسپکٹر ترپاٹھی۔ آن اسپیشل ڈیوٹی۔" میری آواز خاصی بارعب تھی۔

"یور آئیڈنٹٹی سر؟" اسپیشل ڈیوٹی کا ذکر آتے ہی اس کا پستول والا ہاتھ جھک گیا۔

میں نے جیب سے کارڈ نکال کر سامنے کر دیا۔ اس نے ایک سرسری نظر کارڈ پر ڈالی اور مجھے لوٹا دیا۔

"شما کیجئے۔"

"میری موجودگی کو اس علاقے میں بھول جانا۔ کسی پٹرول سے بھی ذکر نہ ہو!" میں نے اسے تنبیہہ کی۔

اسپیشل ڈیوٹی افسران کی حیثیت یہاں گسٹاپو جیسی تھی جس کے مبصر سے جرمن باقاعدہ افواج کے کرنل بھی سہم جاتے تھے۔ اس لیے اس کے سراپے میں بھی خاصا انکسار جھلکنے لگا تھا۔

"رائٹ سر!" اس نے ایڑیاں بجائیں۔

"تھینک یو۔" کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔ ان لوگوں کی جیپ بھی میرے ساتھ ہی آگے بڑھ گئی۔

پاٹل، جیپ کے وہاں سے دفع ہوتے ہی جھاڑیوں سے نکل کر بھاگتا ہوا مجھ سے



لپٹ گیا۔

"گڈ۔ فائن۔" اس نے مجھے داد دی۔

"سب آپ کی دیا ہے شریمان جی!" میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں نے ایک ساتھ ہی قہقہہ لگایا اور سوئے منزل گامزن ہو گئے۔

میرے اندازے کے مطابق ہم ٹھیک وقت پر اس جگہ پہنچ چکے تھے۔ جہاں سے مجھے اس سے پہلے بھی ایک بار فرار ہونا پڑا تھا۔ شاید اس علاقے کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ زیادہ تر غیر قانونی کام اسی طرف سے انجام پاتے تھے۔

مجھے اس پوائنٹ کا بالکل علم نہیں تھا جسے ہم نے بطور لانچنگ پیڈ استعمال کرنا تھا۔ یہاں بھی شاید ماسٹر اور ان کے ایک دو خاص ایجنٹ ہی ان مخصوص مقامات سے آگاہ تھے۔ جنھیں مختلف نمبر دے کر انھوں نے اپنے استعمال کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ نہ تو میں نے پاٹل کو یہ بتایا کہ اس سے پہلے میں اس علاقے کی "یاترا" کر چکا ہوں نہ ہی اس سے اس علاقے کے متعلق کچھ دریافت کیا۔

اصل میں یہ سب لوگ اپنے کام میں ماہر ہو گئے تھے۔ انھیں بھی میری طرح تربیت کی سخت بھٹیوں سے کندن کیا گیا تھا۔ جہاں سے نکل کر آنے والا خود بخود ایک مخصوص سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ کوئی ایسا غیر محسوس اشارہ بھی ان کی گفتگو سے نہیں ملتا تھا جس سے ان کی رازداری پر ذرا سا حرف بھی آ سکے۔ ہر ایجنٹ دوسرے ایجنٹ سے یہی اُمید کرتا تھا کہ وہ بھی اس کی طرح سوائے کام کی بات کے باقی تمام باتوں سے غیر متعلق رہے گا۔

مجھے علم نہیں تھا کہ میں نے اس کے بعد پھر کبھی کلکتہ بھی آنا ہے یا نہیں۔ اس کے باوجود میں نے اس جگہ کا نام پوچھنا بھی گوارا نہ کیا حالانکہ سڑک کے کنارے لگے کسی سنگِ میل سے بھی اس طرف رہنمائی ہو سکتی تھی۔ سڑک یہاں سے کم از کم دو میل دور تھی اور اب ہم جس جگہ تھے وہاں تک پہنچنے کے لیے تو کوئی کچا راستہ بھی نہیں تھا۔

ریت اور کانٹے دار جھاڑیوں میں ہمارا سفر جاری رہا۔ رات پونے ایک بجے ہم بالآخر اس جگہ پہنچ گئے جو ہمارا مطلوبہ پوائنٹ تھا۔ کتنا صحیح اندازہ تھا پاٹل کا۔!

"اور۔ کے سراب آپ ہم سے رخصت ہو رہے ہیں۔ میزبانی میں کمی ہو گئی ہو تو معافی...!"

اس نے ریوالور ہولسٹر سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ یہ بات کہتے ہوئے اس کا چہرہ تو بالکل غیر جذباتی تھا لیکن اس کے دل میں جو جھنور چکرا رہے تھے ان کی شدت کا اندازہ میں بخوبی کر سکتا تھا، بہرحال وہ انسان تھا۔ اپنے ملک سے انتہائی محبت کرنے والا پاکستانی اور یہ اس پاکستان کی طرف جا رہا تھا جو اس کا وطن تھا۔

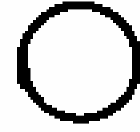
"میرے دوست تم جو کچھ بھی کر رہے ہو۔ اس کا اجر بہت سی نسلیں مل کر بھی ادا نہیں کر پائیں گی۔ تم بہت عظیم لوگ ہو، ہمارے تصورات سے کہیں زیادہ بڑھ کر عظیم۔ آج جو تاریخ تمہارے جسموں پر لکھی جا رہی ہے وہ کل جب کتابوں میں لکھی جائے گی تب شاید تم تو اس دنیا میں نہیں ہو گے لیکن تمہارے زندہ جاوید کارنامے آنے والی نسلوں کو باوقار زندگی گزارنے کی راہ ضرور دکھاتے رہیں گے۔"

——— یہ بات کہتے ہوئے میں نے محسوس کیا تھا۔ جیسے میری آنکھیں نم آلود ہو رہی تھیں۔

پاٹل نے تو اپنا چہرہ دوسری طرف کر رکھا تھا ——— ہم دونوں نے اپنے کوٹ اتار کر بازوؤں پر دوہرے کر رکھے تھے۔ مجھے تو کپڑے خراب ہونے کی کچھ پرواہ نہیں تھی لیکن پاٹل کو واپس نائٹ کلب پہنچ کر کار بھی حاصل کرنا تھی۔ وہ اس سلسلے میں خاص احتیاط برت رہا تھا۔

ہم نے اپنے اپنے پستول اور ٹارچ ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تھیں۔ جبکہ تین ہینڈ گرنیڈ کسی ممکنہ آفت سے بچنے کے لیے ہمارے سامنے موجود تھے۔ ان کی "قوتِ بربادی" عام دستی بموں سے دوگنا تھی اور خصوصی طور سے یہ انہی لوگوں کے زیر استعمال رہتے تھے۔





ہم دونوں ایک قدرے صاف قطعہ اراضی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہماری نظریں بے چینی سے سمندر کے پانیوں پر حدِ نگاہ تک پھسلتی چلی جا رہی تھیں۔ دور دور تک کسی شئے کا نام و نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہم سے کچھ فاصلے پر جھاگ اڑاتی موجیں ساحل سمندر سے بغلگیر ہوتیں اور واپس اپنے پانیوں میں غرق ہو جاتیں۔ ٹھاٹھیں مارتے سمندر کا شور بھی پرسکون ہوتا ہے۔ ان نیلے پانیوں میں کتنی تہذیبیں دفن تھیں۔ اس کا شمار شاید کوئی نہ کر سکے۔

چاند سمندر کے ایک کونے سے لہروں کے دوش پر سفر کرتا اب ہمارے سروں پر آن پہنچا تھا۔ رات غسل ماہتابی فرمانے لگی تھی۔ جب سمندر کی لہروں کے شور پر ایک تیز رفتار بوٹ کا شور غالب آنے لگا۔ ہچکولے کھاتی اور تیز رفتاری سے ساحل کی طرف بڑھتی کشتی اب نمایاں ہونے لگی تھی۔ میں فوراً اپنی جگہ سے پرے ہٹ گیا۔ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے ہینڈ گرنیڈ اٹھانا نہیں بھولا تھا۔ باقی دونوں گرینڈوں پر مجھ سے پہلے اس کا حق تھا۔

ایک طاقت ور ٹارچ سامنے وقفے وقفے سے روشن ہوئی۔ جواب میں پاٹل نے بھی وہی عمل دوسرے رنگ کی روشنی پھینکتے ہوئے دہرایا۔ کشتی کا رخ اب کنارے کے اسی طرف ہو گیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ لوگ ساحل کے بالکل قریب آ گئے۔

ساحل کے کچھ فاصلے پر ہی غوطہ خوری کے لباس میں ایک سائے نے پانی میں چھلانگ لگائی اور پانی کے اندر ہی اندر سفر کرتا۔ وہ ساحل کے قریب پہنچ کر پانی سے برآمد ہوا اب وہ چلتا ہوا ہمارے قریب آ رہا تھا۔ پستول پر میری گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

کچھ فاصلے پر رک کر اس نے اپنے لباس میں سے واٹر پروف ٹارچ نکالی اور ایک مخصوص انداز سے رک رک کر روشنی کو گھماتے ہوئے پاٹل کو نیا سگنل دیا۔ ادھر سے بھی ایسا ہی جواب موصول ہوا تو اس نے ٹارچ دوبارہ اپنے لبادے میں چھپا لی ———
اب وہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ہماری سمت آ رہا تھا۔ بظاہر ایسا دکھائی دے رہا

تھا جیسے کسی نے اسے "ہینڈز اپ" کا حکم دیا ہو۔ خشکی پر آ کر وہ اسی پوزیشن میں رک گیا۔

پھر میں نے پاٹل کو جھاڑیوں کی اوٹ سے برآمد ہوتے دیکھا جس نے نووارد کی طرف پستول تان رکھا تھا۔ دونوں کے درمیان "کوڈ ورڈز" کا تبادلہ ہوا اور اپنی پہچان مکمل کروانے پر اس نے ہاتھ گرا لیے۔ پاٹل نے میری سمت ہاتھ کے مختلف انداز سے "سیف سگنل" دیا اور میں اپنی جگہ سے باہر نکل آیا۔

"باجوہ" نووارد نے گرمجوشی سے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

اس کے بعد میں نے اس سے اپنی شناخت کا مرحلہ طے کیا اور مطمئن ہونے پر میں نے پاٹل کو بھی مطمئن کر دیا۔ موٹر بوٹ کا انجن بند ہو چکا تھا اور وہ پانی پر دائیں بائیں ہلکورے لے رہی تھی۔ جیسے ہی میں نے "اوکے" کہا نووارد نے بوٹ کی طرف ٹارچ سے سگنل بھیجے اور اس کا انجن جاگ اٹھا۔

کم گہرے پانیوں کے نزدیک وہ رک گئی۔

"کم آن سر COME ON SIR" باجوہ نے اشارہ کیا۔

پاٹل کی طرف رخ کرتے ہوئے مجھے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ اس کی آنکھیں مجھ سے کیا کہیں گی۔ شاید اسی لیے میں اس سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہیں پا رہا تھا لیکن اس نے میرے ہاتھ کو جھٹکا دیا تو میں ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح اس کے سینے سے ٹکرا گیا۔

"اس نے بڑے کاری وار سہے ہیں سر!" اس نے مجھے سینے سے چمٹاتے ہوئے کہا۔

"گڈ لک مائی فرینڈ" میں نے حتی الوسع اپنے جذبات پر قابو پائے رکھا۔

وقت نے قدم قدم پر مجھے فطری انسانی کمزوریوں کا احساس دلایا تھا۔ تربیت آپ کے جسم کو موم سے پہاڑ کا تو بنا سکتی ہے لیکن دلی جذبات نیچرل ہی رہتے ہیں۔ یہ پتھر



دل والی اصطلاح جو کمانڈوز سے متعلق سننے میں آتی تھی بالکل غلط ثابت ہوئی تھی۔ فوجیوں کے دل عام سویلین کی طرح ہی دھڑکتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ وہ بھی پہلے انسان اور اس کے بعد اور کچھ ہیں۔

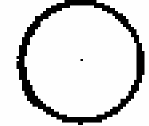
مجھ سے جدا ہوتے وقت پاٹل کو شاید ان لمحوں نے دکھی کر دیا ہو جو اس کے ہم وطن کو اس کے دیس کی طرف لیے جا رہے تھے۔ جب کہ میرا دل اس لیے پھٹ رہا تھا کہ پاٹل نے اپنی مٹی سے جدائی کا روگ کب سے اپنے اندر پال رکھا ہے۔

"فی امان اللہ۔" اس نے ہی ہمت کر کے پہل کی اور مجھ سے الگ ہو رہا۔

"آپ کے لیے تحفہ جناب۔" نووارد نے پلاسٹک کے لفافے میں پیک ایک پاکستانی سگریٹ کی ڈبیا اس کی طرف بڑھا دی۔

گو میں وہاں سے پرے ہٹ گیا تھا۔ لیکن چاند کی روشنی میں پاٹل کے چہرے کی بدلتی کیفیت مجھ پر بخوبی عیاں تھی۔ اس نے کسی متبرک شے کی طرح اسے چوما، آنکھوں سے لگایا پھر بڑے دکھی دل سے اس میں سے سگریٹ نکال کر اپنے سگریٹ کیس میں منتقل کر لیے اور ڈبیا کو سمندر کی لہروں کی نذر کر دیا۔

باجوہ نے بھی اس سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور ہم دونوں پانی میں اتر گئے۔ جب موٹر بوٹ اپنی جگہ سے ہلی تو چاند بادلوں میں چھپ رہا تھا اور چاند نگر کا مسافر ریت پر اپنے پاؤں کے نشان گاڑتا وہاں سے دور ہی دور ہٹتا چلا جا رہا تھا۔



بجلی کی سی سرعت کے ساتھ بوٹ آگے بڑھی اور جب سطح سمندر پر چلتے ایک تختے پر چلتے ہم آبدوز میں پہنچے تو موٹر بوٹ اس کے پیٹ میں سما گئی۔

آبدوز کے کیپٹن بہ نفس نفیس میرے استقبال کے لیے سامنے کھڑے تھے۔ بحریہ کے جیالوں نے باری باری مجھے گلے لگایا اور اس کیبن تک میری رہنمائی کی جہاں حیرتوں

کا ایک نیا باب مجھ پر وا ہونے والا تھا۔

عملے کے دوسرے ارکان تو باہر ہی ٹھہر گئے۔ میں کیبن کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو ایک صاحب نیوی کی وردی میں ملبوس لکڑی کی دیوار کی طرف منہ کیے کھڑے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ میری طرف گھومے تو اچانک خوشی اور حیرت سے جیسے میری زبان گنگ ہو گئی۔

میرے سامنے میرے انسٹرکٹر کھڑے تھے۔

"سر" میں جیسے سسک پڑا۔

"مائی بوائے" میرا روحانی باپ میری طرف بانہیں پھیلائے بڑھا۔

بڑے جان لیوا لمحے ہوتے ہیں یہ۔ درد مارے ڈالتا ہے بندے کو۔ کیسا تماشا بنایا ہے مالک تو نے دنیا کا۔ خوشیاں بھی کیا درد بخشا کرتی ہیں۔ کیسا میٹھا درد ہوتا ہے یہ۔ کیسی اندوہناک خوشی ہوتی ہے یہ۔ آدمی خوشی سے باؤلا بھی ہوا جاتا ہے اور درد سے کلیجہ بھی پھٹنے لگتا ہے۔

سر کی آغوش میں سما کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنے مدار سے بھٹکا ہوا کوئی سیارہ ہوں جو گھوم گھما کر بالآخر اپنے مدار پر پہنچ گیا ہے۔ اس واپسی کی لذت کیسی نرالی تھی۔

"بیٹھو بیٹے" انھوں نے مجھے سامنے رکھے پلنگ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "معاملہ ٹھیک رہا نا؟" انھوں نے میری طرف تشویش کی نظروں سے دیکھا۔

"جی سر" میں نے مختصر جواب دیا۔

"کیسا لگا یہ تجربہ؟" انھوں نے اپنا سگار سلگایا۔

"شاندار۔"

"بڑے خوش قسمت ہو یار۔ ہندوؤں میں گھوم پھر آئے۔" انھوں نے ماحول کو



ذرا غیر سنجیدہ کرنے کے لیے میرے کندھے پر حسبِ سابق ہاتھ مارا۔

"یہ تو ہے سر۔ آپ سنائیے اپنی طرف کیسا چل رہا ہے؟" میں تو جانے کب سے یہ پوچھنے کے لیے بے چین تھا۔

میرے اس سوال نے "سر" کو کچھ دکھی سا کر دیا۔ ان کے خوبصورت چہرے پر سنجیدگی کی ایک تہہ سی جم گئی۔

"بیٹے ہمیں شاید ایک طویل اور صبر آزما لڑائی لڑنا ہو گی۔ میں تو بوڑھا ہو چلا ہوں۔ عمر وفا کرے نہ کرے۔ اب یہ معاملہ تمہی کو سنبھالنا ہو گا۔" ان کی بات کے آخری فقرے نے جیسے میرے کلیجے پر ہاتھ ڈال دیا۔ میرا جی چاہا۔ ان سے چیخ چیخ کر کہوں۔ سر خدا کے لیے ایسا مت کہیے۔ آپ کے حوصلے ہم سے زیادہ جوان ہیں۔ آپ کی رہنمائی میسر نہ آتی تو ہم شاید اب سے بہت پہلے صبر کا دامن چھوڑ چکے ہوتے۔ جب کسی یونٹ میں پیٹرول پر جانے والے کسی جوان کی لاش پہنچتی تھی جسے مکتی باہنی نے دھوکے سے مارا ہوتا تھا تو اس کے ساتھیوں کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا لیکن ان کے بپھرے جذبات کے منہ زور گھوڑوں کو ایسے ہی "سر" لگام دیا کرتے تھے۔

"میرے بچو یہ قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ جلد ہی کرودھ اور نفرت کی یہ کالی گھٹا چھٹ جائے گی۔ تب ہر طرف امن ہی امن ہو گا۔ ہم سب پھر ایک ہی تھالی میں کھائیں گے۔ ایک ہی گھر میں رہیں گے۔ ان شہیدوں کے خون کے صدقے ہماری دعائیں ضرور مستجاب ہوں گی۔ صبر کرو — صبر۔ یہ ورغلائے ہوئے ہمارے بھائی ہیں۔ انھیں جلد ہی سمجھ آ جائے گی کہ ہم ان کے اپنے ہیں۔" ہر یونٹ میں ہر روز کوئی نہ کوئی "سر" اپنے جوانوں سے ایسا خطاب کیا کرتا تھا۔

لیکن آج یہ پژمردگی کیوں چھا رہی ہے میرے "سر" کے چہرے پر۔ ان کی آواز میں وہ رعد کیوں نہیں کڑک رہی۔ خدایا کیا ہم سب روحانی طور پر آہستہ آہستہ مر رہے ہیں؟

اس سے آگے میں کچھ نہ سوچ سکا۔ کیونکہ اچانک کیبن کی لائٹ آف ہو گئی تھی اور ایک تیز وسل کی آواز وہاں گونجنے لگی تھی کیبن پر بھی لرزہ طاری ہو گیا۔ یہ شاید کسی خطرے کی آمد کا اعلان تھا اور آبدوز غوطہ لگا کر سمندر کے فراخ سینے میں پناہ لے رہی تھی۔

اس کے ساتھ ہی وہاں کیپٹن کی ہدایات سنائی دینے لگیں۔ ہمارے لیے یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ صرف اتنا ہوا کہ "سر" بھی میرے ساتھ ہی دیوار کے ساتھ لگے پلنگ پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے سرہانے رکھی ٹارچ نکال لی تھی اور میں نے اپنے جسم سے وطن کی امانت کا بار الگ کر لیا تھا پھر ٹارچ کی روشنی میں میرے انسٹرکٹر ان اہم کاغذات کا جائزہ لینے لگے۔

آبدوز میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ معاملہ کچھ زیادہ ہی سنگین دکھائی دے رہا تھا۔ اب ہم سطح سمندر سے نیچے چلے گئے تھے۔ اس بات کا احساس ہمیں انجنوں کی آواز کی تبدیلی سے ہوا۔ اندھیرے ہی میں "سر" نے میرا ہاتھ تھاما اور ہم کیبن کے اس دروازے سے باہر آ گئے جس سے میں اندر داخل ہوا تھا۔

"اس طرف جناب" باہر کھڑے ایک مستعد جوان نے آپریشن روم کی طرف اشارہ کیا۔

میرے انسٹرکٹر اور میں ایک ساتھ آپریشن روم میں داخل ہوئے تھے جس کے دروازے کے باہر جلتے سرخ بلب کے سائے تلے کھڑے گارڈ نے ہمیں تعظیم دی۔ آبدوز کے کپتان ایک اسکرین کے سامنے کھڑے حالات پر نظر رکھے مختلف احکامات جاری کر رہے تھے ان کے گرداگرد مختلف مشینوں کے گرد نیوی کے مستعد اور چاق و چوبند جوان کسی بھی حکم پر عمل پیرا ہونے کو تیار تھے۔

"وٹ از رانگ آفیسر" میرے سر نے کیپٹن کے نزدیک پہنچ کر پوچھا۔

"کوئی خاص خطرہ نہیں کچھ "ایلائنز" اس طرف آ رہے ہیں۔ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں



مارنے کے لیے" کیپٹن نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

چند منٹ بعد ہم آپریشن روم سے باہر آ گئے اور اسی کیبن میں پہنچ کر "سر" نے مجھے لیٹ جانے کو کہا میں ان کے بضد ہونے پر بادلِ نخواستہ وہاں لیٹ تو گیا لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دُور تھی، میرے انسٹرکٹر باہر نکل گئے تھے۔ وہ شاید مجھے ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتے تھے۔ میں "امانت" کے بارے سبکدوش ہو کر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ پچھلی دو راتوں کی تھکن بھی آنکھوں میں تھی لیکن آنکھ تھی کہ کم بخت لگتی نہ تھی۔

قریباً پندرہ بیس منٹ کے بعد ہی میں بور ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ آبدوز اب سطح سمندر پر سفر کر رہی تھی۔ میں نے طبیعت پر چھائی کسلمندی دُور کرنے کے لیے آبدوز کے عرشے پر جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک جوان نے سیڑھیوں تک میری رہنمائی کی اور میں سیڑھیوں پر پاؤں دھرتا ایک بڑے سے سوراخ سے گزر کر اوپر آ گیا۔

عرشے کی ریلنگ سے ٹیک لگائے میرے انسٹرکٹر اور آبدوز کے کپتان قریب قریب کھڑے تھے۔ آبدوز کی تمام لائٹس آف تھیں لیکن چاندنی کی دم توڑتی روشنیاں بھی اس کی نشاندہی کو کافی تھیں مجھے اوپر آتے دیکھ کر میرے "سر" لپک کر میری طرف آئے۔

"کیا بات ہے؟"

"دل نہیں لگ رہا تھا اکیلے میں" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی ابھی کچھ روز یوں ہی ہو گا۔ بڑے گلیمر سے نکل کر آئے ہو نا" میرے انسٹرکٹر صاحب نے بھی میری طرف قہقہہ اچھالا۔

کیپٹن صاحب بھی اب ہماری گفتگو سننے میرے نزدیک آ گئے تھے۔ چاندنی رات میں ان کا پُرعزم اور تمتماتا ہوا چہرہ اس امر کا غماز تھا کہ یہ کوہ شکن ارادوں کا مالک پانیوں کا باسی طوفانوں سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ ان کی تراشیدہ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی اور بل کھاتی مونچھیں ان کے سرخ و سپید چہرے کا وقار دوچند کر رہی تھیں۔ ٹوپی کے کناروں

سے ان کی کنپٹیوں پر اِکا دُکا سفید بال اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ ان کی عمر کا ایک حصّہ سمندروں سے لڑتے بھڑتے گزر رہا ہے۔ اُن کی گہری بادامی آنکھیں پتھر دل کے پار جھانک لینے کی مقناطیسی قوّت کی مالک تھیں۔

"میرا خیال ہے آپ لوگ کافی پینا پسند کریں گے۔" ان کی بارعب آواز نے ہنستے ہوئے حکم سنایا۔

اصولاً تو اس وقت انھیں اپنے آرام دہ کیبن میں ہونا چاہیئے تھا کیونکہ ان کی جگہ لینے کو ان کے نائب بھی بہرحال موجود تھے لیکن جس خطرناک ذمّے داری کا بوجھ انھوں نے اٹھایا تھا۔ اس سے مکمل عہدہ برآ ہونے سے پہلے انھوں نے شاید خود پر آرام حرام کر رکھا تھا۔

ایسے خطرناک مشن کرنے کا حوصلہ کم ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ دشمن کے نرغے میں گھس کر اپنے ایجنٹ "وصول" کرنا اور انھیں واپس اپنے ساحلوں تک لے آنا کہنے سننے کی حد تک تو ممکن ہو سکتا ہے لیکن اس راستے میں آنے والے مہیب خطرات کا سامنا کرنا جی داروں کا کام ہے۔

عرشے پر لگے انٹرکام پر انھوں نے ہمارے لیے کافی تیار کرنے کا حکم دیا۔ ابھی وہ ہماری طرف پلٹے ہی تھے۔ جب ایک پیٹی افسر سیڑھیوں سے برآمد ہوئے انھوں نے ایڑیاں بجا کر اپنے کمانڈر کو تعظیم دی۔

"یس؟" کیپٹن نے سوالیہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

"سر ریڈار نے کچھ موومنٹ نوٹ کی ہے۔" پیٹی افسر کی اطلاع نے مجھے چونکا دیا۔

"او کے۔ میں آرہا ہوں۔" کیپٹن صاحب بولے۔

پیٹی افسر واپس لوٹ گئے۔ کیپٹن نے ان کے بعد خود ہی نیچے جانا چاہا۔ اچانک ان کی پشت پر انسٹرکٹر صاحب کی آواز بلند ہوئی۔



"لُک LOOK کیپٹن۔"

کیپٹن تیزی سے دوسری طرف پہنچ گئے۔ انھوں نے اپنے گلے میں لٹکی دوربین اب ہاتھوں میں تھام لی تھی پھر وہ دُوربین آنکھوں سے لگا کر انھوں نے انسٹرکٹر صاحب کی اشارہ کرتی انگلی کی طرف نظریں جما دیں ابھی انھوں نے دُوربین آنکھوں سے لگا ہی رکھی تھی کہ اچانک فضا زوردار دھماکے کی آواز سے گونج اٹھی۔ اپنے عقب میں چنگاریوں کی ایک لمبی لکیر چھوڑتا گولا آبدوز سے قریباً تیس چالیس گز دور سمندر کے پانی میں "گڑام م م" کی آواز پیدا کرتا گرا تھا۔

"کم آن جنٹلمین" کیپٹن صاحب نے پھرتی سے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔

"کم آن بوائے۔" انسٹرکٹر صاحب نے مجھے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

میرے بعد میرے "سر" اور پھر کیپٹن صاحب نیچے آگئے۔ ہمارے عقب میں گولوں کے پھٹنے کی زوردار آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"ڈاؤن۔" نیچے پہنچتے ہی کیپٹن نے پہلا حکم جاری کیا۔

ان کے حکم کی گونج فوراً آپریشن روم میں پہنچی اور مختلف بڑے بڑے وہیلوں کے گرد کھڑے جوانوں نے انھیں گھمانا شروع کر دیا۔ جب کیپٹن صاحب کے پیچھے پیچھے ہم دونوں آپریشن روم میں پہنچے تو آبدوز نے باقاعدہ ڈگمگانا شروع کر دیا تھا۔ وہ لوگ اب گہرے پانیوں میں اتر کر اس "تباہ کن جہاز" سے دُور ہٹ رہے تھے جس سے ہم پر بمباری کی جا رہی تھی۔ شاید ایلائز جہازوں نے آبدوز کی نقل و حرکت نوٹ کر لی تھی اور دشمن نے پہلے خاموشی سے آبدوز کو گھیرے میں لینے کا فیصلہ کیا ہوگا تاکہ وہ آسانی سے اس کا شکار کھیل سکیں۔ اصولاً تو ہمیں اس وقت یہاں نہیں ہونا چاہیئے تھا لیکن نہ تو کسی نے ہمیں وہاں سے چلنے کو کہا نہ ہی ہمارے لیے یہ ممکن تھا کہ ہم اپنے شیر دل ملاحوں کو قریب سے دشمن سے دو دو ہاتھ کرتے ہوئے دیکھنے سے محروم رہیں۔

کیپٹن کی آنکھیں پیری اسکوپ پر لگی تھیں۔ ان سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مختلف جوان کسی بھی حکم کی تعمیل میں سربکف تیار تھے۔ جیسے جیسے احکامات جاری ہو رہے تھے۔ مختلف پوزیشنوں پر مستعد جوان مختلف لیوروں اور وہیلوں کو حرکت میں لا رہے تھے۔ آبدوز کی برقی آنکھیں اور کان مسلسل بیدار تھے۔

سمندری لڑائی میں سب سے زیادہ جس صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ہے صبر۔ انتظار۔ مناسب موقعے کا انتظار اور اب صبر و انتظار کی کیفیت بھی نقطۂ عروج کو چھونے لگی تھی۔ پھر ہم نے کیپٹن صاحب کو اپنے الیکٹرانکس آفیسر انچارج کو حکم دیتے دیکھا۔ اس لمحے شاید میری طرح میرے انسٹرکٹر صاحب بھی افسوس کر رہے ہوں کہ ہم ان جانبازوں کے ساتھ عملی جہاد میں کیوں شریک نہ ہو سکے۔

اب پیری اسکوپ پر ابھرنے اور ڈوبنے والی لکیریں ایک واضح شکل اختیار کرنے لگی تھیں۔ کیپٹن نے اپنے ہاتھ میں پکڑے مائیک میں کچھ کہا اور اب چیف آرڈیننس آرٹی فشر کے سامنے لگا سرخ بلب روشن ہو گیا۔ مجھے علم تھا اب وہ بیقراری سے اپنے تارپیڈو افسر کے اگلے حکم کا منتظر ہوگا۔ اس نے تمام تارپیڈو حملے کی حالت میں کر لیے تھے اور کسی بھی لمحے اس کے لیے حکم آیا کہ آیا۔

ایبل سی مین اگلی تارپیڈو ٹیوبوں کے بالکل نزدیک اس کمانی پر مضبوطی سے ہاتھ جمائے کھڑا تھا جو تارپیڈو فائر کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ جیسے جیسے بدبخت جہاز آبدوز کی رینج میں آ رہا تھا۔ کیپٹن کے چہرے کا جلال بڑھتا جا رہا تھا۔ اس لمحے وہ جنگل کا ایسا بپھرا ہوا شیر دکھائی پڑتے تھے جسے گیدڑوں کے ریوڑ نے اپنی کچھار سے باہر آنے پر مجبور کر دیا ہو۔

بالآخر میرے کانوں میں کیپٹن کی وہ غضبناک آواز گونجی جس کا مجھے شدت اور بیقراری سے انتظار تھا۔



"بزن"!

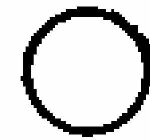
"اللہ اکبر" تمام جوانوں نے مل کر نعرۂ تکبیر بلند کیا جس میں نمایاں ترین آواز میری اور میرے انسٹرکٹر کی تھی۔

پہلا تارپیڈو فائر ہو چکا تھا۔

ایک منٹ ــــ دو منٹ ــــ تین منٹ ــــ انتظار کی شدت سے سب کے اعصاب تڑخنے لگے تھے اور ابھی تک دھماکہ ریکارڈ کرنے والے پیٹی افسر کی طرف سے کوئی اشارہ موصول نہ ہوا تھا۔ سب لوگ بے چینی سے گردنیں موڑے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"بزن" کیپٹن کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

فوراً ایبل سی مین کے ہاتھوں میں برقی رو دوڑی اور اگلا تارپیڈو فائر ہو گیا۔ اس مرتبہ آبدوز کو زبردست جھٹکا لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جوانوں کے فلک شگاف نعروں سے آبدوز دہل گئی۔ دھماکہ ریکارڈ کرنے والے پیٹی افسر نے اپنی سیٹ سے اچھل کر نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ بھارتی فریگیٹ غرق ہو چکا تھا اور محاصرہ ٹوٹ گیا ــــ آبدوز چنگھاڑتی ہوئی دشمن کا زعم روند کر آگے بڑھ گئی۔



پیری اسکوپ نے بھی غرق ہوتے ہوئے جہاز کی گواہی دے دی تھی۔

آبدوز کا ریڈیو سیٹ جاگا اور اپنی فتحمندانہ مراجعت کی خبر دے کر خاموش ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے ہاتھوں میں کافی کے مگ آ گئے۔

"مجھے اپنا وعدہ یاد تھا بہادر ساتھیو!" کیپٹن صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یہ کافی کے مگ، فتح کے جام بن گئے تھے! پھر وہ سرور ساری زندگی نہ مل سکا جو اس روز آبدوز میں کافی پیتے ہوئے ملا تھا۔ صبح جب سورج کی اولین کرنوں نے سمندر کے نیلے پانیوں سے بغل گیر ہو کر سیاہیاں چھٹ جانے کا پیام دیا تو ہماری فاتح آبدوز محفوظ

پانیوں کو چوم رہی تھی۔

سطحِ سمندر پر آبدوز نمودار ہوتے ہی ہم تینوں عرشے پر آ گئے جہاں نیلے پانیوں پر سرخ کرنوں کا مستانہ رقص جاری تھا۔ اس منظر نے ہم سب پر جیسے جادو سا کر دیا ــــ ایک مدہوشی تھی کہ انگ انگ میں رقص کناں ہو گئی ــــ یہ ہمارے پانی تھے ــــ ہماری ہوائیں تھیں ــــ ہمارا سمندر تھا۔ تین گشتی گن بوٹس نے آگے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا۔ انھوں نے بحریہ کے مخصوص انداز میں آبدوز کے گرداگرد چکر کاٹ کر فضا میں چنگاریاں بکھیریں اور اپنے فاتح جیالوں کا شایانِ شان خیر مقدم کیا۔

گہرے پانیوں کی حد پر آ کر آبدوز ٹھہر گئی اور ایک گن بوٹ ہماری سمت بڑھ آئی ــــ ایک مرتبہ پھر پانیوں پر تختے بچھ گئے۔ سمندر کے پاسبانوں کے فراخ سینوں سے توانائیاں حاصل کر کے جب ہم دونوں گن بوٹ پر پہنچے تو میری کمپنی کے جوان آنکھوں میں محبّت کی جوت جگائے میرے منتظر تھے۔

ساحلِ سمندر سے ہم لوگ ایک جیپ میں اپنے نئے کمپنی ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہو گئے۔ جیپ پر میرے ساتھ ڈرائیور تھا اور پچھلی سیٹ پر دو جوان ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں لیے بیٹھے تھے۔ ہم کچے پکے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ اچانک ڈرائیور نے ہینڈ بریک لگا کر جیپ روک دی ــــ اس کے ساتھ ہی زوردار دھماکے سے فضا گونج اٹھی۔ اتنا زوردار اور اچانک جھٹکا تھا کہ میرا سر ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے دونوں جوان اچھل کر ہم پر آ رہے ــــ دوسرے ہی لمحے ہم سنبھل چکے تھے۔ چاروں نے اپنے اسلحے سمیت مختلف اطراف میں چھلانگیں لگائی تھیں۔

خیریت گزری ہم میں سے کوئی زخمی نہیں ہوا تھا۔ شاید ڈرائیور کی چھٹی حس نے ہمیں موت کے منہ میں جانے سے بچا لیا تھا کہ جیپ سے بمشکل پندرہ بیس گز دور



دھوئیں اور دھول کا بادل آسمان کی سمت اٹھ رہا تھا۔ کسی لانچر سے فائر کیا ہوا راکٹ گر کر پھٹا تھا۔ شاید پھینکنے والے سے اندازے کی غلطی ہو گئی تھی یا ڈرائیور کو کسی رحمت کے فرشتے نے عافیت کی راہ سجھا دی تھی۔ کچھ بھی ہو بہرحال یہ ہمارے لیے کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ مَیں نے تو بہت تھوڑے عرصے میں بہت زیادہ معجزے دیکھ لیے تھے۔ اس لیے مجھ پر تو کوئی اثر نہ ہوا؛ البتہ میرے ساتھی اس حادثے سے یقیناً متاثر ہوئے ہوں گے۔

پہلے تو ہم تربیت کے مطابق خطرے والی جگہ سے حتی الامکان دور ہٹ گئے پھر مَیں نے چاہا کہ اٹھ کر صورتِ حال کا جائزہ لوں لیکن اس دفعہ مَیں اپنی مرضی سے نیچے نہیں بیٹھا تھا۔ کسی ان دیکھی طاقت نے مجھے منہ کے بل زمین بوس کر دیا۔ میری نظروں کے سامنے مجھ سے دس پندرہ گز کے فاصلے پر کھڑی جیپ کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ اس مرتبہ نشانہ لینے والا ہرگز نہیں چوکا تھا۔

مَیں نے زمین پر لیٹے لیٹے کہنیوں کے بل پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ باقی ساتھیوں کی تو کچھ خبر نہیں تھی۔ یقیناً وہ بھی میری طرح محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں ہوں گے۔ کھیتوں کا سلسلہ اب خاصا گھنا ہو رہا تھا۔ اگرچہ بظاہر تو یہ جائے امان دکھائی پڑتی تھی لیکن خوش فہمی میں مبتلا رہنے کی اگر ہمیں کوئی عادت تھی تو وہ دورانِ تربیت ہی ختم ہو چکی تھی۔

مجھے علم تھا کہ یہ سلسلہ راکٹ پھٹنے تک محدود نہیں۔ نہ ہی حملہ آوروں نے ہوا میں تیر چلایا تھا ــــ وہ منظّم تھے اور یقیناً باخبر بھی! یہاں سے محض دو ڈھائی میل کے فاصلے پر ہمارا فیلڈ ہیڈ کوارٹر تھا اور کسی ہیڈ کوارٹر کے اتنے نزدیک آ کر اچانک حملہ آور ہونا بچوں کا کھیل نہیں۔ اُن لوگوں نے نتائج پر نظر ضرور رکھی ہو گی۔ انھیں علم تھا کہ اطلاع ملتے ہی ہمارے دستے کتنی برق رفتاری سے حرکت میں آ سکتے ہیں۔

پھر وہی ہوا ــــ نظر اٹھا کر دیکھنے کا یارا تو نہیں تھا لیکن کرالنگ کرتے ہوئے

میں فائرنگ سے ہونے والے دھماکوں کی آواز سے استعمال ہونے والے اسلحے کا بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔ ہم پر واقعتاً آتشیں اولے برس رہے تھے۔ انسان کتنا بے بس ہے کہ سب کچھ چاہتے ہوئے کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ اس بات کا صحیح ادراک ایسے ہی مرحلوں پہ ہوتا ہے۔ میرے کندھے سے اسٹین گن لٹک رہی تھی۔ اچانک حادثے نے دماغ کو ہی نہیں گرمایا تھا خون بھی کھولنے لگا تھا، لیکن میری طرف سے ہونے والی کوئی بھی حرکت سوائے موت کو قریب ترلانے کے اور کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتی تھی — اسٹین گن کی گولیاں حملہ آوروں کا تو کیا بگاڑتیں الٹا میری نشاندہی کر دیتیں اور اگلے ہی لمحے کوئی راکٹ اس جگہ پھٹ کر مجھے زندگی کے بوجھ سے ہمیشہ کے لیے سبکدوش کر دیتا۔ یقیناً کسی ساعت سعید میں میری ماں کی دعائیں مستجاب ہوئی تھیں "اللہ تجھے اپنی امان میں رکھے بچّے" وہ دن میں کتنی ہی مرتبہ یہ فقرہ دہراتی تھی۔ کتنی عظیم ہوتی ہیں یہ مائیں۔ ان کی محبت کی جڑیں زمین کے اندر ہی اندر کتنی گہری ہوتی ہیں۔ بظاہر جب موت کے تمام اسباب مہیا ہوں اور آپ کسی معجزے کے مرہونِ منت ہو کر بچ نکلیں تو اس عمل کے پیچھے صرف ایک ہی قوت کارفرما ہوتی ہے —— دعائیں —— دعائیں اور صرف دعائیں!!

میرے ان جذبوں کو تقویت دینے کے لیے یہ دلیل کافی تھی کہ کوئی میری سلامتی کے لیے دعا گو ہے اور انہی دعاؤں کے صدقے شاید کھیتوں کا وہ سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ دُور نزدیک ساتھیوں کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ مَیں نے ایک دو مرتبہ انھیں دیکھنے کے لیے گردن چاروں طرف گھمائی۔ لیکن دائیں بائیں آگے پیچھے سوائے پھٹتے ہوئے گولوں اور سنسناتی گولیوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

مَیں قریباً رینگتا ہوا ایک سمت بڑھ رہا تھا۔ یہ سمت محفوظ تھی یا غیر محفوظ اس کا اندازہ تو مجھے نہیں تھا لیکن میری کوشش یہی رہی تھی کہ سڑک سے زیادہ سے زیادہ دور ہٹ جاؤں اچانک مجھے اپنی داہنی جانب کھیتوں میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی



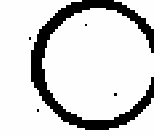
زمین سے چپکے چپکے مَیں نے اسٹین گن کا رُخ اُس طرف پھیر دیا۔ خود مَیں قریباً آڑا ترچھا ہو رہا تھا۔ اگر اس طرف رُخ بدل کر باقاعدہ پوزیشن لیتا تو اس بات کا خطرہ تھا کہ آنے والا آہٹ لے کر خبردار نہ ہو جائے۔ مَیں کچھ ایسے زاویے سے زمین پر لیٹا تھا کہ رُخ بدلتے بدلتے گولیوں کی بھینٹ چڑھ جاتا۔

آنے والے کو شاید اس بات کا یقین تھا کہ یہاں سامنا دوست ہی سے ہو گا۔ اسی لیے وہ بے دھڑک تمام خطرات بالائے طاق رکھے نمایاں ہو گیا تھا۔ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی میرے منہ سے بے اختیار سکھ کی لمبی سانس خارج ہوئی۔ یہ ہمارا ساتھی تھا۔ اس نوجوان لیفٹیننٹ سے میرا تعارف بمشکل آدھا گھنٹہ پرانا تھا۔ اس کی فراخ پیشانی اور سینے کے نمایاں بال اس بات کی چغلی کھا رہے تھے کہ اس کی رگوں میں خالص خون دوڑ رہا ہے۔ یہ نوجوان میرے میزبانوں کا ٹروپ کمانڈر تھا جو مجھے لینے آئے تھے۔

ایک دوسرے کو دیکھتے ہی بے اختیار ہمارے ہونٹوں سے مسکراہٹ چپک گئی — موت کے جبڑے میں پھنس کر مسکرانے کی ایک اپنی لذّت ہے۔ اس کا احساس وہی جی دار کر سکتے ہیں جو موت کی گود میں بیٹھ کر اس پر قہقہے لگانے کے فن سے آشنا ہیں مَیں رینگتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

ہم دونوں نے وہیں لیٹے لیٹے اپنے اسباب کا جائزہ لیا۔ ایک جی تھری آٹومیٹک رائفل، اسٹین گن، دو چاقو، چند فالتو راؤنڈ اور پانچ ہینڈ گرنیڈ جو موجودہ صورت حال کے لیے بالکل ناکافی تھے۔ حالات کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے ہم نے وہاں سے چپ چاپ نکل جانے ہی کو غنیمت جانا اور فوجی تنظیم کے مطابق ایک دوسرے کے تعاقب میں رینگنے لگے۔ نوجوان لفٹین اس علاقے سے کچھ آشنائی رکھتا تھا اسی لیے وہ آگے آگے تھا، اور مَیں اس سے بمشکل دو تین گز کے فاصلے پر اس کے تعاقب میں۔ ہمیں دور سے دیکھنے پر یقیناً یہی احساس ہو سکتا تھا۔ جیسے دو اژدہے ایک دوسرے کے تعاقب میں

لپک رہے ہوں۔



قریباً پندرہ بیس گز کا فاصلہ طے کرنے پر ہم دونوں ہی ٹھٹھک کر رک گئے۔ ہمارے سامنے دو لاشیں پڑی تھیں۔ ہمارے دو ساتھیوں کی لاشیں۔ جن کے اعضا ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ ایک راکٹ ان کے نزدیک پھٹا تھا۔ جس نے پلک جھپکتے دو جیتی جاگتی زندگیوں کو مٹی کے کھلونوں کی طرح بکھیر دیا تھا۔ اُن کی پہچان کے لیے خوش قسمتی سے ان کے چہرے محفوظ رہ گئے تھے۔ دونوں شہیدوں کے نچلے دھڑ قریباً الگ ہو چکے تھے۔

یہ منظر ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ موت سے آنکھ مچولی ہمارا پیشہ تھا ہماری آنکھوں کے سامنے ہنستے کھیلتے ماؤں کے لال چپ سادھ لیتے تھے۔ ہم نے مکتی باہنی کی بربریت کا شکار ہونے والوں کی مسخ شدہ لاشیں سینکڑوں کی تعداد میں دیکھی تھیں، لیکن وہ کچھ ایسا عجیب نظارہ تھا کہ اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا۔ یہ دونوں نوجوان لفٹین کی کمپنی کے جوان تھے جنھوں نے ہمارے ساتھ جیپ سے چھلانگ لگائی تھی۔

لفٹین نے اس واقعے کا کچھ زیادہ ہی اثر قبول کیا تھا۔ وہ دونوں لاشوں کے قریب پہنچ کر گھٹنوں کے بل جھکا اور اس کی نظریں اپنے شہید ساتھیوں پر گڑ گئیں۔ وہ سب موت کی شاہراہ کے مسافر تھے۔ انھوں نے ایک دوسرے کی رفاقت میں موت اور زندگی کے کئی معرکے سر کیے تھے۔ اُن کا اچانک اس طرح بچھڑ جانا لفٹین پر بہت شاق گزرا۔

ایسے لمحے اچھے بھلے فوجیوں کو جذباتی کر دیتے ہیں۔ تب وہ پتھر کے بے حس بندوں سے عام انسان کے روپ میں لوٹ آتے ہیں۔ اپنے پیاروں کی موت پر اُن کا کلیجہ بھی پھٹتا ہے۔ یہ الگ بات کہ اُن کی چیخیں اندر ہی اندر دم توڑ جائیں کہ بہر حال وہ ایک ضابطے کے پابند ہیں۔ جس کے تقاضے انھیں ایک تنظیم میں باندھے رکھتے ہیں ـــــ اتنے منظم ہوتے ہیں کہ وہ مرتے بھی ڈھنگ سے ہیں ـــ وقار سے اور آن بان سے ـــــ!



مجھے تھوڑے عرصے کی جانگسل ریاضتوں نے خاصا گیان بہم پہنچا دیا تھا۔ ایسے سانحات پر صبر کرنا، ضبط کرنا، مجھے آگیا تھا۔ اپنے ساتھی کے اندرونی کرب کا اندازہ میں بخوبی کر سکتا تھا۔ میں نے اسی پوزیشن میں آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے اپنی جانب متوجّہ کیا تاکہ اُسے تشفّی دے سکوں۔

نوجوان لفٹین نے میری جانب چہرہ گھمایا۔ اُس لمحے اس کی آنکھوں میں بجلی سی چمک رہی تھی۔ اپنے پیاروں کی شہادت نے اس کی آنکھوں میں خون بھر دیا تھا۔ اس کے چہرے کے اعصاب تن گئے تھے۔ اُس لمحے اس کے سپاٹ چہرے پر سوائے دو دہکتی آنکھوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ شدّت ضبط سے اس کی کنپٹیوں کی رگیں اُبھر آئی تھیں ـــــ وہ شعلۂ جوالا بن چکا تھا۔ اُس کے انگ انگ میں الاؤ دہک رہے تھے۔ یقیناً وہ اپنے ساتھیوں کے قاتلوں کو بھسم کر دینا چاہتا تھا۔

اس لمحے میں اس سے آنکھیں چار کرنے کی ہمّت نہ پاتا تھا۔ پھر میرے ہاتھ کے دباؤ نے اُسے جھک جانے پر مجبور کر دیا۔ کیونکہ میری حسیات بہر حال بیدار تھیں اور میں نے اپنی سمت اٹھتے اُن قدموں کی آہٹ محسوس کر لی تھی۔ جو فائرنگ کا COVER لیے ہماری تلاش میں اس سمت آرہے تھے ـــــ اُن کے بے شمار قدموں کی آہٹیں ہمیں اُن کی صحیح تعداد کا احساس دلانے کے لیے کافی تھیں۔

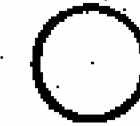
بہادری اپنی جگہ! مصلحت بھی بہر حال ایک حکمتِ عملی ہے۔ وقت کا تقاضہ یہی تھا کہ ہم اپنی جگہ کم از کم اس وقت تک دبکے رہیں جب تک ہمیں "مدد" نہ پہنچ جائے۔ لیکن یہ صرف میری سوچ تھی۔ میرا ہم کار اور ہی خیالوں میں گم تھا ـــــ قدرت نے اُسے ہاتھوں ہاتھ اپنے ساتھیوں کی شہادت کا بدلہ لینے کا موقع مہیّا کیا تھا۔ وہ اس سعادت سے کیونکر محروم رہتا۔ اُس نے نرمی سے میرا ہاتھ پکڑ کر الگ کر دیا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے طرزِ عمل پر معذرت چاہی ـــــ اُس لمحے اس کا چہرہ بالکل

پُرسکون ہو رہا تھا۔ اُس کی ساری درشتگی، سختی، کھنچاؤ ختم ہو چکا تھا۔ وہ پانچویں جماعت کا کوئی معصوم اور کھلنڈرا طالب علم دکھائی دے رہا تھا۔ آنکھوں کی چمک کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اس لمحے اس کے چہرے سے وہ شان مترشح تھی جس شان سے کوئی مقتل کو جاتا ہے اور حق یہ ہے کہ سلامتی اُسی شان کی رہتی ہے۔ واقعی جان تو آنی جانی شے ہے۔ اس کے عزائم تھے کہ اللہ اللہ! میں بھی تمام مصلحتیں بھلا کر اس کی راہ پر گامزن ہو گیا۔

میں نے مٹھی بند کر کے مخصوص اشارے سے اُس کے ولول کو آمنّا و صدقنا کہا اور ہم دونوں اپنے بیچ فاصلہ رکھ کر دائیں بائیں سرک گئے۔ میری اسٹین گن کندھے سے لٹک رہی تھی اور ہینڈ گرنیڈ حملے کی پوزیشن میں تھے۔ میری پلاننگ بظاہر یہی تھی کہ اُن لوگوں پر پہلے اچانک گرنیڈ پھینک کر انھیں لوکھلایا جائے۔

مکتی باہنی کی زیادہ تعداد غنڈہ اور بدمعاش عناصر پر مشتمل تھی۔ جنھیں صرف ہتھیار چلانے کی تربیت دے کر اس طرف دھکیل دیا جاتا تھا۔ یہ لوگ چونکہ فوجی زندگی کے نظم و ضبط سے آشنائی نہیں رکھتے تھے اس لیے زیادہ تر جگھٹوں کی شکل میں حملہ آور ہوتے تھے۔ اِلّا یہ کہ اُن کی کمان بھارتی فوج کا کوئی تجربے کار افسر کر رہا ہو۔

یہ بازو چونکہ میرے آزمائے ہوئے تھے۔ اس لیے مجھے اپنے مدِّمقابل سورماؤں کی اہلیت کی بخوبی خبر تھی ——— یہ حرکت بھی یقیناً مقامی اور نزدیکی دیہات میں موجود مکتی باہنی کے کسی گروپ نے ہی کی تھی۔ جو اپنا کام انجام دے کر فوراً انہی دیہاتوں میں اپنے ہمدردوں کے ہاں روپوش ہو جاتے ——— میں نے منصوبہ بندی اسی نقطۂ نظر کے پس منظر میں کی تھی۔



اب حملہ آور واضح طور پر دکھائی دینے لگے تھے ——— وہ واقعی ایک ریوڑ کی شکل میں ہماری طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ فی الوقت تو ہمارے سامنے پندرہ بیس کا ایک جتھا نمودار ہوا تھا اس کے علاوہ تعداد میں وہ لوگ کتنے تھے؟ اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا۔



——— اور پھر جیسے ہی وہ ہماری رینج میں آئے۔ [illegible] چانک خلاف توقع میرا شیر دھاڑتا ہوا اپنی کچھار سے نکلا اور اس کی آٹومیٹک گن کی لمبی سُرخ ز[illegible]ن شعلے اُگلنے لگی۔ میں نے بھی کسی ”معمول“ کی طرح برقی عمل کے تحت تین ہینڈ گرنیڈ وقفے وقفے سے اُن کی طرف لڑھکا دیئے۔ تینوں بروقت ان کے سروں پر پھٹے۔ اور ایک ایک کر کے وہ بے بس کتّوں کی طرح مرنے لگے۔ گرنیڈ ختم ہوتے ہی میں نے گن سنبھال لی تھی۔ جب اُس حصّے کا صفایا ہو چکا تو میں اپنے ساتھی کی طرف پلٹا۔ جس کی ہلکی سی کراہ، میں نے ابھی ابھی سُنی تھی۔ دوسرے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے کلیجے میں ہاتھ ڈال دیا ہو ——— اس کے سینے میں پانچ نمایاں سوراخ دکھائی دے رہے تھے جن سے بہتے خون نے اُس کی وردی رنگین کر دی تھی۔

اصل میں جوشِ غضب میں اس شیر دل لفٹین نے اُٹھ کر دشمن پر ”چارج“ کیا تھا جو جنگی حکمتِ عملی کے بالکل خلاف بات تھی اور کسی مرتے ہوئے مکتی باہنی کی اسٹین گن کا پورا برسٹ اس کے سینے کو چھلنی کر گیا تھا۔ میں نے اسے سہارا دے کر زمین پر لٹا دیا اور چاہا کہ اُس کی فیلڈ پٹی کھول کر زخموں پر پھاہا رکھوں لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور پانی مانگا۔ اپنی بوتل میں نے اس کے منہ سے لگائی۔ بمشکل دو گھونٹ پانی ہی اس کے حلق میں گیا تھا کہ اس کے بعد پانی باہر آنے لگا جو اس بات کا اشارہ تھا کہ اب اُس کا دمِ آخر ہے۔

مر جانا آسان ہے مرتے ہوئے انسانوں کو دیکھنے سے۔ خود آپ موت کی اذیتناکیاں برداشت کر سکتے ہیں لیکن جب آپ کے عزیز آپ کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہے ہوں تو یہ بات ممکن نہیں رہتی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت سے اُس دم میں دوچار تھا۔ مضروب نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ مجھے تشفی دے رہا تھا۔ یہ مر جانے کی ادا بڑی نرالی ہوتی ہے۔ مار ڈالتی ہے یہ دوسروں کو ——— آنکھوں کے اشارے سے اُس

نے مجھے جھک جانے کو کہا۔ شاید کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مَیں برقی عمل کے تابع جُھک گیا:

"اُدھر میری یونٹ کے لوگوں کو سلام بولنا۔ مجھے افسوس ہے ہم اپنے مہمان کی حفاظت نہ کر سکے۔ اگر ممکن ہو تو میری ماں کو پشاور خط لکھ کر بتانا کہ اس کے بیٹے نے اس کے دودھ کی لاج رکھی ہے۔ سینے پر گولیاں کھائی ہیں پیٹھ نہیں موڑی۔" اس کے بعد وہ اپنے گھر کے متعلق کچھ ہدایات دینے لگا۔

اُس کا چہرہ پُر نور تھا، پُر سکون۔ طمانیت کا ایک سمندر وہاں لہریں مار رہا تھا۔ وہ اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے کسی سفر پر جانے سے پہلے اپنے گھر والوں کو ہدایات دے رہا ہو۔ مَیں پتھر کا بُت بنا اُس پر ٹکٹکی جمائے گھٹنوں کے بل جھکا بیٹھا تھا اُس کی آواز لڑکھڑانے لگی۔ انگلیوں کی گرفت میرے ہاتھ پر کبھی ڈھیلی پڑتی کبھی سخت ہو جاتی "زندگی فی ــــ امان اللہ۔"

یہ آخری فقرہ تھا جو اس نے مجھ سے کہا۔ پھر وہ قرآنی آیات کی تلاوت کرنے لگا۔ اُس کی آواز آہستہ آہستہ بڑبڑاہٹ میں تبدیل ہو رہی تھی۔ نبض ڈوب رہی تھی۔ مجھے ہوش آگیا۔ مَیں نے اس کے ہاتھوں کو نرمی سے الگ کیا اور آرام سے اُسکے مقدّس پہلوؤں میں لٹا دیے۔ غازی مرد کی آنکھیں مُوند چلی تھیں۔ آخری مرتبہ اس نے آنکھیں کھول کر میری سمت دیکھا ــــ مسکرایا ــــ ہچکی لی اور اس کی مسکراہٹ امر ہو گئی۔

اُس کی آنکھیں ابھی تک کھلی ہوئی تھیں۔ مَیں نے موت کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ایسے بڑے نظارے کیسے تھے لیکن اس لمحے ضبط نہ کر سکا ــــ اُس جواں مرد کی آخری ادا نے مجھے رُلا دیا۔ مَیں سسکیاں لے کر رو دیا ــــ دل کا خون آنکھوں کے راستے باہر آنے لگا۔ اس لمحے نہ جانے کیوں میرا جی بے اختیار رونے کو چاہا تھا۔ شاید وہ غبار چھٹ رہا تھا۔ جس نے اندر ہی اندر اب جھکڑ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ لیکن رونا بھی تو شانِ مردانگی نہیں ــــ اس سوچ کے غالب آتے ہی میں نے اس کے پھٹے کانپتے ہاتھوں کی انگلیوں سے بند کیے۔ جھک کر اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ قمیص کی آستین سے



اپنے آنسو پونچھے۔ اُس کی گن دوبارہ لوڈ کی اور اس کے قریب سے ہٹ کر ایک جگہ پوزیشن لے لی۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ میں بجائے نوحہ کناں ہونے کے جان بچانے کی فکر کرتا اور اپنی راہ ناپتا لیکن ایسے غازی مرد کی لاش کو اکیلا چھوڑنا میری غیرت نے گوارا نہ کیا۔

ابھی بمشکل پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ مجھے مکتی باہنی کے چیخنے چلّانے اور گالیاں بکنے کی آوازیں دوبارہ سنائی دینے لگیں ــــ اب میری باری تھی۔ اس لمحے انتقام کی آگ نے مجھے شعلۂ جوالا بنا کر رکھ دیا۔ میری ساری توانائیاں، پھرتیاں، چستی چالاکی میرے وجود میں سمٹ آئی۔ بقایا ہینڈ گرنیڈ تھام کر مَیں وہاں سے تیز رفتار سانپ کی طرح رینگتا ہوا دونوں اطراف میں گھوم گیا اور واپس آگیا۔

میرے دائیں مورچے میں جی تھری، فائرنگ کی پوزیشن میں تیار دھری تھی۔ بائیں ہاتھ اسٹین گن اور ہاتھوں میں گرنیڈ میری حسِ سماعت پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ ان کے بے ہودہ نعروں کی آوازوں نے ایک واضح سمت اختیار کر لی تھی۔ مَیں نے پنجوں کے بل اُسی سمت کا رُخ کیا۔ سامنے سے کف اڑاتے بلوائیوں کا جتھا فصلوں کو روندتا اس طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ مَیں نے اُن کے رینج میں آتے ہی ہینڈ گرنیڈ اُچھالا جو اُن کے عین درمیان پھٹا اس کے ساتھ ہی مَیں جست لگا کر دوسری طرف کُود گیا ــــ اس طرف انھوں نے پسپائی اختیار کی تھی۔ دوسرے ہی لمحے دوسرا گرنیڈ ان پر قیامت ڈھا گیا۔ وہ چیختے چلّاتے یہاں ڈھیر ہونے لگے۔ مَیں نے ان کے مرنے کا نظّارہ نہیں کیا۔ اور اسی پوزیشن میں جی تھری کے نزدیک پہنچ گیا۔ شکار اب اُسی رُخ پر آ رہا تھا۔ رائفل نے انھیں چاٹنا شروع کر دیا۔ گولیاں ختم ہوتے ہی مَیں نے اُس سے نجات حاصل کی اور اپنی اسٹین گن اٹھا کر مخالف سمت کا رُخ کیا۔

بات یہ نہیں تھی کہ مَیں کوئی چھلاوہ تھا۔ جو انھیں نظر نہیں آ رہا تھا یا انھوں نے

جوابی فائرنگ نہیں کی تھی۔ انھوں نے مجھ پر گولیوں کا مینہ برسا دیا تھا۔ کچھ راکٹ بھی میرے دور و نزدیک پھٹ رہے تھے لیکن یہ میری تربیت کا صدقہ تھا۔ میں نے اتنی تیزی سے پینترے بدل بدل کر فائرنگ کی تھی کہ وہ لوگ میری صحیح پوزیشن کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے ذہن میں یہ بات بھی آ گئی تھی کہ مقابلے پر میں اکیلا نہیں بہت سے لوگ ہیں کیونکہ اُن پر دو مختلف گنوں کی فائرنگ ہوئی تھی اور دو مختلف پوزیشنوں سے ان پر گرنیڈ پھٹے تھے۔ اگر وہ ہمت کرتے تو "چارج" کر کے مجھے بھی میرے ساتھیوں کا ہم نوا بنا دیتے۔ لیکن وہ کوئی ایسے مجاہدینِ آزادی تو تھے نہیں جن کے سامنے رتبۂ شہادت پر فائز ہونے کے لیے کوئی واضح مقاصد موجود ہوتے۔ اور نہ ہی ان لوگوں میں اتنا حوصلہ تھا کہ وہ انفرادی شجاعت کا مظاہرہ کر سکتے۔

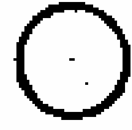
مجھے اپنے پاس موجودہ راؤنڈ کی کمی کا بخوبی احساس تھا اسی لیے اب میں رُک رُک کر اور جگہ بدل بدل کر فائرنگ کر رہا تھا۔ میری حتی الوسع کوشش یہی تھی کہ میری کوئی گولی ضائع نہ جائے اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔ حملہ آور غیر منظم ضرور تھے لیکن بے وقوف اتنے زیادہ بھی نہیں تھے۔ جتنا میں نے اندازہ لگایا تھا۔

جلد ہی وہ زمین پر لیٹ کر فائرنگ کرنے لگے اور میرے گرد اگرد گھیرا ڈال لیا۔ اُن کا ایک کمانڈر چلاّ چلاّ کر اور گالیاں دے دے کر انھیں منظم کر رہا تھا۔ اُسی نے انھیں ایک نیم دائرے کی شکل میں زمین پر لٹا دیا تھا۔ میں محاصرے کی حالت میں کب تک لڑ سکتا تھا؟ بالآخر گولیاں ختم ہو جاتیں اور میں اُن موذیوں کے ہتھے چڑھ جاتا۔

وہاں گرفتاری کا تصور تو سرے سے تھا ہی نہیں۔ وہ کسی ملک کی باقاعدہ فوج نہیں تھے۔ نہ ہی ایسے مہذب لوگ تھے کہ میں انہیں جنیوا کنونشن کے رولز پڑھانے شروع کر دیتا۔ مجھے علم تھا کہ میرے قابو میں آتے ہی وہ میری تکا بوٹی کر ڈالیں گے ۔ میری شدید خواہش تھی کہ زندہ ان لوگوں کے ہاتھ آنے سے کسی کی گولی سے شہادت پا جاؤں ــــــــ



اور جب آدمی اس حد سے آگے بڑھ جائے تو وہ ماورائی مخلوق بن جاتا ہے۔ یہ کارنامے جو انجام پاتے ہیں ان کا سبب شاید جوانوں کا حد سے زیادہ بڑھا ہوا "مورال" ہی ہوتا ہے ورنہ زندگی کسے پیاری نہیں اور وہ لوگ جو کسی "آنسہ" سے محبت کرتے ہوں انھیں تو زندگی سے کچھ زیادہ ہی لگاؤ ہو جاتا ہے۔



اس لمحے میرے پاس صرف ایک لوڈ میگزین اور چند فالتو راؤنڈز باقی رہ گئے تھے جب پردۂ غیب سے ایک عجیب معجزے نے ظہور پایا۔ میرے عقب سے آسمان نے چنگھاڑنا شروع کیا اور جب بے اختیار گردن موڑ کر میں نے اس سمت دیکھا تو احساسِ تشکر سے دل بھر آیا۔ یہ آرمی ایوی ایشن کا ہیلی کاپٹر تھا! ایسے ہیلی کاپٹر عموماً زخمی یا پیغامات ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ موجودہ سنگین حالات کے پیشِ نظر ایسے ہیلی کاپٹروں میں گنز نصب کر دی گئی تھیں اور یہ ایک طرح سے "ریسکیو آپریشن" بھی انجام دیتے تھے۔

پائلٹ نے شاید دُور ہی سے یہ ہنگامہ دیکھ لیا تھا اس نے فوراً پیچھے پیغام بھیجا اور واپس جا کر مدد لانے کے بجائے پیغام بھیجنے پر اکتفا کیا اور خود میری عملی مدد کو آ گیا جس کا اندازہ میں نے اس طرح لگایا کہ اب ہیلی کاپٹر اونچا اٹھ کر گولیوں کی رینج سے باہر نکل گیا تھا۔

گھیرے میں آئے ہوئے ساتھی کو بچانے کے لیے یہ انتہائی دلیرانہ اقدام تھا۔ کیونکہ اس طرح گن شپ ہیلی کاپٹر کا میدانِ جنگ میں کود جانا بڑا عجیب سا دکھائی دیتا ہے۔ میں نے بھی انتہائی خطرہ مول لیتے ہوئے آسمان کے رُخ مخصوص انداز میں فائر کرتے ہوئے اُسے اپنی پوزیشن سے آگاہ کیا۔ کیونکہ ہمارے پاس اس کے علاوہ رابطے کا اور کوئی ذریعہ میسّر نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی اگر تیزی سے چھلانگ لگا کر پوزیشن نہ

بدلا لیتا تو حملہ آوروں کی گولیاں مجھے ہڑپ کر جاتیں۔ پائلٹ نے ہیلی کاپٹر کے "ڈپر" روشن کرتے ہوئے مجھے کاشن دیا کہ اس نے میرا پیغام وصول کر لیا ہے اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے پہلو پر جھکتے ہوئے یکدم نیم قلا بازی کھائی اور ترچھا ہو کر ایک دائرہ بناتا میرے گرداگرد گھوم گیا۔ اُس کی گنشز کا رُخ زمین کی طرف تھا۔ آٹومیٹک برین گنوں سے نکلنے والی گولیوں کی بوچھاڑ نے حملہ آوروں میں سے تین چار کو پہلے ہی حملے میں شکار کر لیا۔ پائلٹ کی مہارت اور فنکارانہ انداز میں فائرنگ نے مجھ سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ بے اختیار اُس کے لیے میرے منہ سے نعرۂ تحسین بلند ہوا۔ دوسرے چکر پر اُس نے دائرے کا درمیانی فاصلہ کچھ اور بڑھا دیا اور تین چار اور غنڈے ڈھیر ہو گئے۔ اس حملے نے تو اُن کی کمر بالکل توڑ کر رکھ دی اور وہ منتشر بھیڑیوں کی طرح جو اچانک شیر کی دھاڑ سن کر خوفزدہ ہو جائیں، ایک ہی سمت میں منہ اٹھا کر بھاگنے لگے۔

ان بھاگتے خونخوار بھیڑیوں کو میرے مسیحا نے یوں ہی نہیں چھوڑ دیا تھا۔ اُس کے پہلوؤں سے جھانکتی برین گنوں نے حق نمک خوب خوب ادا کیا ــــ کئی بھاگتے درندے چیختے چلاتے اُن کی بھینٹ چڑھ گئے۔

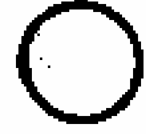
فاتحانہ مراجعت پر پائلٹ خاصا نیچے آ گیا۔ میں بھی اب بے دھڑک اٹھ کھڑا ہوا اور اسٹین گن لہرا کر اُسے اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگا۔ اُس نے میرے نزدیک پہنچ کر چاہا کہ رسّی پھینک کر مجھے اوپر اٹھا لے لیکن میں نے انکار کر دیا جب تک اپنے ساتھی کی لاش میں نہ دیکھ لیتا میرے لیے اُسے اکیلا چھوڑ کر جانا ناممکن تھا۔

ہیلی کاپٹر نے دور و نزدیک کا چکر لگا کر صورت حال کا جائزہ لیا اور جب اُسے یقین آ گیا کہ اب معاملہ ٹھیک ہے تو اپنی منزل کی سمت چل دیا۔ دوسری وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اُس نے میری مدد کو آتے کنوائے کو بھی دیکھ لیا تھا۔

مجھے وہ نوجوان پائلٹ کبھی نہ مل سکا۔ اُس سے ملنے کی شدید خواہش کا المیہ اُس



کی شہادت کی خبر سُن کر اختتام کو پہنچا کیونکہ اگلے سات آٹھ روز وہ ایک انتہائی اہم مشن انجام دیتے ہوئے اپنی مراد کو پہنچا ــــ ایک حسرت سی آج تک دل میں انگڑائیاں لے رہی ہے کہ کاش! میں اپنے محسن کا شکریہ ہی ادا کر سکتا۔



تھوڑی ہی دیر بعد وہ آ گئے ــــ جوانوں سے مسلح دو ٹرک ہماری مدد کو آ گئے تھے۔ انھوں نے چند منٹ بعد ہی ہمارے آخری شہید کا جسدِ خاکی بھی ڈھونڈ نکالا وہ سب مرتبۂ شہادت پر سرفراز ہو گئے تھے اور میں بچ نکلا تھا۔ ان حالات میں مرنے والوں پر رشک آیا کرتا ہے۔ ہم نے دکھی دل سے اُن کی لاشیں اٹھائیں اور غم زدہ ہیڈ کوارٹر کی طرف چل دیے۔ شہیدوں کی کمپنی کے جوانوں کو پہلے ہی سے اُن کی شہادت کی خبر ہو گئی تھی۔ وہ "فال اِن" ہو کر اپنے جانثاروں کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کھڑے تھے! بڑے اندوہناک مناظر ہوتے ہیں یہ۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اپنے وجود کا کوئی حصہ کٹ کر الگ ہو گیا ہو۔ سچی بات ہے کہ میں خود کو نڈھال اور شرمندہ سا محسوس کر رہا تھا۔

یہ کتنے شرم کی بات تھی کہ میرے پیارے میرے سامنے مر گئے اور میں زندہ رہا! اور اُن لمحات نے جب شہیدوں کی لاشیں ایک قطار میں رکھی گئیں۔ مجھے پھر رُلا دیا۔ میرا ہی نہیں تمام جوانوں کا یہی حال تھا ہم سب خوفزدہ تھے، سوگوار تھے، خود کو بکھرا بکھرا محسوس کر رہے تھے۔ ہمارے ذہنوں میں بار بار ایک ہی سلگتا ہوا سوال سر اٹھا رہا تھا: آخر یہ کرودھ کی چڑھی آندھی کب اُترے گی؟ کب وہ دور آئے گا جب ہم خود سے کٹ جانے والوں کو یقین دلا سکیں گے کہ وہ ہمارا ہی حصہ ہیں؟

"یہ لوگ، یہ ہمارے لوگ ہماری جان کے دشمن کیوں ہو رہے ہیں؟"

بمشکل دو فیصد لوگ اُن ورغلائے ہوؤں میں سے ایسے تھے جنھیں "سنگرام" کے معانی آتے ہوں۔ یہ کون سی آزادی مانگ رہے تھے؟ کس سے رہائی اُن کا مقصود تھا؟

انھیں کس نے اپنا غلام بنا رکھا تھا؟

——— ہم تو اُن کے لیے مٹے جا رہے تھے۔ ہم تو ہزاروں میل سے اُن کی مدد کو آئے تھے۔ ہم تو انھیں ہر آفت سے بچانا چاہتے تھے۔ آندھیوں سے، طوفانوں سے، باڑھ سے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے مشترک وطن سے ہماری تو شدید خواہش ہوتی تھی کہ ہماری جانیں کسی بھی طور ان کے کام آسکیں۔ ہم ان کی خدمت کو سعادت جانتے تھے۔ ہم تو ہر لمحہ، ہر دم، ہر گھڑی اُن کے کسی بھی درد کا مداوا کرنے کے منتظر رہتے تھے۔ پھر یہ لوگ آخر ہمارے خون کے پیاسے کیوں ہو رہے تھے؟ ہمیں دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں نفرت کیوں جاگ اٹھتی تھی۔ کیوں؟ آخر یہ سب کچھ کیا تھا؟

سوچتے سوچتے ہمارے ذہن چٹخنے لگتے ہم سیدھے سادے فوجی تھے۔ سیاست کی ہیرا پھیریاں ہمارے علم میں کہاں ہیں؟ ہم تو بس ایک حکم پر مرنا مارنا جانتے تھے۔ ہمیں کب یہ خبر تھی کہ ہماری موت کا سامان تو ہزاروں میل کے فاصلے پر ائرکنڈیشنڈ ڈرائنگ روموں میں بند سیاست دانوں نے پہلے ہی سے کر رکھا ہے۔ نفرت کی جس فصل کو کاٹنے کا ناگوار فریضہ ہم انجام دینے جا رہے تھے، وہ کسی ولایتی کھاد سے کاشت شدہ دلوں میں سر نکالنے والی فصل نہ تھی بلکہ اس کی آبیاری تو سالوں سے کی جا رہی تھی۔ ذہنوں پر صوبائی عصبیت کے ہل تو قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی سے چلنے شروع ہو گئے تھے۔ صوبائی تعصب، لسانی تعصب، معاشی و معاشرتی تعصب، کیسے کیسے زہریلے ناگ پھنکار رہے تھے۔ بھولے بھالے سیدھے سادے مانجھیوں کے دل و دماغ میں۔

"تمھیں لوٹا جا رہا ہے ——— کھایا جا رہا ہے ——— تم جو تخلیق کار ہو، تم جو اپنے خون پسینے سے سنہرے ریشے کو جنم دے رہے ہو ——— تمھاری جانفشانیوں کا ثمر تم تک کبھی نہیں پہنچ پائے گا۔ کبھی نہیں، جب تک کہ تم خود آگے بڑھ کر اپنا حق نہ چھین لو۔"

کیسے کیسے ہلاکت آفریں نظریے تھے جو ایک لمبے عرصے سے اُن کے معصوم اذہان میں



ٹھونسے جا رہے تھے۔ یہ زہر اب ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہو چکا تھا۔

وہ بدقسمت نسل جس کی آنکھ ہی متعصب ماحول میں کھلی۔ جو عصبیت کی زہرناک فضاؤں میں پلی بڑھی۔ جس کے روئیں روئیں میں انتقام کی چنگاریاں سلگائی گئیں۔ وہ ہمارے خون کی پیاسی کیوں نہ ہوتی؟ وہ ہمارا وجود یہاں اپنی دھرتی پر کیونکر برداشت کرتی۔؟

خدایا کیا اندھیر مچ رہا تھا۔ اشکِ ندامت سے لبریز آنکھیں، احساسِ ذلت سے پشیمان پیشانیاں بارگاہِ ایزدی میں جھک جھک جاتیں، لیکن سجدے باریاب نہ ہوئے۔ مشیت الٰہی نے ہم سے گویا رُخ موڑ لیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اب ہم پر "حد" نافذ ہو چکی تھی۔ اعمال رنگ لا چکے تھے۔ کاتبِ تقدیر کا قلم اپنا فیصلہ لکھ چکا تھا پھر کس کی مجال تھی کہ اس کے لکھے فیصلے کے سامنے دم مار سکے؟

چھاؤنی کے قبرستان ہی میں شہیدوں کی تدفین ہوئی۔ تدفین تک میں اُن کے ساتھ ساتھ رہا ——— آخر دم تک ساتھ نباہنا ہماری عادت جو بن چکی تھی۔

# دو دو ہاتھ

رپورٹ داخل کرنے میں تین چار گھنٹے لگ گئے ـــــ شام تک فراغت نصیب ہوئی! اپنے کمرے میں پہنچا تو ایک صاحب یہاں میرے منتظر تھے ـــ :

یہ میرے "سر" تھے ـ!

"ہیلو بوائے کیسے ہو؟" انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں میری جانب گھومتے ہوئے کہا۔

"فائن سر" اور میں کیا کہتا۔ میرے جذبات ایک عالم کی نظروں سے اوجھل رہ سکتے تھے لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ میں اپنے "سر" سے اپنی جذباتی یا ذہنی حالت چھپا لوں۔ انھوں نے چند منٹ ہی میں میرے اندر ہونے والی ٹوٹ پھوٹ کی شدت کا اندازہ کر لیا تھا۔

"دیکھو ینگ مین پہلا اصول تو یہ یاد رکھو کہ فوجی سوچا نہیں کرتے۔ عمل کرتے ہیں عمل۔ اشارہ ملنے پر برق کی طرح عمل پیرا ہوتے ہیں۔ سوچیں ذہن پر گرفت کر لیں تو آدمی قنوطی ہو کر رہ جاتا ہے۔ مختلف دھارے سمندر کی لہروں کی طرح اس کے ذہن کی کشتی کو مختلف سمتوں میں بہا لے جاتے ہیں۔ تب بندے کی اپنی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اس لیے میرے دوست! ـــ زیادہ سوچا نہ کرو۔ جو ہوتا ہے وہ بہر حال ہو کر رہے گا ہمارے بس میں "ہونی" کو روکنے کے لیے جو کچھ ہے وہ کر گزریں گے ـــــ تمہارا تعلق ایک



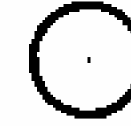
نظریاتی ملک کی فوج سے ہے۔ ہم لوگ اپنے نظریے کے تحفظ کے لیے لڑتے ہیں نتائج سے بے پروا ہو کر ـــ" میرے "سر" بولتے رہے۔ میں سر جھکائے سنتا رہا۔

ـــــ میں اُن سے یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ حضورِ والا آپ کی طرح میری آدھی عمر میدانِ کارزار اور چھاؤنیوں میں نہیں گزری۔ میں تو عام سا پاکستانی محبِ وطن نوجوان ہوں۔ جس کی خاندانی روایات اُسے فوج تک لے آئیں اور اس دَور میں جو سرد جنگ کے عروج کا دور تھا اُس کی ٹریننگ مکمل ہوتے ہی اُسے میدانِ کارزار کی طرف دھکیل دیا گیا۔ میں شاہین کا وہ بچّہ تھا جس کے بال و پر گھونسلے میں نہیں بلکہ کانٹے دار جھاڑیوں میں اُگے تھے اور جو نمو پاتے ہی میدانِ عمل میں کُود گیا تھا۔

بدقسمتی سے میں کبھی مکمل فوجی نہ بن سکا! میں بھی عام انسانوں کی طرح سوچتا تھا۔ میرا دل بھی دُکھ پر کڑھتا، سُکھ پر خوش ہوتا تھا۔ حالات مجھ پر بھی اسی طرح اثر انداز ہوتے تھے جیسے ایک عام پاکستانی پر، وقت نے، حالات نے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تربیت نے مجھے پتھر کی چٹان ضرور بنا دیا تھا لیکن ایسی چٹان جس پر موسموں کی سختیاں بہر طور اثر انداز ہوتی تھیں۔ حادثات کی تند لہروں نے اِس پر کائی سی جما دی تھی ـــــ یہ بڑا اندوہناک سانحہ تھا لیکن اس سے فرار کی راہ نصیب نہیں تھی۔ جس لمحے میرے "سر" مجھے صبر کی تلقین کر رہے تھے۔ مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ ان کے دل و دماغ کی حالت کیا ہو رہی ہے۔ ان کے الفاظ، اُن کے جذبات کی عکاسی ہرگز نہیں کر رہے تھے۔ اُن کی حیثیت اُس باپ کی سی تھی جو اپنے جوان بچّے کی موت پر اپنے گھر والوں کو صبر کی تلقین کر رہا ہو ـــــ جس کا اپنا دل خون کے آنسو رو رہا ہو۔

ہم کافی دیر تک ایک دوسرے کو پُرسہ دیتے رہے، پھر میس میں چائے پینے چلے گئے شام کو میری کمپنی سے پیغام آگیا: مجھے ڈھاکہ جانا تھا۔ ایک ڈکوٹا ہوائی جہاز ہوائی اڈے پر ہمارا منتظر تھا۔ میں اور میری کمپنی کے دو اور جوان جو "خصوصی خدمات" انجام دینے یہاں

آئے ہوئے تھے۔ اُس میں سوار ہو کر رات کی تاریکی میں ڈھاکہ کی طرف پرواز کر گئے۔



ایئرپورٹ پر میرے کرنل صاحب ہمارے استقبال کو موجود تھے۔ انھوں نے ہمیں بے اختیار باری باری سینے سے لگا لیا۔ یہ دونوں جوان بھی کسی خصوصی مشن سے واپس لوٹے تھے۔ حفاظتی اقدامات اور خصوصی تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ہمیں ایک دوسرے کی خدمات سے آگاہ نہیں کیا جاتا۔ جانے والے ایک دوسرے سے ملتے بھی نہیں کہ مبادا اُن کے منہ سے نکلنے والی کوئی غیر ذمّے دارانہ بات دوسرے کے لیے باعثِ مصیبت بن جائے۔

کرنل صاحب کی معیت میں ہم ایک جیپ میں سوار ہو کر کمپنی ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہو گئے۔ جیپ کی حفاظت کے لیے ایک ٹرک آگے اور ایک پیچھے جا رہا تھا۔ اس کے باوجود اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ ہمارا سفر محفوظ رہے گا۔

مَیس کے دروازے پر ہمارا استقبال دوسرے ساتھیوں نے کیا جو بے چینی سے ہماری آمد کے منتظر تھے۔ حسبِ توقع ان میں سے کچھ چہرے غائب تھے ـــــ یہ وہ لوگ تھے جنھیں منصبِ شہادت پر سرفرازی نصیب ہو چکی تھی ـــــ وہ ہنستے کھیلتے رخصت ہوئے اور شہرِ خموشاں کے مکین بن کر، اب اسی چھاؤنی کی حدود میں میٹھی نیند سو رہے تھے۔ سب سے پہلے ہم اُن کی لحد پر پہنچے۔ فاتحہ کو ہاتھ اٹھے تو ان کے سوہنے سجیلے چہرے آنکھوں میں ہلکورے لینے لگے ـــــ آنکھیں بے اختیار اُن کے حضور آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرنے لگیں۔

کمرے میں پہنچا تو خطوط کا ایک پلندہ میرا منتظر تھا۔ یہ ماں کے خطوط تھے۔ والد کے خطوط تھے۔ اپنے پیاروں کے خطوط تھے! انھیں مغربی پاکستان میں اخبارات کے ذریعے عجیب عجیب پریشان کُن خبریں پڑھنے کو ملتی تھیں ـــــ وہ سب پریشان تھے۔



سب دعا گو تھے۔ انھوں نے لکھا تھا: ان کی بھوک پیاس اڑ گئی ہے۔ وہ سوتے جاگتے اپنی سونا دھرتی کے سپنے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے مجھ سے التجائیں کی تھیں کہ میں اُن کی لاج رکھوں ـــــ دشمن کو کچل کر رکھ دوں۔ وہ چاہتے تھے کہ ملک کی سالمیّت کے خلاف اٹھنے والے ہاتھوں کو کاٹ کر پھینک دوں۔ میلی نظروں سے دیکھنے والی آنکھیں حلقوں سے نکال کر باہر پھینکوں ـــــ!!

"کتنے بھولے لوگ تھے یہ ـــــ!"

"کتنے معصوم لوگ تھے یہ ـــــ!"

اُف میرے خدا! مَیں انھیں کیا لکھتا؟ تسلیوں کے پھاہے اُن کی روحوں کے گہرے گھاؤ پر کب تک رکھتا؟ کبھی کبھی تو جی چاہتا اس منافقت کو جہنّم واصل کر کے صاف صاف اُن سے کہہ دوں: کہ جو کچھ تم سُن رہے ہو ـــــ جان رہے ہو۔ وہ تو اُس کا عشرِ عشیر بھی نہیں، جو یہاں رونما ہو رہا ہے۔

لیکن میں یہ سب کچھ کبھی نہ لکھ پایا ـــــ ہم اپنے پیاروں کو تسلیّاں ہی دیتے رہے اور وہ لُٹ گئے۔ مستقبل کے مورّخ کا قلم جب ہمارے کردار کے اس پہلو پر اُٹھے گا تو خدا جانے وہ ہمارے اس فعل کو اچھائی سے تشبیہہ دے گا یا برائی سے؟ یقیناً اس کے لیے بڑا تکلیف دہ ہو گا۔

وہ رات کروٹوں کی نذر ہو گئی! صبح اٹھ کر مَیں نے جیپ نکالی اور درِ محبوب کا رُخ کیا۔ راستے دن کو کسی حد تک محفوظ ہونے لگے تھے۔ ایک محفوظ اور قدرے لمبے راستے کے ذریعے مَیں محمد پورہ پہنچ گیا۔ مَیں نے جیپ گلی کی نکڑ پر کھڑی کر دی اور دل کی بے تابو دھڑکنوں کو سنبھالتا پیدل ہی عثمان کے گھر کے دروازے تک آ گیا ـــــ کتنے خوبصورت لمحے تھے وہ جب مَیں نے بند کواڑوں پر دستک دی۔ اس سمے میرے دل میں شدت سے یہ خواہش جاگزیں تھی کہ دروازہ آلنہ ہی کھولے اور وہ مراد بر آنے کی گھڑی تھی۔

مانوس قدموں کی آہٹ میری سماعت سے ٹکرائی کہ اس لمحے میری تمام حسیات، حس سماعت میں سمٹ آئی تھیں اور دروازہ کھُل گیا۔

میرے سامنے آنسہ کھڑی تھی ـــــ!

آرزوؤں کا سجیلا پیکر بنی سارناتھ کے مندر کی دیوداسی شاید صحن میں بیٹھی بال سُکھا رہی تھی۔ جب میں نے اس کے دروازے پر دستک دے دی۔ اُس کی گھنیری زلفوں کے اجالے شانوں پر پھیلے ہوئے تھے جن سے موتی ٹپک کر پھسل پھسل جاتے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں میں چاندنی اترنے لگی۔ اُس کے نینوں کی جوت جل اٹھی۔ پلکوں پر اجالے جھک آئے، ہونٹوں کی کپکپاہٹ گیت میں ڈھل گئی "علی آپ ـــــ!"

"ہاں میں ہوں آنسہ ـــــ میں لوٹ آیا ہوں" میں نے حتی الوسع خود پر قابو پائے رکھا اور وہ خاموشی سے حیرت و خوشی کے ملے جلے تاثرات لیے مجھے دیکھتی رہی۔

شاید اُسے اپنی بصارت پر یقین نہیں آ رہا تھا ـــــ وہ یہ سوچنے میں بھی حق بجانب تھی۔ بصارتوں اور بصیرتوں نے اب تک اُسے کیا کیا دھوکے نہ دیئے تھے۔

میرا جی چاہا اُس لمحے آگے بڑھ کر اُسے اپنے بازوؤں کے حصار میں جکڑ لوں اور بتاؤں کہ آنسہ زمین کی کششِ ثقل ختم ہو گئی ہے ـــــ ہر شے واپسی کا سفر کر رہی ہے۔ سب اپنے اصل کی طرف لوٹ رہے ہیں، اپنے اپنے مقصود کی طرف اور میری منتہیٰ تم ہو ـــــ تم ـــــ!

"خیریت تو رہی ـــــ کب آئے آپ؟" اُس نے شعور کے جہانوں کو لوٹتے ہوئے کہا۔

"رات ہی پہنچا تھا ـــــ"

"آئیے نا ـــــ اندر آئیے" ـــــ اُس نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا اور ـــــ میری دھڑکنوں پر چلتی میری راہنمائی کرتی وہ مجھے اس کمرے تک لے آئی جسے ڈرائنگ روم



کہنا ہی مناسب ہو گا۔

"بیٹھیے ـــــ" اُس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں بیٹھ گیا اور آنسہ بھی میرے سامنے ہی بیٹھ گئی۔

ـــــ محبت گرامر کی کسی کتاب کا نام نہیں۔ یہ ردیف قافیے کی قیود سے آزاد بحرِ بیکراں ہے۔ اس کی لذتوں سے فیضیاب ہونے والے زبانوں اور لہجوں کے پابند نہیں ہوتے۔ خود بخود زندگی کے قطرے قطرے میں ناچتی لہریں ایک دوسرے سے ٹکرا کر منفی اور مثبت کی حجت پوری کر دیتی ہیں۔ آنکھیں آنکھوں کو پیغام پہنچا دیتی ہیں اور دل کے راستے سفر کرتی یہ موجیں جسم کے انگ انگ میں پھیل جاتی ہیں۔ تب انبساط کی ایسی جلترنگ من مندر میں بجتی ہے کہ روح اُس کی گنگناہٹ سے وجد میں آ کر رقص کناں ہو جاتی ہے۔ بشریت کا ادراک تبھی ہوتا ہے۔

میں بھی اس وقت کسی ایسی ہی کیفیت کا شکار تھا۔ جو فہم سے بالاتر، ناقابلِ بیان، حدِ ادراک سے پرے کوئی شے تھی ـــــ آنسہ کے قرب نے مجھے نئے جہانوں کی سیر کروا دی تھی۔

"کہاں ہیں سب گھر والے؟" میں نے خاموشی کے طلسم کو توڑنے کی کوشش کی۔

"یوسف بھائی کو کل تین گولیاں لگی ہیں۔ گھر ہی پر اُن کا علاج ہو رہا ہے اور عثمان بھائی پچھلے تین روز سے کسی مشن پر گئے ہیں، امی، ابا وہاں گئے ہوئے ہیں" اُس کا لہجہ کچھ سوگوار سا ہو گیا۔

ـــــ میں خاموش ہو گیا۔ یوسف مقامی رضاکاروں کا کمانڈر تھا۔ اس نے ہمارے لیے بہت کام کیا تھا۔ سرفروشی کے کئی معرکے اس کی اور عثمان کی معیت میں انجام پائے تھے۔ اب وہ پیارا دوست بھی ہم سے جدا ہو رہا تھا۔ مجھے علم تھا تین گولیاں آٹومیٹک گن کی کھانے کے بعد کوئی کتنی دیر تک زندہ رہ سکتا ہے۔ خصوصاً یہاں کے حالات نے

تو کچھ زیادہ ہی حقیقت پسند بنا دیا تھا۔ مَیں چپ چاپ کمرے کے فرش پر نظریں جمائے سوچتا رہا۔ اُسے کیا کہتا۔

"آپ خیریت سے تو رہے نا!" آلنسہ نے بات کا رُخ بدلنے کی کوشش کی۔ اس نے یوسف کے زخمی ہونے کی خبر پر میرے سوگوار ردِّ عمل کو محسوس کر لیا تھا اور شاید یہ کوشش بھی کی ہو کہ تھوڑی دیر ہی کے لیے سہی ماحول کو خوشگوار تو بنا دے۔

"ہاں" ــــــ مَیں نے مختصر سا جواب دیا۔

"کوئی اطلاع تو دی ہوتی آپ نے ــــــ" مَیں نے نظریں ملائیں اُس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ اُس لمحے آلنسہ کا لہجہ مجھے کھا گیا۔

"جہاں مَیں تھا وہاں سے اطلاع دے ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر تم مجھ سے دُور کہاں تھیں" مَیں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔

"علی! ایک بات کہوں آپ سے ــــــ عموماً ایسی باتیں کہی نہیں جاتیں لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی یہ بات مَیں آپ سے چھپا نہیں سکتی ــــــ" اس نے اپنے ساڑی کے پلو کو انگلی پر مروڑا۔

"کیا ــــــ کہہ ڈالو ــــــ" مَیں نے بے چینی سے پوچھا۔

"مجھے یہ سب کچھ بڑا عجیب سا لگتا ہے ــــــ بڑا انہونا سا ــــــ کبھی کبھی تو اس پر خواب کا گمان گزرتا ہے۔ اصل میں زندگی نے آج تک ہمیں کوئی سکھ دیا ہی نہیں۔ شاید اس لیے اتنی بڑی خوشی مل جانے پر یقین نہیں آتا ــــــ بس یوں لگتا ہے۔ جیسے کسی روز ایک دم یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا ــــــ ہماری محبّت کا یہ مختصر سا تاج محل دھڑام سے زمین بوس ہو جائے گا....." بالآخر اس نے اپنے لاشعور میں چھپے خوف کا اظہار کر ہی دیا۔

"نہیں آلنسہ ــــــ تم یہ سب کچھ ذہن سے نکال دو۔ یہ اتنا ہی سچ ہے جتنا آج رات کے بعد کل کی صبح کا طلوع ہونا ــــــ" اپنی آواز کی کپکپاہٹ میں خود محسوس کر سکتا تھا۔



"ہاں علی! صبح تو ضرور آتی ہے لیکن اجالوں کا انتظار جانے کس کس کی جان لے گا" وہ تقریباً روہانسی ہو گئی۔

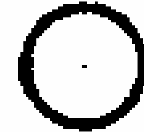
"ارے بابا چھوڑو! اتنے دنوں بعد ملی ہو اور ایسی باتیں ــــــ"

ــــــ مَیں دراصل نہیں چاہتا تھا کہ یہ غنیمت لمحے بھی ہمارے وسوسوں کی بھینٹ ہی چڑھ جائیں ــــــ جہاں اگلے پل کا گمان نہ ہو، وہاں ایسی مقدّس گھڑیوں کے دوبارہ نصیب ہونے کی صرف دعا ہی کی جا سکتی تھی۔

"اور کیسی باتیں کروں؟" اُس نے اپنی بھیگی پلکیں اٹھا کر قیامت ڈھائی۔

"کوئی رومانٹک سی گفتگو کرو نا" مَیں نے حتی الوسع کوشش کی کہ میرا لہجہ ذرا فلمی قسم کا ہو جائے۔

"اچھا جناب پہلے چائے لے آؤں آپ کے لیے پھر رومانٹک گفتگو بھی کر لیں گے" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میری اگلی بات سُنے بغیر باہر نکل گئی۔



مَیں اکیلا پھر سوچوں کے بھنور میں ڈوبنے ابھرنے لگا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ عثمان کہاں ہے؟ اگر وہ ڈھاکہ میں ہوتا تو مجھ سے ملنے ضرور آتا کیونکہ میرے اوسی صاحب کو میرے اور اُس کے خصوصی تعلقات کا علم تھا۔

لیکن میری سوچوں کا تانا بانا جلد ہی بکھر گیا ــــــ آلنسہ واپس آ گئی تھی۔

ــــــ اس نے اب اپنے بال سلیقے سے باندھ لیے تھے اور ساڑھی کا پلو دوپٹے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ بڑے قرینے سے اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے چائے کے برتن میرے سامنے جمائے اور چائے کی پیالیاں اپنے ہونٹوں سے لگائے ہم مستقبل کے سپنے بُننے لگے۔ مَیں نے ایک مرتبہ پھر اُسے اپنے گاؤں، وہاں کے لوگ، ان کی عادات، گھر بار سے متعلق بتانا شروع کر دیا۔ یہ سب کچھ مَیں اسے اتنی مرتبہ بتا چکا تھا

کہ اب اُسے حفظ ہونے لگا تھا۔

آلنسہ خود مجھ سے میرے گاؤں کی مختلف باتیں پوچھتی رہتی۔ اُسے مَیں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ہمارے گھر میں کتنے پیڑ ہیں اور اُن پر کون کون سا پھل لگتا ہے ——— لیکن نہ جانے کیوں مَیں نے اُسے جان بوجھ کر رضیہ کے متعلق کبھی کچھ نہ بتایا ——— اپنے گھر کے پچھواڑے میں رہنے والے باقی تمام لوگوں کا تعارف کرواتے ہوئے مَیں اکثر اُس کا ذکر گول کر جاتا تھا۔ اُس روز مَیں نے جانے کس جذبے کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُس کے سامنے رضیہ کا ذکر بھی کر دیا۔

"کمال ہے آپ نے آج تک تو یہ بتایا ہی نہیں تھا"۔ اس کا چونک پڑنا فطری سی بات تھی۔

"یہ کوئی ایسی خاص بات تھی نہیں! پھر مَیں نے ابھی گاؤں کے سارے نفوس کہاں گنوائے ہیں تمھیں ——— ابھی تو ہمارے گاؤں کے کئی لوگ باقی ہیں ———" مَیں نے لفظوں کا سہارا ڈھونڈا۔

"اچھا ——— مَیں تو کچھ اور ہی سمجھ رہی تھی"۔ آلنسہ کی مسکراہٹ نمایاں تھی۔

اُس روز دورانِ گفتگو آلنسہ نے اچانک ایک ایسی بات کہہ دی جس نے مجھے بھی تھوڑی دیر کے لیے بوکھلا دیا۔

"علی! کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم جلد ہی شادی کر لیں"۔ یہ فقرہ ادا کرتے ہوئے اُسے حجاب اور ہمّت کے جن جن پہاڑوں کو سر کرنا پڑا تھا وہ کچھ مَیں ہی جان سکتا تھا۔ یوں محسوس ہوا جیسے لفظ اس کے حلق میں پھنسے ہوں جنھیں وہ بڑی بے دردی سے کھینچ تان کر باہر نکال رہی تھی۔ اُس کی جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی، وہ یہی بات کہتی کیونکہ ہر عورت بنیادی طور پر کمزور ہے وہ جیسے ہی کوئی مضبوط حصار دیکھتی ہے۔ فوراً اُس میں مقیّد ہونے کی خواہش کرتی ہے تاکہ خود کو محفوظ کر لے۔



"آلنسہ مَیں تمہارے شکوک کو جھٹلاتا نہیں۔ تم ایسا سوچنے اور کہنے میں حق بجانب ہو لیکن اس بات کا جواب اتنا آسان نہیں کہ مَیں ابھی تمھیں دے دوں۔ ہم سب جس کیفیت کا شکار ہیں۔ مَیں اُسے بخوبی محسوس کر سکتا ہوں۔ مَیں تمھیں صرف ایک بات کا یقین دلاتا ہوں کہ حالات خواہ کیسے ہی ہو جائیں بشرطِ زندگی، کوئی دنیاوی طاقت ہمیں الگ نہیں کر پائے گی۔ یہ ایک مرد کا وعدہ ہے ——— ایسے مرد کا جسے اپنے کہے کی لاج رکھنے کا ڈھنگ آتا ہے ———" میری باتیں کچھ کھوکھلی سی تھیں لیکن بیچاری مظلوم لڑکی مطمئن ہو گئی۔ اُس نے صرف ایک مرتبہ نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا شاید یہ جواب اُسے حسبِ توقع نہیں ملا تھا اس لیے وہ کچھ زیادہ ہی رنجیدہ ہو رہی تھی۔ آنسو بے اختیار اُس کے گالوں پر بہہ گئے۔

مَیں کسی مقناطیسی عمل کا تابع ہو کر اپنی جگہ سے اٹھا اور اسے سینے سے لگا لیا۔ آلنسہ نے بھی ذرا بھر مدافعت نہ کی اور کمزور درخت کی ٹہنیوں کی طرح میرے بازوؤں میں جھول گئی۔

"کچھ دیر آلنسہ، کچھ دیر اور ——— یقین کرو اب تو مَیں تمھیں اپنا حصّہ جاننے لگا ہوں، اپنے جسم اور روح کا حصّہ۔ تم سے الگ رہنے کا تصوّر ہی میرے لیے بڑا اذیت ناک ہے"۔ میری آواز بے قابو ہو رہی تھی۔

"بہت دیر ہو گئی علی! وہ ہمیں مار ڈالیں گے! ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑے ہیں۔ روزانہ کسی نہ کسی کو مار ڈالتے ہیں وہ۔ یہاں کوئی محفوظ نہیں رہا"۔ اُس نے خوفزدہ بچّوں کی طرح روہانسی آواز میں کہا۔

مَیں اسے خود سے چمٹائے بے بسی سے اس کی پشت سہلاتا رہا۔ اس لمحے خود کو مَیں بُری طرح پھنسا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ میری اس اذیت ناکی کا خاتمہ باہر کا دروازہ کھُلنے کی آواز پر ہوا۔ آلنسہ آواز سُنتے ہی مجھ سے الگ ہو کر تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

چاچا اور چاچی آ گئے تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی سب کچھ بھول بھلا کر بے اختیار مجھے سینے سے باری باری چمٹا کر میری بلائیں لیں۔ میری اچانک آمد نے دونوں بوڑھوں کے مرجھائے ہوئے چہرے کھلا دیے تھے۔

"کیا حال ہے یوسف بھائی کا؟" مَیں نے چھوٹتے ہی دریافت کیا۔

دونوں ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے۔ شاید میرے سوال نے انھیں واپس مرتی مارتی دنیا میں دھکیل دیا تھا۔

"بیٹا ــــــ دعا کرو اللہ اسے صحت دے دے۔" ان کے گول مول جواب نے میرے اندیشوں کو سچ ثابت کر دیا..... اُس لمحے میرے جی میں تو یہی آئی کہ ابھی یوسف کے ہاں پہنچ جاؤں لیکن اب واقعی میں خود میں مرتے ہوئے انسان کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ آنسہ کی گفتگو نے مجھے کچھ زیادہ ہی احساس کر دیا تھا۔ مَیں نے خاموشی سے گردن جھکالی اور کیا کرتا؟ دونوں بوڑھے مجھ سے حسبِ سابق ملکی حالات پر تبصرہ کرنے کے خواہاں تھے ــــــ وہ مجھ سے زیادہ باخبر تھے لیکن مجھ سے زیادہ خوش فہم بھی تھے۔

اصل میں انسانوں کا المیہ یہ بھی ہے کہ وہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی پُرامید رہنا چاہتے ہیں۔ ہم سب کی حالت سزائے موت کے اس قیدی جیسی تھی جس نے اپنے بلیک وارنٹ پر دستخط کر دیے تھے لیکن جو تختہ دار کی طرف جاتے ہوئے بھی پُرامید تھا کہ ابھی شاید کوئی معجزہ رونما ہو کر اسے موت کے منہ میں جانے سے بچا لے گا۔

آنسہ تھوڑی دیر بعد اندر آ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں ضبط کے گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔ اُن کا فسوں دوچند ہو گیا تھا لیکن مَیں اس سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ پھر وہاں بیٹھے بیٹھے مَیں نے ایک فیصلہ کر لیا؛

آنسہ کی بات مان لینے کا فیصلہ ــــــ! مجھے احساس تھا وہ جو کچھ مانگ رہی ہے اُس میں وہ حق بجانب ہے ــــــ ایسے غیر یقینی حالات میں اگر مَیں نے بھی آگے قدم بڑھا کر اُن لوگوں کو سہارا نہ دیا تو اُن کے گھرانے کا تار پود بکھر جائے گا۔ مَیں اُن لوگوں سے نہ ملتا تو دوسری بات تھی۔ اب مَیں نے ان سے روابط اس حد تک بڑھا لیے تھے جہاں ایک دوسرے پر اعتماد کرنا پڑتا ہے اور اس اعتماد کو ٹھیس نہیں لگنی چاہیئے تھی۔



"مَیں چلتا ہوں ــــــ چاچی" ــــــ مَیں نے بالآخر اٹھتے ہوئے اُن سے کہا۔

آنسہ مجھے حسبِ عادت دروازے تک چھوڑنے آئی تھی ــــــ دونوں بوڑھے اندر ہی رہ گئے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر ہم دونوں رک گئے۔ زمین نے میرے ہی نہیں اُس کے پاؤں بھی پکڑ لیے تھے۔ شاید وہ بھی مجھ سے کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن اس مرتبہ مَیں نے اُسے پہل نہ کرنے دی اور بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"آنسہ!" مَیں نے اس کے لرزتے ہاتھ کی پشت کو سہلاتے ہوئے کہا "مجھے تمھاری ہر بات منظور ہے۔ ہاں میں تیار ہوں۔ تم جب بھی کہو مَیں اسی لمحے نکاح کر لوں گا۔ مجھے" ــــــ میری بات ادھوری ہی رہ گئی۔ آنسہ نے اپنی سُرمگیں آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ اس لمحے وہ حسن و وقار کی دیوی نظر آ رہی تھی۔

"علی! مَیں معافی چاہتی ہوں۔ مجھے اتنا خودغرض نہیں ہونا چاہیئے ــــــ آپ پر پہلا حق اس ملک کا ہے جس کے ہم سب بیٹیاں بیٹے ہیں۔ مجھے اب احساس ہونے لگا ہے کہ شاید زندگی کے کسی لمحے مَیں نے کوئی اچھا کام کیا تھا ورنہ آپ جیسے عظیم انسان سے میرا مقدّر وابستہ نہ ہوتا ــــــ آپ میرے تھے، میرے ہیں، میرے رہیں گے! اور آپ کی آنسہ آپ کا انتظار کرے گی۔ اُس وقت تک جب تک آپ اس ملک کو دشمن کے ناپاک وجود سے پاک نہیں کر دیتے۔ جب تک ہمارے کھیتوں کی ہریالی لوٹ نہیں آتی۔ جب تک ہمارے پٹ سن کا سونا پھر سے جگمگانے نہیں لگتا ــــــ مجھے اس کی کچھ پروا نہیں یہ انتظار کتنا لمبا ہو گا ــــــ"

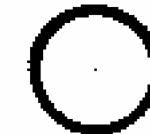
اُس کا ایک ایک لفظ نشتر بن کر میرے سینے میں اترنے لگا۔ حسن و وفا کی دیوی اُس

مجھے بہت عظیم دکھائی دے رہی تھی ——— میری سوچ سے بھی زیادہ قد آور ——— کسی دوسری دنیا کی مخلوق ——— !

خدا جانے وہ کون سے جذبات تھے جو مجھ پر غالب آئے: "آنسہ"۔۔۔ میرے منہ سے بس ایک لفظ ہی نکل پایا۔

——— ہم دونوں ہی اُس لمحے دوسرے جہانوں میں کھو گئے۔ لیکن نہیں ——— آنسہ کے حواس بجا تھے۔ اُس نے میری جذباتی کیفیت کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا۔ مجھے آہستگی سے اُس نے خود سے علاحدہ کر دیا اور بڑھ کر دروازہ کھولا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا ——— آنسوؤں سے بھیگی وہ مسکراہٹ ——— خدا کی پناہ! میں کب اُسے بھلا پاؤں گا؟ اس منظر کی مزید تاب لانے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ میں نے "خدا حافظ" کہا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔

باہر نکلتے ہوئے میں نے پلٹ کر بھی اُس سمت نہیں دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اُس سمت دیکھنے پر میں پتھر کا ایک بت ہو کر رہ جاؤں گا۔



اب تک صورتِ حال یہ تھی کہ تخریب کار عموماً گھسے پٹے طریقے ہی استعمال کرتے تھے۔ زیادہ تر وہ دو طرح سے اپنا کام کرتے تھے۔ بوبی ٹریپ[1] BOOBY TRAP اور سیفٹی والو[2] SAFETY VALVE کے ذریعے ان دونوں ترکیبوں کا حل ہم نے ڈھونڈ نکالا تھا۔ وہ اس طرح کہ ہم لوگ فوجی کنوائے کے آگے خالی چھکڑا باندھ دیتے، یا ریل گاڑی کے

---

[1] تباہ کن دھماکہ خیز مواد کو کسی بھی شے سے اس طرح باندھا جاتا ہے کہ ذرا سی جنبش پر ہی اُس کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔ یہ دھماکہ خیز مواد خاصا جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔

[2] اس ترکیب میں تخریب کار کچھ دور بیٹھ کر تباہ کن دھماکہ کر سکتے ہیں۔



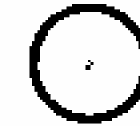
انجن کے آگے کچھ خالی ڈبے باندھ دیتے۔ اس طرح انسانی جانوں کا ضیاع بہت کم ہوتا تھا اور عموماً دشمن کا چھپایا ہوا دھماکہ خیز مواد غیر مؤثر ثابت ہوتا۔

لیکن جب اس بات کا علم مکتی باہنی کے کرتا دھرتا "را" کے اعلیٰ افسران کو ہوا تو وہ سر پیٹ کر رہ گئے۔ بڑے بڑے بھارتی اور غیر بھارتی دماغ مل کر بیٹھے اور انھوں نے بالآخر اس کا بھی حل ڈھونڈ نکالا؛ تخریب کاروں کے پاس دھڑا دھڑ دُور سے کنٹرول کیے جانے والے REMOTE CONTROL اور بجلی سے چلنے والے دھماکہ خیز بم پہنچنا شروع ہو گئے۔ ان خطرناک بموں کی مدد سے وہ چلتی ٹرین کو بھی حسبِ منشا بھک سے اڑا سکتے تھے۔ اس کے بعد وہ مزید ایڈوانس ہوئے تو انھوں نے ڈائنمو سے بھی نجات حاصل کر لی اور اس کی جگہ ڈرائی بیٹری سیل نے لے لی۔ جو لوگ بآسانی ایک عام سی ٹارچ میں چھپا کر ایک سے دوسری جگہ لے جا سکتے تھے۔

مشرقی پاکستان ندی، نالوں، دریاؤں اور سمندر کا دیس ہے۔ دشمن زمین سے زیادہ پانی میں خطرناک ثابت ہوتا تھا۔ وہ لوگ انھی پانیوں کے کیڑے تھے ——— یہیں وہ پلے بڑھے اور جوان ہوئے تھے۔ اپنے علاقے کے چپے چپے پر بہتے پانیوں سے اُن کی پرانی شناسائی تھی جبکہ ہماری دوستی اُن سے حال ہی میں ہوئی تھی۔ ہم ایک سے دوسری ندی تک پہنچنے کے لیے بھی نقشوں کی مدد کے محتاج تھے۔ زیادہ تر افواج کے جوان مغربی پاکستان سے یہاں آئے تھے جن کی معلومات اس علاقے کے متعلق صفر تھیں۔ مقامی آبادی پر کسی بھی قسم کا اعتماد خود کو موت کے منہ میں دھکیلنے کے مترادف تھا۔ ہم اس سلسلے میں کافی نقصان اٹھانے کے بعد اب خاصے محتاط ہو گئے تھے۔ عموماً یہی ہوتا کہ آبی راستے پر چلتی ہمارے جوانوں کی بوٹ رک جاتی تو خود بخود کوئی بنگالی وہاں آ جاتا وہ ہمیں اپنی رضاکارانہ خدمات بڑی بڑی قسمیں اٹھانے کے بعد پیش کرتا۔ جوان بہر حال مسلمانوں کی اولاد تھے۔ جب اُن کا ایک مسلمان بھائی انھیں بڑی بڑی قسمیں اٹھا کر اپنی وفاداری کا یقین

دلاربا ہو تو وہاں انکار کی گنجائش کہاں رہ جاتی تھی۔ وہ اس کی بات پر عمل کرتے اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر چل دیتے۔ جہاں گھات میں لگے تخریب کار انھیں نشانے کی زد میں آتے ہی اڑا کر راکھ کر دیتے۔ بہت کم، خوش نصیب ایسے ہوتے جو اُن کی بات پر عمل پیرا ہونے کے بعد بچ نکلنے میں کامیاب ہوتے۔

بہاری رضاکار ہمارے بہترین دوست تھے۔ لیکن وہ اتنے قلیل تعداد تھے کہ ہر جگہ ہم انھیں بطور گائیڈ اپنے ساتھ رکھنے سے لاچار تھے۔ یوں بھی ان کے ذمّے بہت سے فرائض تھے۔ وہ نہ صرف یہ کہ پٹرول پارٹیوں کے ہمراہ گشت پر جاتے بلکہ اندرونی امن و امان برقرار رکھنے کی ذمّہ داری بھی کافی حد تک ان کے کندھوں پر ہی تھی۔ پہلے پہل تخریب کار بارودی سرنگ کسی ساکن جہاز یا کشتی سے باندھ دیتے جو مقرّرہ وقت پر یا حرکت کرنے سے پھٹ کر اُسے تباہ کر دیتی اس کے بعد وہ "لمپیٹ مائن" استعمال کرنے لگے۔ یہ ایسی مائنز (سُرنگیں) ہوتی تھیں جن کے منہ پر مقناطیس لگا ہوتا اور وہ خود بخود اپنے ٹارگیٹ سے چپٹ کر مقرّرہ وقت پر پھٹ جاتیں ——— ! مزید حوصلے بڑھے تو بھارتی نیول فورسز کے تربیت یافتہ "فراگ مین" (غوطہ خور) زیرِ آب تیرتے ہوئے آنے لگے۔ یہ لوگ بڑی آہستگی سے جہاز یا کشتی میں تباہ کُن سرنگ چپکا کر واپس لوٹ جاتے۔ اس خصوصی مقصد کے لیے انڈین نیوی نے چار سو خصوصی غوطہ خوروں کا ایک دستہ تیار کیا تھا۔ یہ لوگ زیادہ عرصے زیرِ آب رہنے کے لیے عموماً نڑیا بانس کی پتلی نالی سطحِ آب پر رکھتے جس سے سانس لینے میں سہولت رہتی۔ بلسا اوقات یہ بھی دیکھنے میں آتا کہ وہ کیلے یا بانس کے تنے کے ساتھ "لمپٹ مائن" باندھ کر اسے پانی کے بہاؤ کے رُخ بہا دیتے جو اپنی مقناطیسی قوت کی بنا پر خود بخود ٹارگیٹ سے چپک کر اسے تباہ کر دیتیں۔



مَیں نے ہیڈکوارٹر پہنچتے ہی سب سے پہلے اپنے والد کو خط لکھا ——— اَلنسرا اور



اس کے گھر والوں کے مکمل حالات سے آگاہ کرنے کے بعد ان سے اجازت طلب کی کہ وہ مجھے پوربو پاکستان کی بیٹی کو اپنانے کی اجازت دیں، ممکن ہے ہمارا سنجوگ پورب پچھم کے بچھڑے ہُوئے رشتوں کو ایک لڑی میں پرونے کی تمہید بن جائے۔

اور خط لفافے میں بند کر کے ابھی مَیں نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائی ہی تھی کہ قریب رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ عام حالات میں یہ گھنٹی خوش خبری کی نوید ہی لایا کرتی۔ عموماً اپنے عزیز، اقربا اور پیارے اس پر ہم سے مخاطب ہوا کرتے، لیکن اُن دنوں فون اٹھانے سے پہلے ہمارے مُنہ سے فوراً "الہٰی خیر" نکلا کرتا تھا۔ مَیں نے بھی بے چینی سے ریسیور اٹھایا۔

"فوراً کانفرنس روم پہنچو ——— ایمرجنسی" پیغام ملا۔

مَیں نے چائے کی پیالی جوں کی توں وہیں رکھی۔ ٹوپی سر پہ جمائی، میز پر رکھا ریوالور لوڈ کر کے ہولسٹر میں ڈالا اور قریباً بھاگتا ہوا کانفرنس روم تک پہنچا تھا۔ جہاں میری طرح دوسرے جوان بھی اسی طرح بھاگے چلے آ رہے تھے۔ میرے پہنچنے کے دو منٹ بعد ہی ہمارے "او سی" صاحب بھی ایک تیز رفتار جیپ سے برآمد ہوئے اور ہمارے سیلوٹ کا جواب دیتے کانفرنس روم میں جا گھسے۔

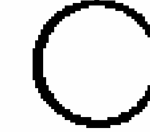
ہم ان کے تعاقب میں تیز رفتاری سے اندر داخل ہُوئے اور پھُرتی سے اپنی کرسیاں سنبھال کر بیٹھ گئے۔ حاضری مکمّل ہوتے ہی کرنل صاحب کے ایڈجوٹنٹ نے سامنے لگے بڑے سے نقشے پر سے پردہ ہٹایا۔

——— ہمارے سامنے چٹاگانگ کی ناگن کی طرح لہراتی بل کھاتی ندیوں اور سانپ کی طرح پھنکارتے نالوں اور جنگلوں کا ایک وسیع سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ کرنل صاحب نے سامنے رکھی میز سے چھڑی اٹھا کر اس کی نوک نقشے پر جما دی۔

"جنٹل مین! ——— ان کی گمبھیر اور پُرسکون آواز ہماری سماعت سے ٹکرائی "آپریشن

سرچ لائٹ شروع ہو چکا ہے۔ چاٹگانگ کی اہمیت آپ سب پر بخوبی واضح ہے۔ یہ بندرگاہ ہماری شاہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر شاہ رگ کٹ جائے تو بڑے سے بڑے توانا جسم بھی موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ آپ لوگ آج جس مشن پر جا رہے ہیں، اس پر ہمارے مستقبل کا دارو مدار ہے۔" اس کے بعد انھوں نے ہمیں چاٹگانگ میں ان مقامات کی آگاہی دینا شروع کی جہاں ہماری افواج گھیرے میں آ چکی تھیں اور جس جس جگہ بنگالی غدّاروں نے باقاعدہ قبضہ جما رکھا تھا۔ ہمیں آگے بڑھ کر دشمن کو اچانک یہیں جا لینا تھا۔

"گڈ لک مائی بوائز! اینڈ خدا حافظ" ـــــ انھوں نے اپنی گفتگو ختم کی اور ہم لوگ ایک ایک کر کے باہر آ گئے۔ ہماری روانگی میں صرف ایک گھنٹہ باقی تھا۔



چاٹگانگ بڑی حساس بندرگاہ تھی۔ لیکن یہاں موجود مغربی پاکستان کے رہنے والے فوجیوں کی تعداد چھ سو تھی۔ یہ لوگ ۲۰ بلوچ رجمنٹ سے متعلق تھے اور اپنی خدمات پوری کرنے کے بعد کراچی واپس جانے کے منتظر تھے۔ ان کا ہراول دستہ تو کراچی روانہ ہو چکا تھا، جب کہ اچانک باقی جوانوں کو روک لیا گیا کیونکہ ہائی کمان نے "آپریشن سرچ لائٹ" شروع کر دیا تھا جس کا مقصد سارے مشرقی پاکستان کو بھارتی اور بنگالی تخریب کاروں کے وجود سے پاک کرنا تھا۔

۲۰ بلوچ کے چھ سو جوانوں کا مقابلہ مشرقی پاکستان کے پانچ ہزار باقاعدہ اور بے قاعدہ فوجیوں اور رضا کاروں سے تھا۔ ان میں سے قریباً آدھی تعداد ایسٹ بنگال سنٹر سے متعلق تھی۔ اس کے علاوہ حال ہی میں کھڑی کی گئی پلٹن ۸۔ ایسٹ بنگال بھی یہیں موجود تھی۔ چاٹگانگ ہی میں ایسٹ پاکستان رائفلز کا سیکٹر ہیڈ کوارٹر تھا اور ان کا ایک ونگ مستقل یہاں قیام پذیر تھا۔ مکتی باہنی کے سدھائے ہوئے غنڈے اور بنگالی پولیس اس کے علاوہ تھی۔

ان حالات میں اندازہ کیجئے کہ یہ مٹھی بھر جیالے کس طرح چاٹگانگ کا دفاع کر سکتے تھے۔ بہر کیف کسی نہ کسی صورت ۲۰ بلوچ ابھی تک مقابلے پہ ڈٹی ہوئی تھی۔ انھیں کو[illegible]ے راستے کمک بھیجی گئی تھی۔ لیکن ابھی کومیلا سے امدادی دستے بمشکل چند میل جنوب میں صوبہ پور کے نزدیک ہی پہنچے تھے کہ باغیوں نے لکڑی کا بنا ہوا واحد پل اڑا کر ان کی پیشقدمی روک دی۔

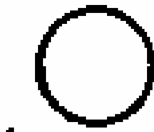
ان حالات میں میجر ضیاء الرحمٰن کو اتنا وقت مل گیا کہ وہ اپنی عددی برتری کا فائدہ اٹھا کر شہر اور چھاؤنی کے کئی حصّوں پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ریڈیو سٹیشن کی عمارت کے گرداگرد مورچے کھود کر ۲۰ بلوچ کے شیر دل جیالوں نے سدِ سکندری دشمن کے سامنے تان دی تھی جسے وہ کبھی عبور نہ کر سکا۔ گبھرو جہاں ایک دفعہ جم گئے وہاں سے موت ہی نے انھیں ہلایا۔ مکتی باہنی اور میجر ضیاء الرحمٰن کے دستے ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

دشمن نے ریڈیو سٹیشن کے گرداگرد جب اپنی پیش چلتے نہ دیکھی تو وہ وہاں سے پیچھے ہٹ کر چاٹگانگ کپتائی روڈ پہ واقع ریڈیو ٹرانسمیٹر پہ حملہ آور ہو لئے۔ جہاں صرف دس جوان معمولی اسلحے کے ساتھ پہرہ دے رہے تھے۔ انھوں نے دشمن کے سامنے ہتھیار پھینکنے پر مر جانے کو ترجیح دی۔ اور کربلا کی یاد تازہ کر دی۔ یہ دسوں کوہ شکن ایک کے بعد ایک شہید ہو گئے لیکن آخری جوان کی زندگی میں بھی کسی کو آگے بڑھنے کی جراُت نہ ہوئی۔ اس عظیم شہادت کے بعد دشمن نے ٹرانسمیٹر پہ قبضہ کر لیا جہاں ایمرجنسی طور پر نشریاتی نظام کی گنجائش موجود تھی۔ اسی ٹرانسمیٹر سے میجر ضیاء الرحمٰن نے فوراً "بنگلہ دیش" کی آزادی کا اعلان نشر کر دیا۔

کومیلا کے امدادی دستے کی خبر جب ڈھاکہ پہنچی تو جنرل ہیڈ کوارٹر نے کومیلا کے بریگیڈیر صاحب کو حکم دیا کہ وہ پُل کو دشمن کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیں اور نالے کے ذریعے کمک کو آگے بڑھائیں لیکن اس اثنا میں غازیوں نے جان توڑ حملوں کے ذریعے دوبارہ پل پہ قبضہ کر

لیا تھا اور تیز رفتاری سے وہ چٹاگانگ کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ اپنے گھیرے میں آئے ہوئے مجاہد ساتھیوں کی مدد کو بڑھنے والا یہ برق رفتار دستہ ابھی چٹاگانگ سے قریباً بائیس کلومیٹر دور کومیرا کے مقام تک ہی پہنچ پایا تھا کہ اچانک اس پر چاروں طرف سے آتش و آہن کا مینہ برسنے لگا۔ ہزاروں کی تعداد میں غدار بنگالی یہاں گھات لگائے انہی کے منتظر تھے۔

ہماری فوج کا اصول اس لحاظ سے ذرا نرالا ہے کہ ہمارے افسران مورچوں میں بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ ہر اس مقام پر رہنا چاہتے ہیں جو براہِ راست دشمن کی زد میں ہوتا ہے۔ انھیں چونکہ جوانوں کی کمان سنبھالنا ہوتی ہے اس لیے وہ "کمانڈ" کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ اس دستے کے کمانڈنگ افسر بھی ہراول دستے کے ساتھ سب سے آگے جوانوں کی کمان کر رہے تھے کہ اچانک دشمن کے حملے کی زد میں آگئے اور پندرہ دیگر ساتھیوں کے ساتھ انھوں نے بھی اپنی جان، جانِ آفریں کو سونپ دی۔ باقی جوانوں نے جہاں کہیں جس کو آڑ میسر آئی وہیں مورچہ بنالیا اور دشمن کے خلاف مقابلے پر ڈٹ گئے۔ دشمن نے کمال ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے جوانوں کے تمام رابطے، کاٹ دیے اور ڈھاکہ اور کومیلا سے کٹ کر وہ بالکل تنہا مکتی باہنی کے مقابلے پر ڈٹ گئے۔



اس دستے کی اچانک گمشدگی نے جنرل ہیڈکوارٹر میں تشویش کی لہر دوڑادی اور میجر جنرل صاحب ڈھاکہ سے بنفسِ نفیس ایک جانباز پائلٹ کے ساتھ ہیلی کاپٹر میں سوار ہوکر اس کی تلاش میں نکل گئے۔ وہ تمام مشکلات سے لڑتے بھڑتے چٹاگانگ تک آن پہنچے۔ یہاں کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے ہیلی کاپٹر پر بے تحاشا گولیاں اور گولے پھینکے گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی امان میں رکھا۔ اور جنرل صاحب ۲۰ بلوچ کے جوانوں کے درمیان اترنے میں کامیاب ہوگئے۔

یہاں آکر انھیں علم ہوا کہ خود ۲۰ بلوچ کا ایک دستہ بھی امدادی فوج کی تلاش میں نکلا



ہے اور ابھی تک کوئی اطلاع نہیں مل سکی۔ جنرل صاحب نے انتظار کو بزدلی جانا اور اپنے شیر دل پائلٹ کی معیت میں چٹاگانگ سے کومیلا کی طرف جانے والے راستے کے اوپر پرواز کرنے کا عزم لے کر ہیلی کاپٹر میں سوار ہوگئے۔ تمام راستوں پر دشمن کا مکمل قبضہ تھا۔ دو تین مرتبہ پائلٹ نے ہیلی کاپٹر کو بادلوں سے نیچے لانے کی کوشش کی۔ ایک دفعہ تو اس کو تین گولیاں بھی لگیں۔ ہیلی کاپٹر کوئی فائٹر ایئرکرافٹ تو تھا نہیں کہ دشمن پر جوابی حملہ کرکے اپنا راستہ صاف کرتا۔ بادلِ نخواستہ وہ لوگ ڈھاکہ کی طرف پرواز کر گئے۔

اس کے فوراً بعد جنرل ہیڈکوارٹر سے ہمیں حکم ملا کہ "پیرا ٹروپر لینڈنگ" کرکے گھیرے میں آئے ہوئے جوانوں کی مدد کو پہنچو۔ اب سب سے پہلا مسئلہ ان کی تلاش تھی۔ ہم لوگ حکم ملتے ہی ٹرکوں پر سوار ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہوگئے جہاں بڑے بڑے تین دیو ہیکل جہاز ہمیں اپنے پیٹ میں نگل کر کومیلا کی طرف پرواز کر گئے۔ ہمارا "فارمیشن لیڈر" ایک سیبر جہاز تھا۔ جسے ملک کا ایک مایہ ناز اسکواڈرن لیڈر ہمارے آگے آگے اڑائے لیے جا رہا تھا۔

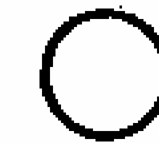
کومیرا کے نزدیک "فارمیشن لیڈر" کو گھیرے میں آیا بے یار و مددگار دستہ دکھائی دیا۔ فوراً ہمارے جہاز کا ریڈیو جاگ اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے سامنے لگے "مول ڈور" پر سرخ بتی جلنے بجھنے لگی۔

"اٹینشن ایئربورن ـــــ ڈراپنگ ایریا" ایک گونجدار آواز جہاز کے انجنوں کا شور چیرتی ہوئی ہماری سمت لپکی۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں جہاز کے مائیک پر خوش خبری ملی کہ ساتھی نظر آگئے ہیں۔ اس خبر نے میرے تن بدن میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ جوانوں نے فلک شگاف نعرہ بلند کیا۔ بدن میں بجلیاں کوندنے لگیں۔ ہم رعد بن کر دشمن کو خاک کرنے کے لیے بے چین ہوئے جاتے تھے۔

"نمبر ون ریڈی فار جمپ" جمپ ماسٹر کا حکم سنائی دیا۔
کمانڈوز حرکت میں آگئے۔ جہاز کا دروازہ کھل گیا اور ہم ایک کے بعد ایک آسمان

کی بیلگوں وسعتوں میں تیرنے لگے۔ ہم نے دشمن کے عقب میں لینڈنگ کی تھی۔ میرے گروپ کے دس جوان جلد ہی میرے گرداگرد جمع ہو گئے۔ ہم نے اپنے ہلکے لیکن خاصے کارآمد ہتھیاروں کو پوزیشن میں کیا اور اپنے مخصوص انداز میں چیتے کی طرح پنجوں کے بل چلتے ہوئے دشمن کو عقب سے جالیا۔ جوانوں کے فلک شگاف نعرے فضا کا سینہ چاک کیے دیتے تھے۔ وہ غیظ و غضب میں بھرے دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ ہر جوان پوزیشن بدل بدل کر اتنی تیز رفتاری سے دشمن پر فائرنگ کرتا کہ اُسے سنبھلنے کا موقع نصیب نہ ہوتا۔

دوسری طرف گھیرے میں آئے ہوئے جوانوں کو جب ہماری آمد کی خبر ہوئی تو ان کے حوصلے دو چند ہو گئے اس کے ساتھ ہی کومیلا سے چھوٹی توپوں کی ایک بیٹری بھی ان کو تلاش کرتی ہوئی پہنچ گئی۔ ہمارے باقی ساتھیوں نے تخریب کاروں کے گرداگرد ایک مکمل دائرے کی شکل میں لینڈنگ کی تھی اور گھیرے میں آئے ہوئے جوان جوشِ غضب سے اچانک محاصرے کی حالت سے نکل کر دشمنوں کی صفوں میں جا گھسے۔ صرف ایک گھنٹے کی لڑائی نے دشمن کے کس بل نکال دیے اور وہ اپنی سینکڑوں لاشیں میدانِ جنگ میں چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بھاگتے ہوئے دشمن کی راہیں پہلے ہی سے سپیشل سروس گروپ S.S.G کے جوانوں نے مسدود کر دی تھیں۔ انھوں نے بھاگتے بزدلوں کو اپنے نشانے پر رکھ لیا اور وہ مکئی کے دانوں کی طرح بھُننے لگے۔ شاید ہی کوئی خوش قسمت ایسا ہو جو وہاں سے زندہ بچ کر نکل پایا۔



کومیلا سے آنے والی امدادی فوج اور ۲۰ بلوچ کا ملاپ بالآخر چاٹگانگ میں ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی لاگ ایریا کمانڈر نے جو فضائی راستے سے ڈھاکہ سے حال ہی میں یہاں پہنچے تھے۔ پانچ میڈیم گنز، دو ٹینکوں۔ پیادہ فوج کی ایک پلٹن اور بحریہ کی طرف سے فراہم کردہ ایک تباہ کن DESTROYER جہاز اور تین گن بوٹس کی مدد سے ایک ٹاسک



فورس ترتیب دے لی۔ اب باغیوں سے چاٹگانگ کو پاک کرنے کا اصلی مرحلہ آگیا تھا۔ باغیوں کا زیادہ تر اجتماع کپتائی روڈ کی ٹرانسمیٹر بلڈنگ، ایسٹ پاکستان رائفلز کے سیکٹر ہیڈکوارٹر اور ضلع کچہری کے نزدیک ریزرو پولیس لائن میں تھا۔

سب سے پہلے ہمارے ایس ایس جی کے دستے کو حکم ملا کہ باغیوں کو ٹرانسمیٹر بلڈنگ سے نکال کر اس پر اپنا قبضہ مضبوط کیا جائے۔ پچھلے کئی روز سے وہ اس بلڈنگ میں بنگلہ دیش کی حکومت قائم کیے بیٹھے تھے۔ ہم نے بجائے خشکی کا راستہ اختیار کرنے کے دریائی راستے سے دشمن پر اچانک ایک پہلو سے حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنایا اور جوان گن بوٹس میں سوار ہو گئے۔ سب سے اگلی گن بوٹ میں مَیں اپنے جوانوں کی کمانڈ کر رہا تھا۔ میری ہدایت پر تینوں بوٹس ایک دوسرے سے فاصلے پر اس پوزیشن میں آگے بڑھ رہی تھیں کہ بوقتِ ضرورت ہم ایک دوسرے کو کورنگ فائر دے سکیں۔ ہم لوگ دریائی راستے پر ابھی بمشکل چند سو گز ہی چل پائے تھے کہ کناروں پر لگے گھنے درختوں سے ہم پر فائرنگ ہونے لگی۔

"ڈاؤن"۔ مَیں نے چلّا کر جوانوں کو حکم دیا۔

تمام جوان کشتی کے پیٹ سے چمٹ گئے۔ مَیں نے مشین گنوں کا رخ ساحل کی طرف موڑنے کا حکم دیا۔ یہ حکم پچھلی دونوں کشتیوں پر بھی پہنچایا گیا۔ ہم باغیوں کی فائرنگ کا جواب دیتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ یہ بڑا جان لیوا معرکہ تھا۔ دشمن اوٹ میں تھا اور ہم کھلے پانیوں میں اس کے نشانے کی زد پر۔

ایسی ہولناک گھڑیوں میں بڑے بڑے جابروں کا پتہ پانی ہونے لگتا ہے۔ شجاعتیں، مردانگیاں اور تربیت سب رخصت پر چلی جاتی ہیں۔ فوجی صرف عام آدمی بن کے رہ جاتا ہے۔ وہ خوف زدہ انسانوں کی طرح موت سے پناہ مانگنے لگتا ہے۔ زندگی بچانے کی فکر اس کے ہاتھ پاؤں پھُلائے دیتی ہے۔ نہ تو ٹھیک سے گن پر پٹہ چڑھ پاتا

ہے، نہ ہی انگلیاں ٹریگر سے صحیح دوستی نبھا پاتی ہیں۔ وہ بوکھلائے ہُوئے، موت کے خوف سے سہمے ہوئے بزدلوں کی طرح صرف اور صرف جان بچانے کی فکر کرتا ہے اور اسی بوکھلاہٹ اور بُزدلی میں دشمن کی گولیوں کی خوراک بن کر گیدڑ کی موت مر جاتا ہے۔

لیکن مَیں نے کہا تھا ناکہ ہمارا خمیر خاص مٹّی سے اٹھا ہے۔ ہم جو قومِ رسولِ ہاشمی ہیں ہماری تعمیر میں کوئی خاص ترکیب کارفرما ہوتی ہے۔ ہم نے ان لمحوں میں بوکھلانا نہیں سیکھا۔ ہمیں بُزدلوں کی طرح پیٹھ پھیر کر بھاگنا نہیں جواں مردوں کی طرح مرنا سکھایا جاتا ہے۔ موت ہماری نجات، موت ہمارا مقصود۔ پُروقار موت ہماری انتہا ہے۔

جب ہم موت سے بغل گیر ہوتے ہیں تو ہماری شجاعتوں کو مہمیز لگتی ہے۔ لڑنے اور مرنے کا جذبہ دوچند ہو جاتا ہے تب ہمارے صف شکن غازی یہ نہیں دیکھتے کہ غنیم کی تعداد کتنی زیادہ ہے، اسلحے میں اسے کس قدر برتری حاصل ہے۔ صرف ایک ہی دھن ہمارے دلوں میں سما جاتی ہے۔ دشمن کو تہس نہس کر دینے کی دُھن۔ ہم صرف ایک خواہش کرتے ہیں کہ دشمن کے ناپاک وجود سے اپنے وطن کی مٹی کو پاک کر ڈالیں۔ خواہ اسے اپنے خون کا غسل ہی کیوں نہ کروانا پڑے۔

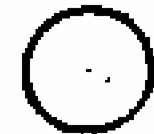
ہم دریا کے بیچوں بیچ چل رہے تھے۔ چھوٹے اسلحے کا فائر بے کار تھا ہمارے پاس دشمن کی طرح بے کار پھونکنے کو اسلحہ موجود نہیں تھا۔ ہم تو ایک ایک راؤنڈ سے کم از کم ایک ایک دشمن کو مارنے کا عزم رکھتے تھے۔ جوان کشتی میں لیٹے ہوئے تھے۔ جیسے ہی دشمن پر آگ برسانے والا کوئی جیالا دشمن کی کسی گولی کا نشانہ بن کر مُرادوند ہوتا فوراً دوسرا جوان اس کی جگہ لے لیتا۔

اس دوران ہمارا سفر جاری رہا۔ بالآخر اپنے سولہ سرفروشوں کی قابل قدر جانوں کا نذرانہ دے کر ہم لوگ اپنے ٹارگٹ تک پہنچ گئے۔ ساحل پر ہم چھلانگیں لگا کر کشتیوں سے اترے، شہید ساتھیوں اور پانچ جوانوں کی ایک ٹولی وہیں چھوڑ کر مَیں نے باقی غازیوں



کو بکھر کر "چارج" کرنے کا حکم دیا۔

وہ قہرمان دیوتا بن کر دشمن پر گرے۔ اپنے ساتھیوں کی شہادت نے ان کی رگوں میں انگارے دوڑا دیے تھے۔ جوشِ غضب و انتقام میں وہ رعد بن کر دشمن پر گرتے اور اُسے بھسم کر کے رکھ دیتے۔



دوسری طرف سے ۲۰ بلوچ کا ایک اور دستہ لیفٹیننٹ کرنل فاطمی کی قیادت میں ٹرانسمیٹر بلڈنگ کی طرف بڑھا۔ دشمن نے دورانِ قبضہ ٹرانسمیٹر بلڈنگ کے گرداگرد گہری خندقیں کھود کر انھیں نالیوں کے ذریعے ایک دوسری سے ملا کر خود کو ان میں محفوظ کر لیا تھا۔ یہ سارا دفاعی نظام پیشہ ورانہ مہارت سے تیار کیا گیا تھا۔ آخر کو وہ کم بخت تھے تو اپنی ہی فوج کے تربیت یافتہ۔

ہم نے بکھر کر نیم دائرے کی شکل میں ان کے گرداگرد گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا۔ جب دشمن گھیرے میں آگیا تو ہم نے اپنی عظیم روایات کے مطابق انھیں ہتھیار ڈال لینے اور خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرنے کا حکم دیا۔ لیکن دشمن ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس بات کا خطرہ تھا کہ ہماری گولہ باری سے ٹرانسمیٹر بلڈنگ ہی تباہ نہ ہو جائے۔ علاوہ ازیں دشمن کے ہاتھوں اسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ بھی بہرحال موجود تھا۔ ان خطرات کے مدِّنظر ایئر کمان سے مدد کی درخواست کی گئی اور دو سیبر الیف ۸۶ دشمن کا صفایا کرنے کا اہم مشن لے کر خندقوں میں دُبکے دشمن پر ٹوٹ پڑے۔

سیبر کی گنوں نے خندق میں دُبکے دشمن کو چن چن کر بھون ڈالا۔ انھوں نے خطرناک حد تک پیشہ ورانہ مہارت کا مظاہرہ کیا اور جب ہم چارج کر کے ٹرانسمیٹر پر قابض ہوئے تو مَیں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عمارت کی دیواروں پر گولیوں کے نشانات کے سوا عمارت اور ٹرانسمیٹر مکمل محفوظ تھے۔ ان کو کوئی گزند نہیں پہنچا تھا۔

عمارت کے مختلف کونوں میں دُبکے دشمن کو ہم نے جلد ہی باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔
میجر ضیاء الرحمٰن ایک روز پہلے ہی یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ یہاں موجود مکتی باہنی کے تمام تخریب کار مارے گئے یا انھوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ کوئی مائی کا لال بھی ہمارا گھیرا توڑ کر نکلنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔

مَیں نے اپنی کمپنی کے بچے کھچے جوانوں کو اکٹھا کیا۔ ہم لوگ پچھلے دو روز سے حالتِ جنگ میں تھے۔ شاید ہی کسی خوش قسمت جوان کو چند گھڑیاں سستانے کا موقع ملا ہو۔ جوانوں کی آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔ اُن کی وردیوں پر جا بجا اپنے شہید اور زخمی ساتھیوں کے خون کے چھینٹے جمے ہوئے تھے۔ چہرے گولہ بارود سے گرد آلود اور اٹے ہوئے تھے۔ بازو مسلسل فائرنگ کرنے سے شل ہو رہے تھے۔

لیکن ہمارے ولولوں کو موت نہیں آئی تھی۔ ہمارے ارادے ہنوز تازہ تھے۔ ہم اب بھی کسی بھی لمحے دشمن کا خون پینے کو تیار تھے۔

شہدأ کی تدفین اور زخمیوں کو فیلڈ ہسپتال میں بھیجنے کے بعد ہمیں کچھ دیر کے لیے سستانے کا موقع مل گیا۔ ہم نے وہیں بمشکل آگ سلگائی اور دشمن کے بچے کھچے راشن سے چائے تیار کر کے جوانوں میں تقسیم کی۔ دو دو مٹھی بھنے ہوئے مکئی کے دانے اور ایک ایک کپ چائے میرے جوانوں کو بیس گھنٹے کی مسلسل تگ و دو کے بعد نصیب ہوئے تھے۔ صبر کے ان پتلوں نے اس پر بھی ذاتِ باری کا شکر گزارا۔ بلوچ رجمنٹ کے جوان بھی پچھلے کئی دنوں سے حالتِ جنگ میں تھے لیکن انھیں کبھی کبھی سستانے کا موقع مل جاتا تھا۔

وہ اپنے تھے نا ـــــ انھوں نے ہمارا احساس کیا اور کرنل صاحب نے ہمیں "آف" کر دیا۔ مَیں نے جوانوں کو "اسٹینڈ ڈاؤن" حالت میں آرام کرنے کا حکم دیا اور میرے جانباز جوان سمیت بلڈنگ کے برآمدے ہی میں دراز ہو گئے۔ خود مَیں بھی ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے اونگھنے لگا۔ جلد ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔



پچھلے واقعات اتنی تیزی سے وقوع پذیر ہوئے تھے کہ ماضی قریب خواب کا حصہ دکھائی دینے لگا تھا۔ آنسہ سے اچانک ملاقات۔ ہم دونوں کا ایک جذباتی کیفیت سے گزر۔ والد صاحب کے نام میرا خط۔ ابھی دو تین روز پہلے ہی کی تو بات تھی۔

مجھے ابھی سوئے بمشکل دو ڈھائی گھنٹے ہی گزرے تھے جب ایک آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ رات کا شاید آخری پہر تھا۔ یوں محسوس ہوا جیسے مجھے کسی نے آواز دے کر جگایا ہو۔ بے اختیار میرا ہاتھ پہلو میں رکھی اسٹین گن پر پڑا لیکن سامنے نظر آنے والے ہیولے پر جس کے آثار واضح ہونے لگے تھے، نظر پڑتے ہی میں نارمل ہو گیا۔ یہ میری کمپنی کے این۔ سی۔ او تھے۔

"ایکسکیوز می سر ـــــ پیغام ہے۔" انھوں نے مجھے بیدار ہوتے دیکھ کر فوراً کہا۔
اس لمحے حوالدار کی سادگی پر مر جانے کو جی چاہا۔ وہ بے چارے خود بھی تو ہمارے ساتھ تھے۔ اور جان لیوا مراحل سے گزر کر انھیں بھی نیند کی یہی چند گھڑیاں نصیب ہوئی تھیں جن کا سامنا ہم کو تھا۔ لیکن ان کی محبّت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے "سر" کے آرام میں مخل ہونے پر معافی مانگ رہے تھے۔

یہ محبّتیں، یہ عقیدتیں کسی ڈسپلن کی نہیں ایک خاص تعلق خاطر کی دین تھیں۔ ہمارے ہر جوان کو اپنے افسر سے اور ہر افسر کو اپنے جوان سے اتنی ہی محبت تھی۔ ایک مسکراہٹ بے اختیار میرے ہونٹوں پر آ گئی۔ مسکراتے ہوئے مجھے جبڑے کھنچنے کا احساس بھی ہوا تھا لیکن اس طبیعت کی کسل مندی بالکل ختم ہو چکی تھی اور مَیں دو ڈھائی گھنٹے کی نیند کے بعد خود کو بالکل تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ یقیناً میرے باقی جوان بھی اگلے کسی حکم پر عمل کرنے کے لیے تیار تھے۔

مَیں پھرتی سے ریڈیو آپریٹر تک پہنچا۔ سیٹ سے میرے او۔ سی صاحب کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ وہ خود بھی رات کے اس پہر جاگ رہے تھے، محض اس لیے کہ

ان کے ہم وطن چین کی نیند سو سکیں۔

"ہیلو بولائے۔ ہاؤ آر یو؟" ان کے لہجے کی شگفتگی کبھی ماند نہ پڑی۔

"او کے۔ فائن سر" میں نے اپنے لہجے کو حتی المقدور خوشگوار بنایا۔

"جوان تو ٹھیک ہیں ناں سائیں؟" اُن کی شوخی برقرار رہی۔

"یس سر" میں نے پُرجوش آواز میں کہا اور انھوں نے اگلا مشن بریف کر کے فوراً روانگی کا حکم دے دیا۔ میں نے جوانوں کو پانچ منٹ میں تیار ہونے کا حکم دیا۔ ہمارے "بلوچ" ساتھیوں نے اس دوران میں دوبارہ چائے تیار کر لی تھی۔ یہ ان کی محبت اور خلوص کا عظیم مظاہرہ تھا۔ پھر چند منٹ بعد ہی وہ بڑے پُرجوش انداز میں ہمیں اپنے گلے سے لگا کر رخصت کر رہے تھے۔ ہمارے مشن کی سنگینی کا انھیں احساس تھا۔ خدا جانے اب کے بچھڑے ہوئے پھر کب ملیں۔ ملیں بھی یا یہی آخری ملاقات ٹھہرے۔

○

باغیوں کا دوسرا بڑا گڑھ ایسٹ پاکستان رائفلز سیکٹر ہیڈ کوارٹر تھا۔ جہاں ہماری اطلاعات کے مطابق بارہ سو کے قریب مسلح باغی مورچہ بند تھے۔ ان لوگوں نے اپنے مورچے قدرے اُونچی جگہ پر پُشتوں کے ساتھ ساتھ تعمیر کیے ہوئے تھے۔ اور فائرنگ کے لیے ان میں حسبِ ضرورت سوراخ بھی موجود تھے۔

ہماری مشترکہ کمان براہِ راست لاگ ایریا کمانڈر بریگیڈیئر انصاری کے ہاتھ تھی۔ انھوں نے خشکی کی سمت سے ایک پلٹن (جس کی مدد کے لیے دو ٹینک اور ایک توپ بھی ان کے ہمراہ تھی) کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اور ایس۔ ایس۔ جی (کمانڈوز) کو بحری راستے سے یلغار کرنے کا حکم ملا۔

ہم نے دوبارہ وہی حکمت عملی اپنائی تھی۔ اس مرتبہ مجھے دو گن بوٹس ملی تھیں ہمیں کَور دینے کے لیے البتہ نیوی کا ایک تباہ کن DESTROYER جہاز بھی موجود تھا۔ خشکی



اور آبی راستے سے بڑھنے والی افواج کا ملاپ فجر کی اذان کے بعد ہوا۔ ہم نے ایک ساتھ دونوں اطراف سے پوری شدت سے حملہ کیا۔ دشمن محفوظ مورچوں میں ڈٹا ہوا تھا لیکن یہاں ہمیں یہ ایڈوانٹیج حاصل تھا کہ ان مورچوں کی ماہیت اور کمزور پہلو ہماری نظروں میں تھے۔

قریباً تین گھنٹے کی خوں ریز لڑائی کے بعد بالآخر ہم نے چارج کیا۔ اور ایک خطرناک اور زبردست دستی جنگ کے بعد بالآخر دشمن پر قابو پا لیا۔ اس دستی جنگ میں ایسے ایسے ایمان افروز مناظر دیکھنے میں آئے کہ عقل حیران رہ گئی۔ دشمن کے بارہ سو مسلح اور محفوظ سپاہیوں کے مقابلے میں ہماری تعداد بمشکل چھ سو تھی۔ ایسے حالات میں اس طرح کھلا حملہ کرنا بڑے دل گُردے کا کام ہے میں اُس لانس نائیک کو ساری زندگی نہیں بھلا پاؤں گا جس نے ایک مشین گن بردار بنگالی پر جس کی فائرنگ نے ہماری پیش قدمی کے راستے میں دیوار سی کھڑی کر دی تھی، خالی رائفل سے حملہ کیا اور اسے موت کے گھاٹ اتار کر اس کی گن کا رُخ دشمن کی طرف پھیر کر فائرنگ شروع کر دی۔ لیکن وہ خود بھی چند منٹ بعد ہی دشمن کے پھینکے ہوئے ایک دستی بم کی زد میں آ کر مرتبۂ شہادت پر فائز ہو گیا۔

○

یہاں سے نمٹتے ہی ہمیں ریزرو پولیس لائنز کی طرف بڑھنے کا حکم ملا جہاں خاصی تعداد میں بھگوڑے فوجی، عوامی لیگ کے غنڈے، بھارتی کمانڈوز اور مکتی باہنی کے لوگ موجود تھے۔ انھوں نے پولیس کے اسلحہ خانہ پر قبضہ کر کے ۲۰ ہزار رائفلیں اپنے قبضے میں لے لی تھیں۔ جب انھیں دوسرا مورچہ سر ہونے کی اطلاع ملی تو ان کا دم خم ٹوٹنے لگا۔ لیکن وہ لڑنے مرنے پر اب بھی تیار تھے۔

طلوعِ آفتاب کے فوراً بعد ہم نے انھیں جا لیا۔ دشمن کی مدافعت بڑی کمزور ثابت ہوئی اور توقعات کے برعکس ہمیں یہاں زیادہ تردد نہ کرنا پڑا۔ بھارتی باقاعدہ افواج کے

سورماؤں نے تو آدھے گھنٹے بعد ہی اپنی پلٹن تعداد کا صفایا کروانے کے بعد توبہ کر لی اور ہتھیار پھینک کر الگ ہو رہے۔ اپنے آقاؤں کا حشر دیکھ کر تخریب کاروں نے عبرت پکڑی اور وہ بھی ایک ایک کر کے مورچوں سے باہر آنے لگے۔ اس کے بعد ہم تیزی سے شہر میں پھیل گئے۔ ہماری کمپنی کو چاٹگانگ شہر میں حاجی کیمپ کے علاقے کو کنٹرول کرنے کا حکم ملا۔

جب میں اصفہانی جوٹ ملز کالونی پہنچا تو ایک منظر دیکھ کر جیسے زوردار گھونسا میرے کلیجے میں لگا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہاں غدّاروں نے مغربی پاکستانی اور ہمارے ہمدرد بنگالی اور بہاری لوگوں کو کالونی کی ملحقہ عمارت کے کلب میں اکٹھا کر کے ان کا بہیمانہ قتلِ عام کیا تھا۔ یہاں جو شیطانی ڈراما بھارتی اور مکتی باہنی کے درندوں نے کھیلا اس کی نظیر دنیا بھر کے مظالم کی تاریخ میں نہیں ملے گی۔ میں نے اپنی گناہگار آنکھوں سے بچّوں کے کھلونے خون میں بھیگے دیکھے۔ عورتوں کی بے حرمتی کرنے کے بعد ان کے پستان کاٹ کر انھیں ایک ڈھیر کی صورت میں پھینکا گیا تھا۔ کئی شیر خوار بچے یہاں بھوک اور پیاس کے ہاتھوں بلک بلک کر مر گئے۔ ایک بچّے کی لاش اس حالت میں ملی کہ اس کے منہ میں اس کی ماں کی چھاتی تھی اور ماں کے سینے میں گہرا گھاؤ دکھائی دے رہا تھا۔ بستروں کی چادریں خون سے اکڑی ہوئی تھیں۔ ایک بھی متنفس یہاں زندہ نہ بچا تھا۔ یہ ایسا دردناک منظر تھا کہ میرے جوان جنھوں نے دشمن کے دانت کھٹے کر دیے تھے، جو پچھلے تین چار روز سے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیوانہ وار لڑ رہے تھے اب بچّوں کی طرح سسکیاں لے لے کر رو رہے تھے۔

خود میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ کلیجہ غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ خدا ہی جانتا تھا ان لمحات میں کس طرح میں نے اپنے اندر ہی اندر اپنے نوحوں کا گلا گھونٹا — جانے کتنی سسکیاں میرے اندر دم توڑ گئی تھیں۔ شاید زندگی میں کبھی دوبارہ میں اتنا جذباتی نہ



ہوا جتنا اس ملے اس منظر نے کر دیا تھا۔ ایک تیز دھار آرا تھا جس نے اندر ہی اندر ہم سب کو کاٹنا شروع کیا تھا۔ میرے حوصلہ دینے پر اور بالآخر سختی سے منع کرنے پر جوان نارمل ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی جذباتی حالت کیا تھی اس سے میں بخوبی آگاہ تھا۔

○

چاٹگانگ پر قبضہ مکمل کرنے کے بعد ہمیں کشتیا اور پبنہ کی طرف بڑھنے کا حکم ملا۔ کشتیا جیسور کے شمال مغرب میں قریباً نوّے کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ریلوے جنکشن اور کئی سڑکوں کا سنگم ہونے کے باوجود عام حالات میں یہاں فوج کبھی قیام پذیر نہیں رہی۔ جب شورش پیدا ہوئی تو جیسور سے قریباً ۱۵۰ سپاہیوں کی ایک کمپنی میجر شعیب شہید کی کمان میں یہاں بھیجی گئی۔ یہ لوگ کوئی جنگ لڑنے تو آئے نہیں تھے۔ اُن کا مقصد تو صرف امن و امان کا قیام تھا۔ کمپنی کمانڈر نے اپنے جوانوں کو وی۔ ایچ۔ ایف VERY HIGH FREQUENCY سٹیشن اور ٹیلی فون ایکس چینج کے علاوہ اکّا دکّا دوسرے مقامات پر تعینات کر دیا۔ جب یکدم غلغلہ اٹھا اور مکتی باہنی نے یلغار کی تو میجر شعیب پر قریباً دو ہزار مسلح اور توپ خانے کی مدد کے حامل بھگوڑے بنگالی اور باقاعدہ افواج کے سپاہیوں نے حملہ کر دیا۔

ان ڈیڑھ سو جاں بازوں پر کیا گزری، ان کی کہانیاں وقت کی گرد میں کہیں کھو چکی ہیں لیکن وہ تاریخِ حریت کا ناقابلِ فراموش باب بن چکے ہیں۔ وہ شیر دل اپنے کمپنی کمانڈر سمیت ایک ایک کر کے سارے کے سارے مرتبۂ شہادت پر سرفراز ہو گئے۔

ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

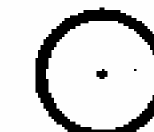
○

پبنہ میں بھی صرف ایک سو پچیس سپاہیوں کا ایک دستہ موجود تھا جس کے پاس عام

قسم کا اسلحہ تھا۔ اُن پر ڈیڑھ ہزار کے قریب مسلح اور تربیت یافتہ تخریب کاروں نے حملہ کیا کیپٹن اصغر شہید کی کمان میں یہاں سرفروشی اور جاں بازی کی عظیم داستان رقم کی گئی۔ یہ شیر دل کیپٹن اور اس کے بعد اس کا سیکنڈ ان کمانڈر لیفٹیننٹ رشید، جان توڑ کر لڑے۔ اور دونوں شہید ہو گئے۔ دشمن کی تعداد کا اندازہ اس بات سے لگا لیجئے کہ تمام راستوں پر اُن کا اتنا کنٹرول تھا کہ جب راجشاہی سے بمشکل ایک ہیلی کاپٹر کسی نہ کسی طرح گولیوں سے چھلنی ہو کر زخمیوں کو لینے پنبہ پہنچا تو اسے اترنے کے لیے جگہ نہ مل سکی اور وہ واپس چلا گیا۔

راجشاہی سے بمشکل ایک مردِ غازی میجر اسلم شہید اٹھارہ جوانوں کو ساتھ لے کر پنبہ پہنچے۔ انھوں نے دشمن کے نرغے میں پھنسے بہادروں کو باہر نکالا۔ جن کی آدھی تعداد شہید اور زخمی ہو چکی تھی۔ جاں فروشوں کا یہ قافلہ آہستہ آہستہ پسپا ہوتا راجشاہی کی طرف ہٹنے لگا۔ لیکن ہزاروں کی تعداد میں پھیلے دشمن سے بچ نکلنا کب ممکن تھا۔ کسی نہ کسی طرح جب تین چار روز تک بھوک پیاس اور زخموں کی اذیتیں برداشت کر کے یہ قافلہ راجشاہی پہنچا تو ۱۴۳ میں سے صرف ۱۸ جوان انتہائی زخمی حالت میں باقی بچے تھے۔ باقی تمام کے تمام میجر اسلم سمیت شہید ہو چکے تھے۔

ان واقعات کا المناک پہلو یہ ہے کہ بپھرے ہوئے غنڈوں سے کسی کو امان نہ ملی۔ انھوں نے فوجیوں سے تو جو سلوک چاہا کیا لیکن سویلین سے بہت بُرا سلوک کیا گیا جس کسی پر پاکستانی فوج کے ہمدرد ہونے کا شبہ ہوا۔ اس کی بہو بیٹیوں کی آبرو ریزی اس کی آنکھوں کے سامنے کرنے کے بعد انھیں اغوا کر کے کلکتہ کے بازارِ حسن کی زینت بنا دیا گیا۔



پچھلے چار پانچ روز سے ہم صرف دشمن ہی کے خلاف نہیں اپنے خلاف بھی



ایک طویل اور صبر آزما جنگ لڑ رہے تھے۔ کئی دفعہ اصفہانی جوٹ ملز کالونی جیسے واقعات دیکھ کر جی چاہتا کہ اردگرد کے دیہات بلڈوزر سے روند ڈالیں شاید اسی طرح مرنے والوں کی ارواح کو کوئی سکھ پہنچا پائیں لیکن فوج کسی جذباتی درس گاہ کا نہیں ایک ڈسپلن کے پابند ادارے کا نام ہے۔ ہم لوگ جب کبھی ٹھنڈے دل سے حالات پر غور کرتے تو ان تمام واقعات کو قدرت کی "ستم ظریفی" کا نام دے کر چپ ہو جاتے۔

دو روز تک ہمارا قیام پنبہ میں رہا۔ اس کے بعد اچانک راجشاہی پہنچنے کا حکم ملا۔ وہاں بغاوت زوروں پر تھی۔ اور فوج صرف چھاؤنی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ہمارے پاس نفری اتنی کم تھی کہ وہ بمشکل چھاؤنی ہی کی حفاظت کر پاتی۔ دشمن کے خلاف کاروائی کرنے یا امن و امان برقرار رکھنے کے لیے بھی ہمارے پاس جوانوں کی کمی تھی۔ راجشاہی کی صورتِ حال یہ تھی کہ شہر کے تمام محبِ وطن لوگ، مغربی پاکستان کے شہری اور وہاں مقیم فوجیوں کے کنبے پناہ لینے کے لیے چھاؤنی میں ڈیرے ڈالے بیٹھے تھے۔ جن کے گرد ہزاروں کی تعداد میں تخریب کاروں نے گھیرا ڈال رکھا تھا اور وہ لوگ روز بروز اپنا گھیرا تنگ کرتے جا رہے تھے۔

جوانوں کی قلیل تعداد کا اندازہ یوں لگا لیجئے کہ وہ بمشکل چھاؤنی کے گرد اپنا حصار مکمل کر پائے تھے۔ روزانہ کوئی نہ کوئی سویلین یا فوجی غنڈوں کی زد میں آ کر زخمی ہو جاتا اور ناکارہ ہو کر اُن کے مسائل میں مزید اضافہ کر دیتا۔ اس خطرناک صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ایک "ریسکیو آپریشن" ترتیب دیا گیا جس پر تین مراحل میں عمل ہونا قرار پایا۔

۱۔ گھیرے میں آئے ہوئے مٹھی بھر فوجیوں اور سویلین کی مدد کو پہنچا جائے۔
۲۔ زخمیوں، خواتین اور بچوں کو یہاں سے نکال کر محفوظ مقام تک لے جایا جائے تاکہ کم از کم خواتین اور بچے دشمن کی بربریت کی بھینٹ نہ چڑھنے پائیں۔
۳۔ شہر میں مختلف مقامات سے حملہ آور ہو کر کمانڈوز (ایس۔ ایس۔ جی) دشمن سے شہر

کو نجات دلائیں۔

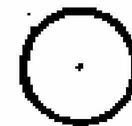
آپریشن پر عمل شروع ہو چکا تھا۔ اب مجھے اپنی کمپنی کے ساتھ گماسپور نامی مقام پر ایک پُل کو دشمن کے قبضے سے چھڑانا اور اس علاقے کا کنٹرول سنبھالنا تھا۔ میں اپنے بیس جوانوں کا دستہ لے کر پیدل روانہ ہوا۔ پنبہ راجشاہی روڈ پر ہم لوگ علی الصباح پہنچ گئے۔ یہاں فرسٹ ایسٹ بنگال رجمنٹ کے بھگوڑوں نے پہلے ہی سے مورچہ بندیاں کر رکھی تھیں۔ مقامی دیہاتیوں کو ورغلا کر پہلے ہی سے وہ اپنے ساتھ ملا چکے تھے۔ میں نے اپنے جوانوں کو تین ٹولیوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے کے تعاقب میں آگے بڑھنے کا حکم دے رکھا تھا۔ ایک مقامی بہاری رضا کار ہمارا گائیڈ تھا۔ جسے اس علاقے سے متعلق خاصی معلومات حاصل تھیں۔ وہ ہمیں کچے راستوں سے راجشاہی کی طرف لے جا رہا تھا۔ دوسرے مختلف گروپ بھی انہی رضا کاروں کے تعاون سے بکھر کر ایڈوانس کر رہے تھے۔ اس طرح ہمارا مقصد ایک تو دشمن پر اپنی "زیادہ نفری" کا رعب ڈالنا تھا دوسرے یہاں ہمیں مدافعت کی امید کچے راستوں سے کم تھی۔ کیونکہ عموماً فوج پکے راستے اپنایا کرتی تھی اور تخریب کار بھی انہی پر گھات لگایا کرتے تھے۔ میرے پاس تین ایل۔ ایم۔ جی لائٹ مشین گنیں تھیں۔ دو راکٹ لانچر ان کے علاوہ تھے۔ اس سے پہلے ہمیں اس بات کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا کہ ہلکے ہتھیاروں کے ساتھ دشمن کا مقابلہ محض خام خیالی ہے کیونکہ اب بات صرف امن و امان بحال کرنے تک محدود نہیں رہی تھی ہماری توقعات سے بھی آگے پہنچ چکی تھی۔

بھارتی بی۔ ایس۔ ایف (بارڈر سیکورٹی فورس) اور آرمی کے تربیت یافتہ کمانڈوز ہزاروں کی تعداد میں مشرقی پاکستان میں داخل ہو چکے تھے۔ ان لوگوں کے پاس ہر طرح کا اسلحہ موجود تھا۔ دریائی راستوں سے وہ لوگ میڈیم توپیں تک چھپا کر لانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انھیں چھپانے کے لیے انھیں ہزاروں محفوظ پناہ گاہیں یہاں میسر تھیں۔



زیادہ تر اسلحہ وہ لوگ دیہاتوں میں اپنے ہمدردوں کے گھروں میں چھپا دیتے تھے۔

انھیں ہماری اس کمزوری کا علم تھا کہ پاکستانی فوج صرف تخریب کاروں سے نمٹنے کے لیے میدان میں اتری ہے۔ سویلین آبادی سے ہمارا ٹکراؤ انتہائی ناگزیر حالات ہی میں ممکن تھا۔ عام حالات میں ہم کبھی کسی گاؤں میں داخل نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ اکثر کنی کترا کر گزر جاتے تھے۔ اس کی ایک وجہ دشمن کے اس مذموم پروپیگنڈے کے اثر کو زائل کرنا تھا جو وہ چلا چلا کر دنیا بھر کے کونے کونے میں کر رہا تھا کہ پاکستانی افواج شہریوں کا قتل عام کر رہی ہیں۔ دوسرے اپنے معصوم اور ورغلائے گئے بنگالی بھائیوں کو بتانا مقصود تھا کہ ہم انہی میں سے ہیں اور ان کے دشمن کو مارنے کا عزم لے کر آئے ہیں۔ اپنی اس "بے جا رحمدلی اور فراخدلی" کی ہمیں بلاشبہ توقع سے بڑھ کر قیمت ادا کرنی پڑی اور سینکڑوں کی تعداد میں ہمارے جوان اب تک ان "معصوم اور بے بس بھولے بھالے درندوں" کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ وہ لوگ جنھیں ہم بظاہر بے ضرر جان کر چھوڑ دیتے ہم پر فوراً کسی نئے عذاب کا نزول کروا دیتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کسی مشتبہ شخص کو کوئی پٹرول پارٹی گرفتار کر کے لاتی تو وہ آدمی ہاتھ باندھتے ہوئے قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتا کہ وہ بے گناہ ہے۔ اُسے تو زبردستی مکتی باہنی نے اس کام کے لیے آمادہ کیا تھا۔ ہمارے افسران کو ان پر یقین آ جاتا بہرحال وہ ہمارے مسلمان بھائی تھے اُسے رہا کر دیتے۔ چند ہی منٹ پر اُن کی نشاندہی پر تخریب کار ہم پر اچانک حملہ آور ہوتے اور دو چار جوانوں کو موت کے گھاٹ اتار کر اپنی راہ لیتے۔



راجشاہی کے باہر ہی ہمیں زوردار دھماکوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ دشمن کتنی قوت سے حملہ آور ہوا ہے۔ گولوں اور گولیوں کے دھماکوں سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ کچھ دستے راستے میں اپنا کام مکمل کرتے ہوئے محصور فوج

کی مدد کو پہنچ گئے تھے۔ ان میں کمانڈوز بھی شامل تھے۔ جنھوں نے یہاں پہنچتے ہی پھیل کر دشمن کو سمیٹنا شروع کر دیا۔ مَیں اپنے بقایا ساتھیوں کو مختلف اطراف میں روانہ کر کے اپنے دو جوانوں کے ہمراہ گماسپور پُل کی طرف روانہ ہو گیا۔ گماسپور پُل کی حفاظت کے لیے تین رضاکار وہاں موجود تھے لیکن اس شدّت کی لڑائی میں ان کا تھری ناٹ تھری کی دقیانوسی رائفلوں کے ساتھ دشمن کے ساتھ نبرد آزما رہنے کا تصوّر ہی محال تھا۔ ہمارے اندازے کے مطابق وہ یا تو دشمن کے ہتھے چڑھ گئے تھے یا شہید ہو چکے تھے۔

پُل تک پہنچنے کے لیے مجھے اور میرے دونوں ساتھیوں کو جگہ جگہ مزاحمت کا سامنا ہوا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح بچتے بچاتے ہم ٹارگٹ ایریا میں داخل ہو گئے۔ ہم تینوں ساتھی تین اطراف سے پل کی سمت بڑھے جس کے نزدیک ایک مجمع لگا ہوا تھا۔ یہاں میری آنکھوں نے عجیب منظر دیکھا۔ ایک رضاکار کے گلے میں درندوں نے رسّہ ڈال رکھا تھا۔ وہ اسے زمین پر گھسیٹ رہے تھے اور اس کے بدن میں سنگینیں مار مار کر اسے مجبور کر رہے تھے کہ وہ "جے بنگلہ دیش" کا نعرہ لگائے لیکن دھرتی کا وہ بجیلا بانکا سپوت ہر دفعہ "پاکستان زندہ باد" ہی کہتا تھا۔ نہ جانے یہ عمل کب سے جاری تھا۔ اس کے بقایا دونوں ساتھیوں کی سنگینوں سے چھلنی لاشیں وہیں پڑی تھیں۔ ان کی گردنوں میں بھی ایسے رسّے پڑے ہوئے تھے۔ خون آشام بھیڑیوں نے انھیں بھی اسی طرح سنگینیں مار مار کر شہید کر دیا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر واقعی میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ مَیں نے اپنی اسٹین گن دوسرے ساتھی کو تھما کر اسے اس کی جگہ پر بھیج دیا اور خود ایل۔ ایم۔ جی سنبھال لی۔ گن کو اسٹینڈ پر نصب کر کے مَیں نے درندوں کو اپنی رینج میں لیا اور پہلے برسٹ نے ہی ان دونوں بھیڑیوں کی جان لے لی جو اس غازی مرد پر سنگین زنی کر رہے تھے۔ رسّے والا دوسرے ساتھی کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ اس کے بعد تو جیسے ہم تینوں پر جنون طاری ہو گیا۔ بمشکل پندرہ منٹ کی فائرنگ میں ہم نے وہاں تماشہ دیکھنے اور دکھانے والوں کو کتّے کی موت مار ڈالا۔ درندوں سے نمٹتے ہی ہم بھاگم بھاگ غازی مرد کے پاس پہنچے۔ میرے ایک جوان نے جس کی آنکھوں سے خون برس رہا تھا۔ اس کی گردن رسّی سے آزاد کی۔ اسے اٹھا کر بٹھایا گیا۔ غازی مرد اٹھ کر بیٹھنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ دوسرے جوان نے زمین پر دو زانو بیٹھ کر اس کا سر اپنے شانوں پر رکھا۔ مَیں نے لرزتے ہاتھوں سے پانی کی بوتل کھول کر اس کے منہ سے لگائی۔ بمشکل دو گھونٹ اس نے پیئے اور سر کے اشارے سے بوتل پرے ہٹانے کو کہا۔



"کیا نام ہے بھائی آپ کا؟" مَیں نے فوجی بنتے ہوئے کہا۔

"خلیل ..." اس کی زبان لڑکھڑائی۔ اس کے آگے اس نے بولنے کی کوشش کی لیکن لفظ اس کے منہ نکل نہیں پاتے تھے۔ دائیں ہاتھ سے وہ زمین پر انگلیاں پھیرتا رہا۔ بمشکل اس نے بایاں ہاتھ اٹھا کر "وی" کا نشان بنایا۔ ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی اور اس کے دونوں ہاتھ نیچے ڈھلک گئے۔ وہ ہمیں وکٹری کی نوید سناتا موت کی دیوی کی گود میں جا بیٹھا۔

وہ مرا نہیں تھا اس کی تو صرف جسمانی موت واقع ہوئی تھی۔ اصل میں ہم مر گئے تھے۔ ہم تینوں جن کے کلیجے اس لمحے پھٹ گئے تھے۔ ہمارا خون زہریلا ہو رہا تھا۔ پاؤں کے ناخن سے سر کے بالوں تک ہمارے جسموں میں آرے چلنے لگے تھے کوئی نادیدہ قوت ہمیں آہستہ آہستہ کاٹنے لگی۔ یہ کاٹ اندر ہی اندر گہری ہی گہری ہوتی گئی۔ ہمارے دل، جگر، معدے، شریانوں غرض اندر موجود ہر شے کو موت آ گئی۔ لیکن ہم باہر سے زندہ تھے۔

میری حالت آپریشن ٹیبل سے اٹھ کر بھاگے ہوئے اس مریض کی طرح ہو رہی تھی جس کا انستھیسیا ٹھیک سے نہیں ہو پایا تھا۔ مجھے اس لمحے یوں محسوس ہوا جیسے

میرے بدن میں خون نہیں کلوروفارم دوڑ رہا ہے۔ وہ عالمِ ہوش نہیں تھا جس میں ہم تینوں کھڑے تھے۔ یہ تو برزخ کے آگے کوئی مقام تھا۔ ہم پر اصحابِ کہف والی نیند طاری تھی۔ ہم زندہ مردہ تھے۔ میں ان کا کمانڈر تھا۔ اسی لیے ہوش بھی مجھے ہی سب سے پہلے آیا۔ میں نے جھک کر اس کی دائیں سمت دیکھا جہاں اس کے خون میں لتھڑے ہاتھ کی بیقرار انگلیوں نے زمین پر لکیریں کھینچی تھیں۔ لکیریں نمایاں ہوئیں لکھا تھا۔

"الوداع۔ پاکستان"

وہ بدر و حنین کا مسافر تھا۔ وہ تیتومیر کا سپاہی تھا۔ وہ ۱۴۰۰ سال سے پاکستان کے لیے لڑتا آیا تھا۔ وہ مراد پا گیا۔ اس کا جوگ مکمل ہو گیا۔ اس کی منزل آ گئی تھی۔ وہ زندگی کی بس سے چپ چاپ نیچے اتر آیا۔ لیکن ہم ابھی زندہ تھے۔ ہمیں ابھی زندگی کا سنیاس بھگتنا تھا۔ ہمارا بن باس ابھی شاید مکمل نہیں ہوا تھا۔

صاحبو!

جب کبھی سمندر کنارے پک نک منانے جایا کرو۔ جب زندگی کی تمام رنگینیاں تمھارے پہلوؤں سے چمٹی ہوں ــــــ وقت فرصت دے تو کبھی کبھی خلیج بنگال کی سمت سے آنے والی ہواؤں کے نوحے بھی سن لیا کرو۔ ان کے دامن میں سفر کرتی "رسم خلیلی" کی کہانیاں بھی سن لیا کرو۔ یہ ہوائیں آپ کو بتائیں گی کہ "آتشِ نمرود" میں "عشق" کیوں کر کودا تھا۔ اِن ہواؤں نے آگ کو گلزار بنتے دیکھا ہے۔ ان کی پکار پر کان دھرو۔

ہم نے بھیگی آنکھوں کا نذرانہ اس کے حضور پیش کیا۔ اس کے مقدس جسد کو زمین پر لٹایا۔ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن"

ہم تینوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ اللہ نے دنیا سے اپنی امانت واپس لے



لی۔ بے شک وہ قادرِ مطلق ہے۔ جب جو چاہے کر گزرے۔ پتھر کے انسانوں نے اپنے بازو آسمان کی طرف پھیلائے۔ ہاتھوں کی ہتھیلیاں آپس میں جڑ گئیں دل کا خون آنکھوں کے راستے سفر کرتا گالوں پر بہنے لگا۔

"الٰہی تیرے دھتکارے ہوئے بندے تیری پناہ چاہتے ہیں۔ ستار العیوب ہماری پردہ پوشی کر لے۔ الرحم الرّاحمین! ہم سے منہ نہ موڑ۔ بحر و بر، خشک و تر کے خدا ہم ناکس ہیں ہمارا امتحان نہ لے۔ ہم پر روشنیوں کے دروازے بند نہ کر مولا!

ہم تو پہلے ہی اندھے ہیں۔ ہماری بصارتیں لوٹا دے۔ ہماری بصیرتیں لوٹا دے بس کریا مالک۔ رحم کر دے۔"

آسمان پر بادل بہت گہرے تھے۔ شاید انھوں نے "آہ" کو جانے کی راہ نہ دی ہو گی یا شاید ہماری نیتوں میں کھوٹ تھا کہ دعائیں مستجاب نہ ہوئیں ــــــ

ہم وہاں سے چل دیے مگر ــــــ

ــــــ ہمارے کانوں میں بدستور یہ آوازیں آ رہی تھیں: "الوداع ــــ پاکستان!

"الوداع پاکستان!!"

ہم ان آوازوں کو خوب پہچانتے تھے ــــــ یہ تھے میری سنار دھرتی کے شہدا ــــ جو اپنے پوربو پاکستان کو الوداع کہہ رہے تھے۔

# بھولی ہوئی کہانی

ایک دوسری کمپنی کے جوان بھی اسی طرف آ رہے تھے۔

——— ہم نے انھیں وہیں چھوڑا اور اپنے ہیڈ کوارٹر کی طرف چل دیے جہاں دوسرے جوان بھی مختلف ٹولیوں میں آ آ کر جمع ہو رہے تھے۔

یہ ٹیک ہیڈ کوارٹر درختوں کے ایک جُھنڈ کے درمیان ایک زیرِ زمین مورچے پر خیمہ ڈال کر بنایا گیا تھا! میری طرح دوسرے گروپ کمانڈروں کو بھی یہیں جمع ہو کر اگلے احکامات موصول کرنے کا حکم ملا تھا۔

دو دن تک ہم لوگ یہیں مقیم رہے۔ تیسرے روز علی الصباح ایک اطلاع نے ہمارے ٹیک ہیڈ کوارٹر میں پریشانی کی لہر دوڑا دی۔ انٹیلی جنس کی ہنگامی رپورٹ کے مطابق سلہٹ میں جہاں ہماری افواج کی تعداد بہت کم تھی (کیونکہ اس طرف سے ابھی تک بڑے پیمانے کی کارروائی نہیں ہوئی تھی) بھارتی فوج کی مدد سے تخریب کاروں کی ایک بڑی تعداد نے اچانک سرحد عبور کر کے ہمارے قلیل تعداد فوجیوں کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ وہ لوگ پاکستان کے ہمدرد لوگوں کو اپنے گھیرے میں لیے پسپا ہوتے شہر کے اندر مورچہ بند تھے۔ انھیں فوری طور پر فضائی مدد درکار تھی کیونکہ زمینی مدد پہنچنے میں بہت سی رکاوٹیں حائل تھیں۔



کمانڈوز کو چھاتہ بردار لینڈنگ کر کے اُن لوگوں کی مدد کو پہنچنے کا حکم ملا۔ ایس۔ ایس۔ جی کی مختلف کمپنیاں ملک کے مختلف حصّوں میں دشمن سے برسرِ پیکار تھیں اور ایک جگہ ان کا جمع ہونا قریباً ناممکن تھا کیونکہ کمانڈوز قلیل تعداد میں تھے اور اپنی اہم نوعیت کی ذمے داریوں کے پیشِ نظر بکھر بکھر کر خدمات انجام دے رہے تھے ——— اب بھی مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے کمانڈوز کے مختلف دستوں کو اس علاقے میں چھاتہ بردار کارروائی کا حکم ملا تھا۔

دشمن نے سلہٹ پر دو سرحدی مقامات بالی گاؤں اور رلا لوٹ سے حملہ کیا تھا اور تیزی سے پیش قدمی کر کے سلہٹ کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ شہر کے گرداگرد تمام اونچی عمارات اور اہم مقامات پر وہ لوگ قابض تھے اور کسی بھی طرف سے سلہٹ میں گھسنے والی امدادی افواج کو زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا۔

ہم لوگ قریباً سہ پہر کے وقت سلہٹ پہنچے اور اپنے اپنے پیراشوٹ سنبھالے ہارنس بردار اپنی اپنی جگہ بے حس و حرکت جمے بیٹھے تھے۔

دشمن کے عین درمیان اور اس غضب کی اندھا دُھند فائرنگ میں "پیراٹروپر لینڈنگ" بڑے دل گردے کی بات ہے اور پھر جیسے ہی جہاز کی بتی نے جلنا بجھنا شروع کیا، جہاز کے اندرونی مائیک پہ پائلٹ کی بھرّائی ہوئی آواز سنائی دی:

"خبردار رہیے! ائر بورن AIR BORN ہم ڈراپنگ زون میں داخل ہو رہے ہیں۔"

فوراً تربیت کے مطابق ہم نے اپنے آگے والے چھاتہ بردار کا ہارنس چیک کرنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی جہاز کے دونوں اطراف کے دروازے اوپر اٹھے اور MOCK DOORS کے اوپر جلتے سرخ بلب سبز ہو گئے۔

"اسٹینڈ ان دی ڈور" جمپ ماسٹر کا حکم سنائی دیا۔ سب سے آگے والے چھاتہ بردار جن میں سے میں تھا، دروازوں پر ڈٹ گئے۔

"جمپ"

"اللہ اکبر" ہم دونوں نے خود ہی اپنا مورال بڑھانے کے لیے نعرے لگائے اور باہر کود گئے۔ جہاں جہاز کے گرد اگرد پھٹتے گولے اور گولیاں ہمیں اس حالت میں بھی بخوبی دکھائی دے رہے تھے۔ کسی بھی لمحے کوئی گولی یا کسی گولے کا کوئی ٹکڑا ہمارا کام تمام کر سکتا تھا۔ بڑے بڑے جی داروں کا پِتّا پانی ہونے لگتا ہے ایسے حالات میں کلیجہ خود بخود منہ کو آجاتا ہے۔ چھاتہ بردار اتنا بدحواس ہو جاتا ہے کہ اول تو اس کا چھاتہ ہی نہیں کھلتا اور اگر وہ صحیح رفتار اور پوزیشن میں گرنے بھی لگا ہو تو پی، ایل، ایف (پیرالینڈنگ فال) یعنی گرتے وقت کی پوزیشن میں کچھ ایسا گڑبڑا جاتا ہے کہ جسم کی کوئی ہڈی تڑوا بیٹھتا ہے۔

اپنے جوانوں کا مورال بڑھانے کے لیے ضروری تھا کہ میں خود سب سے پہلے چھلانگ لگاؤں یوں بھی ہماری روایت یہی ہے کہ "پہلے افسر پھر جوان"!!

محصور فوجی جوانوں نے جنھیں موقع محل کی نزاکت کا صحیح ادراک ہو چکا تھا۔ چھاتہ برداروں کو دیکھتے ہی اپنی فائرنگ کی رفتار تیز کر دی تھی۔ ابھی تک وہ بڑی آہستگی اور مستقل مزاجی سے فائرنگ کر رہے تھے تاکہ اپنا ایمونیشن محفوظ رکھیں لیکن اب وہ ہمیں دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے ـــــ دشمن کو کافی حد تک انھوں نے اپنی طرف متوجّہ کر رکھا تھا لیکن اس کے باوجود مہ پرمینہ کی طرح گولیاں برس رہی تھیں۔

یہ لینڈنگ وقفے وقفے سے جاری تھی۔ اب تک چار جہازوں سے جوان چھلانگیں لگا کر اپنے ساتھیوں اور اپنے ملک کے جاں نثاروں کی مدد کو آچکے تھے اور اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان میں سے آدھے یا اس سے کچھ کم زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی مرتبۂ شہادت پر فائز ہو چکے تھے لیکن جاں نثاری اور جاں گساری کی ایسی ہی مثالیں



کسی ملک کی فوج کو زندۂ جاوید رکھتی ہے ـــــ آنے والی نسلوں پر دور رس اثرات مرتب کرنے کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ دے کر ہی جاں فشانی کی رسم زندہ کی جاتی ہے۔

ہم لوگ مار دھاڑ کرتے، مختلف عمارتوں اور قدرتی مورچوں کی اوٹ میں سکڑتے سمٹتے اپنے اسلحہ سمیت بالآخر اُس کیمپ تک پہنچ جانے میں کامیاب ہو گئے جس کو ایک طرح سے اب چھاؤنی کی حیثیت حاصل تھی۔ سویلین کو یہاں مختلف چھوٹے چھوٹے کوارٹروں میں رکھا گیا تھا جن کی دیواروں کو مارٹروں کی گولہ باری نے ناکارہ کر دیا تھا اور وہ بے بسی کے عالم میں ملبے کے ڈھیروں کے مختلف کونوں کھدروں میں چھپے کسی غیبی امداد کے منتظر تھے۔

ـــــ شام ڈھلنے سے کچھ دیر پہلے تک ہم اس قابل ہو سکے کہ اس علاقے میں کم از کم ہیلی کاپٹر اُترنے کی گنجائش پیدا کر سکیں تاکہ معصوم اور بے گناہ بچّوں، بوڑھوں اور عورتوں کے علاوہ درجنوں زخمیوں کو محفوظ علاقے میں پہنچایا جا سکے۔ ان لوگوں کی موجودگی میں ہمارے لیے دشمن کا کھل کر مقابلہ کرنا خاصا مشکل نظر آتا تھا۔ ہیلی کاپٹروں کے اترتے کے وقت عجیب حالت تھی۔ ہر طرف زخمیوں کی آہ و بکا کا شور، ہیلی کاپٹروں کی گڑگڑاہٹ گولیوں اور گولوں کے دھماکے گونج رہے تھے۔ ہوا کے تیز جھکڑ سرِ شام ہی چلنے شروع ہو گئے تھے۔ اس پر مستزاد ہیلی کاپٹروں کے بلیڈوں سے نکلتی ہوئی تیز ہوا مزید گرد و غبار پیدا کر رہی تھی۔

آسمان کا رنگ بھی تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا اور میری چھٹی حِس کسی مزید قدرتی آفت کا پیغام بھی سنا رہی تھی۔ اس گرد و غبار اور نفسا نفسی کے باوجود تمام جوان بڑی مستعدی اور ہوشیاری سے اپنے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ ملبے اور بچے کھچے کوارٹروں کے مختلف کونوں سے زخمیوں، عورتوں، بچّوں اور بوڑھوں کو سہارا دے کر لاتے اور سنسناتی گولیوں کی بوچھاڑ میں انھیں کسی نہ کسی طرح ہیلی کاپٹرول

میں ٹھونسا جا رہا تھا۔

ان میں سے شاید ہی کوئی خوش نصیب ایسا تھا جس کا پورا کنبہ سلامت بچا ہو۔ ورنہ تو یہ عالم تھا کہ ان کے آدھے آدھے کنبے شہید ہو چکے تھے۔ کئی کنبوں کے سربراہ جو ہمارے لیے خدمات انجام دیتے ہوئے مارے گئے تھے، اُن کے کنبوں کا حوصلہ برقرار رکھنے کے لیے ہم نے انھیں یہ بتایا تھا کہ وہ لوگ کیمپ سے باہر دشمن سے نبرد آزما ہیں۔ اور موجودہ حالت میں اُن کا یہاں تک پہنچنا ممکن نہیں! وہ رقت آمیز منظر آج بھی نگاہوں کے سامنے آتا ہے تو کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ کتنے ہی معصوم بچے اور مقدس بہنیں ایسی تھیں جن کی نظریں آخری لمحات میں بھی اپنے باپ اور سرتاجوں کو ڈھونڈ رہی تھیں ـــــ اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ان کے دل شدتِ غم سے پھٹ رہے تھے، وہ بے بسی اور بے کسی کے عالم میں اپنے ملک کے فوجیوں کو اپنی بھومی کے غداروں سے جنگ کرتا دیکھ رہی تھیں۔!!

اور یہ بیان اُن اولوالعزم اور عمر رسیدہ ماؤں کے ذکر کے بغیر ادھورا رہ جائے گا جنھوں نے اُن پُرخطر گھڑیوں میں بھی اپنا حوصلہ اور ایمان سلامت رکھا! ایسے روح پرور مناظر اس سے پہلے چشمِ فلک نے کب دیکھے ہوں گے کہ وہ تقدس مآب مائیں جن کے ہاتھوں پر معمولی خراش آ جانے سے اُن کی اولادوں کے دل دہل جاتے تھے، اپنے خون آلود دامنوں ـــــ خون میں تر ساڑیوں کو سنبھالتی اپنے بچوں اور بہو بیٹیوں کو حوصلہ دے رہی تھیں! انھوں نے جاں گسل لمحات میں اپنا فرض نہیں بھلایا تھا ـــــ وہ اپنے اہل و عیال ہی کو نہیں ہم کو بھی تسلیاں دے رہی تھیں۔ آسمان کی سمت اپنے خون آلود دامن پھیلا کر ہماری کامیابی کے لیے دعا گو تھیں۔

یہ کربلا کی مائیں تھیں؟

یہ زینبؓ کا روپ تھیں۔



ـــــ یہ بدر، احد، حنین کی مائیں تھیں! جو صدیوں کا سفر طے کر کے سلہٹ آن پہنچی تھیں۔ یہ روایت انھیں خون میں منتقل ہوئی تھی ـــــ دشمن نے ان کے کلیجوں میں خنجر گھونپے۔ ان کے لال اُن سے چھین لیے۔ ان کے جسموں کو سنگینوں سے چھید اگیا۔ اُن کی نظروں کے سامنے اُن کی باعصمت، باکرہ، بچیوں پر درندگی کی انتہا ہو گئی۔ لیکن اُن کے عزم کبھی نہ ڈگمگائے۔ اُن کے سربفلک ارادوں کو کبھی موت نہ آئی۔ اُن کے ولولوں کی آہنی دیواریں کبھی نہ ٹوٹیں۔ کبھی نہ گرائی جا سکیں ـــــ وہ اپنے اس مقدس فریضے میں اتنی منہمک ہوئیں کہ اپنی باری پر ہیلی کاپٹروں میں سوار بھی نہ ہو سکیں۔

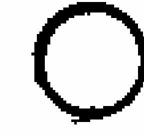
ہم نے مقررہ تعداد سے قریباً تین تین گنا زیادہ لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ان ہیلی کاپٹروں میں ٹھونس دیا اور انھوں نے اللہ کا نام لے کر زمین سے اٹھنا شروع کیا۔ ہیلی کاپٹروں نے اس وقت پرواز کے لیے پر تولے تھے جب چاروں اطراف تیز اور مسلسل فائرنگ کے ساتھ ساتھ بڑی زوردار ہوا بھی چل رہی تھی۔

یہ بڑے صبر آزما لمحات تھے۔ ہمارے بچے اور ہماری مائیں بہنیں دشمن کی براہِ راست فائرنگ کی زد میں تھیں۔ ان کی زندگیوں کا تمام تر انحصار خداوند تعالیٰ کی ذات کے بعد اب اگر کسی پر تھا تو آرمی ایوی ایشن کے شیر دل کوہ شکن شاہینوں پر۔ جن کے کندھوں پر حالات نے انتہائی نازک اور انتہائی مشکل ذمے داری ڈال دی تھی۔ انھیں مناسب بلندی حاصل کرنے کے لیے اونچی اڑان کرنا تھی جس کے لیے ایک بڑا چکر فضا میں لگانا ضروری تھا جب کہ نوبت یہ آ گئی تھی کہ ان کے بلند ہوتے ہی اُن پر آگ برسنے لگتی تھی۔

عین اُن خطرناک اور جانگسل لمحات میں ہمارے دو شاہین مغرب کی جانب سے نمودار ہوئے وہ دُور سے اس طرح نظر آ رہے تھے جیسے دو بڑے بڑے عقاب آپس میں

پَر ملائے اُڑتے چلے آرہے ہوں۔ اپنے ہدف کے نزدیک آکر انھوں نے اپنی مخالف سمتوں میں قلا بازیاں لگا کر "چھٹنے" کا انداز اختیار کیا۔ اور ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں قریباً ٹیڑھے ہو کر ان کی گنز نے باغیوں پر قہر برسانا شروع کیا۔ اپنے دو چکر مکمل کر کے وہ آسمان کی بلندیاں چھونے لگے۔

یہ ہیلی کاپٹروں کو اشارہ تھا کہ جیالے ساتھیو! بے دھڑک چلے آؤ ہم نے تمھارے راستے کی رکاوٹ دور کر دی ہے۔ ہیلی کاپٹروں کے پائلٹ بھی انتہائی تربیت یافتہ اور ہوشیار تھے۔ انھوں نے ذرا سا موقع ملتے ہی مناسب بلندی حاصل کر لی اور جانب مشرق پرواز کرتے دشمن کی گولیوں کا منہ چڑاتے نکل گئے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ نقطوں کی شکل اختیار کرتے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔



اُن کی محفوظ روانگی کے بعد ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اُس نے ہمارا "ریسکیو آپریشن" کامیاب کیا۔ اب ہم کم از کم اس پوزیشن میں ضرور آ چکے تھے کہ کھل کر دشمن سے دو دو ہاتھ کر سکیں۔

اب شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔ اندھیرا پھیلنے کے ساتھ ساتھ دشمن کی فائرنگ میں بھی شدت پیدا ہو رہی تھی۔ دشمن پہلے ہی سے ہمارے کیمپ کے گرداگرد خندقوں میں مورچے قائم کیے بیٹھا تھا دوسری طرف اُس کی تعداد ہم سے کم از کم سات آٹھ گنا تھی۔ ہماری مورچہ بندیاں ان کے علم میں تھیں جب کہ ابھی تک ہم ان کی پوزیشن کا تعین بھی نہیں کر سکے تھے۔ بس اندازے ہی سے ساری کارروائی کی جا رہی تھی۔ ہمارے دو اطراف میں جنگل اور اونچی اونچی فصلیں اور باقی دونوں اطراف رہائشی مکانات تھے۔ دشمن ان محفوظ آڑوں سے بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا مگر ہمیں شہری آبادی کا خیال رکھنا تھا۔ ہم دشمن کی فائرنگ کے جواب میں کم از کم رہائشی علاقوں کی جانب فائرنگ



نہیں کر سکتے تھے۔ ان حالات میں ہمارے لیے یہی راستہ رہ گیا تھا کہ صبر و تحمل سے اپنی کمین گاہوں میں دُبک کر دشمن کے کھلے حملے کا انتظار کریں اور اس کے سر پہ پہنچنے کے بعد ہی اس کا منہ توڑ جواب دیں۔ اس سنگین صورتِ حال کے خاتمے کے لیے سیکشن کمانڈروں نے ایک بنکر میں میٹنگ کی اور ہم نے فیصلہ کیا کہ جوانوں کو صبر کی تلقین کی جائے تاکہ وہ جوش میں آکر زیادہ فائرنگ نہ کریں۔ تعداد کی کمی کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا گیا کہ خالی مورچوں کو اس ترکیب سے باری باری استعمال کیا جائے کہ دشمن کو ہمارے درمیان کہیں کوئی خلا GAP نہ مل سکے جس سے گزر کر وہ کیمپ میں داخل ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے چار سرفروشوں کو او، پی ڈیوٹی کے لیے تیار کیا اور وہ چاروں اندھیرا پھیلتے ہی مختلف سمتوں میں ہمیں "فی امان اللہ" کہہ کر کیمپ سے باہر دشمن کی مورچہ بندیوں کی طرف رینگ گئے۔

جلد ہی ان کی طرف سے "نشانے" ملنے لگے اور ہم نے اپنی واحد میڈیم گن سے اُن کی ہدایت پر گولہ باری شروع کر دی۔ اس گن کو ابھی تک ہم نے استعمال نہیں کیا تھا، تاکہ دشمن کے اچانک چڑھ آنے کی صورت میں اسے بروئے کار لایا جا سکے رات آٹھ بجے کے نزدیک لڑائی انتہائی شدت اختیار کر گئی۔ کیونکہ ابھی تک دشمن نے ہمیں تر نوالہ ہی سمجھ رکھا تھا۔ اب جب اُن پر ۲۵ پونڈ کے گولے پھٹے تو اُن کی گویا آنکھیں کھل گئیں اُنھوں نے ہمیں مزید مہلت سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیے بغیر مارٹروں سے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ کیوں کہ دشمن کے نقطۂ نظر اور جنگ کی حکمتِ عملی کے مطابق بھی ہمارا ٹارگیٹ اس ہتھیار کے لیے انتہائی موزوں تھا۔

دشمن کی فائرنگ میں شدت آتے ہی ایس، ایس، جی کے گبھرو دو دو چار، چار کی ٹولیوں میں بٹ کر اُن کے مورچوں کی طرف بڑھنے لگے ان کی کوشش یہی تھی کہ

کسی طرح دشمن کے درمیان خلا ڈھونڈ کر وہاں سے نقب لگائی جائے۔ اللہ نے مدد کی اور کچھ جوانوں کی قربانی دے کر ہم نے کچھ ایسے خلا تلاش کر لیے جہاں سے دشمن پر بآسانی فائرنگ ہو سکتی تھی۔ یہ برابر کے خطرے والی پالیسی تھی۔ کبھی کبھی انتہائی نامساعد حالات میں کمانڈروں کو ایسی پالیسیاں بھی اپنانا ہوتی ہیں جہاں مرنے اور مارنے کے برابر کے مواقع میسر آتے ہیں۔ اگر ہم اچانک دشمن کے درمیان پہنچ کر اُس پر حملہ آور ہو سکتے تھے تو اسے بھی یہ ایڈوانٹیج حاصل تھا کہ وہ اُس مخصوص ایریا کو جہاں اُسے ہمارے جوانوں کی موجودگی کا احساس ہوتا چاروں اطراف سے فائرنگ کر کے تہس نہس کر دیتا اور ایسا ہوا۔ لیکن نتائج اسّی فیصد ہمارے حق میں اور بمشکل بیس فیصد دشمن کے حق میں گئے۔

ایک طرف تو انسان، انسان پر آگ برسانے میں مصروف تھا دوسری طرف مشیتِ الٰہی نے غضب کی شکل دھاری ۔۔۔ شمالی جانب سے آسمان پر اچانک سیاہ گھٹائیں امڈنے لگیں۔ جوشِ غضب سے آسمان پر بجلیاں کوندنے لگیں اور بدلیاں دھاڑنے لگیں۔ کچھ تو گولہ باری تھی اور کچھ آسمانی بجلیوں نے ایسا سماں باندھا کہ آسمان تانبے کی طرح سرخ ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی موسلا دھار بارش ہو گئی ۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا علاقہ جل تھل ہو گیا۔

بوچھاڑ اس شدّت کی تھی کہ جوانوں کے لیے قدم جما کر ٹھہرنا مشکل ہو رہا تھا۔ مگر خیریت گزری کہ ہمارے پاس ہتھیار ایسے تھے جن پر یہ رکاوٹیں اثر انداز نہ ہو سکتی تھیں۔ اُس لمحے "جنگِ خندق" یاد آ گئی اور میرے دل نے گواہی دی! "اللہ تعالیٰ نے آج پھر "گھوڑوں والی منضبط فوج" کے مقابلے میں آسمان سے ہمارے لیے مدد بہم پہنچائی ہے۔" دشمن اور آسمانی قہر کے درمیان اب براہِ راست محاذ آرائی شروع ہو گئی تھی۔ طیش میں آیا ہوا دشمن اس "غیبی اشارے" کو اپنی موت کا سامان جان کر



بھاگنے کے بجائے جھنجھلا کر اپنی گولہ باری میں شدت پیدا کرتا جا رہا تھا۔ اس طرح ہمیں یہ فائدہ میسر آ گیا کہ اب ہمیں "ویری لائٹ" استعمال کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ہمارے شیر دل او پی دشمن کی گن کو روشنی میں دیکھتے ہی اس کے نشانے کا تعین کر لیتے اور اتنی صحیح اور مؤثر فائرنگ کرواتے کہ ایک دو راؤنڈ چلنے کے بعد دشمن کے اس مورچے کا صفایا ہو جاتا۔

موسلا دھار بارش اور تیز رفتار جھکڑ چلنے سے نہ صرف یہ کہ ہمارے مورچے پانی سے بھر گئے تھے اور کمر تک پانی میں کھڑے ہو کر دشمن کا مقابلہ کرنا جوانوں کے لیے دوبھر ہو رہا تھا بلکہ کسی درخت کے تنے کی اوٹ بھی ہم نہیں لے سکتے تھے۔ کسی بھی لمحے کوئی درخت ٹوٹ کر ہم پر گر سکتا تھا۔

جوانوں کے جسموں کے نچلے حصے شل ہو رہے تھے لیکن ان کی ہمت بلند تھی۔ حوصلوں میں تازگی تھی ۔۔۔ اُن کے ارادے جواں تھے۔

پچھلے بائیس گھنٹے سے یہ جیالے مسلسل دشمن کی گولہ باری کی زد میں تھے اور اب تک دشمن اُن پر قریباً دو ہزار مارٹر گولے پھینک چکا تھا لیکن ان کا بال تک بیکا نہ کر سکا۔ نصف شب کے بعد جب بارش کی رفتار میں کچھ کمی آ گئی تو کمانڈوز کو محاصرے سے اچانک نکل کر دشمن پر برق رفتاری سے جھپٹنے کا حکم ملا۔

یہ ہماری عسکری زندگی کے اہم ترین لمحات تھے۔ اُس لمحے ہمارے تمام اسٹاف" باری باری ہمارے سامنے سوال بن کر کھڑے ہو گئے۔

"صاب ہم نے کبھی تمہارا قدم غلط نہیں پڑنے دیا۔"

"تمہارے ساتھ جنگلوں میں سرکھپائی کی ہے صاب"!

"تمہارے سنگ سنگ صحراؤں کی ریت پھانکی ہے صاب۔"!

"تمہاری معیت میں سر بفلک پہاڑیاں سر کی ہیں صاب"!

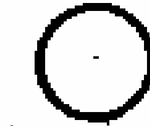
ہر کوئی اپنی اپنی تربیت یاد دلا رہا تھا پھر وہ سب ایک زبان ہو کر چلّائے۔

"ہماری محنتوں کا صبر دو گے نا صاب!"

"نہیں اسٹاف۔ نہیں! وہ وقت کبھی نہیں آئے گا جب ہم جیتے جی کبھی گردن جھکا کر تمھارے سامنے کھڑے ہوں گے۔" مَیں نے دل ہی دل میں اُن سب سے عہد کیا۔

بارش میں مسلسل بھیگنے سے ہماری وردیاں ہی بوجھل نہیں ہو رہی تھیں، جسم کا بند بند بھی پانی میں کھڑے رہنے سے ٹوٹنے لگا تھا۔ اور اُس رات چشمِ فلک نے حیرت سے اُن ڈیڑھ سو سرفروشوں کا نظارہ کیا ہوگا جو بارش میں بھیگتے "نعرۂ تکبیر۔ اللہ اکبر۔ نعرۂ تکبیر۔ اللہ اکبر" پکارتے دشمن پر دیوانہ وار ٹوٹ پڑے تھے۔ ہمارا "چارج" اتنا اچانک، بھرپور اور تیز تھا کہ دشمن بوکھلا گیا۔ اس نے چند منٹ تک جم کر مقابلہ کرنے کی ہمّت بھی نہ کی اور دم دبا کر بھاگ نکلا۔ صبح تک سلہٹ کی فضائیں اُن کے ناپاک وجود سے پاک ہو چکی تھیں۔ بھاگتا ہوا دشمن بے شمار اسلحہ اور گولہ بارود، سینکڑوں زخمی، قیدی اور سینکڑوں لاشیں ہمارے لیے چھوڑ گیا۔

صبح ہم نے اپنے جوانوں کو ایک ایک مگ چائے کا "جامِ حیات" پیش کیا، جس نے اس وقت خاصی مسیحائی کی۔ ہمیں دو گھنٹے سستانے اور شہدا کی تدفین کرنے کے لیے ملے۔ اس کے بعد سلہٹ کے مضافاتی علاقوں میں پھیل کر ہم نے دشمن کے بھگوڑے اور چھپے ہوئے تخریب کاروں کو گھیرا ڈال کر باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ قریباً ایک ہفتے بعد ہم واپس ڈھاکہ جا رہے تھے۔



میس میں پہنچا تو چار پانچ خطوط میرے منتظر تھے جو بڑا لمبا سفر کر کے مجھ تک پہنچے تھے۔





سب سے پہلے جس خط پر میری نظر پڑی۔ اس کی تحریر کچھ اجنبی سی تھی اس لیے مَیں نے پہلے وہی خط کھولا لکھا تھا:

"فوجی صاحب!

یہ خط مَیں احمد علی سے لکھوا رہی ہوں۔ مَیں نے آج تک کوئی خط نہ کسی کو لکھا نہ لکھوایا۔ لکھ تو مَیں سکتی ہی نہیں اور لکھوانے کی کبھی نوبت نہیں آئی، لیکن احمد علی کے گھر اخبار آتا ہے اور روزانہ وہ کوئی نہ کوئی پریشان کن خبر مجھے سنا دیتا ہے۔ چاچا اور چاچی کے پاس میں روزانہ صبح شام تمھاری خیریت معلوم کرنے جاتی ہوں۔ وہ بھی اب کچھ چپ چپ سے رہنے لگے ہیں۔ سمجھ نہیں آتی ان سب لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ میرے فوجی! ضبط کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ آج جب مَیں نے اپنا ٹرنک کسی کام سے کھولا تو اس کے ایک کونے میں رکھی وہ انگوٹھی دکھائی پڑی جو تم نے فوجی امتحان دینے کے لیے جاتے وقت مجھے پہنائی تھی۔ جانے کیوں مجھے رونا آ گیا۔ تم تو جانتے ہو مَیں روتی کبھی نہیں۔ پچھلے دنوں ہماری گائے چوری ہو گئی۔ وہی ڈبے دار وچھیری جو مَیں نے خود لے کر پالی تھی۔ اماں دو تین روز تک اُس کی یاد میں روتی رہی۔ اُس نے تو اتنا غم کیا کہ روٹی تک کو ہاتھ نہ لگایا لیکن مجھے کچھ نہ ہوا۔ میں گو بڑی پتھر دل تھی، لیکن اس روز میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اور ہاں۔ وہ جو تصویر تم نے بھیجی تھی نا اپنی چاچی کو، وہ مَیں پرسوں چوری چھپے رات کو لے آئی تھی۔ جب ماں سو گئی تو مَیں کتنی ہی دیر تک لالٹین کی روشنی میں اُسے دیکھتی رہی۔ اللہ! تم کتنے بدل گئے ہو۔ کیا ڈاڑھی رکھ لی ہے تم نے؟ تم تو روز شیو کیا کرتے تھے۔ کچھ کمزور بھی نظر آ رہے تھے۔

اچھا فکر نہ کرنا مَیں نے تمھارے لیے بڑا اچھی جوڑ رکھا ہے۔ وہ نیل بار والی جو بھینس تھی نا، وہ بس ماں نے میرے نام ہی لگا دی ہے۔ کہتی ہے شادی پر تیرے ساتھ کر دوں

گی۔ اس کے مکھن کا گھی بنا کر میں نے تمہارے لیے رکھا ہے۔ یہ بتاؤ تم کب آؤ گے۔

چاچی مجھے کہتی ہے کہ تم اگلے مہینے ضرور چھٹی پر آؤ گے۔ ضرور آنا۔ اس دفعہ بابا کرم علی کے امرودوں پر بڑا جوبن ہے۔ وہ جو لیچی کا درخت لگایا تھا تم نے ہمارے آنگن میں، اس پر بھی خوب پھل آیا ہے۔ بڑا مزا رہے گا۔ اچھا سچ سچ بتانا کبھی تم نے بھی مجھے یاد کیا ہے یا نہیں۔

کاش تم نے مجھے لکھنا بھی سکھا دیا ہوتا۔ تمہیں خود خط لکھ سکتی ——— کھل کر دل کا حال بیان کر سکتی۔

میں ہی کیا، سارا گاؤں تمہارے لیے دعائیں مانگتا ہے۔ میرے فوجی! تم سینکڑوں میل دور ضرور ہو لیکن میرے دل سے دُور کبھی نہیں ہو سکتے! ہے نا!

تمہاری (رجّو)

رضیہ۔ ! خدا کی پناہ !

——— میں نے تو اُسے بھلا ہی دیا تھا۔ بالکل خوشگوار خواب کی طرح جو کچھ عرصے تک تو یاد رکھے جاتے ہیں پھر انسانی حافظے سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتے ہیں۔

لیکن آج جب اُس کا لکھوایا ہوا خط ملا تو مجھے اپنا بچپن یاد آگیا۔ اپنا گاؤں، اپنے کھیت، اپنی مٹی، اپنے لوگ، اپنے مویشی، اپنے باغات، پگڈنڈیاں، نہر، ٹیڑھے میڑھے کچے پکے راستے، ساون بھادوں کی اولین بارشیں، زمین سے نکلتی مٹی کی سوندھی سوندھی مہک، ہریالی، گھر کا پچھواڑہ، اس کے آنگن میں لگا لیچی کا بوٹا جو میں بڑے شوق سے شہر سے خرید کر لایا تھا جسے میں نے اور رجّو نے مل کر زمین میں گاڑا تھا۔ اپنی محبت کی اولین نشانی۔ (اور پہلی محبتوں کے درخت پر پھل بھی آنے لگا تھا) جست کے برتن میں دودھ کی دھاروں کی کھنک اور رجّو کے ہاتھ۔!!!

ایک ایک کر کے جیسے سب کچھ مجھے یاد آگیا۔ بے اختیار میری آنکھوں کے کونے بھیگ گئے!

"تو رجّو اب تک میری منتظر ہے؟" خط کی تحریر میں سے اُس کی شبیہہ اُبھری" آنکھوں میں انتظار کی جوت جگائے پنجاب کی الہڑ مٹیار رجّو مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

"فوجی کب لوٹو گے؟"

پھر جیسے اچانک خواب کا منظر بدل گیا۔ رجّو کی پرچھائیاں لرزیں اور اُن پر آلنسہ غالب آگئی۔ بڑی مچھلی نے چھوٹی مچھلی کو نگل لیا۔ بنگال کی ساحرہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اپنا جادو مجھ پر پھونک چکی تھی۔

میں بے بسی سے رجّو کو، اپنے بچپن کو، اپنی اولین محبت کو بنگال کے جادو کا شکار ہوتے دیکھتا رہا۔

# موت کے راہی

ڈھاکہ کی زندگی اب ایسے سمندر کی طرح بظاہر پُرسکون ہو رہی تھی۔ جس میں بہت جلد بہت بڑا اجوار بھاٹا اُٹھنے والا ہو۔۔۔ دن کو خاموشی طاری رہتی اور سنگینوں کے سائے میں کاروبارِ زندگی بھی جیسا تیسا چل ہی رہا تھا لیکن اندھیرا پھیلتے ہی دھماکوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

یہاں حفاظتی اقدامات پر مامور جوانوں کو روزانہ رات کو ایک لمبی اور تھکا دینے والی نفسیاتی لڑائی کا سامنا ہوتا تھا۔ بازار کی کسی نکڑ سے، گلی کے کسی موڑ پر، گنجان علاقوں سے گزرتے کسی مکان کی بالکنی سے ایک بم اچھلتا ہوا آتا، زوردار دھماکہ ہوتا، ایک دو جوان شہید ہو جاتے اور دو چار زخمی ہو جاتے۔

۔۔۔۔ انھیں اپنے دفاع میں گولی چلانے سے بھی احتراز برتنا پڑتا تھا کیونکہ کسی بھی بے گناہ شہری کے زد میں آجانے کا خطرہ سر پر منڈلاتا رہتا۔ اس کے علاوہ ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے سخت احکامات تھے کہ بغیر اجازت علاقہ کمانڈر کے ہم کسی بھی مکان میں گھس کر اُس کی تلاشی نہیں لے سکتے تھے۔ اس حد سے بڑھی ہوئی احتیاط پسندی نے ہمیں بڑا نقصان پہنچایا اور آگے چل کر یہی احتیاط پسندی ہماری تباہی کے تابوت میں آخری کیل بن کر ٹھک گئی کیونکہ بھارتی چھاتہ بردار فوج کو جس نے ڈھاکہ



پر لینڈنگ کی تھی مقامی آبادی نے اپنے گھروں میں چھپا کر خفیہ راستوں کے ذریعے ہم پر حملہ آور ہونے کے مواقع فراہم کیے تھے۔

رات کو میس میں کھانا کھاتے ہوئے میرے اردلی نے کسی ملاقاتی کی آمد کا "مژدہ" سنایا۔ ان حالات میں کسی ملاقاتی کی آمد ہمارے لیے واقعی مژدہ بن جاتی تھی۔ اس طرح ہمیں ماحول کی یکسانیت سے کچھ حد تک تو چھٹکارا نصیب ہو جاتا تھا۔

مَیں نے جلدی جلدی دو چار نوالے نگلے اور اپنے کمرے میں پہنچا تو ایک نوجوان جس کے سر پر پٹی بندھی تھی۔ میری چارپائی پر بیٹھا ایک انگریزی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ میری آہٹ پر اُس نے نظریں اوپر اٹھائیں تو میرے منہ سے بے اختیار نکلا "عثمان بھائی!"

"علی بھائی!" کہہ کر اس نے بانہیں پھیلا دیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے دیوانہ وار لپٹ گئے۔ کلکتہ کے بعد یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ عثمان کے سر پہ بندھی ہوئی پٹی کی طرف اشارہ کر کے مَیں نے دریافت کیا۔

"خیریت۔"

"کچھ نہیں، چھرّے ٹانکے لگے ہیں۔ بس قسمت اچھی تھی کہ گولی پھسلتی ہوئی نکل گئی ورنہ تو کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اور جہاں اب پٹی بندھی ہے وہاں آپ کو روشن دان بنا دکھائی دیتا۔۔۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کب واپس لوٹے؟" مَیں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"آج۔ ابھی۔ شاید کل پرسوں تک پھر ہمیں واپس جانا ہوگا۔"

ہم دونوں نے ہی کلکتہ کے متعلق کوئی گفتگو نہ کی۔ کیوں کہ اب عثمان کو میرے "بزنس" کے تمام آداب سے آگاہی حاصل ہو چکی تھی اور وہ بخوبی جانتا تھا کہ کون سی بات کا جواب میرے پاس ہے اور کس بات کا نہیں۔ مَیں نے بھی بجائے جنگی صورتِ حال

پر تبصرہ کرنے کے لیے اُس سے عام گفتگو کرنے کو ہی ترجیح دی۔ لیکن کب تک۔

بالآخر گھوم پھر کے ہم دونوں اُس "بلے رحمانہ موضوع" کی طرف آ گئے کہ سوائے اس کے کہنے سننے کو اور رہ ہی کیا گیا تھا۔ رات گئے تک عثمان چھاؤنی میں میرے پاس رہا۔ رات کو جب اُس علاقے کی طرف ایک پٹرول پارٹی گشت کرنے گئی تو میں نے اُسے بھی اُن لوگوں کے ساتھ بھیج دیا کیوں کہ اس حالت میں اُس کا زیادہ دیر تک بے آرام رہنا صحت کے لیے مضر تھا۔ میں نے اُسے اگلے دن ڈھاکہ میں موجود رہنے کی صورت میں صبح ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کی خواہش تھی چوں کہ ہم کافی دیر بعد اکٹھے ہوئے ہیں اس لیے دوپہر کا کھانا کم از کم اکٹھے کھائیں۔ خیریت گزری کہ اس رات میری کوئی ایمرجنسی ڈیوٹی نہ لگی صرف رات کے آخری پہر مجھے گشت پر نکلی پٹرول پارٹیوں کی فائنل رپورٹ تیار کرنی تھی۔

صبح اپنے افسران کو اپنے اگلے ٹھکانے کی اطلاع دے کر (تاکہ میرے لیے ایمرجنسی پیغام کی صورت میں وہ لوگ مجھ سے وہاں رابطہ قائم کر لیں) میں عثمان کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جیپ میں نے حسبِ سابق گلی کی نکڑ پر ہی کھڑی کر دی تھی اور خود وہاں سے اتر کر پیدل ہی ان کے گھر کی طرف چل دیا۔ گھر سے کچھ فاصلے ہی پر میں گھر کے باہر ہجوم دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

"یا الٰہی خیر" بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور میں تیزی سے ہجوم کے درمیان راستہ بناتا اُس طرف چل دیا جو میرے احترام میں ایک طرف سمٹنے لگا تھا۔

"کیا بات ہے۔ کیا ہوا؟" میں نے دروازے کے باہر سسکیاں لیتے ایک رضاکار سے دریافت کیا جو عثمان کے ساتھ کئی معرکوں میں حصّہ لے چکا تھا۔

"چاچا کو مار ڈالا مکتی باہنی نے" اس نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔



"کیا۔۔۔" حیرت سے میں اُس کا منہ دیکھنے لگا۔

"یس سر یقین نہیں آتا تو جا کر دیکھ لیجئے" ایک بوڑھے بہاری نے مجھے کندھے سے تقریباً جھنجوڑتے ہوئے خاصے طنزیہ لہجے میں کہا۔ اُن کے خیال میں جیسے عثمان کے والد کی موت بھی ہماری لاپرواہی سے واقع ہوئی تھی۔

میں نے دروازہ کھولا دالان میں عثمان پر نظر پڑی۔ چاچا کی لاش وہیں رکھی تھی۔ چارپائی کے پائے سے لگیں ماں بیٹی اُس پر نوحہ کناں تھیں۔ لاش کے منہ پر کپڑا پڑا تھا۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی عثمان "علی بھائی" کہہ کر تیزی سے آگے بڑھا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ مردِ آہن جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہمارے سنگ سنگ ایک طویل عرصے سے موت کی شاہراہ کا مسافر تھا، جو بڑھ چڑھ کر ہر خطرناک مہم کے لیے خود کو رضاکارانہ طور پہ پیش کیا کرتا تھا۔ جس کی آنکھوں کے سامنے سینکڑوں لوگ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرے تھے۔ جو خود کئی مرتبہ موت کے منہ سے بال بال بچ نکلا تھا۔

ـــــــ آج وہی بہاری وطن پرست بچوں کی طرح سسکیاں لے کر میرے گلے سے لپٹا رو رہا تھا۔ ظالم مکتی باہنی کے درندے بالآخر اپنے انتقام کی پیاس کسی حد تک بجھانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ عثمان کے ہاتھوں انھوں نے بار بار زک اٹھائی تھی۔ وہ نہ جانے کب سے اس موقعے کی تلاش میں تھے کہ اس سے اپنا انتقام لیں ـــــــ وہ درندے، عثمان جیسے ہر وطن دوست کے ہی نہیں اُس کے پورے کنبے کے خون کے پیاسے تھے۔

عثمان نے مجھے روتے ہوئے آہوں اور سسکیوں کے درمیان بتایا کہ رات چاچا عشاء کی نماز پڑھنے حسبِ معمول مسجد میں گئے تھے۔ جب کافی دیر تک وہ واپس نہ آئے تو گھر والوں کو فکر دامن گیر ہوئی لیکن عثمان نے انھیں تسلی کروا دی کیوں کہ چاچا کا یہ معمول تھا

کر وہ نماز کے بعد نوافل پڑھتے اور تمام نمازیوں کے گھروں کو رخصت ہونے کے کافی دیر بعد گھر واپس لوٹتے تھے۔ رات قریباً گیارہ بجے عثمان خود اپنی رائفل لے کر باپ کو ڈھونڈنے نکلا۔ مسجد کو اُس وقت امام صاحب تالا ڈال کر سو رہے تھے۔ اُس نے محلّے کے کچھ رضا کار ساتھ لیے اور ارد گرد علاقے کو کھنگالنا شروع کیا لیکن چاچا نہ مل سکے۔ مایوس ہو کر وہ لوگ گھروں کو لوٹ گئے

مکتی باہنی نے اب تک دو تین مرتبہ عثمان کے گھر پر حملہ کیا تھا —— لیکن سوائے ایک حملے کے جب امیت سرکار وہاں گھس آنے میں کامیاب ہو گیا تھا اُنھیں کوئی اور کامیابی نصیب نہ ہوئی اور انھوں نے ابتدائی حملے ہی میں ایسی منہ کی کھائی کہ دم دبا کر بھاگ نکلے۔ اس کے بعد سے وہ لوگ اُن کی تاک میں تھے۔ اُن کی کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح عثمان یا اس کے والد زندہ ہاتھ آئیں تو انھیں اذیتیں دے دے کر موت کی نیند سُلا سکیں۔ بڑی سوچ بچار کے بعد بالآخر اُن کے ہاتھ عثمان کے والد کی یہ کمزوری لگی کہ وہ رات کو بہت دیر گئے مسجد سے واپس لوٹتے ہیں، جب کہ سرِ شام ہی وہاں سناٹا چھا جاتا تھا اور بھرے پڑے بازاروں میں بھی کوئی باہر نکلنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ انھوں نے اسی موقعے کو مناسب جانا اور مکتی باہنی کے دو تین آدمی نمازیوں کے بھیس میں وہاں چلے آئے۔ ہر بنگالی کو شک کی نگاہ سے تو دیکھا نہیں جاتا تھا نہ ہی اُس بے چارے بوڑھے کے وہم و گمان میں یہ بات تھی کہ وہ نمازی دراصل موت کے فرشتے ہیں۔ نماز کے بعد وہ لوگ وہیں مسجد میں چھپ کر اس کی واپسی کے منتظر ہو گئے۔ جب عثمان کے والد نماز پڑھ کر حسبِ معمول اپنے نوافل اور وظائف مکمل کرنے کے بعد باہر نکلے تو اُن لوگوں نے انھیں زبردستی اغوا کر لیا۔

بے چارا ادھان پان سا بوڑھا جو پہلے ہی مسلسل صدمے اور ذہنی اذیتیں برداشت کر کر کے ادھ موا اور زندہ درگور ہو چکا تھا اُن مشٹنڈوں کا کیا خاک مقابلہ کرتا وہ لوگ



اُسے کندھے پر لادے بے ہوشی کی حالت میں اٹھا کر خفیہ راستوں سے باہر نکل گئے۔ ایسے خفیہ راستے، وہ اپنا ہر حملہ شروع کرنے سے پہلے فرار ہونے کے لیے چن رکھتے تھے کیوں کہ ڈھاکہ کے چپّے چپّے پر یا گلیوں بازاروں میں پہرہ دینے کے لیے ہمارے پاس بہت زیادہ فوج نہیں تھی۔ وہاں تو بمشکل سرحدوں پر دشمن سے نمٹا جا رہا تھا ایک ایک کمپنی کو مسلسل کئی کئی روز تک لڑنا پڑتا تھا۔ اندرونی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے فوج انتہائی ناکافی تھی۔

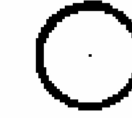
ساری رات خونخوار بھیڑیے اُس بے کس اور بدبخت بوڑھے بہاری پر جس کا جرم یہی تھا کہ وہ اپنی مٹی سے محبت کرنے والا ہے۔ ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے رہے۔ اور صبح اس کی مسخ شدہ لاش محلے کے باہر پھینک گئے۔ چاچا کا چہرہ اذیتیں دے دے کر انھوں نے اس قدر بگاڑ دیا تھا کہ چند لمحوں کے لیے بھی اُس پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ آنکھوں کی جگہ دو گڑھے نظر آ رہے تھے۔ ہونٹ اور کان کٹے ہوئے اور غائب تھے۔

ایسی درندگی اور بربریت اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ لاش کے گلے پر رستے سے گھسیٹنے کے نشان بڑے واضح اور ابھرے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی بنگالی زبان میں لکھا ایک رقعہ اُس کی لاش پر رکھا تھا جس کا ترجمہ کچھ یوں تھا۔

"اگر خیریت چاہتے ہو تو اپنی بہن اور ماں سمیت ہتھیار ڈال کر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دو۔ ورنہ یاد رکھنا تم تینوں کے ساتھ اس سے بھی زیادہ بدترین سلوک کیا جائے گا"

اس رقعے میں "ہتھیار ڈالنے" اور "پیش ہونے" کے لیے کسی جگہ کی نشان دہی نہیں کی گئی تھی لیکن ہم سب بخوبی جانتے تھے کہ انھیں ہر محبِ وطن پاکستانی خصوصاً بہاریوں

کے پل پل کی خبر رہتی ہے۔ اگر عثمان لڑائی سے ہاتھ کھینچ لیتا تو انھیں یقین آ جاتا اور وہ اپنے ذرائع سے اُسے حاضر ہونے کی جگہ کی نشاندہی بھی کر دیتے۔



چاچا کی مسخ شدہ لاش دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ سالے ڈھاکے کی بنگالی آبادی کو بلڈوزروں سے روند ڈالوں۔ لیکن یہ صرف سوچنے اور جذباتی ہو جانے کا معاملہ نہیں تھا۔ چاچا کے قاتلوں کی گرفتاری بہت ضروری تھی ورنہ یہاں موجود باقی محبِ وطن رضاکاروں کا مورال بُری طرح ڈاؤن ہو جاتا۔ وہ لوگ پہلے ہی خود کو عدمِ تحفظ کا شکار جاننے لگے تھے۔ شاید اسی لیے اس بوڑھے نے مجھے طنزیہ لہجے میں مخاطب کیا تھا۔

میری وردی دیکھ کر گھر کے باہر والا ہجوم بے قابو ہو رہا تھا۔ وہ لوگ "انتقام" "انتقام" کے نعرے لگا رہے تھے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس سے انتقام لینے کو کہہ رہے ہیں؟ کیا ہم لوگ سارے مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کو مار ڈالیں؟ کیا یہ ممکن تھا کہ اُن میں سے ایک ایک غدار کو چن کر الگ کیا جا سکے یا مکتی باہنی کے غنڈے اپنے گلے میں تخریب کار ہونے کی تختیاں لٹکائے پھر رہے تھے کہ ہم نے انھیں نظر انداز کر رکھا تھا؟

یہ لوگ آخر ہمیں کیوں قصوروار جان رہے ہیں۔

ہم بھی تو اُن کی طرح مجبور تھے۔ مجبورِ محض!

مَیں نے عثمان کو تسلی دی اور مردانہ وار حالات کا مقابلہ کرنے کی تلقین کی۔ حالانکہ یہ طفل تسلیاں دینے والی بات تھی۔ مَیں جانتا ہوں ہم مرنے والوں کا پُرسہ روٹین ہی میں کرتے ہیں۔ صبر تو اللہ کی ذات ہی انسان کو دیتی ہے لیکن اس کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔ یہ حادثہ صبر کرنے کا نہیں تھا۔ اُصولاً تو ان لوگوں کو بھی رو رو کر چاچا کے



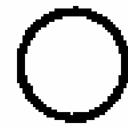
ساتھ ہی مر جانا چاہیئے تھا لیکن وہ صرف رو رہے تھے۔ بین کر رہے تھے۔ دہائی دے رہے تھے۔!!

اور مَیں۔!

مجھے تو رونا بھی نہیں آتا تھا۔ مَیں تو پتھر کی سل بنا مکان کے باہر بچھی ایک کھاٹ پر بیٹھا ہونقوں کی طرح اُن لوگوں کے چہرے تک رہا تھا۔ وہ مریل مریل سانولے چہرے جن کی آنکھوں سے خوف اور وحشت ٹپک رہی تھی، جو نہ جانے کس برتے پر اپنے ڈھانچوں میں ابھی تک روحوں کو مقید کیے ہوئے تھے۔

عثمان کو مَیں نے اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا تھا۔ اس کی حالت اب کافی سنبھل گئی تھی۔ میرے وجود میں لاش کی حالت دیکھتے ہی تپتا ہوا لاوا کھولنے لگا تھا۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ قاتلوں کا پتہ چلا سکوں ورنہ میں ایک پل بھی شاید یہاں نہ رکتا۔

دوپہر تک ہم نے لاش کو تدفین کے لیے تیار کر لیا۔ جنازہ اٹھا تو وہاں ایک کہرام برپا تھا۔ مَیں اب تک خود میں آلنسہ سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں پاتا تھا۔ لیکن میرے اندازے سے بالکل ہٹ کر وہ انتہائی صابرا اور بہادر لڑکی تھی۔ اُسے دیکھ کر اُس لمحے مجھے قرونِ اُولیٰ کی وہ مسلمان بیٹیاں یاد آ گئیں جو اپنے باپوں کی راہِ حق میں شہادت پر فخر کیا کرتی تھیں اور جن کی استقامت کو فرشتے سلام کرتے تھے۔



اب تک میں آلنسہ سے نہیں ملا تھا۔ جس روز ہم نے اس کے باپ کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا اس روز مَیں ان کے گھر گیا۔ عثمان کے زخموں کو خاصا آرام تھا۔ اس کے ٹانکے دو تین روز پہلے ہی کھل چکے تھے۔ اسے جان بوجھ کر ہم نے آرام کا موقع فراہم کر رکھا تھا کہ اس کی ذہنی اور جسمانی حالت کسی حد [illegible] نارمل ہو۔
دروازہ حسبِ سابق آلنسہ ہی نے کھولا۔ اس کی حالت قدر [illegible] سنبھل چکی تھی لیکن

ایسی بھی نہیں کہ اس نے اپنے باپ کی موت کا سانحہ بھلا دیا ہو۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ سلام کرنے کے بعد اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی لیکن لاکھ ضبط کے باوجود وہ اپنے آنسو نہ روک سکی۔

اس لمحے جس کیفیت کا ہم دونوں شکار تھے، اس کا اظہار الفاظ میں شاید کبھی ممکن نہ ہو سکے۔ آنسوؤں سے بھیگی اُس کی مسکراہٹ نے اس کے اندر کے کرب کو مجھ پر عیاں کر دیا تھا۔ خود میں ایک قدم دروازے کے اندر اور ایک باہر رکھے ٹکٹکی باندھے مجسم حُسنِ پریشاں کو ہونقوں کی طرح تکے جا رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُسے پرسا دوں تو کس طرح؛ کن الفاظ میں؛ مَیں کوئی شاعر تو تھا نہیں، نہ ہی کوئی بہت پڑھا لکھا شخص تھا۔ مَیں تو ایک عام سا فوجی تھا جس پر بدقسمتی سے میدانِ جنگ سے باہر کے حالات کچھ زیادہ ہی اثر انداز ہونے لگے تھے۔ ممکن تھا دوسرے لوگ بھی اس کیفیت کا شکار ہوں لیکن مجھے اقرار کرنے دیجیے کہ مَیں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی حساس ہو گیا تھا۔

"کیسی ہو آنسہ؟" مجھے اور کچھ نہ سوجھا۔

میرے سوال کا جواب ایک سسکی کی صورت میں اس کے منہ سے نکلا اس کے ساتھ ہی ایک ہوک سی میرے سینے سے اُٹھی۔

"آئیے نا" اس نے روہانسی آواز سے آدابِ مہمان نوازی کا حق ادا کرنا چاہا اور میں ہپناٹائزڈ سا اندر داخل ہو گیا۔

"کون ہے آنسہ؟" عثمان یہ پوچھتے ہوئے خود بھی وہاں آ گیا۔

"اوہ۔ علی بھائی۔" اس نے مجھ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا اور میری طرف بڑھا۔ آنسہ جس کے لیے آنسو اور آہیں ضبط کرنا ناممکن ہو رہا تھا، اپنے منہ پر ہاتھ رکھے تیزی سے اندر چلی گئی۔ مَیں بے بس سا ان سارے مناظر کا روگ پالتا رہا۔



"کیسے ہیں علی بھائی؛ بہت اچھا کیا آپ نے جو آ گئے۔ امی آپ کو کل سے یاد کر رہی تھیں۔" عثمان نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کی۔

"خدا خیر کرے۔" میرے دل نے کہا اور میں اس کی معیت میں اسی کمرے میں جا بیٹھا جہاں کبھی مرحوم والد سے میری باتیں ہوا کرتی تھیں۔ چند منٹ بعد ہی اس کی والدہ وہاں آ گئیں۔ مَیں انھیں دیکھ کر سلام کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ خلافِ توقع بہادر بڑھیا نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور مطمئن سی سامنے کرسی پر بیٹھ گئیں۔ مَیں نے سینکڑوں جوانوں کو مرتے دیکھا تھا، ان کی تدفین ہوتے دیکھی، لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چاچی سے اظہارِ غم کروں تو کیسے؛

"بیٹا مجھے علم ہے تمھیں مرحوم سے محبت تھی۔ تم بھی ہمارے غم میں برابر کے شریک ہو۔ ہمارے لیے قابلِ افسوس بات تو تب ہوتی جب خدانخواستہ ان کی قربانی رائگاں جاتی۔ خدا ہی سب کی نیتوں کا حال جانتا ہے لیکن خدا شاہد ہے بیٹے کہ مَیں نے کبھی اولاد، خاوند یا مال و متاع پر حق نہیں جتلایا۔ مَیں ہوتی ہی کون ہوں کسی شے پر حق جتلانے والی۔ مَیں نے تو اپنا بیٹا اور بیٹی بھی ملک و ملت کو سونپ رکھے ہیں میرے لیے باعثِ سعادت ہوتا بیٹا اگر اس بڑھیا کی جان بھی ملک کے کسی کام آ سکتی۔" انھوں نے خود ہی بڑے پُر وقار لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

میری نظریں وقار و عظمت کی اس پُتلی پر نہ ٹھہرتی تھیں جو اپنے سہاگ کا دان مادرِ وطن کو دے کر سرخروئی سے سینہ تانے میرے سامنے بیٹھی تھی۔

سلام ہو ایسی عظیم المرتبت ماؤں پر!

"اچھا بیٹا مَیں تمھارے لیے چائے بھیجوں۔" شاید اسے میرے سامنے آنسو بہانا گوارا نہ تھا؛ چنانچہ میرا جواب سُنے بغیر وہ چلی گئی۔ عثمان اور مَیں کافی دیر تک چپ چاپ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ شاید اسے بھی میری طرح کہنے کے لیے کوئی بات نہیں سوجھ

رہی تھی۔ پھر اسی نے ہمت کر کے خاموشی کا طلسم توڑا:

"علی بھائی! پرسوں ہم لوگ کومیلا کی طرف جا رہے ہیں۔ میں نے بھی اپنا نام زبردستی اس طرف جانے والے رضاکاروں میں لکھوا دیا ہے۔"

میں اس کی اس بات کا کیا جواب دیتا۔ میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ اب عثمان اپنی ماں بہن کو چھوڑ کر جائے۔ مصلحت بھی اسی میں تھی کہ وہ ڈھاکہ سے باہر نہ نکلے لیکن جس عظیم مقصد کے لیے وہ جا رہا تھا اس سے اُسے منع کرنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ مادرِ وطن کی حفاظت کے لیے ایسی قربانیاں کیا معنی رکھتی ہیں؟ جانے عثمان جیسے کتنے ماں کے لال اپنے گھر بار لٹا کر سروں سے کفن باندھے اس رزمِ حق و باطل میں کودے ہوئے تھے۔

"ٹھیک ہے عثمان لیکن مناسب تھا اگر تم ڈھاکہ ہی میں رہ جاتے۔" میں نہ چاہتے ہوئے بھی کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"علی بھائی آپ تو ایسی بات نہ کہیئے۔" اس نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔

مجھے کچھ شرمندگی سی ہوئی۔ میری مشکل آنسہ نے آسان کر دی جو اس لمحے چائے کے برتن سنبھالنے اندر داخل ہوئی۔ ابھی اس نے چائے بنائی ہی تھی کہ باہر دروازے پر آہٹ ہوئی۔ عثمان کے اٹھنے سے پہلے میں خود ہولسٹر سے پستول نکال کر باہر نکل گیا۔ دروازہ میں نے بالکل کمانڈوز کے سے انداز میں کھولا تھا۔ باہر کتنا ہی ہوشیار مجرم کیوں نہ ہوتا اس کے وار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وہی ہوا، دروازے سے لگے شخص کے سر پہ میں اتنا اچانک پہنچا تھا کہ وہ بوکھلا گیا۔ خیریت گزری کہ وہ عثمان کے ساتھیوں میں سے تھا۔ میں نے اس سے معذرت کی اور اندر آ کر عثمان کو اس کا پیغام دے دیا۔ عثمان جو ہاتھ میں اسٹین گن پکڑے بیٹھا تھا بغیر کچھ کہے سنے باہر چلا گیا۔

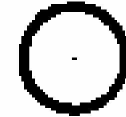


میں نے چائے کی پیالی اٹھا لی اور آنسہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کا حسنِ جہاں سوز بھی عجیب قیامت ڈھا رہا تھا۔ میں ابھی کچھ کہنے کے لیے پر تول ہی رہا تھا کہ عثمان اچانک اندر آیا اور بولا "میں تھوڑی دیر تک واپس آتا ہوں۔ علی بھائی آپ جائیے گا نہیں۔"

"بھئی چائے تو پیتے جاؤ!" میں نے کھڑے ہو کر اسے روکنا چاہا۔

"کرنل صاحب نے فوراً بلایا ہے۔ وہ صرف گھنٹہ ڈیڑھ کے لیے آئے ہیں۔ انھیں "بریف" کر کے واپس جانا ہے۔" اس نے میری اگلی بات سنے بغیر "خدا حافظ" کہا اور اسٹین گن پکڑے باہر نکل گیا۔

"فی امان اللہ۔" میں نے آہستہ سے کہا اور بے دم ہو کر واپس بیٹھ گیا۔



آنسہ اور میں دونوں کن انکھیوں سے چوری چھپے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی اچانک جب ہماری نظریں آپس میں ٹکرائیں تو ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے شرمندگی محسوس کرنے لگتے۔

"آنسہ! میں معمولی سا سپاہی ہوں۔ اگر بہت بڑا ادیب بھی ہوتا تو شاید وہ لفظ مجھے کبھی نہ مل پاتے جن کے ذریعے تمہارے والد کی قربانیوں کو خراجِ عقیدت پیش کر سکتا لیکن ایک بات ضرور ہے۔ دنیا میں روزانہ لاکھوں لوگ مرتے ہیں لیکن وہ خدا کے مقرب ٹھہرے جو کسی عظیم مقصد کی خاطر اپنے انجام کو پہنچ جائیں۔

"آنسہ! جب مستقبل کا مورخ آج کی کہانی لکھنے بیٹھے گا تو وہ کبھی نہیں جان پائے گا کہ اس جنگ میں جو ہم ایک طویل عرصے سے لڑ رہے ہیں، کوئی آنسہ، عثمان یا اس کے والدین بھی شامل تھے لیکن من حیث القوم تمہاری جاں نثاریوں اور جاں سپاریوں کو خراجِ تحسین پیش کیے بغیر وہ کبھی نہ رہ سکے گا۔ کاش میری قوم اس قابل

ہو جائے کہ وہ تمہاری ان عظیم الشان قربانیوں کا ادراک حاصل کر سکے "میرا لہجہ خاصا گمبھیر ہو رہا تھا۔

"علی" وہ سسک پڑی۔

دکھ پر مرہم وقت ہی رکھے تو رکھے، انسانوں کی بنائی ہوئی کسی لغت میں وہ الفاظ نہیں، جنہیں ادا کر کے کوئی غم گساروں کو مطمئن کر سکے۔ اس لمحے جب وہ کمزور اور دھان پان سی بنگال کی ساحرہ میرے سامنے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی، خود مجھے اپنا دل پگھلتا محسوس ہو رہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ آنسہ جی بھر کے آنسو بہا لے تاکہ اس کے اندر کا سارا غبار دھل جائے۔

وہ بڑی حوصلہ مند لڑکی تھی۔ ضبط کر گئی۔ اس نے خود ہی دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور ایک بے جان سی زبردستی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"علی!" اس نے سنبھل کر کہنا شروع کیا "مجھے آپ سے کچھ باتوں کی معافی مانگنی تھی۔"

میں تڑپ ہی تو گیا "کیسی بات کر رہی ہو آنسہ" میں نے بے چینی سے پہلو بدل کر کہا۔

"مجھے آپ سے وہ کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا جو میں نے کہا۔ اصل میں خوف انسان کو بزدل بنا دیتا ہے اور کمزور انسان اسی لمحے تحفظِ ذات کے مرض کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔"

"آنسہ" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "مجھے شرمندہ نہ کرو۔ شاید تم یہ کبھی نہ جان پاؤ گی آنسہ کہ جب سے تم نے خود کو میری ذات سے منسوب کیا ہے میں خود کو کتنا ارجمند جاننے لگا ہوں۔ میری اصلیت بھی یہی ہے آنسہ کہ میں بھی بہت کمزور انسان ہوں۔ یہ جنگ ہم میں سے کسی نے بھی نہیں چاہی تھی۔ ہم سب لقا کی یہ لڑائی امن

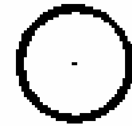


کے لیے لڑ رہے ہیں۔ میں جانے کتنی شدت سے ان لمحوں کا منتظر ہوں جب فضاؤں کی زہرناکیاں اپنی موت مر جائیں اور میں تمہیں لہروں کے دوش پر جھولا جھلاتا یہاں سے دور پنجاب کے سبزہ زاروں میں لے جاؤں۔ تم نہیں جانتیں آنسہ کہ وہ سب لوگ تم سے مل کر کتنا خوش ہوں گے"!

"علی۔ یہ سپنا" اس نے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔ اس سے آگے کہنے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔

"آنسہ! یہ سپنا ضرور پورا ہو گا۔ اس سنہری دھرتی پر ماجھیوں کے گیت پھر سے گونجیں گے۔ ہمارے کھیتوں کی ہریالی بہت جلد لوٹنے والی ہے۔ بہت جلد" میں نے جوشِ جذبات سے کھڑے ہو کر اس کے کندھے تھام لیے۔

"علی" آنسہ کٹی ہوئی ٹہنی کی طرح مجھ پر آن گری۔ اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔



چاچی تھوڑی دیر بعد ہی اندر آ گئی۔ میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا کہ ان دونوں کے دل و ذہن میں کلبلاتے اندیشوں کو اپنی لچر سی اور بے معنی دلیلوں کے ذریعے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دوں۔ میں اپنا سارا زورِ خطابت تصویر کا ایک ہی رخ روشن رُخ پیش کرنے پر صرف کر رہا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں بالکل جھوٹ بول رہا ہوں۔ اس لمحے مجھے نہ جانے کیوں شرم نہ آئی۔

عثمان کی واپسی تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اس نے اشارے سے ماں بہن کو باہر جانے کو کہا اور مجھ سے مخاطب ہوا "علی بھائی! ہم لوگ آج رات کی فلائٹ سے چلے جائیں گے۔ میں بزدل نہیں لیکن حقائق سے آنکھیں بند کرنا بھی شانِ مردانگی نہیں سمجھتا۔ علی بھائی! میرے بعد اس دنیا میں اب میری ماں اور بہن کی محافظ صرف

خدا کی ذات ہے۔ جس روز کلکتہ میں آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا اس روز کے بعد سے میں خود کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا ہوں لیکن ایک خلش سی رہ رہ کر مجھے ضرور ستاتی ہے کہ کہیں یہ میرا ایک طرفہ فیصلہ تو نہیں تھا۔۔۔۔"

"عثمان!" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

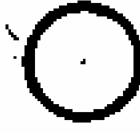
"تم خود ایک مرد ہو اور اس بات کو بخوبی سمجھ سکتے ہو کہ جس کی قسمت آلنسہ سے منسوب ہو جائے وہ دنیا کا خوش قسمت ترین شخص ہو گا۔ مجھ میں اتنا حوصلہ ہی نہیں تھا کہ کبھی کھل کر تم سے یہ بات کہہ سکتا۔ شاید خدا کو میری حالت پر رحم آگیا اور میرے دل کی بات تمھاری زبان پر آ گئی۔ میں نے اتمام حجت کے لیے گھر والوں کو سارے حالات لکھ کر بھیج دیے ہیں۔ مجھے امید ہے امیرے والدین بھی میرے فیصلے سے اختلاف نہیں کریں گے۔ کاش ملکی حالات اس قابل ہوتے کہ میں انھیں بلا سکتا۔"

"علی بھائی! اب میں مطمئن ہو کر موت کے منہ میں چھلانگ لگا سکتا ہوں۔" اس نے گرمجوشی سے میرا ہاتھ دبایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب ہم اُسے رخصت کر رہے تھے تو جہاں اس کی ماں اور بہن کے گمبھیر لہجے ان کے اندرونی دُکھ کی نشاندہی کرتے تھے وہاں ایک طمانیت سی ان کے چہروں سے ٹپک رہی تھی۔ شاید عثمان نے انھیں میرے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا اور ایسے ناممکن حالات میں ان کے لیے یہ بات کسی معجزے سے ہرگز کم نہ تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں بھی ان لوگوں سے الگ ہو گیا۔ اس مرتبہ مجھے دروازے تک چھوڑنے کے لیے چاچی خود آئی تھیں، جبکہ آلنسہ اندر ہی رہ گئی جو اس بات کا اشارہ تھا کہ انھوں نے شعوری طور پر مجھے اس رشتے کے حوالے سے جاننا شروع کر دیا ہے جو میں ان سے استوار کرنے جا رہا تھا یا پھر صحیح لفظوں میں تقدیر اور حالات نے ان کے اور میرے بیچ قائم کر دیا تھا۔





حالات اتنے بگڑ گئے تھے کہ اب کسی بھی افسر کو اکیلے سفر کرنے کی اجازت نہیں تھی خصوصاً ہم جیسے "سپیشل ڈیوٹی" افسروں کو تو سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ چھاؤنی سے باہر ہرگز اکیلے نہ جائیں۔ ہم لوگ عموماً ایسے احکامات نظرانداز کر دیتے تھے کہ کون اپنے ساتھ باڈی گارڈوں کی فوج بھی پالتا پھرے۔ بمشکل چند لمحے ہی تو میسّر آتے تھے جنھیں حفاظتی اقدامات کی نذر کر دینے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

اس مرتبہ جب میں شہر کی طرف آنے لگا تو کرنل صاحب نے ایک حوالدار کو زبردستی میرے ساتھ کر دیا۔ اب وہی میری جیپ میں موجود تھا۔ جیپ میں نے احتیاطاً یہاں سے دو فرلانگ دُور کھڑی کی تھی۔ واپس پہنچا تو جیپ میں لگے وائرلیس پر ایک پیغام میرا منتظر تھا۔

میں ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ ہمیں اچانک ہی احکامات ملا کرتے تھے لیکن اس روز نہ جانے کیوں مجھے کچھ تشویش سی ہوئی۔ میں نے حوالدار کو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کو کہا اور خود اپنی گن سنبھالتا دوسری سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ابھی ہم لوگ ہوائی اڈے سے کچھ دُور ہی تھے کہ اچانک حوالدار نے بریک لگائے اور جیپ الٹتے الٹتے بچی۔ یکے بعد دیگرے دو گولے زوردار دھماکوں کے ساتھ ہمارے قریب سے اپنے پیچھے چنگاریوں کی ایک لکیر چھوڑتے آگے گزر گئے۔

میں دل ہی دل میں حوالدار کی حاضر دماغی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ دوسرے ہی لمحے میں گن سمیت چھلانگ لگا کر جیپ سے باہر تھا۔ حوالدار نے بڑی پھرتی سے اسٹیئرنگ گھمایا اور جیپ ایک آڑ میں کھڑی کر کے اگلے حکم کا منتظر ہو گیا۔

کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر ایک اور گولا ہمارے سروں پر سے پرواز کرتا گزر گیا۔

آواز سے ہم نے اندازہ لگایا کہ یہ فائرنگ "مارٹر" سے کی جا رہی تھی جو میرے ہی لیے نہیں بلکہ مجھ جیسے بہت سے لوگوں کے لیے تشویش کا باعث تھا۔

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ تخریب کار شہر میں مارٹر گنیں کس طرح لے آئے ہیں؟ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ ہمارے انتظامات میں انھیں کہیں بہت بڑا خلاء نظر آگیا تھا جسے ان لوگوں نے خوب خوب استعمال کیا۔ اس کے بعد کوئی گولہ نہ پھٹا۔ تھوڑی دیر بعد جب ہم ان کے گرنے کی جگہ تک پہنچے تو میں نے اندازہ لگایا کہ فائرنگ کرنے والے یا تو بالکل نااہل تھے یا پھر ان کی گنوں میں "سائٹ" نصب نہیں ہے شاید اسی وجہ سے وہ نشانہ صحیح نہیں لے پائے۔

ہمارے SWEEP OPRATIONS عموماً شہروں تک ہی محدود تھے سارے مشرقی پاکستان میں تو ہم پھیل کر وہاں کے چپے چپے پر کارروائی کرنے سے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تخریب کاروں کے ٹھکانے اب مضافات میں منتقل ہو گئے۔ جہاں انھیں یا تو ہر طرح کی سہولت خود بخود مل جاتی تھی یا پھر وہ زبردستی حاصل کر لیتے تھے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ مضافاتی علاقے ہمارے کنٹرول سے بالکل باہر ہیں۔ جس کا اندازہ اس ایک واقعے سے لگا لیجئے کہ سدھیر گنج کا پاور اسٹیشن جو ڈھاکہ سے چند میل کے فاصلے پر تھا، تخریب کاروں کی کارروائیوں کا نشانہ بن گیا اور جب وہاں مغربی پاکستان سے عملہ منگوا کر مرمت کے لیے بھیجا گیا تو ان کے محافظوں کی موجودگی میں تخریب کاروں نے پانچوں ٹیکنیشنوں کو مار ڈالا۔

عموماً مضافاتی علاقوں میں گشت کرتے ہوئے ہمیں یوں لگتا تھا جیسے ہم ENEMY TERRITORY سے گزر رہے ہیں۔ وہ افسر جن کے سر اندرونِ شہر نظم و نسق رکھنے کی ذمہ داری ڈالی جاتی خود دردِ سر میں مبتلا ہو کر رہ جاتے۔ مسلمان اور پاکستانی ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے "معصوم" "بے گناہ، ورغلائے گئے" "پوربو پاکستانی بھائیوں" کے خلاف



کارروائی کرنے سے ہچکچاتے یا پھر اس وقت ان پر فائرنگ کرتے جب دشمن عین سر پر آجاتا۔ ان کی اس "رحمدلی" کے ہاتھوں اب تک سینکڑوں جوان بغیر ایک گولی فائر کیے شہید ہو چکے تھے۔

عموماً سو یا ڈیڑھ سو افراد کی ایک کمپنی کے ذمے پورے شہر کی حفاظت ڈال دی جاتی۔ ان کے فرائض میں متعلقہ علاقوں کے ریڈیو اسٹیشن، بجلی گھر، تار گھر اور اسی نوعیت کی دوسری حساس قسم کی تنصیبات کی حفاظت کرنا اور انھیں دشمن کے ممکنہ حملے سے محفوظ رکھنا شامل ہوتا۔ اوّل تو اتنے کم افراد سے اس بات کی توقع ہی رکھنا فوجی نکتہ نگاہ سے سوائے بیوقوفی کے اور کچھ نہیں۔ اس کے باوجود جوان معجزاتی طور پر اپنی ذمّے داریوں سے کماحقہ عہدہ برآ ہوئے۔

اس طرح مجھ جیسے افسران جنھیں زیادہ تر میدانِ عمل میں رکھا جاتا خود کو خوش قسمت جانتے۔ ہم لوگ زیادہ کارروائیاں دشمن کے علاقے میں گھس کر ہی انجام دیا کرتے تھے یا عموماً دشمن کے "بھرپور حملے" کا سامنا کرتے جاتے تھے۔ چھاؤنیوں میں ہمیں ہلے آپریشن کے بعد محض ایک دو روز آرام کرنے ہی کے لیے بلایا جاتا تھا۔ یہ رعایت بھی کچھ خوش قسمتوں ہی کو حاصل تھی جن میں سے اتفاق سے ایک میں بھی تھا۔ ورنہ تو میرے کئی ساتھی افسران پچھلے کئی کئی مہینوں سے مستقل اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھے۔ کبھی کبھی اپنے ہیڈ کوارٹر، یا بٹالین ہیڈ کوارٹر میں ان کی خیریت کی اطلاع کسی محاذ سے آجاتی یا ان سے الگ ہو کر یہاں پہنچنے والے شدید زخمیوں کے ذریعے ان کے حالات کا علم ہو جاتا۔ ایک ہی کمپنی یا ایک بٹالین میں رہتے ہوئے جب کہ ہمارے فرائض کی نوعیت بھی قریباً ایک ہی جیسی ہوتی، ہمیں مہینوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتی تھی۔

بھارتی افواج کی اس قدر بالواسطہ مداخلت جو وہ مشرقی پاکستان میں کر رہی تھیں، دیکھ کر اس وقت میں سوچا کرتا تھا کہ آخر ان لوگوں کو ہم پر حملہ کرنے میں کیا دشواریاں پیش آتی ہیں۔ پاکستان پر اپنی جارحانہ یلغار کے لیے انھوں نے عالمی رائے عامہ کو بھی اپنی چلتر بازیوں اور پروپیگنڈے کے زور سے کافی حد تک ہموار کر لیا ہے اور مقامی طور پر بھی اپنی مکاریوں اور ریشہ دوانیوں سے گھر کے بھیدیوں اور غداروں کے تعاون سے ایسے حالات پیدا کر لیے ہیں کہ اب ان کے حملے کے لیے میدان بالکل صاف تھا۔

اس وقت تو مجھے ان سوالوں کا کوئی جواب نہ ملا لیکن ایک لمبی مدت کے بعد جب بھارت ہی سے اس سانحے پر کتابیں چھپیں جن میں سے اکثر بھارتی حکومت کی آشیرواد ہی سے منظر عام پر آئیں تو اس سوال کا جواب بھی بھارتی فوج کے ایک میجر جنرل ڈی کے پیلٹ کی تصنیف THE LIGHTING CAMPAIGN PAGE NO41-42 سے مل گیا یہ جنرل اس منصوبے میں پوری طرح شامل تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

"درحقیقت مسلح افواج کو بھرپور حملہ کرنے کے لیے مزید مہلت درکار تھی۔ کیونکہ ہماری فوج کے کئی ڈویژن انتخابات کی وجہ سے اندرون ملک امن وامان برقرار رکھنے کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ دو ڈویژن فوج مغربی بنگال پہنچ چکی تھی لیکن اس کا بھاری اسلحہ ابھی تک کشمیر میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ ناگا اور میزولینڈ MIZO LAND کی ممکنہ شورش سے نمٹنے کے لیے دو ڈویژن فوج مستقل وہاں موجود تھی۔ فضائیہ کے لیے بھی اضافی ہوائی اڈوں کی ضرورت تھی اور سلچر میں واقع کری گرام کے ہوائی اڈے کی توسیع کا سلسلہ بھی جاری تھا۔"

اسی سلسلے کی ایک اور کتاب کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ بھارت کو اپریل کے آخر تک بھی چین کی ممکنہ مداخلت کی شکل میں روسی امداد کی یقین دہانی حاصل نہیں ہوئی تھی اور روس کی آشیرواد کے بغیر بھارت کے لیے کھلی جنگ چھیڑنا ناممکن



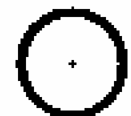
تھا۔ وہ لوگ بری طرح چین کے خوف کا شکار رہتے مصنف لکھتا ہے۔

"ہمیں کم از کم ابھی نو ماہ کی مدت درکار تھی تاکہ بھارت سرکار عالمی رائے عامہ کو ہموار کرے اور روس سے چین کی پاکستان کو ملنے والی ممکنہ امداد کے خلاف مدد کی یقین دہانی حاصل کر سکے۔ ان اقدامات کے بغیر حملے کا آغاز بالکل ناممکن تھا۔

THE LIBERATION WAR BY A.K SUBRAMANYAM + M.AYUB-PAGE 177

اگست کے درمیانی عرصے میں بھارتی حکومت اور روس کے درمیان ایک "دفاعی معاہدہ" عمل میں آگیا۔ اس طرح وہ چین کے خطرے سے قریباً بے نیاز ہو گئے۔ یہ درمیانی عرصہ گزارنے کے لیے بنگلہ دیش کی قائم کردہ "جلاوطن حکومت" نے جس میں عوامی لیگ کے مفرور لیڈر خوندکر مشتاق، تاج الدین، منصور علی اور قمر الزمان وغیرہ شامل تھے، مکتی باہنی کو اپنی مسلح جدوجہد تیز کرنے اور پاکستانی افواج کو الجھائے رکھنے کے احکامات جاری کر دیے۔ سیاسی محاذ پر وہ لوگ پوری طرح سرگرم عمل تھے ہی۔ اب انھیں سوائے اس کے کہ کوئی سنہری موقع ملے اور کسی شے کی حاجت نہیں تھی جو بالآخر ہمارے ایک سابقہ جرنیل حکمران کی مہربانی سے مل ہی گیا۔

یہاں قریباً ڈیڑھ دو گھنٹے گزارنے کے بعد جب میں واپس اپنے میس پہنچا تو خود کو تھکا تھکا محسوس کرنے لگا تھا۔ بستر پر گرتے ہی نیند کی آغوش میں سما گیا۔ نیند جو میری واحد اور مؤثر پناہ گاہ تھی۔



آنکھ کھلی تو بھوک چمک رہی تھی۔ میس میں ہمیشہ شگفتہ اور مسکراتے نظر آنے والے چہروں پر ایک عجیب سی پژمردگی طاری تھی۔ وہ لوگ چپ چاپ چوروں کی طرح ایک دوسرے سے شرمندہ شرمندہ سر جھکائے وہاں آتے اور بغیر برتنوں کی آواز پیدا کیے کھانا کھا کر چلے جاتے۔ چھاؤنی کے کھیل کے میدان بڑی بے بسی سے کھلاڑیوں کے منتظر

رہتے لیکن وہاں سوائے گراؤنڈ کی صفائی کرنے والے عملے کے اور کوئی نہ آتا۔ ساری دلچسپیاں اور ہنگامے جانے کہاں کھو کر رہ گئے تھے۔

وہاں تو ہر طرف ایک پُراسرار سی خاموشی چھائی رہتی۔ اس سناٹے کو اگر کبھی کبھی مجروح کرتی تو اذان یا پھر آرمی وہیکلز کی نقل وحمل کرنے کی آواز۔

واپسی پر کمرے میں پہنچتے ہی اردلی نے میری ڈاک بڑے احترام سے پیش کردی۔

اب ہمارے لیے دلچسپی کا واحد سامان یہی رہ گیا تھا کہ ہم خطوط پڑھا یا لکھا کریں۔ سب سے پہلے میں نے والد کا خط ہی کھولا تھا۔ کیونکہ اس مرتبہ میرے آلنسہ کے بارے میں لکھے خط کا جواب آنے والا تھا۔ والد صاحب نے لکھا تھا۔

بڑی عجیب سی بات ہے تمہارے اس فیصلے پر مجھے نہ تو خوشی ہوئی نہ ہی صدمہ ہوا۔ میں جانتا ہوں تم نے یہ قدم جن حالات میں اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان حالات میں کسی بھی غیرت مند فوجی کا یہی ایماندارانہ فیصلہ ہوتا۔

بیٹا! میری شدید خواہش تھی کہ زندگی میں اس خوشی کے موقع پر تمھیں اپنے ہاتھوں سہرا باندھتا لیکن ان حالات میں میں تمھیں اس بات کی اجازت بھی ہرگز نہیں دوں گا کہ اب تم اس معاملے سے پیچھے ہٹ جاؤ۔ اپنی مردانگی اور غیرت پر آنچ نہ آنے دینا۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں، اگر ممکن ہو تو اپنی اور میری بہو کی تصویر اس پتے پر بھیجنا جو میں تمھیں خط میں لکھ رہا ہوں۔

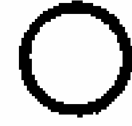
تم حیران تو ہو گے کہ میں یہ کیا کہہ رہا ہوں لیکن مجھے معاف کر دینا بیٹے کہ ابھی مجھ میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں پیدا ہو سکی کہ تمھاری والدہ کو یہ اطلاع دے سکوں۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ وہ ذہنی طور پر تمھاری نسبت بچپن ہی سے رضیہ سے طے کر چکی ہے لیکن تمھاری خوشی کے لیے وہ



تمھارے ہر فیصلے کو میری طرح دل وجان سے قبول کرے گی۔ تمھارے سوا ہمارا ہے ہی کیا۔ ہم تمھارے اور ہونے والی بہو کے لیے دعا گو ہیں۔

تمھارا دعا گو والد

اس خط کو پڑھ کر میری حالت بھی میرے والد جیسی ہی تھی۔ نہ تو مجھے خوشی ہو رہی تھی، نہ ہی صدمہ۔ میرا ضمیر کسی حد تک مطمئن تھا کہ میں نے اس ظالمانہ فیصلے کے لیے بادل ناخواستہ ہی سہی، والدین کی رضامندی تو حاصل کر لی ہے۔ اس طرح کم از کم ایک بوجھ سا میرے سینے سے ہٹ گیا تھا۔ جس نے آلنسہ کے والد کی وفات کے بعد سے مجھے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔



مارچ کے سرچ لائیٹ آپریشن" سے دسمبر کی جنگ تک مکتی باہنی اور بھارتی کمانڈوز کی کارروائیوں کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور جون سے اگست کے آغاز تک کا ہے اور دوسرا اگست سے اکتوبر تک۔

پہلے دور میں ان کی کارروائیاں جھجک کر، سہم کر، ڈرتے ڈرتے، چھپتے چھپاتے انجام پاتی تھیں۔ جب کہ دوسرے دور میں وہ انڈین افواج کے باقاعدہ کمانڈوز کی مدد سے کھل کر اور گھات لگا کر حملے کرنے لگے تھے۔ ہم لوگ اب دوسرے دور میں داخل ہو چکے تھے۔

یہ اکتوبر کا پہلا عشرہ تھا۔ اس میں مکتی باہنی نے محب وطن سیاسی لیڈروں کا قتل عام شروع کر دیا تھا۔ عوامی لیگ اور اس کی حلیف جماعتوں کے علاوہ وہ کسی جماعت کے ورکر کو بھی بلاتخصیص بنگالی یا بہاری معاف نہیں کرتے تھے۔ خصوصاً ڈھاکہ ان کی بہیمانہ کارروائیوں کا مرکز تھا کیونکہ اب بھارتی ملٹری انٹیلی جنس نے اپنی زیادہ توجہ فوج کے اس اعصابی مرکز پر مرکوز کر رکھی تھی۔

بھارتی پروپیگنڈا مشینری ڈھاکہ شہر میں آئے روز اس طرح کی وارداتیں رونما ہونے پر دنیا بھر کو یہ باور کروانا چاہتی تھی کہ پاکستانی فوج نظم و نسق برقرار رکھنے میں بالکل ناکام ہو چکی ہے۔ یہ انسانی بربریت اور وحشت کا دور تھا۔ بنگالیوں کا شہر میں واقع ہر گھر مورچہ بن چکا تھا۔ مسلح افواج کو سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ حملہ کرنے میں کبھی پہل نہ کریں۔ فوج شہر کے صرف ان مقامات پر حملے کرتی تھی جہاں سے اس پر فائر آتا تھا۔

ایسی کارروائیوں میں اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کچھ بے گناہ سویلین بھی نہ مارے جائیں اور یہی بات بھارتی پریس اُچھال کر مقامی آبادی اور رائے عامہ کو ہمارے خلاف کر رہا تھا۔ بعض دفعہ ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آتے کہ کسی غیر بنگالی نومولود بچے کے کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں، کسی نوجوان لڑکی کی بہیمانہ آبروریزی کے بعد موت، کسی شیر خوار بچے کی مسلی ہوئی لاش یا کسی ماں کی کٹی ہوئی چھاتیاں دیکھ کر ہمارے کسی جوان پر غصے اور صدمے کی شدت سے پاگل پن کا دورہ پڑ جاتا اور اسی پاگل پن کا شکار ہو کر وہ اپنے سامنے نظر آنے والے کسی بھی بنگالی پر فائرنگ شروع کر دیتا تھا۔

مشہور جنگی وقائع نگار ڈیوڈ لوشک اپنی کتاب PAKISTAN CRISIS میں لکھتا ہے کہ محدود ترین جنگی اندازے کے مطابق بھی مشرقی پاکستان کے ۵۵۱۲۶ مربع میل علاقے کے لیے کم از کم ڈھائی لاکھ فوجی درکار تھے۔ (صفحہ نمبر ۱۳۰) جب کہ صورت حال یہ تھی کہ ہمارے پاس افسروں اور جوانوں کی کل تعداد (مسلح افواج سے متعلق) صرف ـــ ۳۲۴۲۰ تھی۔ اس بات سے ہماری کم مائیگی کا اندازہ لگائیے۔ فضائی اور بحری راستے مسدود اور غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے بھاری جنگی ساز و سامان کبھی بھی ہم تک نہ پہنچ سکا۔ اکثر کمپنیاں جو مغربی پاکستان سے یہاں چارج سنبھالنے آتیں۔ وہ اپنے ساتھ اپنے ہلکے ہتھیار ہی جلدی میں لا سکتی تھیں۔ ان کے بھاری ہتھیار عموماً وہیں رہ جاتے تھے۔

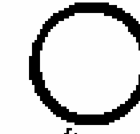


ماضی کا مؤرخ اور دنیا کا جنگی حالات سے واقفیت رکھنے والا کوئی شخص اس بات پر اس "بدقسمت فوج" کو خراج تحسین پیش کیے بغیر کبھی نہ رہ سکے گا کہ اس نے ان نامساعد، دگرگوں اور بدترین حالات میں بھی پورے ساڑھے آٹھ یا نو ماہ تک اپنے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہ آنے دی اور نہ صرف اپنے تمام طرح کے "ہیڈکوارٹرز" بلکہ بڑے بڑے شہروں اور قصبات کے تمام حساس مقامات کو مکتی باہنی کی دست برد سے محفوظ رکھا اور ۳۷۰ سرحدی چوکیوں میں سے ۲۶۰ آخر دم تک ان کے قبضے میں رہیں۔

ان حالات میں سب سے زیادہ فوجیوں کے مورال پر جو چیز اثر انداز ہوئی وہ بے تحاشا زخمی، بیمار اور شہداء تھے جن کی دیکھ بھال اور لاشوں کی روانگی کا معاملہ بُری طرح کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ جو لوگ سرحدی مقامات کے نزدیک زخمی ہوتے انھیں فیلڈ ہسپتالوں تک منتقل کرنا اب ناممکن ہو کر رہ گیا تھا کیونکہ اس طرف جانے والے راستوں میں سے اکثر پر مکتی باہنی نے بارودی سرنگیں بچھا رکھی تھیں اور راستے میں آنے والے سرندی، نالے، جنگل وغیرہ کے نزدیک وہ گھات لگائے ہوئے منتظر ہوتے تھے۔ اکثر فوجی کنوائے ان کی زد میں آ جاتے اور وہ بآسانی انھیں شکار کر لیتے تھے۔

زخمیوں کو پیچھے لے جانے کا واحد ذریعہ ہیلی کاپٹر تھے جن کی تعداد یہاں نہ ہونے کے برابر تھی۔ جو کچھ تھے بھی وہ اتنی اہم اور حساس نوعیت کی ڈیوٹی سرانجام دے رہے تھے کہ انھیں ایسے معمولی مقاصد (فوجی نکتہ نگاہ سے) کے لیے استعمال کرنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ بہت کم ہیلی کاپٹر محض اس ڈیوٹی کے لیے مختص کیے گئے تھے اس سلسلے میں بھی ایک قباحت یہ درپیش تھی کہ پہلے متعلقہ رجمنٹ کا ڈاکٹر اس بات کی تصدیق کرے کہ واقعی زخمی کے لیے ہیلی کاپٹر بھیجنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر عموماً سرحدی مقامات سے دور بٹالین ہیڈکوارٹرز میں ہوتے تھے اور ضابطے کی کارروائی ہی میں اتنی دیر لگ جاتی تھی کہ زخمی شہید کا رتبہ حاصل کر لیتا تھا۔

سی۔ ایم۔ ایچ میں موجود زخمیوں کو دیکھ کر کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا۔ ان میں سے اکثر جسم کا کوئی نہ کوئی اعضا گنوانے کے بعد یہاں تک آتے تھے۔ زیادہ تعداد ان بدقسمتوں کی تھی جو زندہ تو رہے لیکن زندگی بھر کے لیے مفلوج ہو کر رہ گئے پہلے پہل تو شہدا کی لاشیں ان کے گھروں تک پہنچا دی جاتی تھیں لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔



میں اب ڈھاکہ تک ہی محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ مقامی طور پر ہماری حکومت سورج ڈھلنے کے بعد ختم ہو جاتی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کے بعد شرپسندوں کا راج شروع ہو جاتا تھا۔ فوجیوں کو چھاؤنیوں میں امان میسّر تھی لیکن غیر فوجی غیر بنگالیوں کی زندگی جیتے جی جہنم بن چکی تھی۔ وہ لوگ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے اور اپنا اثاثہ اونے پونے داموں فروخت کرنے کے بعد ائرپورٹ کا رُخ کرتے جہاں جہاز کا ٹکٹ حاصل کرنے والوں کی قطاریں لگی رہتی تھیں۔ اکثر لوگ تو کئی کئی ہفتوں سے ہوائی اڈے کی عمارت میں فروکش تھے۔ ان کی ناگفتہ بہ حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔

کئی ایسے مغربی پاکستانی جو یہاں پچھلے بیس بیس سال سے مقیم تھے اور جن کے لاکھوں کروڑوں کے بزنس تھے، اب کوڑی کوڑی کو محتاج ہو کر یہاں آن پڑے تھے۔ ان کے کاروبار تباہ ہو گئے تھے۔ اکثر ان میں سے صدیوں کے بیمار نظر آنے لگے تھے۔ مسلسل مصائب اور اس خوف نے جس کا وہ ایک لمبی مدت سے شکار تھے، ان کی سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب کر لی تھیں۔ ان میں سے شاید ہی کوئی خوش قسمت ایسا ہو گا جس کا پورا کنبہ سلامت رہا۔ ورنہ زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جن کے خاندان کے قریباً آدھے افراد جان بحق ہو چکے تھے۔

اپریل تک تو یہ حالت تھی کہ عوامی لیگ نے ہوائی اڈے کو جانے والے



راستوں پر اپنی چیکنگ پوسٹیں قائم کر رکھی تھیں۔ وہ لوگ ہوائی اڈے کی طرف جانے والے ہر شہری کی تلاشی لے کر اس کی جیبیں خالی کر دیتے۔ اس کے بعد اسے جی بھر کے ذلیل کیا جاتا اور اکثر کو تن کے کپڑوں کے ساتھ ہی ہوائی اڈے تک جانے کی اجازت ملتی۔

آپریشن سرچ لائٹ کے بعد کم از کم یہ پوزیشن ختم ہو چکی تھی۔ اب ان کی وہ پوسٹ تو باقی نہیں رہی تھی لیکن مغربی پاکستان کی طرف جانے والوں کا اتنا زیادہ رش ہو چکا تھا کہ مہینوں ان کی باری نہیں آتی تھی۔ لوگ ہزاروں روپے خرچ کر کے بلیک میں ٹکٹ خریدتے اور ہوائی اڈے کی عمارت پر ڈیرے ڈال کر بیٹھ جاتے۔ یہاں انھیں کم از کم یہ سہولت تو میسّر تھی کہ بھلے فرش پر ہی سہی وہ محفوظ نیند تو سو سکتے تھے۔ کیونکہ ہوائی اڈے کے گرداگرد فوج کا زبردست پہرہ تھا اور تخریب کاروں کے اس طرف آنے کے امکانات بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ جب کہ وہ بدقسمت مغربی پاکستانی اور بہاری جو ابھی تک شہروں میں رہائش پذیر تھے ان کی راتوں کی نیند حرام ہو چکی تھی۔

میری کمپنی کی تعداد قریباً نصف رہ گئی تھی۔ باقی سب جوان ایک ایک دو دو کر کے اپنی جان مقدّس فریضے کی ادائیگی میں جانِ آفریں کو سونپ چکے تھے۔ کمانڈوز کو اتنی تیزی سے حرکت میں آنا پڑتا تھا کہ اگلے پل کا گمان نہیں گزرتا تھا۔ ہمارا چونکہ بٹالین ہیڈکوارٹر ڈھاکہ میں تھا۔ اس لحاظ سے تو ہم مرکز میں مقیم تھے۔ جب کہ صورتحال یہ تھی کہ ہم مہینے میں شاید ہی ایک دو دن اپنے ہیڈکوارٹر میں گزارتے تھے جب کہ بقیہ تمام ایام ہمیں مختلف آپریشنوں میں گزارنے ہوتے تھے۔

میں کئی روز تک سوچتا رہا کہ والد صاحب کو اس خط کا کیا جواب لکھوں انھوں

نے میری خوشی کی خاطر میرا فیصلہ تو قبول کر لیا تھا لیکن ان کے اپنے سپنوں کا کیا انجام ہوا۔ اس کا تصوّر ہی میرے لیے اندوہناک تھا۔ کبھی کبھی جب میں یہ سوچتا کہ رخّو کو جب میری اور آنسہ کی شادی کا علم ہو گا تو میرے متعلق کیا سوچے گی؟ تب ایک بے کلی سی لگ جاتی تھی۔ ابھی تک میں یہی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مَیں نے اس سے بے وفائی کی ہے یا نہیں؟

یہاں کے ہر بہاری گھرانے کی کہانی آنسہ کے گھر سے ملتی جلتی تھی۔ مَیں اس دلہن کو شاید قیامت تک نہ بھول پاؤں جو ایک روز، جب ہم نواب گنج کے علاقے میں ایک شورش فرو کرنے گئے تھے تو جانے کہاں سے بھاگی ہوئی گولہ باری کے درمیان سے گزر کر زندہ سلامت ہم تک آ پہنچی تھی۔

اسکی شادی کو بمشکل ایک ہفتہ گزرا تھا جب مکتی باہنی کے درندوں نے حملہ کر کے اس کے سارے گھرانے کو موت کی نیند سلا دیا۔ وہ نہ جانے کس طرح ان کے ہاتھوں سے نکل کر ہم تک جان بچانے آ پہنچی تھی۔ اس کی حالت شدّتِ غم اور خوف سے غیر ہو رہی تھی۔ اس نے دھاڑیں مار کر ہم سے روتے ہوئے فریاد کی کہ اس کی نندوں کو درندوں کے ہاتھوں سے بچائیں۔

مَیں نے ایک حوالدار کی قیادت میں پانچ جوان اس طرف روانہ کیے۔ جب وہ لوگ اس کے گھر تک پہنچے تو بھیڑیے اس کی نندوں کی عزّت لوٹ کر انھیں بے دردی سے قتل کر چکے تھے اور اس کے گھرانے کے بقیہ تمام افراد کی لاشیں مسخ کرنے کے بعد وہاں سے جا چکے تھے۔ وہ ہفتے کی بیاہی ہوئی مسلمان بیٹی پھٹی پھٹی نظروں سے اپنے پیاروں کی لاشیں دیکھتی رہی اسے جیسے ان مناظر کو دیکھ کر سکتہ سا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور ایک طرف بھاگ اٹھی۔ ہمارے جوان اس کے تعاقب میں لپکے انھوں نے بمشکل اسے قابو کیا اور اپنے کیمپ تک



لائے لیکن ہم اسے باندھ کر تو رکھ نہیں سکتے تھے۔ ایک روز جب اسے ڈھاکہ اسپتال پہنچانے کی تیاری کر رہے تھے تو وہ سپاہیوں کی نظر بچا کر بھاگ نکلی۔ وہ پاگل ہو چکی تھی۔

ایسی سینکڑوں پاگل سہاگنیں مشرقی پاکستان کی گلیوں میں اپنے لٹنے کی دہائی دیتی پھرتی تھیں۔ ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ ان کے مرض ناقابلِ علاج ہو چکے تھے کیونکہ ان کی عزّتوں کے رکھوالے ہی وحشی بن کر ان کی عصمت دری کر رہے تھے۔

وہ بے چاری پناہ لینے جاتیں تو کس سے؟

کس کے سامنے جا کر مدد کے لیے فریاد کناں ہوتیں؟

ڈھاکہ میں اپنے قیام کے آخری لمحات تک مَیں نے دیکھا کہ ایسے پاگلوں کی تعداد بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ کوئی لوٹنے کے پاگل پن میں مبتلا تھا۔ کوئی لُٹ کر پاگل ہو گیا تھا۔ آٹھ دس روز تک مسلسل دن رات میں ڈھاکہ کے مضافاتی علاقے میں خدمات انجام دیتا رہا۔

انٹیلی جنس کی رپورٹیں اور وہ خطرناک دستاویزات جو ہم تک پہنچ رہی تھیں، ہمارے لیے حد درجہ تشویش کا باعث تھیں۔ اب ہماری ہائی کمان کو یقین ہو چلا تھا کہ انھیں بالآخر بھارت کے ساتھ ایک آخری اور بھرپور جنگ لڑنا ہے۔ ہمارے جوانوں کو اب تک کی صبر آزما اور اعصاب شکن لڑائی نے تھکا ڈالا تھا لیکن اپنے محدود وسائل کے پیشِ نظر ہمیں نہ صرف یہ کہ اسی قلیل تعداد فوج سے جنگ لڑنا تھی۔ بلکہ اسی تھکی ماندی اور زخموں سے پاش پاش فوج کے ذریعے اندرونِ ملک بھی امنِ عامہ کی صورتِ حال کو برقرار رکھنا تھا۔

وہ لوگ جو آج پاکستانی فوج کی بزدلی کا رونا روتے نہیں تھکتے اور عجیب عجیب طرح کی تاویلیں پیش کرتے ہیں۔ شاید جنگ کے معنی ہی نہیں جانتے۔ آیئے ایک

نفرِ دشمن کی اور اس کے مقابلے میں اپنی افواج کا جائزہ لے لیجئے۔

بھارت کی آٹھ ڈویژن فوج مشرقی پاکستان کی سرحد پر مورچہ بند تھی۔ دو ڈویژن اس کے علاوہ چین کی طرف متعین تھے جن کا رُخ بوقت ضرورت اس طرف موڑا جا سکتا تھا۔ ان آٹھ ڈویژنوں میں سے دو مغربی بنگال میں رکھے گئے تھے تاکہ حکم ملنے پر جیسور کی سمت پیشقدمی کر سکیں (یہ ۲ کور کے ماتحت تھے) شمال مغربی علاقے پر چڑھائی کے لیے تین ڈویژنوں پر مشتمل ۳۳ کور تھی۔ شمال میں ۱۰۱ کمیونیکیشن زون تھا جو ایک لڑاکا ڈویژن کے طور پر لڑنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ مشرقی سرحد پر تین ڈویژن مورچہ بند تھے جن کی کمان ۴ کور کے حوالے تھی۔ ہر ڈویژن توپخانے سے لیس تھا۔

ان کے علاوہ آرٹلری اور پیدل فوج کی مندرجہ ذیل رجمنٹیں تھیں۔

(۱) فیلڈ رجمنٹ (توپ خانہ) ۴۸ توپیں جن کی تعداد پھر ۶۰ ہوگئی۔

(۲) میڈیم رجمنٹ (توپ خانہ) دس توپیں، بعد میں بارہ ہوگئیں۔ ان میں روس کی ساختہ ۱۳۰ ملی میٹر دھانے کی وہ توپیں بھی شامل تھیں جو تیس کلومیٹر تک مار کرتی ہیں۔

(۳) ٹی۔۵۵ ٹینک : ایک رجمنٹ (تقریباً ۴۵ ٹینک)

(۴) پی ٹی ۷۶ ٹینک : ایک رجمنٹ + ۱۲ سکواڈرن

(۵) شرمن ٹینک : ایک رجمنٹ

ہمارے ٹینک رات کو بالکل اندھے ہوتے ہیں جب کہ بھارت کے اکثر ٹینکوں میں انفرا ریڈ شیشے نصب ہیں اور رات کو بخوبی استعمال ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح بھارتی ٹینک پانی میں تیر کر رکاوٹ عبور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ معقول تعداد میں بھارتی فوج کے پاس بکتر بند گاڑیاں تھیں جن کی مدد سے وہ دو پلٹنیں بیک وقت گولیوں کی بوچھاڑ سے محفوظ رکھ کر میدان میں اتار سکتی تھی۔



فضائی قوت۔

اسّی اسکواڈرن (ایک اسکواڈرن میں اٹھارہ طیارے) ان میں مگ ۲۱ کینبرا (بمبار) ایس۔یو۔ایل (لڑاکا بمبار) نیٹ (زمینی کمک دینے والے) طیارے شامل تھے۔ دشمن نے مشرقی پاکستان کے گرداگرد ہوائی اڈوں کا جال بچھا رکھا تھا اور دریائی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے باربردار طیارے اور ہیلی کاپٹر مہیا کیے گئے تھے۔

بحری قوت۔

طیارہ بردار بحری بیڑہ (AIR-CRAFT CARRIER) "وکرانت" جس میں سمندری دیکھ بھال کرنے والے چھ طیارے، سولہ سمندری عقاب (لڑاکا بمبار) تین سی ہاک شامل تھے۔ اس کی حفاظت کے لیے معقول تعداد میں ڈسٹرائر (DESTROYER) اور فریگیٹ (FRIGATES) تھے۔ علاوہ ازیں چار بڑے جنگی جہاز، دو آبدوزیں، ایک سرنگیں صاف کرنے والا جہاز اور پانچ گن بوٹس۔

اس کے علاوہ۔

ایک چھاتہ بردار بریگیڈ، تین بریگیڈ گروپ، بارڈر سیکیورٹی فورس کی بیالیس پلٹنیں اور مکتی باہنی الگ تھی۔

(بحوالہ کرنل صدیق سالک — WITNESS TO SURRENDER)

اس آتش و آہن میں ڈوبی فوج کے مقابلے میں ہماری دفاعی قوت زمینی فوج کے صرف تین انفنٹری ڈویژنوں پر مشتمل تھی۔ جب کہ وہ ضروری سازوسامان سے بھی لیس نہ تھے۔ پی اے ایف کا صرف ایک اسکواڈرن (سولہ سیبر طیارے) ڈھاکہ میں تھا۔ بحریہ کے پاس صرف چار گن بوٹس تھیں۔ اس کے علاوہ تہتر ہزار نیم عسکری نفری جو 'اسکاؤٹوں'، رضاکاروں، مجاہدوں اور ای۔پی۔سی۔اے۔ایف پر مشتمل تھی۔

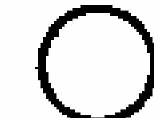
یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ایک طرح سے مشرقی پاکستان کی قریباً ساری ہی

بنگالی آبادی بھی ان لوگوں کی فوج کا ایک حصّہ ہی شمار ہوتی تھی کیونکہ اُن کی دلی ہمدردیاں بھارتی فوج کے ساتھ تھیں اور انھوں نے وقت آنے پر اس کا عملی مظاہرہ بھی جی جان سے کیا۔

مشرقی محاذ تین اطراف سے بھارتی علاقے میں گھرا ہوا تھا۔ چوتھی سمت خلیج بنگال تھی جہاں مضبوط بھارتی بحریہ کسی بھی وقت ناکہ بندی کر کے یا بارودی سرنگیں بچھا کر ہمارا راستہ بند کر سکتی تھی۔

صرف جنوب مشرقی سرحد پر ایک چھوٹی سی پٹی برما کی طرف کھلتی ہے لیکن یہ علاقہ جنگلوں اور پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے جہاں مختلف قبائل آباد تھے۔ اس علاقے کی پوزیشن کچھ اس طرح کی ہے کہ یہاں کھلی جنگ کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔

مقامی موسمی حالات الگ مصیبت تھی۔ مشرقی پاکستان میں اپریل سے اکتوبر تک بارشیں ہوتی رہتی ہیں اور سیلاب بھی کناروں سے باہر آ کر تباہی مچاتا رہتا ہے۔ پانی اترنے کے بعد بھی سیلن زدہ زمین پر آسانی سے کوئی بھی فوج نقل و حرکت نہیں کر سکتی۔



اس روز جب میں ایک مہم سے واپس لوٹا تو ایک ضروری پیغام میرا منتظر تھا۔ میں بھاگم بھاگ سی ایم ایچ پہنچا جہاں عثمان زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔

وہ کل رات ہی واپس لوٹا تھا جب ڈھاکہ میں دورانِ گشت گھات میں لگی مکتی باہنی کا شکار ہو گیا۔ اس کے دو ساتھی جاں بحق ہوئے تھے اسے اسٹین گن کا قریباً پورا برسٹ پیٹ اور سینے پر لگا تھا۔ اس کا اتنا زیادہ خون بہہ چکا تھا کہ ڈاکٹر آپریشن کرنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے تھے۔ مجھے تو اس کا زخم دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ وہ اب تک زندہ کیسے رہا؟

مجھے دیکھتے ہی ایک زخمی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔



"علی بھائی!" اس کی نحیف اور کمزور سی آواز سن کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ "خدا کا شکر ہے ملاقات ہو گئی۔ شاید اللہ کو یہی منظور تھا۔ اس کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔ میری شدید خواہش تھی کہ آپ سے آخری وقت باتیں کر لوں۔ کچھ کہہ سن لوں!" وہ اپنی ہی کہے جا رہا تھا۔ مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔

میں ٹکر ٹکر اس کا منہ دیکھے جا رہے تھے۔ اسے کہنے کے لیے مجھے کچھ نہ سوجھ رہا تھا۔ میرا ذہن واقعی ماؤف ہو چکا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ ابھی تک اس کا زندہ رہنا کسی دوا کا نہیں دعا کا مرہون منت ہے۔ معجزہ ہے۔

"ایکسکیوز می سر!" ایک ڈاکٹر نے اچانک وہاں آ کر مداخلت کی۔ وہ مجھے وہاں سے ہٹ جانے کا اشارہ کر رہا تھا۔

شاید اسے آپریشن تھیٹر میں لے جانا مقصود تھا۔ عثمان نے میری طرف ایسی جگر پاش نظروں سے دیکھا کہ میرا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔ اس کی حالت اس پھانسی پانے والے مجرم کی سی تھی جس کے لواحقین کو آخری ملاقات میں "وقت ختم" ہونے کی وارننگ دے کر الگ کر دیا جاتا ہے۔

"گڈ لک میرے پیارے بھائی!" میں نے اپنے آپ کو حتی الوسع سنبھالے رکھا۔ موت کی شاہراہ کے مسافر کو میں روتے ہوئے الوداع کہنا نہیں چاہتا تھا۔ لوگ جانے والوں کو ہنستے ہوئے رخصت کرتے ہیں اور کمانڈو کے لیے تو یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیاروں کو کبھی روتے ہوئے گلے مل کر الگ نہ ہو۔ اسے مسکرانے کا حکم ہوتا ہے۔ میدانِ کارزار میں بھی موت کو مسکرا کر لبیک کہنا سکھایا جاتا ہے۔

اور مجھے یہ بھرم بہرحال نبھانا تھا کیونکہ میں کمانڈو تھا۔

گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے میں نے جھک کر اس کے ماتھے پر

بوسہ دیا۔ اپنے وطن کی مقدس مٹی کے حضور جان کا نذرانہ پیش کر دینے والے اس جانباز کو دینے کے لیے میرے پاس اور تھا ہی کیا۔

اللہ! کوئی یوں بھی تہی دامن ہوتا ہے۔

میں اس کے کمرے سے نکلا اور ایمرجنسی آپریشن روم کے باہر رکھے اس لوہے کے بنچ پر بیٹھ گیا جو مجھ جیسوں ہی کے لیے وہاں بچھا ہوتا ہے۔ ابھی بمشکل دس پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک جیپ سے آنسہ اور چاچی باہر نکلتی دکھائی دیں۔ مجھے جیسے کسی نادیدہ قوت نے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ابھی تک میں خود فراموشی کے عالم میں وہاں بیٹھا تھا۔ ارد گرد کے ماحول سے بالکل بے نیاز، بے گانہ سا۔ عثمان کی بات کچھ اور تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں چاچی اور آنسہ کا سامنا کیسے کر پاؤں گا۔؟

دونوں ماں بیٹیاں پھٹی پھٹی نظروں سے چند منٹ بعد میرے سامنے سوال بنی کھڑی تھیں۔ انھوں نے زبان سے کچھ نہ کہا لیکن ان کی بے زبانی مجھ پر قیامت ڈھا گئی۔

میں تو سیدھا سادا فوجی تھا اگر کوئی بہت بڑا انشا پرداز بھی ہوتا تو شاید دنیا بھر کی لغتوں میں سے اس وقت انھیں تشفی دینے کے لیے کوئی لفظ نہ ڈھونڈ پاتا۔

اصولاً مجھے یہی چاہیے تھا کہ انھیں طفل تسلیاں دے کر بہلاؤں۔ انھیں کہوں کہ وہ بالکل نہ گھبرائیں۔ معمولی سا زخم ہے۔ عثمان ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ ابھی مسکراتا ہوا آپریشن تھیٹر سے باہر نکلے گا اور ہمارے تمام وسوسوں، تمام نامرادیوں کو اس کی مسکراہٹ موت کی نیند سلا دے گی۔

لیکن میں چپ رہا!

منافقت کی بھی آخر کوئی انتہا ہوتی ہے۔ اس لمحے میری تمام حیات کو جیسے



کسی نے عملِ تنویم کے ذریعے سلب کر لیا۔ میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کچھ نہ کہہ سکا۔ میرے ضمیر نے اس لمحے کسی مصلحت کو اپنانا گوارا نہ کیا۔ میں نے جھوٹ بولنے سے خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ میں بھی ہونقوں کی طرح ان کا منہ دیکھتا رہا۔

ہم تینوں ہی پتھر کے بُت بنے ایک دوسرے کے سامنے ایستادہ تھے۔ بالکل ان مجسموں کی طرح جنھیں عبرت کا نشان بنانے اور زمانۂ ماضی سے تاریخ کے طالب علموں کو روشناس کروانے کے لیے میوزیم میں رکھا جاتا ہے۔ وہ مجسمے جو بے جان ہوتے ہیں لیکن جن کے جسموں پر ماضی کے اوراق پھڑپھڑا رہے ہوتے ہیں۔

مجھے علم نہیں اس وقت میرا بلڈ پریشر کیا تھا؟ دل کی دھڑکنوں کی رفتار کیسی تھی؟ خون کی گردش شریانوں میں نارمل تھی یا ابنارمل۔ میں اپنے آپ سے، اپنے گرد و پیش سے بالکل الگ تھلگ ان دونوں ماں بیٹی کے سامنے کھڑا سوچ رہا تھا کہ قدرت نے ان میں کیا دیکھ لیا کہ انھیں امتحانوں کے لیے چن لیا ہے۔ ان کے اجداد نے کیوں ایسی بڑی کوئی نیکی کر لی تھی کہ وہ خدا کے برگزیدہ بندے بن کر اپنے آنے والوں کو ہمیشہ کے لیے اس کے امتحانات کی نذر کر گئے۔

میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ عثمان مر جائے گا لیکن کیوں؟ آخر وہ کیوں مرے گا؟ اس کی بوڑھی ماں اور جوان بہن نے ایسا کیا پاپ کیا کہ وہ دونوں اس کی موت کے بعد زندہ درگور ہو کر رہ جائیں؟ وہ بھی اس کے ساتھ ہی کیوں نہ مریں؟

کچھ کمزور لمحے زندگی میں ایسے بھی آتے ہیں جب پتھر لوگ بھی موم کی طرح پگھل کر رہ جاتے ہیں۔ ان ساعتوں میں بڑے بڑے سورماؤں کی مردانگی کو موت آ جاتی ہے، توانائیاں رخصت ہو جاتی ہیں اور بڑے بڑے جابر، بچے بن کر رہ جاتے ہیں۔

اس وقت میں انھی کمزور لمحوں کی مکمل گرفت میں تھا۔

دنیا کے کسی کمانڈو ٹریننگ سینٹر میں ایسی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے کوئی قاعدہ، کلیہ نہیں بتایا جاتا۔ کوئی ایسا کورس نہیں پڑھایا جاتا جس کی کسی بھی کتاب میں یہ لکھا ہو کہ مرتے ہوئے انسان کے لواحقین کا سامنا کیسے کیا جاتا ہے؟

اس لحاظ سے تو کم از کم میری تربیت ادھوری تھی۔

اچانک ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا اور مجھے یوں لگا جیسے میں نے کینسر کا علاج دریافت کر لیا ہو۔ میں نے سوچا میں اور تو کچھ نہیں کر سکتا اپنے پیارے دوست کو اپنے جیالے کو ایک پُرسکون موت تو دے سکتا ہوں عالمِ سکرات میں اس کے لیے کوئی ڈھکوسلا تو فراہم کر سکتا ہوں۔

تب میں ایک ارادہ کر کے آپریشن روم کی طرف بڑھا۔ میں نے بغیر آہٹ کیے دروازہ کھولا، دونوں ماں بیٹی مجھے حیرت سے اندر جاتا دیکھنے لگیں۔ آپریشن تھیٹر میں عثمان کے سرہانے کھڑی دونوں نرسوں نے چونک کر میری طرف دیکھا لیکن میرے کندھے پر لگے اسٹار اور سینے کے بائیں جانب آویزاں نشان کو دیکھ کر کسی کی جرأت نہ تھی کہ مجھ سے کوئی سوال کرتا۔ وہ پاکستان آرمی کی نرسیں تھیں اور میں پاکستان آرمی کا آفیسر۔

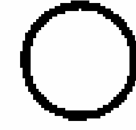
عثمان کے دائیں بائیں کھڑے اسٹینڈوں پر خون اور گلوکوز کی بوتلیں لٹک رہی تھیں ابھی تک وہ مکمل ہوش و حواس میں تھا۔ میں اس کے سرہانے جا کھڑا ہوا تو اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے سر کے اشارے سے مجھے خوش آمدید کہا۔

"عثمان بھائی! میں نے چند لمحوں کا ضیاع بھی گوارا نہ کیا۔" میں آنسہ سے آج شادی کر لوں گا ۔۔۔ ابھی ۔۔۔"

ایک پُرنور مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے چھلک گئی۔ اس کی آنکھوں کی روشنی دوچند ہو گئی۔ بالکل ایسے ہی جیسے بجھنے سے پہلے چراغ کی لو ایک دم بھڑک اٹھتی ہے۔



پھر اس کی آنکھیں چھلک گئیں لیکن یہ منظر دیکھنے کے لیے میں وہاں ٹھیرا نہیں بغلی دروازے سے ڈاکٹر اندر داخل ہو رہا تھا۔ دونوں نرسیں بت بنی مجھے جاتے دیکھتی رہیں۔



"بیٹھ جائیے چاچی ۔۔۔ بیٹھو آنسہ۔" میں نے اپنی منتظر دونوں ماں بیٹیوں کو تسلی دی۔ وہ دونوں انہی قدموں پر کھڑی تھیں جن پر میں انھیں چھوڑ گیا تھا۔ اب میں قدرے سنبھل چکا تھا۔ میں نے مرتے ہوئے عثمان کے ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ ہی نہیں تھمایا تھا۔ اپنے دل اور روح پر پڑی پتھر کی چٹان بھی اتار کر پھینک دی تھی۔ اب میں خود کو قدرے مطمئن جانتا تھا۔

"بیٹا! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" چاچی نے پہلی مرتبہ زبان کھولی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی منافقوں کی طرح مسکرا دیا۔

"اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔" مجھے عثمان ہی کا کہا ہوا فقرہ یاد آ گیا۔ یوں بھی آدمی بڑا مطلبی ہے۔ بڑا ہی سیانا ہے۔ ہر طرف سے مایوس ہو جائے تو اللہ کی پناہ میں آ جاتا ہے۔ مذہب کو آڑ بنا کر آفتوں سے محفوظ رہنے کا آرزومند ہو جاتا ہے۔ ہر بات میں صبر و شکر کے حوالے تلاش کرنے لگتا ہے۔

بوڑھی مظلوم عورت خاموش ہو گئی۔ وہ میری اس بات کو رد کرنے کا حوصلہ نہ کر سکی میں اس کے اور اپنے درمیان ذاتِ باری تعالیٰ کو لے آیا تھا۔ یہ میری بزدلی تھی یا عقلمندی کا فرار تھا یا مصلحت کوشی؟ مجھے ان سوالوں کا جواب پھر کبھی نہ مل سکا۔

"آؤ آنسہ گھر چلتے ہیں۔ عثمان ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا وہ آپریشن تھیٹر میں ہے اور ہم کل دوپہر سے پہلے اس سے ملاقات نہیں کر سکتے۔" میں نے پتھر کی اجنتا کو مخاطب کیا جو خالی خالی نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔

"آئیے چاچی ۔"

اور میں ان دونوں ماں بیٹی کو لے کر محمد پورہ چلا آیا۔ جہاں ان کے گھر پر عثمان کی خیریت جاننے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، پریشان سہمے اور گھبرائے ہوئے مایوس اور خوفزدہ محبِ وطن لوگ اپنے اس جیالے ساتھی کی خیریت جاننے کو بے تاب ہو رہے تھے جو بدترین حالات میں بھی ان کی امید بندھائے ہوئے تھا جس کا وجود ان کے لیے باعثِ برکت تھا۔ ایک عثمان کے دم سے ان کے اندر "مورال" نام کی کوئی شے ابھی تک باقی تھی۔

ہمیں دیکھ کر وہ مودب سے پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے انھیں عثمان کے لیے دعا کرنے کی درخواست کی اور وہ وہاں سے اس کے لیے دعائیں مانگتے چلے گئے۔ دونوں ماں بیٹی کو میں نے تسلّی دے کر وہیں بٹھایا اور تھوڑی دیر بعد واپس آنے کا کہہ کر چل دیا۔

میرے ذہن میں آندھیوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ اور میرا رخ چھاؤنی کی طرف تھا۔ میں جانتا تھا میرے میجر صاحب کو میرے اور عثمان کے تعلق اور آنسہ سے میری دلچسپی کا علم ہے۔ صرف وہی ایک ایسی ہستی اس مرتی مارتی مخلوق میں تھی جس کی گود میں سر چھپا کر میں جائے پناہ تلاش کر سکتا تھا۔ "سر" مجھے برآمدے ہی میں مل گئے ہم دونوں باہر آ گئے۔

"مجھے علم ہے مائی بوائے۔ تم کیا کہو گے؟" انھوں نے میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہا۔

"سر! عثمان مر رہا ہے۔" میں قریباً سسک پڑا۔

"صبر بیٹے! صبر کرو۔ ہمیشہ یاد رکھو تم اول آخر کمانڈو ہو۔"

"میں بہت کمزور انسان بھی ہوں سر! مجھے معاف کر دیجئے۔"

اور وہ مسکرا دیے۔

میرے اردلی کو چائے کا کہہ کر وہ میرے کمرے میں چلے آئے۔ انھوں نے میری



ساری گفتگو سنی۔ اپنا پائپ سلگایا۔ دو تین مرتبہ گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ چائے کے دو تین کپ انھوں نے یکے بعد دیگرے پی لیے۔ اس دوران میں پائپ کا دھواں بکھیرتے میرے کمرے میں چکر کاٹتے رہے۔

شاید کسی کڑے امتحان سے گزر رہے تھے۔ میں سر جھکائے ان کی آواز کا منتظر تھا۔

"کم آن بوائے۔" ان کا اعتماد سے بھرپور لہجہ ان کی مضبوطیٔ کردار کا غماز تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ میرے ساتھ جیپ میں محمد پورہ کی طرف جا رہے تھے۔

جیپ میں چلا رہا تھا۔ میرے "سر" ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے میرے ساتھ والی سیٹ پر موجود تھے۔ ان کے پُروقار ماتھے پر سلوٹیں نمایاں ہونے لگی تھیں پھر اچانک ان کا چہرہ ہمیشہ کی طرح پُرسکون نظر آنے لگا۔ میں کنکھیوں سے بار بار ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان کے اس روّیے نے مجھے الجھن کا شکار کر دیا تھا پھر انھیں مسکراتے دیکھ کر میری بھی جان میں جان آ گئی۔

میں نے آنسہ اور چاچی سے ان کا تعارف کروایا تو انھوں نے تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد مجھے اور آنسہ کو باہر جانے کے لیے کہا۔ ابھی تک انھوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا لیکن میں جان گیا تھا کہ انھوں نے میری اس خواہش کا احترام کر لیا ہے کہ میں عثمان کی خواہش کا بھرم قائم رکھوں۔ ہم دونوں دوسرے کمرے میں چلے آئے۔

"کیا بات ہے علی؟" آنسہ نے بڑے گمبھیر اور پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

میں نے اسے عثمان سے اپنا وعدہ، عثمان کی خواہش اور اپنے عزم سے آگاہ کر دیا چند سیکنڈ تک وہ سر جھکائے کچھ سوچتی رہی۔ پھر اس نے بڑے پُروقار انداز میں اپنا سر اوپر اٹھایا اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا:

"مشرق کی عورت جب کسی مرد کو پسند کرتی ہے تو اس کی شخصیّت کو ہمیشہ ایک حصار کی شکل اپنے اردگرد محسوس کرتی ہے۔ علی! آپ مجھ سے کبھی جدا نہ تھے۔ ملکی حالات

سے کوئی ذی شعور آنکھیں بند نہیں رکھ سکتا۔ اس وقت آپ پر سب سے زیادہ حق میرا نہیں اس ملک کا ہے جس کے ہم سب بیٹے بیٹیاں ہیں۔ یہ میری خودغرضی کی انتہا ہوگی اگر میں ان حالات میں چند لمحوں کے لیے بھی آپ کو آپ کے فرائض سے الگ کردوں۔ مجھے افسوس ہے اس روز شدتِ غم سے بے قابو ہو کر میں نے کچھ جذباتی باتیں آپ سے کہہ دی تھیں لیکن وہ وقت اب بیت گیا۔ میں نہیں چاہتی جس عظیم مشن کی انجام دہی کے لیے میرا باپ شہید ہو گیا اور میرا بھائی موت سے جنگ لڑ رہا ہے، اس مشن کے کسی بھی سپاہی کو ایک پل کے لیے بھی اس کی ذمے داریوں سے علاحدہ کروں۔ میرے لیے یہ احساس ہی باعثِ فخر ہے کہ میری قوم کا ایک غازی مجھے کسی قابل جانتا ہے۔"

اس کی گفتگو کا ایک ایک لفظ نشتر کی طرح میرے دل میں اتر رہا تھا۔ وہ تو میرے تصوّرات سے بہت بلند، بہت ہی اونچائی پر پرواز کر رہی تھی۔ اس لمحے میں خود کو اس کی قدآور شخصیت کے سامنے محض ایک بونا جان رہا تھا۔ رفعتوں کے جس آسمان پر بیٹھ کر وہ مجھ سے مخاطب تھی، میں تو اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میری نظریں اس پیکرِ جمال کے پُروقار چہرے پر ٹھہرتی نہ تھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح اس کی عظمت کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کروں۔ میں نے انتہائے جذبات سے لاچار ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور عقیدت مندوں کی طرح جھک کر اس پر بوسہ دیا کہ میری دانست میں اظہارِ جذبات کی یہی آسان ترین راہ مجھے دکھائی دی تھی۔

میرے ہونٹوں کی لرزش نے آلنسہ پر میری کیفیت وا کر دی تھی۔ اس نے بڑی آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور مجھے چلئے لانے کا کہہ کر نپے تُلے قدموں سے باہر نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی "سر" کمرے میں داخل ہوئے۔ انھوں نے میرا بازو



پکڑا اور مجھے باہر لے آئے۔ مجھ میں اتنی ہمّت ہی نہ رہی تھی کہ ان سے کچھ دریافت کرتا۔ وہاں سے رخصت کے وقت چاچی نے میرے سر پر جس انداز سے دستِ شفقت رکھا تھا۔ اس سے میں نے ان کے اور میجر صاحب کے درمیان ہونے والی گفتگو کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا۔

وہ ہمیں رخصت کرنے دروازے تک آئیں۔

اس روز مغرب کی نماز کے بعد ایک نہایت سادہ تقریب محمد پورہ کے ایک مکان میں منعقد ہوئی جس میں میری رجمنٹ کے قریباً سبھی اعلیٰ افسران نے شرکت کی اور ہماری پلٹن کے مولوی صاحب نے میرا اور آلنسہ کا نکاح پڑھا کر مشرق اور مغرب کے بظاہر اٹوٹ رشتے پر صداقت کی مہر ثبت کر دی۔ تمام حاضرین نے بھیگی پلکوں اور بے آواز سسکیوں سے ہاتھ پھیلا کر خدا کے حضور التجائیں کی کہ خداوندا! اس واقعے کو مبارک ثابت کر دے اور مشرق و مغرب کو پھر سے اسی رشتے میں باندھ دے جس سے الگ ہونے پر دونوں ہی اپنی موت آپ مر جائیں گے۔

آلنسہ اور میری خواہش پر ہماری رخصتی عثمان کی صحت یابی تک ملتوی کر دی گئی۔ ہمارا نکاح مسجد میں پڑھایا گیا جہاں سے ہم اس سادہ سی ضیافت میں شرکت کے بعد جو محمد پورہ کے سرفروش بہاریوں نے منعقد کی تھی اپنے ساتھیوں کے ہاں چھاؤنی آ گئے

اسی رات یہ اطلاع عثمان کو پہنچا دی گئی۔ اب میں کم از کم اس حد تک تو مطمئن تھا کہ اپنے دوست کا کچھ بوجھ تو میں نے ہلکا کر دیا۔ رات معمول کی گشت پر گزارنے کے بعد جب صبح ہم لوگ عثمان کی خیریت دریافت کرنے اسپتال گئے تو چاچی اور آلنسہ بھی وہیں موجود تھے۔ میرے ساتھ میرے "سر" آئے تھے۔ اسپتال کے عملے نے جسے عثمان کی اہمیت اور اس سے میری رشتے داری سے آگاہ کر دیا گیا تھا، اس کی مخدوش حالت کے پیش نظر آلنسہ اور چاچی کو وہاں طلب کر لیا تھا۔

دونوں ماں بیٹی دم توڑتے عثمان کے سرہانے کھڑی بے بسی سے اسے مرتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ وہ ڈاکٹر محض ان کا دل رکھنے کے لیے وہاں موجود تھا ورنہ پہلی ہی نظر میں اسے دیکھ کر بخوبی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اسے زبردستی زندہ رکھا جا رہا ہے۔

ہمیں آتے دیکھ کر وہ حوصلہ مند مسکرایا۔ اس نے سر اٹھا کر ہمارا خیر مقدم کیا۔

میجر صاحب آگے بڑھے اور اس کے فگار سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے سے منع کیا۔ اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلے لیکن اس کی قوّت گویائی جیسے سلب ہونے لگی بمشکل اس نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کچھ کہنا چاہا میں اس پر قریباً جھک کر اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"علی..... بھائی..... خدا آپ ..... دونوں..... کو..... نئی زندگی مبارک کرے ..... خدا حافظ..... پاکستان ..... ۔" اس کی بڑبڑاہٹ مدھم ہو گئی۔

"عثمان..... عثمان..... ۔" میں نے اس کے کندھے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا لیکن میجر صاحب کے ساتھ کھڑے ڈاکٹر نے مجھے سر کے اشارے سے منع کر دیا۔

مجھے نئی زندگی کی نوید دے کر مادرِ وطن کی آبرو۔ پوربو پاکستان کا جیالا سپوت "الشمس" کا کمانڈر۔ مکتی باہنی کی آنکھ میں ایک مدت سے کھٹکنے والا کانٹا، میرے پیارے ملک کی سرحدوں کا رکھوالا، زندگی کی جنگ ہار گیا۔

وہ جسے مارنے کے لیے مکتی باہنی نے سینکڑوں آدمی مروا ڈالے، جس نے جیتے جی کبھی شکست تسلیم نہ کی، جو جیا تو وطن کے لیے مرا تو وطن کے لیے، جس کا رواں رواں حب الوطنی کے نغمے الاپتا رہا جس کے دن اور راتیں، صبح و شام، ہر لمحہ، ہر گھڑی ملک دشمنوں کے خلاف جہاد کرتے بسر ہوئے۔ وہ جانباز، وہ جیالا، مادرِ وطن کا وہ ارجمند سپوت محض چند گھنٹوں میں موت کے سامنے ہتھیار ڈال گیا۔

شاید ابھی تک میری اور آلنسہ کی شادی کی خبر سننے ہی کا منتظر تھا۔



میں بے اختیار سسک پڑا۔ ڈاکٹر وہاں سے پرے ہٹ گئے، میجر صاحب نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ آلنسہ بلک پڑی، چاچی اس کے پلنگ کی پائنتی سے لگ کر بین کرنے لگی۔ ٹھنڈے اور بے رحم کمرے کی فضا میں سسکیاں دم توڑنے لگیں۔ عثمان کی موت بڑا المیہ تھا۔ لوگ تو روزانہ مر رہے تھے لیکن ایک عہد کو نہیں مرنا چاہیئے تھا۔

جب عہد مر جاتے ہیں تو روایتیں بھی ان کے ساتھ ہی نیست و نابود ہو جاتی ہیں۔ عثمان "روایت" تھا۔ "عہد" تھا۔ وہ جب تک جیا، نامرادیوں سے، ناکامیوں سے بھرپور جنگ لڑتا رہا۔ اس روز جب ہم اس کی لاش ایک فوجی ٹرک میں ڈالے محمد پورہ کی طرف جا رہے تھے تو مجھے پہلی بار دل کی گہرائیوں سے یہ احساس ہوا کہ مشرقی پاکستان کے بانکے سجیلے حُسن کو موت آ گئی ہے۔

مجھے یوں لگا جیسے اب کبھی اس سنہری مٹی پر شپلا کے پھول نہیں کھلیں گے، سندری اور اناس کے درخت پودے نہیں اُگیں گے۔ یہاں کی سُبک روندیوں پر بہنے والی کشتیوں سے اب کبھی مانجھیوں کے گیت فضاؤں میں رس نہیں گھولیں گے۔ ناریل اور تاڑ کے درخت آہستہ آہستہ جھلسنے لگے۔ خونخوار کالی دیوی اپنی لمبی زبان نکالے آہستہ آہستہ لیکن بڑی بے رحمی سے پوربو پاکستان کو چاٹ رہی تھی۔

شکوک و شبہات کی اس صلیب پر لٹکا میں نہ جانے کب تک ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔

محمد پورہ کے باہر ہزاروں بہاری اور محبِ وطن بنگالی اپنے اس پیارے کے استقبال کو موجود تھے۔ ان کے چہرے برف کی طرح سفید تھے۔ ان پر نہ تو غم کی پرچھائیاں جھپٹتی نظر آتی تھیں۔ نہ ہی وہ تفاخر کی جھلک جو اپنے شہیدوں کے لیے پائی جانی چاہیئے ـــــ ان سب کے احساسات کو تو جیسے موت آ چکی تھی۔ اِس روز شاید انہوں نے بھی اس بے رحم حقیقت کا ادراک حاصل کر لیا تھا کہ اب بازی ہاتھ سے نکل چکی ہے۔

عثمان کی موت نے ان کی کمرِ ہمت توڑ دی تھی لیکن وہ مرتے ہوئے ان انسانوں کی طرح جو آخری لمحات تک معجزوں اور کرشموں کے منتظر رہتے ہیں، زندہ تھے۔

مَیں اور مجھ جیسے دوسرے افسران جو اپنے اس جاں نثار کو سفرِ آخرت پر روانگی کے وقت کندھا دینے آئے تھے۔ ایک دوسرے سے منہ چھپاتے پھرتے تھے جیسے عثمان کی موت کا ذمّے دار ہمی میں سے کوئی تھا۔

اس کے زخموں سے خون اب تک جاری تھا۔ خدا جانے اتنا خون اس میں کہاں سے آگیا تھا۔ اس کی منسلکہ یونٹ کے مولوی صاحب نے جلد ہی اسے غسل دیا اور ہم نے شہید کی لاش کو پرچم میں لپیٹ کر کندھوں پر اٹھا لیا۔

آہ و بکا، بین، چیخ و پکار، ماتم سبھی کچھ کو اپنے جلو میں لیے ہم قدم بہ قدم قریبی قبرستان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ قریباً سارا ڈھاکہ ہی اس کے جنازے پر ہجوم کی صورت اُمڈ آیا تھا۔

پھر ہم نے اپنے پیارے، اپنے جانثار ساتھی کو اپنے ہاتھوں منوں مٹی تلے دبا دیا۔ اس کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان کی تاریخ حریت کا وہ باب بھی دفن ہوگیا۔ جس پر اب تعصب اور گروہ کی چڑھتی آندھیوں کی پیدا کردہ دھول کا وزن بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔

وہ رات مَیں نے اپنے "سر" کے حکم پر اُسی گھر میں گزاری۔ ساری رات ڈھاکہ کی گلیوں میں مکتی باہنی کے بدمست درندے، شراب کے نشے میں دھت ہوائی فائرنگ کر کے عثمان کی شہادت کا جشن مناتے رہے۔ ساری رات میں اس کی روتی ماں اور سسکتی بہن کو جھوٹی تشفیاں دے کر بہلاتا رہا۔

آنسہ میری منکوحہ بیوی ضرور تھی لیکن ان حالات میں کسی کو بھی اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ بدبختی کا آگ اگلتا دیوتا منہ پھاڑے تیزی سے ہمیں نگلنے کے لیے



آگے بڑھتا رہا۔ میری خواہش تھی کہ آنسہ اور چاچی کو چھاؤنی لے آؤں۔ لیکن ان دونوں نے ہی شدت سے اس بات کی مخالفت کی۔ وہ اپنے آخری لمحات بھی اپنوں میں بسر کرنا چاہتی تھیں۔

آنسہ کی محبت میں اب ایک تقدس آمیز فرمانبرداری بھی سمٹ آئی تھی۔ وہ میری خدمت کا کوئی موقع ضائع نہ ہونے دیتی۔ ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ دو تین گھنٹے کے لیے اس سے ملاقات کا موقع میسّر آتا تو وہ حتی المقدور میری "خدمت" میں جُت جاتی۔ اس نے کبھی چھاؤنی جانے سے انکار نہ کیا۔ چاچی نے بھی اسے اور مجھے مکمل اجازت دے دی تھی لیکن اُس نے خود وہاں سے ہٹنا گوارا نہ کیا اور عثمان کی ماں کو اکیلے چھوڑنا میری غیرت کو گوارا نہ تھا۔

مَیں نے جنگ سے پہلے جو آخری خط گھر لکھا اس میں والدین کو عثمان کی شہادت اور اپنی "شادی" کی "خبر" بھی سنا دی۔ اس خط کا جواب مجھے کبھی نہ مل سکا۔ حالات نے اس برق رفتاری سے پلٹا کھایا کہ ڈاک تار اور نقل و حمل کے تمام ذرائع ہی ایک طرح سے منجمد ہو کر رہ گئے۔ ہم لوگ دشمن کے درمیان بُری طرح پھنس گئے۔ سمندر اور خشکی، چاروں اطراف سے غنیم کی فوج نے ہمیں اپنے شکنجے میں کس لیا اور ہم بے یار و مددگار نامکمل ہتھیاروں اور زخمی تھکی ماندی فوج کے ساتھ اس کے مقابلے پر ڈٹ گئے۔

# ٹوٹا ہوا تارا

دشمن نے دراصل ہم پہ ALL OUT حملہ ۲۱ر نومبر کو کر دیا تھا۔ اس کے بعد ۱۶ر دسمبر کے سانحے تک بھارتی فوجیں کھُلم کھلا میدانِ جنگ میں ہمارے خلاف لڑتی رہیں یہ الگ بات کہ دنیا کو یہی بتایا گیا کہ: بھارتی افواج نے کھلی جنگ ۳ر دسمبر کو پاکستان کے اعلانِ جنگ کے بعد شروع کی تھی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ ماہِ اگست کے آخر ہی سے بھارت کے پورے پورے بریگیڈ ہم پہ حملہ کر رہے تھے ـــــ سوائے ڈھاکہ اور چٹاگانگ کے۔ جہاں دشمن نے ۳ر دسمبر کے بعد بھرپور حملہ کیا۔ ۲۱ر نومبر کے بعد سے بھارتی کمانڈوز کی سرگرمیاں اس محاذ پر اپنی انتہا کو پہنچ گئیں۔ ان کے جوان مختلف گروپوں کی شکل میں مکتی باہنی کی مدد سے ان خفیہ راستوں کے ذریعے جو ان کے لیے مکتی باہنی محفوظ کر لیتی تھی، داخل ہونے لگے۔ سرحدوں میں داخلے کے بعد لوگ پوشیدہ بری اور آبی راستوں سے مشرقی پاکستان کے اندر ہی اندر پھیلتے چلے گئے۔ راستے میں جہاں کہیں انھیں پاکستانی فوج کی کوئی اکّا دکّا کمپنی یا پیٹرولنگ پارٹی دکھائی پڑتی وہ اس پر گھات لگا کر حملہ کرتے اور مکتی باہنی کے تخریب کاروں کی مدد سے اپنی مراد کو پہنچتے۔

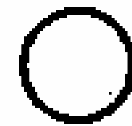
دشمن کمانڈوز سے نمٹنے کا فریضہ بھی پاکستانی کمانڈوز ہی کو انجام دینا ہوتا، کیونکہ



لوہے کو لوہے ہی سے کاٹا جاتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں کمانڈوز کی محض چند بٹالین رکھی گئی تھیں۔ خیال شاید یہی کیا جاتا تھا کہ انھیں سرحدی علاقوں میں گھس آنے والے بھارتی کمانڈوز اور مکتی باہنی کے تخریب کاروں ہی سے نمٹنا ہو گا۔

بھارتی عزائم کے متعلق ہمیں کبھی کوئی غلط فہمی تو نہ تھی لیکن اس بات پر بہت کم لوگوں کو یقین آتا تھا کہ: وہ بین الاقوامی سرحدوں کا تقدس پامال کرتا ہوا اس طرح مشرقی پاکستان پر ننگی جارحیت کر کے چڑھ آئے گا! زیادہ سے زیادہ یہی توقع کی جاتی تھی کہ بھارتی افواج بلاواسطہ طور ہی پر مکتی باہنی کی مدد کریں گی لیکن یہ مفروضہ ابتدا ہی میں قائم ہی نہ کیا گیا کہ وہ ان کے دوش بدوش کھلی جنگ میں بھی کود پڑیں گی۔ اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ اس سے پہلے دنیا بھر میں ایسا کوئی واقعہ مہذب دور میں دیکھنے کو نہیں ملتا تھا۔ عموماً یہی دیکھنے میں آتا تھا کہ کچھ ممالک کی آشیرواد یا کسی حد تک بلاواسطہ حمایت ہی دوسروں کو حاصل ہوتی تھی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارا مقابلہ دنیا کی ایک کثیر تعداد فوج اور آبادی رکھنے والے ملک سے تھا جس کے وسائل ہی ہم سے پندرہ بیس گنا زیادہ نہیں تھے بلکہ وہ سیاسی اور اخلاقی میدانوں میں بھی اپنی روایتی مکاری اور فریب کے بل بوتے پر ہماری شکست کا سامان پیدا کر چکا تھا ـــــ بھارتی افواج کی قریباً سبھی آزمودہ کار اور خصوصی طور سے ایسی جنگ کے لیے تربیت یافتہ پلٹنیں، یہاں مورچہ بند ہو گئی تھیں، کیونکہ دشمن ایک بار قدم آگے بڑھا کر دوبارہ پیچھے ہٹنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے نزدیک یہ "بھارت ماتا" کی ہمیشہ کے لیے سیاسی موت ہوتی۔



جنگلوں، دلدلوں، ندی نالوں اور ناہموار اونچی نیچی گزرگاہوں میں جہاں عموماً زمین گیلی رہتی یا پھر وہاں پانی کھڑا ہوتا ـــــ ہماری افواج ایک لمبی مدت سے حالت

جنگ میں تھیں! ہمیں گھات میں لگے دشمن کے ہاتھوں شدید نقصان اٹھانا پڑتا — مختلف متعدی امراض اور موسمی حالات کے مرہون منت مصائب نے بھی ہمیں ادھ مُوا کر دیا تھا۔

جوانوں کو کئی کئی دن دلدلی علاقوں اور گھٹنے گھٹنے پانی میں رہ کر دشمن کا تعاقب کرنا یا ان سے جنگ لڑنا ہوتی تھی۔ عموماً کوئی اطلاع ملنے پر اسپیشل گروپ کے جوانوں ہی کو ہراول دستے کی حیثیت سے آگے روانہ کیا جاتا تھا تاکہ اچانک اگر وہ گھات لگائے پاک فوج کے منتظر بھارتی کمانڈوز کی زد میں آجائیں تو اپنی پیشہ ورانہ مہارت اور روایتی دلیری کی بنا پر باقی افواج کے جوانوں کو بھی وہاں سے نکال کر لے جائیں یہی وجہ تھی کہ یہاں کمانڈوز کی شہادتوں کا تناسب کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ اس کے باوجود آخری لمحات تک انھوں نے ملک و قوم کی خدمات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جس کی گواہی بھارتی جرنیلوں کی لکھی مختلف کتابوں سے بھی بخوبی مل جاتی ہے۔

جدید دور کی لڑائیوں میں ائرفورس ہمیشہ ایک مؤثر اور فعال کردار ادا کرتی آئی ہے کئی دفعہ دیکھنے میں آتا ہے کہ بحریہ یا پیدل فوج کی کمزوریوں پر بھی مضبوط اور پیشہ ورانہ اہمیت کی حامل فضائیہ بخوبی پردہ ڈال سکتی ہے۔ مشرقی پاکستان کی جغرافیائی حالت کے پیش نظر ممکن ہے یہاں ہم چھاپہ ماروں کے خلاف کوئی مؤثر کارروائی ائرفورس کے ذریعے نہ کر سکتے لیکن کھلی جنگ کے بعد اس کی اہمیت بہت ہی زیادہ بڑھ جاتی تھی۔

ہماری فضائیہ کی مکمل جنگی طاقت محض ایک اسکواڈرن اور پندرہ دن کے گولہ بارود پر مشتمل تھی جب کہ اس کے اترنے اور چڑھنے کے لیے بھی ڈھاکہ ہوائی اڈہ ہی رہ گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں دشمن کے پاس جدید ترین طیاروں پر مشتمل کم از کم دس اسکواڈرن، بے انداز گولہ بارود اور تین چار مضبوط ایئربیس تھے۔

— دشمن نے اپنے بھرپور فضائی حملوں کا آغاز ۳ر دسمبر کو کیا۔ جنگ کے پہلے



ہی روز ہمارے باکمال شاہبازوں نے ۴۳ فضائی معرکے سر کیے اور مجموعی طور پر ۳۰ ہزار راؤنڈ فائر ہوئے — دنیا بھر کی فضائیہ کی تاریخ میں اس قدر زیادہ کارکردگی کا ریکارڈ شاید کہیں نہیں مل سکتا! دشمن کے جدید ترین سپرسانک طیاروں کے مقابلے میں ہمارے پاس سیبر جہاز تھے لیکن چشم فلک نے حیرت سے نظارہ کیا، دنیا بھر کے جنگی مبصروں نے اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔ ان کے اندازے دھرے کے دھرے رہ گئے جب پہلے ہی روز فضائی معرکوں (ڈاگ فائیٹ) میں ہمارے شاہبازوں نے ۱۲ بھارتی طیاروں کو تباہ و برباد کر دیا۔ بھارتی اپنی مقدور بھر کوشش کے باوجود ڈھاکہ ائربیس کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے اور ان کے بمباروں نے اپنا غصّہ چار بڑے بڑے طاقتور بم ائرپورٹ کے گرد و نواح میں پھینک کر نکالا جو سوائے گرد و غبار اڑانے اور بڑے بڑے گڑھے زمین میں ڈالنے کے اور کوئی قابل قدر کارنامہ انجام نہ دے پائے۔

دشمن کو اپنے دوست کے فراہم کردہ "سٹیلائٹ سسٹم" جدید ترین جاسوسی طیاروں، انٹیلی جنس اور سب سے بڑھ کر اپنے مقامی دلالوں کے ذریعے ہماری جنگی تیاریوں کی پل پل کی خبر تھی! ہماری بے سروسامانی اس پر پوری طرح عیاں تھی، خصوصاً ہماری فضائیہ اور بحریہ کی کم مائیگی کا اسے بخوبی علم تھا لیکن پہلے ہی روز اپنی فضائیہ کی اس طرح درگت بنتے دیکھ کر اس نے براہِ راست تصادم میں اپنے مزید جہازوں سے ہاتھ دھونے کے بجائے اپنی حکمتِ عملی بدل لی۔

اب دشمن نے ہمارے ذرائع نقل و حمل کو تباہ کر کے ہمیں مفلوج کرنے کی ٹھانی اور وہ ہمارے مقابلے پر مگ ۲۱ کی جگہ ایس یو ۷ اور ہنٹر طیارے لے آیا۔ جو پرے باندھ کر ہمارے کنوائے، مسافر بردار کشتیوں، پلوں، ریلوے لائنوں وغیرہ پر حملے کرنے لگے۔ جن کی حفاظت صرف طیارہ شکن توپیں کر رہی تھیں اور زمین پر بیٹھ کر فضائی جنگ ایک حد تک ہی لڑی جا سکتی ہے۔

ہم اپنے قلیل تعداد جہازوں کے ساتھ قطعاً اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ براہِ راست دشمن سے ٹکراؤ کا خطرہ مول لے سکیں ـــــ ڈھاکہ پر دشمن کا دباؤ کچھ کم ہوا تو ہمارے شہبازوں کو بھی مہلت نصیب ہوئی لہٰذا انھوں نے راجشاہی اور کومیلا کے گرد و نواح میں اپنی فوج کی اعانت کی اور بڑھتی ہوئی بھارتی افواج پر بڑے زوردار اور جان توڑ حملے کیے۔

ہمارے ایک سیبر کی کل فضائی صلاحیت بمشکل ۳۵ منٹ تھی اور ڈھاکہ سے ان کا پرواز کر کے سرحدی علاقوں تک آنا اور واپس لوٹنا ہی ناممکن تھا اس طرح ڈھاکہ سے دور دور تک پھیلی ہوئی ہماری بری افواج مکمل طور سے بھارتی فضائیہ کا نشانہ بننے لگیں۔ ہماری فضائیہ ۸ دسمبر ہی کو عملاً مفلوج ہو کر رہ گئی۔

ـــــ جب ہمارے جہاز ۸ دسمبر کی صبح اپنی افواج کی مدد کو روانہ ہونے کے لیے COMBAT AIR PATROLLING کی غرض سے پر تول رہے تھے عین ان لمحات میں قریباً ۱۸ بھارتی مگ ۲۱ اچانک ان پر حملہ آور ہوئے ہمارے صف شکن شہبازوں نے حوصلہ نہ ہارا اور کسی نہ کسی طرح اپنا اسٹارٹ مکمل کر کے قابلِ پرواز ہوتے ہی ان کے مقابلے پر ڈٹ گئے انھوں نے دنیا کی فضائی تاریخ کا حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا اور محض پانچ سیبر جہازوں نے پہلے ہی حملے میں ۸ بھارتی مگ ۲۱ چاٹ لیے۔

اس اچانک اور خلافِ توقع جارحیت نے دشمن کو دم دبا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن بھاگتا ہوا دشمن روسی ساخت کے پانچ پانچ سو کلوگرام وزنی درجن بھر بم کسی نہ کسی طرح رن وے پر پھینک کر اسے ناکارہ بنانے میں کامیاب ہو گیا! یہ بم جدید ساخت کے اور انتہائی خطرناک تھے۔ انھوں نے رن وے پر جا بجا گہرے گڑھے ڈال دیے۔ ان گہرے شگافوں کو بہرحال پُر کرنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ ایم ای ایس اور انجینئرنگ بٹالین کے جوانوں کے علاوہ ہماری رضاکار بھی فوراً گڑھوں پر ٹوٹ پڑے۔ مگر ابھی انھیں بمشکل آدھ گھنٹہ ہی گزرا تھا جب اچانک بھارتی فضائیہ کے

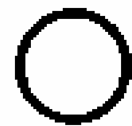


غول حملے کے لیے امڈ پڑے۔ ہمارے شاہین تو پرواز کے قابل ہی نہیں رہ گئے تھے۔ اب ساری ذمے داری طیارہ شکن (اینٹی ائرکرافٹ) گنوں کے گنرز پر آن پڑی تھی۔ انھوں نے بھی جی جان سے یہ معرکہ لڑا لیکن دشمن کا ایک جہاز تباہ ہوتا تو وہ اس کے مقابلے میں دس جہاز لے آتا۔

بالآخر وہ وقت بھی آگیا جب دشمن کامیاب رہا اور اس نے رن وے پر اتنے بڑے بڑے گڑھے ڈال دیے جن کا دورانِ جنگ بھر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ مقصد دشمن کو یونہی حاصل نہیں ہو گیا تھا۔ اسے اپنے ۲۵ طیاروں کی قربانی بھی دینا پڑی تھی۔

اس طرح پاکستان ائر فورس تو جنگ کے ابتدائی مراحل ہی میں ختم ہو گئی۔ اب ڈھاکہ کو ہوائی حملوں سے محفوظ رکھنے کی ذمے داری طیارہ شکن بیٹریوں پر عائد ہو گئی اور انھوں نے جنگ کے آخری لمحات تک جس تندہی، جانفشانی اور مہارت سے اس منصب کو نبھایا وہ کچھ انہی کا حصہ ہے۔ کیا مجال جو کبھی ان کے پائے ثبات میں لغزش آنے پائی ہو ـــــ وہ مسلسل بیدار رہے، چوکس رہے۔ اُن کی نظریں ہر لمحے آسمان کی وسعتوں میں بھارتی فضائیہ کے جہازوں کو تلاش کرتی رہتیں اور جوں ہی "شکار" انھیں دکھائی دیتا وہ "اللّٰہ اکبر" کے فلک شگاف نعرے بلند کر کے اس پر دیوانہ وار گولے برسانے لگتے۔

آرمی ایوی ایشن کے ہیلی کاپٹر البتہ کسی حد تک محفوظ رہے جو شدید زخمیوں یا پھر اعلیٰ افسران کو لانے اور لے جانے کے سوا اور کوئی کام سرانجام نہیں دے سکتے تھے۔ ان کے بہادر اور جوان ہمت پائیلٹوں نے بھی دشمن کی طاقتور ائر فورس کی موجودگی کے باوجود جس جانفشانی سے اپنا کام انجام دیا وہ تاریخِ حریت کا الگ سنہرا باب ہے۔



آرمی کی تعداد اور سامانِ جنگ کا اندازہ تو آپ کر ہی چکے ہیں۔ پاکستان بحریہ کی حالت بھی کچھ کم ابتر نہ تھی۔ دشمن کے طاقتور ترین بحری بیڑے کے مقابلے میں ہمارے پاس "کومیلا، جیسور، سلہٹ اور راجشاہی" نام کی صرف چار گن بوٹس تھیں۔ جن پر ۶۰/۹۰ ملی میٹر کی بھاری مشین گنیں اور بعض پر ۵۰ یا ۳۰ بور دننگ مشینیں لگا کر انھیں "بحری بیڑے" کا حصہ بنالیا گیا تھا۔ ان کشتیوں سے ہم تخریب کاروں اور بھارتی کمانڈوز کا معمولی تعاقب تو کر سکتے تھے لیکن ان سے طیارہ بردار (AIR CRAFT CARRIER) تباہ کن جہاز (DESTROYER) فریگیٹ (FRIGATE) جہازوں کا مقابلہ کرنے کا تصور بھی دیوانگی تھا۔

مشرقی پاکستان کا سمندری ساحل برما کی سرحد پر ٹکناف (TEKNAF) سے مغربی بنگال میں پاسر (PASSAR) تک تقریباً چھ سو کلو میٹر تک پھیلا ہوا ہے۔ دوسری طرف سے یہ صوبہ ندی نالوں کا ہزاروں میل لمبا پیچ در پیچ سلسلہ بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے ـــــ چٹاگانگ سے کراچی تک ہزاروں میل لمبی آبی گزرگاہیں الگ تھیں جن کی بھارتی بحریہ نے نومبر کے آغاز ہی سے ناکہ بندی کر لی تھی۔

اس لمبے چوڑے سمندری محاذ کو سنبھالنے کے فرائض ہماری اس ننھی منی اور بالکل معمولی حیثیت کی حامل بحریہ کو انجام دینے تھے جو جنگ کا آغاز ہوتے ہی اپنے کم ترین وسائل کے ساتھ بندرگاہوں کے محفوظ ٹھکانوں میں سمٹ آئیں جہاں سے وہ باری باری نکلتیں۔ دشمن پر کاری ضربیں لگاتیں اور اس کے فضائی حملوں سے چھلنی چھلنی ہو کر کسی نہ کسی طرح اپنے مستقر پر لوٹ آتیں۔

دورانِ جنگ اس معمولی سی بحریہ نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ اس کے جواں بخت ملاحوں کی دلیری اور پیشہ ورانہ اہلیت کی بہترین مثال ہے ـــــ وہ لوگ ہر جگہ اپنی بساط بھر کوشش کے ساتھ آرمی کے لیے نقل و حمل کے فرائض



نہ صرف انجام دیتے رہے بلکہ کئی جگہ دریائی ساحلوں پر انھوں نے دشمن افواج کی پیش قدمی کو روکا اور اسے بھاری جانی اور مالی نقصان پہنچایا۔

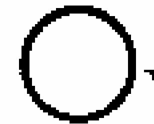
اس سلسلے میں "راجشاہی" نامی گن بوٹ کی کہانی دنیا بھر کی بحری تاریخ میں ہمیشہ ایک ممتاز مقام کی حامل رہے گی۔ اس کے واقعات کچھ یوں ہیں:

۵ ردسمبر کو پاکستان نیوی کو اطلاع ملی کہ چٹاگانگ کے نزدیک ایک مقام پر بھارتی پیراٹروپرز لینڈنگ ہوئی ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ چٹاگانگ بالکل دشمن کے رحم و کرم پر ہے۔

چٹاگانگ کے انچارج آفیسر کے حکم پر چاروں گن بوٹس دشمن سے نمٹنے کا عزم لے کر آگے بڑھیں ان میں "راجشاہی" بھی شامل تھی۔

ـــــ چاروں گن بوٹس ایک دوسرے سے الگ الگ اپنے "ہدف" کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ "راجشاہی" ابھی ٹارگیٹ کے نزدیک ہی پہنچی تھی جب اچانک اس پر چھ بھارتی ہنٹروں نے بیک وقت حملہ کر دیا۔ راجشاہی کے شیر دل کیپٹن اور اس کے ملاحوں نے ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کیا اور بری طرح نشانہ بننے کے باوجود واپس چٹاگانگ پہنچ گئی۔ اس مہم میں اس بوٹ کا کیپٹن بھی اپنے کئی ساتھیوں سمیت شدید زخمی ہو گیا تھا۔

جنگ کے خاتمے پر یہی گن بوٹ دشمن کی بحریہ اور فضائیہ کا زعم خاک میں ملا کر قریباً دو ماہ تک سمندر کی تند و تیز موجوں سے اپنے چھلنی وجود کے ساتھ لڑتی بھڑتی کراچی تک پہنچ گئی تھی۔



جنگ کے ابتدائی ایام ہی میں بحریہ اور فضائیہ کی ناکامی اور تباہی کوئی معمولی صدمہ نہیں تھا۔ یہ بہت بڑا سانحہ تھا ـــــ ہم چاروں طرف سے محصور ہو چکے تھے!

زمین، سمندر یا فضا سے کسی مدد کا سوال ہی خارج از بحث تھا۔ اب سارے مشرقی پاکستان کو اس کے سمندروں، ندی نالوں، جنگلوں، پہاڑوں اور فضاؤں سمیت بچانے کی ذمہ داری پاک فوج کے ان ۴۵ ہزار ریگولر جوانوں اور افسروں کے کندھوں پر آن پڑی تھی۔ جن میں سے بیشتر زخمی، تھکے ہارے، بیمار اور قریباً ذہنی طور پر بے بس ہو چکے تھے۔

۲۱ نومبر کو دشمن نے سرحدی مورچوں اور ابھاروں کو ہڑپ کرنا (WAR OF SAL- ENTS) شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہماری دفاعی حکمتِ عملی بھی بدل گئی۔

— اب تک براہِ راست مقابلے کی نوبت کچھ زیادہ نہیں آئی تھی۔ اب دشمن کھل کر سامنے آ چکا تھا! میں اپنی کمپنی کے ساتھ ان دنوں "ہلی" کے نزدیک "نواپاڑہ" نامی ایک چوکی پر موجود تھا۔ جب اچانک بھارت کی "گارڈز" نے ہم پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ "ہلی" کے گرد و نواح میں قریباً ۲۰ کلومیٹر تک پھیلی ہوئی تقریباً سبھی پوسٹوں بابر پوسٹ، قاسم، اپٹورا اور نواپاڑہ پر بیک وقت ہوا۔

یہاں ہم فرنٹیئر فورس (ایف۔ایف) کے جوان مورچہ بند تھے جن کی تعداد بمشکل چند سو تھی اور جن پر قریباً ایک بریگیڈ نے حملہ کیا تھا۔ دشمن نے مکتی باہنی کی اطلاعات پر کہ یہاں پاک فوج کی تعداد بہت کم ہے۔ اس علاقے کی جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر یہ قدم اٹھایا تھا لیکن اسے منہ کی کھانی پڑی۔

پہلے تو دشمن بابر پوسٹ کو روندتا، یلغار کرتا ریلوے لائن کے پار تک بڑھتا چلا آیا تھا لیکن جوابی حملے نے اس کے پاؤں اکھاڑ دیے اور اس کے وہ تینوں ٹینک جو ریلوے لائن کے پار ہمارے علاقے میں گھس آئے تھے، ہماری ٹینک شکن (آر۔آر) گنز نے تباہ کر دیے۔ دشمن نے اس ایک ٹینک کو جسے جوانوں نے ہمارے اپنے علاقے میں خاصا اندر آنے کے بعد ہٹ کیا تھا، کھینچ کر واپس لے جانا چاہا تاکہ اپنی جارحیت کا کوئی نشان وہاں نہ چھوڑے لیکن اس کی یہ کوشش ناکام رہی۔ ۲۰ نومبر کو عالمی پریس



کے چیدہ چیدہ نمائندوں نے اپنی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھا اور حسبِ سابق سرد مہری اختیار کیے رکھی۔ قبل ازیں بھی ہم بھارتی جارحیت کے کئی ثبوت پیش کر چکے تھے لیکن ہمارے پاس بھارتی زہریلے پروپیگنڈے کا شاید کوئی توڑ تھا ہی نہیں۔

ٹینکوں کی لڑائیوں کے لیے مشرقی پاکستان کا دلدلی اور ناہموار علاقہ کچھ زیادہ موزوں نہیں لیکن کئی ایسے میدانی اور کھلے علاقے بھی تھے جہاں دشمن نے بے شمار ٹینک لڑائی میں جھونک دیے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس "وجنتا" (VIJNTA) نامی وہ ٹینک بھی تھے جنہیں دلدلی علاقوں میں لڑائی کے لیے خصوصی طور سے بنایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ جدید ترین روسی ساختہ ٹی ۵۵ اور ٹی ۵۶ ٹینک بھی تھے۔

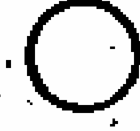
ان کے مقابلے میں ہمارے پاس اس علاقے میں ۱۴ ڈویژن سے متعلق ۲۹ کیولری تھی جو ہماری دانست میں بڑی اہمیت کی حامل تھی لیکن جس کے پاس سیکنڈ ورلڈ وار اور پھر ۱۹۵۱ء کی جنگ کوریا میں استعمال شدہ ایم ۲۴ ساخت کے ٹینک تھے۔ جن کی حیثیت ان جدید ترین ٹینکوں کے نزدیک نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان ٹینکوں کے دہانے اتنے (GROOVELESS) ہو چکے تھے کہ فائر ہونے کے بعد ان سے گولہ کبھی پوری شدت سے باہر نہیں نکلتا تھا اور اس کی رینج بمشکل ہزار میٹر تک ہوتی تھی۔

اس کے بعد "ہلی" دشمن کے لیے ہمیشہ لوہے کا چنا بنا رہا اور یہاں دنیا نے حرب و ضرب کی وہ شاندار داستان رقم ہوتی جس کا تذکرہ دنیا بھر کی جنگی تاریخوں میں ہمیشہ سنہرے الفاظ سے کیا جائے گا۔

اسی محاذ کے جری افسر میجر محمد اکرم شہید کو چھٹا نشانِ حیدر دیا گیا! اس محاذ کے صف شکن اور مادرِ وطن کے جیالے سپوتوں کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے بھارت کے ایسٹرن کمانڈ کے جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ نے کہا تھا: "یہ ناقابلِ تسخیر ہیں"

THEY ARE UNCONQUERABLE اس مہم سے نمٹنے کے بعد مجھے زخم خوردہ اور

تھکن سے چُور جوانوں کے ساتھ دریائے ٹیسٹا — (TISTA) کے کنارے مورچے سنبھالنے کا حکم ملا - ہم لوگ آغاز دسمبر تک اسی محاذ پر دشمن پر سے برسرپیکار رہے پھر اچانک ہمیں ڈھاکہ واپسی کے احکامات ملے۔



ڈھاکہ پہنچتے ہی ہیڈکوارٹر میں میری ملاقات میجر صاحب سے ہوئی۔ انھوں نے مجھے مخدوش حالات کے پیش نظر آلنسہ کو کنٹونمنٹ میں لے آنے کی ہدایت کی۔ میں نے پہلے تو آلنسہ اور چاچی کی خواہش کا احترام ملحوظ خاطر رکھا لیکن حقائق کو نظر انداز کرنا بھی میرے نزدیک بہادری نہیں بے وقوفی ہوتا۔ اگلے دو تین روز میں میں نے آلنسہ کو وہیں لے آنے کا فیصلہ کرلیا۔

کچھ لمحات ایسے بھی ہوتے ہیں جب انسان خلافِ فطرت بھی بہت کچھ کر گزرتا ہے — آلنسہ میری محبت تھی، میری بیوی تھی! اس کے گھربار کی قربانیاں، اس کے اقربا کی وطن عزیز کے لیے جدوجہد ہی ایسے ناقابل تردید حقائق تھے جنھوں نے میرے گرداگرد اس کے لیے احترام و محبت کی ایسی سربفلک چوٹیاں کھڑی کردی تھیں کہ ان سے پار جھانکنا ہی میرے بس سے باہر تھا۔

لیکن نومبر کے آخری ہفتے کے بعد میرے ہی نہیں، پاک فوج کے ہر جوان کے ذہن پہ صرف جنگ سوار تھی! ہمیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا تھا — ہم تو گوشت پوست کی ایسی مشینیں بن کر رہ گئے تھے جو حکم ملتے ہی حرکت میں آجاتیں۔ نہ دن ہمارے تھے نہ راتیں، نہ جسم ہمارے تھے نہ سوچیں۔ سب کچھ غیر مرئی طاقت کے اختیار میں چلا گیا تھا — ہم سب پر جنون کی حد تک صرف اور صرف ایک ہی سوچ سوار تھی کہ جلد از جلد جس طرح بھی ممکن ہو، جتنی بھی قربانی دی جاسکے ہم دشمن کو ایسا منہ توڑ جواب دیں کہ اسے آئندہ ہمارے خلاف کبھی سر اٹھانے کا حوصلہ ہی نہ ہو۔



اور جب کبھی ذہن میں بھولے بھٹکے سے کوئی وہم، کوئی وسوسہ، کوئی انہونی سی، انجانی سی خلش آلنسہ کے متعلق سر اٹھاتی تو نہ جانے کیوں میں اپنے ضمیر کے سامنے خود کو شرمندہ سا محسوس کرنے لگتا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں کچھ خودغرض سا ہو چلا ہوں کہ ملکی معاملات پر ذاتی معاملات سے متعلق سوچیں غلبہ پانے لگی ہیں۔ اور کچھ یہی تھے وہ خیالات جو مجھے لبا اوقات الجھن میں مبتلا کردیتے تھے۔

یکم دسمبر کو جب میں محمد پور گیا تو چاچی کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ عثمان کی موت کے صدمے کو ان کے دل و دماغ نے شاید ابھی تک قبول نہیں کیا تھا۔ خاوند اور اس کے بعد جوان سال اکلوتے بیٹے کی موت نے اس بوڑھی اور انتہائی مظلوم عورت کو مکمل طور سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ سارا سارا دن دیوانوں کی طرح چپ چاپ یا تو خلاؤں میں گھورتی رہتی یا پھر عثمان کے متعلق ہر آنے جانے والے سے باتیں کرتی رہتی۔

آہستہ آہستہ اب وہ بالکل ہی چارپائی سے لگ گئی تھی! میری آمد پر وہ ایک حوصلہ مند خاتون کی طرح میرے استقبال کو آگے بڑھی۔ مجھے گلے لگایا، سر پہ دست شفقت پھیرا اور بڑے عزم اور جبر سے خود پہ قابو پائے رکھا۔ ان دونوں کالونیوں محمد پورہ اور میرپور میں رضاکاروں کے انتظامات اور ان کی ہمت و حوصلے کو دیکھ کر اپنی بزدلی پر غصہ آنے لگتا تھا! تاہم میں نے دبے لفظوں میں آلنسہ کے سامنے پھر اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ مسکرا کر بولی۔

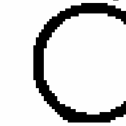
"ان لوگوں کو ہماری یہاں موجودگی نے خاصی تقویت دی ہے پھر آپ آخر ایسا سوچتے ہی کیوں ہیں؟ ہمیں ہمیشہ اچھائی کی امید رکھنی چاہیئے — آپ تو کمانڈو ہیں علی! اگر آپ بھی ایسا ہی سوچنے لگے ہیں تو ان لوگوں....!

— فقرہ اس نے ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

مجھے اس لمحے خود پر واقعی غصّہ آنے لگا تھا۔ مَیں کچھ بھی ہوتا بالآخر اپنے ملک کی فوج کا ایک افسر تھا۔ آلنسہ میری بیوی ضرور تھی لیکن مجھے خاوند بن کر نہیں پاک فوج کا افسر بن کر ــــ کمانڈو بن کر سوچنا تھا! کبھی کبھی تو اس کا عزم و حوصلہ اور عظمتِ کردار دیکھ کر مجھے اس پر رشک آنے لگتا تھا۔

مَیں نے اس کے عزائم پر "مرحبا" کہا اور شام کو واپس لوٹ آیا۔

ــــ واقعی، ان حالات میں عثمان کی ماں اور بہن کو وہاں سے لے جانا محمد پورہ اور میرپور کی آبادیوں کا بڑھا ہوا مورال ختم کرنے والی بات تھی۔



۲ر دسمبر کو ہمیں چاندپور پہنچ کر اس علاقے کے جی او سی کے زیرِ کمان رہنے کا حکم ملا جہاں سے ہم مظفر گنج اور اس سے آگے پھر بھی گنج تک چلے گئے۔

ــــ ۳ر دسمبر کو دشمن کے بھرپور حملے کے بعد ان علاقوں میں اس کا دباؤ بہت بڑھ چکا تھا! ہم نے ان مقامات تک پہنچنے کے لیے چاندپور روڈ کے بجائے کھیتوں کے بیچوں بیچ کچّا راستہ اختیار کیا تھا۔ کیچڑ سے لت پت وردیاں اور بوٹ اور مسلسل پانی میں سفر کرنے سے بُرا حال ہونے لگا تھا۔ وردیاں گیلی ہو کر جسموں سے چپک گئی تھیں اور کئی کئی روز کے مسلسل سفر نے جوانوں کو بری طرح تھکا دیا تھا۔

یہاں مختلف مقامات پر دشمن سے براہِ راست ٹکراؤ ہوا اور کئی خونریز معرکے لڑے گئے ہمیں ایک جگہ رکنے کو نہیں بلکہ مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر خدمات انجام دینے کو کہا گیا تھا۔ ۸ر دسمبر تک ہم لوگ چاندپور واپس پہنچ چکے تھے جہاں اچانک ہم پر تیز بھارتی فضائی حملے ہونے لگے۔

صورتِ حال کچھ ایسی ہو گئی کہ اب یہاں مزید رُکنا ممکن نہیں تھا۔ ہمیں واپس ڈھاکہ آنے اور نئی مورچہ بندیاں سنبھالنے کے احکامات ملے کیونکہ ہمارے ایسٹرن



ہیڈکوارٹر میں فوجوں کی تعداد بمشکل اتنی ہی تھی کہ وہ اندرونِ ڈھاکہ سے ہونے والے مکتی باہنی کے حملے کو کنٹرول کر سکتی۔ ۸ر دسمبر کی رات کو یہ حکم موصول ہوا اور ہمارے ڈیڑھ سو جوانوں نے جن کا تعلق الیف ایف، ۲۳ پنجاب اور ایس۔ ایس۔ جی سے تھا، دریائے میگھنا کے راستے ڈھاکہ پہنچنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

ہمارے جی او سی صاحب نے مقامی طور پر کچھ کشتیاں اور لانچیں اکٹھی کر لیں اور ان کے کناروں پر بھاری مشین گنیں نصب کرنے کے بعد انھیں "جنگی جہازوں" کی شکل دے کر رات کے اندھیرے میں ڈھاکہ پہنچنے کا ارادہ کیا۔

ــــ ہمارے اس "کنوائے" کی حفاظت کے لیے پاک بحریہ نے ایک گن بوٹ بھی روانہ کر دی تھی اور ایک لحاظ سے یہی ڈیڑھ سو سپاہی اور دوسرے عملے کے قریباً چالیس پچاس آدمی ہمارا ۳۹ ڈویژنل ہیڈکوارٹر تھے جن سے ہماری قلیل تعداد اور وسائل کی کمی کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

تیاریوں میں قریباً ساری رات بسر ہو گئی اور علی الصباح ہمارا کنوائے چاندپور سے نرائن گنج (ڈھاکہ) کی طرف روانہ ہوا۔ یہ سفر بظاہر تو چار گھنٹے کا تھا لیکن جن حالات کا سامنا ہمیں کرنا تھا اس کے پیشِ نظر قرنوں پر محیط نظر آتا تھا:

ابھی ہم نے بمشکل ڈیڑھ دو گھنٹے ہی گزارے تھے کہ اچانک آسمان کو بھارتی مگ طیاروں نے ڈھانپ لیا ــــ وہ دیوانہ وار ہم پر ٹوٹ پڑے۔ کھلے دریا میں ایسا شاندار نشانہ میسّر آنے پر ان پر نشے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور بھارتی فضائیہ کے سورمے اس بے یار و مددگار کنوائے کو مکمل تباہی سے دوچار کرنے پر تلے نظر آتے تھے۔

ہم لوگ ابھی نرائن گنج سے کچھ دُور ہی تھے جب یہ حملہ ہوا۔ طیارہ شکن توپیں (اینٹی ائرکرافٹ) صرف اس گن بوٹ پر نصب تھیں جسے بحریہ نے اس بدقسمت کنوائے

کی مدد کرنے کے لیے روانہ کیا تھا۔

آفرین ہے گن بوٹ کے کپتان پر۔ اس نے بجائے ہمیں دشمن کے رحم وکرم پر چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کرنے کے مقابلے کی ٹھانی اور ڈٹ گیا۔ ایک گن بوٹ کی حیثیت اتنے جیٹ طیاروں کے آگے بھلا تھی ہی کیا؟ پہلے تو وہ کشتیوں اور لانچوں پر سوار افراد پر، جن کی مشین گنوں کی گولیاں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں، اپنی بہادری کے جوہر آزماتے رہے اور پھر اس طرف سے فارغ ہو کر انھوں نے گن بوٹ کو گھیرے میں لے لیا۔

اب تک بوٹ کے گنرز نے قریباً ۴ طیارے شکار کر لیے تھے! میں ایک لانچ میں اپنے پندرہ بیس جوانوں کے ساتھ جن میں سے تقریباً آدھے زخمی ہو چکے تھے بے لبی کے عالم میں چیلوں اور گدھوں کی طرح جھپٹ جھپٹ کر حملہ آور ہوتے ان طیاروں کو دیکھتا اور اپنی کم مائیگی پر کڑھ رہا تھا۔ جب وہ غوطہ لگا کر ہمارے نزدیک آتے تو میں جوش غضب سے ان پر مشین گن سے فائرنگ کرنے لگتا لیکن یہ حرکت دیوانگی کی ایک کیفیت کے سوا اور کیا معنی رکھتی تھی۔

وہ گن بوٹ ہم سے بمشکل پچاس گز دور تھی جب میں نے بیک وقت ایک فارمیشن میں آگے پیچھے قطار بنا کر چھ مگ ۲۱ کو اس پر فائرنگ کرتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی زوردار دھماکہ ہوا اور شدت کرب وغم سے میں نے آنکھیں بند کر لیں ــــ گن بوٹ کا بالائی حصہ دھماکے سے اُڑ گیا۔ اس کے ساتھ ہی بحریہ کے کئی جوانوں کے خون میں نہائے لاشے بھی پانی میں گرتے نظر آئے۔

مجھ میں یہ منظر مزید دیکھنے کی تاب نہ رہی اور میں دوڑ کر لانچ کے انجن روم میں پہنچا۔ جہاں ڈرائیور، جس کے سر سے خون بہہ رہا تھا، بمشکل اسٹیرنگ کنٹرول کیے ہوئے تھا۔ میں نے اس کے نائب کی مدد سے اسے سیٹ سے کھینچ کر باہر نکالا اور



خود اسٹیرنگ سنبھال لیا لیکن ابھی لانچ بمشکل سنبھل ہی پائی تھی کہ بیک وقت دو تین مگ ہم پر جھپٹ پڑے ـــــ میرے گرداگرد پانی میں راکٹ پھٹ رہے تھے۔ ایک راکٹ زوردار دھماکے کی آواز کے ساتھ پھٹا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ہیلمٹ کے نیچے چہرے کی دائیں طرف ایک آگ سی داخل ہو گئی۔

لانچ ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔

ـــــ میرے کمانڈو زخمی حالت میں بڑی بے لبی کے ساتھ دریا میں چھلانگیں لگا رہے تھے۔ میں نے دائیں طرف ہاتھ لگا کر دیکھا: میرا ہاتھ خون میں لت پت ہو گیا!! شاید لانچ کا کوئی ٹکڑا راکٹ پھٹنے کے بعد اُڑ کر لگا تھا۔ پیچھے گردن گھمائی تو ڈرائیور اور اس کا نائب شہید ہو چکے تھے۔

طیارے اپنا کام کر کے آگے نکل گئے اور اب وہ دوسری لانچوں اور کشتیوں پر جہنم کا دہانہ کھولے ہوئے تھے! چند لمحوں کی مہلت نصیب ہوئی تو میں نے اپنے شہید ساتھیوں میں سے ایک کی فیلڈ پٹی نکال کر پھرتی سے اپنے زخم پر باندھ لی۔ اس کے بعد کم از کم اتنا ضرور ہوا کہ خون بند ہو گیا۔

لانچ پانی کے بہاؤ پر بہتی چلی جا رہی تھی! میں نے زخم کے باوجود بادل نخواستہ دریا میں چھلانگ لگا دی۔ میرے گرداگرد تختوں سے لٹکے اور تیر تیر کر دریا کے کنارے کی سمت بڑھتے جوانوں پر بھارتی سورما جھک جھک کر راکٹوں اور گولیوں کا مینہ برسا رہے تھے۔ خود میرے گرداگرد بھی پانی میں گولیاں اور راکٹ پھٹ رہے تھے لیکن اس وقت میں ان سب سے بالکل بے نیاز ایک مکمل کمانڈو بنا تیرتا ہوا تیز رفتاری سے ساحل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ـــــ تیرتے ہوئے دھڑکتے دل سے میں نے نظریں اٹھا کر گن بوٹ کی طرف دیکھا جس کا بالائی حصہ تباہ ہونے کے باوجود اس کے توپچی بھارتی طیاروں کے خلاف

زندگی اور موت کا معرکہ لڑ رہے تھے۔

دشمن کے جہازوں کی بے تحاشا فائرنگ سے بچتے بچاتے بالآخر میں اور میرے بیس ساتھی ساحل پر آ پہنچے۔ گن بوٹ کا کپتان بھی بڑی مہارت سے اپنی بوٹ کو بچاتا ہوا ساحل پر پہنچ گیا۔

نرائن گنج پر ہمارا استقبال کمانڈو بٹالین کی ایک کمپنی کے چند بچے کھچے جوانوں نے کیا جنھوں نے اس روز "سہ گھنٹے تک آرام" کیا تھا اور جو ان دنوں عیاشی کے زمرے میں آتا تھا۔

میرے جوانوں میں سے اکثر زخمی اور بغیر ہتھیاروں کے تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے تھے جن کے جسموں سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا یہاں فیلڈ اسپتال میں، جو ایک جھونپڑی میں بنا ہوا تھا۔ ہماری مرہم پٹی کی گئی اور شدید زخمیوں کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے ڈھاکہ سی۔ایم۔ایچ بھیجنے کے انتظامات ہونے لگے اور باقی تمام کمانڈوز کو جو خوش قسمتی سے ابھی تک زندہ اور ٹریگر دبانے کے قابل تھے فوراً ڈھاکہ پہنچ کر ایسٹرن ہیڈکوارٹر کے اگلے احکامات پر عمل کرنا تھا۔

○

ہم لوگ ہیلی کاپٹروں کے ذریعے دشمن کے طیاروں کی نظروں سے بچتے بچاتے بالآخر شام کے قریب ڈھاکہ پہنچ گئے۔ جہاں میرے "سر" بڑی بے چینی سے میرے منتظر تھے۔ انھوں نے میری سر پر بندھی پٹی اور اس پر خون تو دیکھ لیا تھا لیکن جانے کسی مصلحت کے تحت ابھی تک میرے زخم کا حال دریافت نہ کیا۔

"ہیلو ینگ مین" ان کی بذلہ سنجی ابھی تک برقرار تھی۔

میں جواب میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔

نزدیک ہی میرے او سی موجود تھے۔ کرنل صاحب سے جب میں نے اجازت



چاہی کہ میں آلنسہ کی خبر لے آؤں تو انھوں نے عجیب سی نظروں سے میری اور پھر میجر صاحب کی طرف دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے اچانک زوردار گھونسہ میرے دل پر رسید کر دیا ہو۔

"بیٹے تمھاری وائف اسپتال میں ہے" بالآخر انھوں نے ہمت کی۔

"کب؟ کیسے؟" میں نے کسی اضطراری کیفیت کے تابع یہ بات تو کہہ دی لیکن پھر خود ہی شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ مجھے علم تھا کہ جس شدت سے بھارتی ائر فورس ڈھاکہ پر حملے کر رہی ہے، اس کے بعد اس قسم کے سوالات کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی تھی۔

۳ر دسمبر کے روز ہی سے ڈھاکہ پر اپنی وحشت اور بربریت کی انتہا بھارتی ائر فورس نے کر دی تھی۔ ان کے جہاز بڑے آرام سے ٹہلتے ہوئے تشریف لاتے اور دو تین "نشان زدہ" جگہوں کو نشانہ بنا کر چل دیتے تھے۔ انھیں مکتی باہنی کے ذریعے پل پل کی خبریں موصول ہو رہی تھیں اور انھی کارآمد اطلاعات پر بھارتی طیارے حملے کرتے رہتے۔

ڈھاکہ کی آبادی میں ان کا خاص نشانہ میرپور اور محمد پور کی بستیاں تھیں کیونکہ یہ دونوں آبادیاں پاکستان کے حامیوں کا گڑھ سمجھی جاتی تھیں۔ ایسے ہی حملے میں انھوں نے آلنسہ کی والدہ اور پندرہ دیگر بہاری عورتوں اور بچوں کو مار ڈالا۔ آلنسہ کو شدید زخمی حالت میں ملبے سے نکالا گیا اور رضاکار اسے اور دیگر زخمیوں کو اسپتال پہنچا گئے تھے۔

میرے سوال کا جواب دونوں میں سے کسی نے بھی نہ دیا۔ البتہ ایک تیز رفتار جیپ ہمارے نزدیک آ کر اچانک رک گئی:

"کم آن بوائے" میجر صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے قریباً جھنجوڑ ڈالا۔

میں ان کے ساتھ تقریباً گھسٹتا ہوا ہی جیپ تک پہنچا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ انھوں نے سنبھال لی اور ہماری جیپ گولیوں اور گولوں کے زوردار دھماکوں کے عین درمیان تیزی سے ڈھاکہ کے ٹی بی اسپتال کی طرف اڑنے لگی یہ اسپتال ڈھاکہ یونیورسٹی کے نزدیک ہی تھا اور ہمارے ایسٹرن ہیڈکوارٹر کا، جواب ڈھاکہ یونیورسٹی میں منتقل ہوچکا تھا، ایک حصّہ تھا۔ دنیا کی بدترین افواج بھی زخمیوں کے اسپتالوں اور عبادت گاہوں پر حملے سے گریز کرتی ہیں لیکن ہمارا واسطہ شاید انسانوں سے نہیں بھیڑیوں سے تھا جو کسی انسانی یا خدائی اخلاق اور ضابطے کو خاطر میں نہیں لاتے۔

ڈھاکہ میں ہماری افواج نے شہر میں مورچہ بندیاں کر رکھی تھیں تاکہ دشمن کی حملہ یلغار کو روک سکیں۔ ہمارے جی۔ او۔ سی ہر دوسرے تیسرے روز اپنا ہیڈکوارٹر تبدیل کرلیتے تاکہ بھارتی طیّاروں کی بمباری سے محفوظ رہ سکیں لیکن مکتی باہنی ان کے ہر نئے ٹھکانے کی اطلاع فوراً اپنے آقاؤں کو دے دیتی۔ اس طرح ان کے ہیڈکوارٹر اور خود جنرل نیازی ۱۳ دسمبر کے بعد سے اب تک مسلسل دشمن کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ وہ جہاں بھی پہنچتے بھارتی فضائیہ ان کے تعاقب میں وہاں آ پہنچتی۔

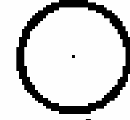
جنگ کے فوراً بعد بھارت میں لکھی جانے والی ڈی۔ آر۔ منکیکر کی کتاب جس کا نام (PAKISTAN CUT TO SIZE) رکھا گیا تھا اس سیکٹر میں لڑنے والے بھارتی اور بنگلہ دیشی کمانڈروں کی مدد سے مصنّف نے مکمل کی؛ وہ اپنی کتاب میں اس بمباری کا ذکر کرتے ہوئے جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کی جنگ کے فوراً بعد منعقدہ پریس کانفرنس کا حوالہ بھی اس کی دلیل میں دیتے ہوئے لکھتا ہے:

"بھارتی فوج کا مقصد اس مسلسل بمباری سے یہ تھا کہ وہ جنرل نیازی کے اعصاب ہی مفلوج کرکے رکھ دے اور انھیں کسی اہم فیصلے پر پہنچنے کے قابل ہی نہ چھوڑے! ایسٹرن کمانڈ کے جنرل اروڑہ نے کلکتہ پریس کانفرنس میں انکشاف کیا کہ انھیں جنرل



نیازی کی نقل وحرکت کی پل پل کی خبر تھی اور جب انھیں اطلاع ملی کہ انھوں نے اپنا ہیڈکوارٹر اسپتال اور یونیورسٹی میں منتقل کرلیا ہے تو وہاں بھی شدید بمباری کروائی گئی۔"

اس طرح خود بھارت کی ایسٹرن کمانڈ نے اسپتال میں بمباری کے "سانحے" کو بڑی ڈھٹائی سے اپنی شاندار حکمتِ عملی کا حصّہ بنا کر پیش کیا ہے۔



ہم لوگ ابھی اسپتال سے بیس پچیس گز دُور ہی تھے۔ جب ہم نے بھارتی طیاروں کو اچانک گِدھوں کی طرح جھپٹ کر اسپتال پر حملہ آور ہوتے دیکھا۔

"سر" نے جیپ کھڑی کردی اور ہم نے چھلانگیں لگا کر قریبی درختوں کے نیچے پناہ لے لی۔ میرے دائیں ہاتھ میرے "سر" اور ان کے پیچھے ہمارے دو جوان جو جیپ میں ہمارے ساتھ آئے تھے۔ انھوں نے ایک ہاتھ میرے کندھے پر بھی رکھا ہوا تھا۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں میں بھاگ کر اسپتال نہ پہنچ جاؤں۔

بھارتی گدھ جھپٹے اور اسپتال کی بلڈنگ سے دھواں اٹھنے لگا۔ طیارہ شکن توپوں کی فائرنگ سے آسمان اور فضا لرز رہی تھی: "میری آلنسہ مجھ سے چھینی جا رہی ہے اور میں یہاں کھڑا اس کا تماشہ کر رہا ہوں"۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا حملہ کریں میں تیزی سے اسپتال کی طرف بھاگا۔ جس کے دروازے سے زخموں کی شدت سے تڑپتے اور کراہتے مرد، عورتیں، فوجی اور غیر فوجی گھسٹتے ہوئے اپنے قدموں پر کسی نہ کسی طرح چلتے باہر آ رہے تھے۔

مجھے علم نہیں تھا کہ کس طرح میں اسپتال کے دروازے تک پہنچا۔ اس کے ساتھ ہی میرے سامنے برآمدے کی چھت گر گئی۔ میں نے دیوار کی اوٹ میں چھلانگ لگائی۔ میرے دونوں جانباز میرے تعاقب میں تھے۔

ملبے کے ڈھیر کو میرے پیچھے پھلانگتے ہوئے وہ میرے ساتھ ہی اس وارڈ کی طرف بھاگے چلے آرہے تھے جہاں آنسہ بستر مرگ پر پڑی میری منتظر تھی! ابھی ہم بمشکل وارڈ کے دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ اچانک راکٹ پھٹنے لگے۔ برآمدے اور کمرے لرز گئے اس کے ساتھ زخمیوں کی چیخ وپکار اور آہ وبکا بلند ہوئی۔ میں دیوانوں کی طرح بستروں سے نیچے گرے زخمیوں میں آنسہ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ جو اچانک مجھے وارڈ کی دیوار کا سہارا لیے کھڑی نظر آگئی۔

"آنسہ"۔ میں نے دیوانہ وار اُسے اپنی بانہوں میں دبوچ لیا۔

"علی"۔ وہ کراہی۔ اس کے زخموں سے خون جاری تھا۔ شاید ٹانکے ٹوٹ گئے تھے۔

میں اسے بازوؤں میں تھامے باہر کو لپکا۔ میرے دونوں شیر دل ساتھی "سر" "سر" کہتے میرے تعاقب میں تھے۔

ابھی ہم بمشکل ملبے کے ڈھیر کو پھلانگتے اسپتال کے دروازے تک ہی پہنچ پائے تھے کہ اچانک ایک راکٹ ہمارے نزدیک پھٹا۔ میرے دونوں جوانوں نے پھرتی سے باہر کی سمت چھلانگیں لگادیں۔ میں آنسہ کے ساتھ ہی اچانک لڑکھڑایا اور منہ کے بل دوسری سمت جا گرا۔

کسی پھٹتے ہوئے شیل کے ٹکڑے میرے جسم پر لگے تھے! میرے نزدیک ہی خون میں نہائی آنسہ پڑی تھی۔ میں پھرتی اور ہمت سے اٹھا اور اسے بازوؤں میں اٹھا کر اس جھنڈ کی طرف بھاگا جہاں ہماری جیپ کھڑی تھی۔ میرے دونوں جوانوں کو بھی زخم آئے تھے۔ ان کی وردیاں سُرخ ہو رہی تھیں ـــــ دونوں ہی اپنے "سر" پر نچھاور ہونے کا عزم رکھتے تھے۔

آنسہ کو میں نے جیپ کے نزدیک ہی زمین پر لٹا دیا۔ اس کی حالت بگڑ رہی تھی۔ وہ تکلیف اور درد کی شدّت کو برداشت کرنے کے لیے اپنے ہونٹوں کو بار بار دانتوں



سے کاٹ رہی تھی۔ مجھے کچھ نہیں سُوجھ رہا تھا۔

ـــــ میں اسے مرنے سے روکنا چاہتا تھا۔ جس طرح بھی ہو۔ جیسے بھی ممکن ہو میں چاہتا تھا کہ اسے مرنے نہ دوں۔

ـــــ اور تو کچھ نہ سُوجھا میں نے چاہا؛ اسے دوبارہ اٹھا کر جیپ میں ڈال کر کسی محفوظ مقام تک لے جاؤں۔ ابھی میں نے گھٹنوں کے بل جھک کر اُسے اٹھانا ہی چاہا تھا کہ آنسہ نے سر کے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔

میرے پھیلے ہوئے ہاتھ کسی مقناطیسی عمل کے تابع رُک گئے۔

"علی"۔ اس نے درد کی شدت سے تڑپ کر سرگوشی کی۔

"آنسہ"! میرا کلیجہ کٹنے لگا۔

"علی.... خدا.... حافظ...." اس کا فقرہ بمشکل مکمل ہوا اور وہ امر ہوگئی۔

میں دیوانوں کی طرح اس پر جھک کر اُسے جھنجوڑنے لگا۔ لیکن وہ نہ جاگی ظالموں نے بالآخر اُسے مار ڈالا۔ اس کی موت کا ادراک ہوتے ہی میرے ذہن میں جھکڑ چلنے لگے۔ کہیں دُور سے مشین گنوں کی فائرنگ کی آوازیں ہوائی لہروں پر سنسناتی میرے دل و دماغ میں دھماکے پیدا کرنے لگیں۔ آسمانوں پر چیختے چنگھاڑتے طیاروں کا شور میرے خون میں گردش کرنے لگا۔ میرے اعصاب کے تمام تاروں میں بجلیاں کوندیں اور وہ تیزی سے جھنجھنا اُٹھے۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے گرد اگرد موجود سارے ماحول کو موت آگئی ہے۔ ایک تیز سی جلن نہ جانے کہاں سے میرے پپوٹوں میں گھس آئی تھی۔ میں پوری قوت صرف کرنے کے بعد اپنی آنکھیں کھولنے کے قابل ہوا۔ پھر اچانک ایک خواہش شدت سے میرے دل و دماغ میں در آئی ـــــ میں نے چاہا میں مر جاؤں! زندہ رہنے اور وجود کی واقعیت سے مجھے ہول آنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے زبردستی روح کے پنچھی کو

جسم کے پنجرے میں مقید کر رکھا ہے۔ وہ پھڑپھڑا کر آزادی ـــ آزادی ـ سنگرام ـ سنگرام پکار رہا تھا۔

فضاؤں کی زہریلی سنسناہٹ میرے کانوں میں بے نام سی گونج پیدا کرنے لگی۔

اچانک ہی کسی نے جھک کر میرے کندھے کو چھوا تھا۔ شاید میرے "سر" نے جو میرے پیچھے چپ چاپ آکر کھڑے ہو گئے تھے۔

میں نے ایک نظر گردن گھما کر ان کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔ انھوں نے مجھ سے نظریں ملائے بغیر اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میجر صاحب کے ہاتھ کی جنبش مجھے عالم ہوش میں واپس لے آئی اور میں نے دیکھا آنسہ مر چکی ہے۔

اس کی آنکھیں جو خیام کی رُباعیاں تھیں، ان کی چمک ماند پڑنے لگی تھی۔

اس کے حسین سراپے کو جس کے ہر پہلو سے زندگی کا حُسن جنم لیتا تھا موت آگئی۔

اس کے سیاہ لمبے بالوں میں جھلملاتے گہرے سمندروں کے رنگ پھیکے پڑ گئے۔

اس کے بدن کی سنولاہٹ کو راون کے زہریلے ڈنک نے ڈس لیا۔ وہ چپ چاپ میرے سامنے خون میں لت پت لیٹی تھی۔ اس کے عظیم آدرش، قربانیاں، سبھی کچھ دھڑام سے زمین بوس ہو رہے۔

"لبوائے!" میرے "سر" مجھے کھینچ کھانچ کر عالم ہوش میں لا رہے تھے! کمانڈو بنو۔ کمانڈو!" انھوں نے مجھے بازو سے پکڑ کر کھڑا کر لیا۔

مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی جیسے کسی کو سکتہ ہو جائے۔ میں رونا چاہتا تھا ـــ مجھے رونا چاہیے تھا۔ میں نے جلتی آنکھوں سے اپنے "سر" کی طرف دیکھا جو مجھے "کمانڈو" بننے کی تلقین کر رہے تھے۔ جن کی خود اپنی آنکھیں بھی بھیگ رہی تھیں۔

"سر" میرے منہ سے نہ جانے کیسے نکلا۔

"علی" ان کی بوجھل آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔



میں بلک پڑا۔ بالکل ننھے بچوں کی طرح رو دیا۔ انھوں نے مجھے باپ کی طرح سینے سے چمٹا لیا۔ کتنا وشال سینہ تھا ان کا۔

ہمارے دائیں بائیں دونوں جوان پتھر کی مورت بنے آنسو بہا رہے تھے ـــ ان کے جسموں سے خون جاری تھا لیکن انھیں سوائے اپنے افسران کے غم کے اور کسی غم یا دکھ تکلیف کی خبر تک نہ تھی۔

ہر مٹی کا اپنا حُسن ہوتا ہے۔ اپنا قرینہ ہوتا ہے۔

آنسہ بنگال کی بیٹی تھی۔ اس کے خاندان نے اس مٹی کی تقدیس کے لیے اپنی جانیں نذر کی تھیں۔ وہاں کے لوگوں نے تو انھیں دھتکار دیا لیکن مٹی کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ اس کی بیٹی کو کہیں اور پناہ ملے ـــ میرے پنجاب کی ہریالیاں بانہیں پھیلائے اسے پکارتی رہیں مگر میرے بنگال کی بیٹی اپنی مٹی میں سما گئی۔

پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اسپتال کا عملہ وہاں اکٹھا ہو گیا۔

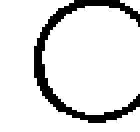
ـــ ہوائی حملہ ختم کر کے۔ میری آنسہ کو مار کر۔ بھارتی سورمے واپس اپنے ٹھکانوں کو لوٹ گئے تاکہ دوبارہ نئی تیاریوں کے ساتھ آئیں اور سب کی آنساؤں کو ان سے چھین لیں۔

آنسو بہاتے جوانوں اور تصویرِ حیرت بنے میرے وجود کو "سر" نے اسپتال کے عملے کو سونپا۔ جنھوں نے خون روتی آنکھوں سے ہماری مرہم پٹی کی! انھوں نے محض ایک گھنٹے کی قلیل مدت میں میری آنسہ کو بھی کورا کفن پہنا کر اس کے سارے زخموں کا خون خشک کر کے پھولوں کے ڈھیر میں میرے سامنے لٹا دیا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ یہ پھول وہ کہاں سے لے آئے تھے؟

ـــ آنسہ میری محبت ہی نہیں ہماری پہچان بھی تھی۔ جب "پہچان" ہی نہ رہی تو میرا پورا پاکستان بھی مر گیا اور اس کی لاش سے "بنگلہ دیش" نے جنم لے لیا۔

ہم نے اس کی لاش کو قریب ہی دفنا دیا ۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ آخری لمحات تک میں اس کے ساتھ ہی رہا اور اپنی محبت کو اپنے ہاتھوں قبر میں اتارا ورنہ یہاں سڑکوں اور گلیوں میں سینکڑوں بے گور و کفن لاشے جانے کب سے پڑے اپنی بے لبسی کا ماتم کر رہے تھے۔



قبرستان سے کمپنی تک واپسی کا سارا سفر میں نے سوتے جاگتے کیا تھا. کبھی میں عالم ہوش میں ہوتا اور کبھی حدِ ادراک سے بھی آگے نکل جاتا ۔ مجھے اپنے اردگرد تاریکیاں ہی تاریکیاں نظر آئیں ۔ مسلسل اور زوردار فائرنگ کی آوازیں دُور بہت دُور ہٹتی چلی جاتیں اور کبھی اچانک گولیاں اور گولے میرے نزدیک آکر پھٹنے لگتے. میری حالت اس مدہوش کی سی تھی جس پر ہوش مندی کی حجت بھی بہر حال لاگو ہوتی تھی۔

اسی رات اپنے میجر صاحب کی سرکردگی میں ہماری کمپنی کے بچے کھچے بیس جوانوں کے ساتھ میں ڈھاکہ سے قریباً دس میل دور "دھیرا" کی طرف جا رہا تھا۔ اس سانحے سے میرا اب تک محفوظ رہنا شاید اس باعث تھا کہ جنگ کی شدت اور ہماری پے در پے پسپائی کے اجتماعی دکھ کا جو مگر مچھ میرے اندر مہیب جبڑا کھولے بیٹھا تھا اس نے اکبر کی موت کے "ذاتی روگ" کو نگل لیا تھا۔

اسپتال سے آج تک وہ کبھی مجھ سے الگ نہ ہو سکی ۔ بالکل اسی طرح جیسے دریا اپنے پرانے پانیوں سے کبھی نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن ان فیصلہ کن لمحات میں میرا ایمان سلامت رہا اور خدا کے حضور شرمندہ ہونے سے یوں بچ نکلا کہ میں نے آخری لمحے تک اپنے ذاتی روگ کو اپنے اور ملکی فرائض کے درمیان کبھی دیوار نہ بننے دیا۔

یہاں ہمارا مقابلہ زیادہ تر مکتی باہنی اور ان کے بھارتی کمانڈوز سے ہوتا رہا



جو ایک عرصے سے ڈھاکہ کے گرداگرد اپنا دائرہ تنگ کرنے میں مصروف تھے ۔ ۱۶ دسمبر کو انٹیلی جنس رپورٹ ملی کہ بھارتی اس علاقے میں پیرا ٹروپر لینڈنگ کرنے والے ہیں۔

فوج کا یہ مایہ ناز شعبہ جنگ کے آخری لمحات تک سرگرم عمل رہا ۔ اس کے جانبازوں نے اپنے سر اپنی ہتھیلیوں پر سجا کر مادرِ وطن کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کیا لیکن ان کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہ آئی۔

روزانہ ہم پر بھارتی طیّاروں کے حملے ہوتے ۔ ہم اپنے مورچوں میں سر دیے بے لبسی سے انھیں خود پر بمباری کرتے دیکھتے رہتے ۔ طیارہ شکن بیٹریاں تو پھر بھی گولے فائر کر کے اپنے دل کا غبار نکال لیتی تھیں، ہمیں تو یہ سہولت بھی میسّر نہ تھی ۔ کئی مرتبہ دیکھنے میں آیا کہ جب بھارتی طیّارے چنگھاڑتے ہوئے ہم پر حملہ آور ہوتے تو اچانک کسی گوشے سے "اللہ اکبر" کی فلک شگاف دھاڑ گونجتی اور کوئی جوان جوشِ غضب میں مورچے سے باہر نکل کر دیوانہ وار آسمان کی سمت اپنی گن اونچی کر کے بھارتی طیاروں کی طرف گولیاں برسانے لگتا۔

ممکن ہے ہوشمندوں کے نزدیک یہ دیوانگی کی کوئی قسم ہو لیکن ان حالات میں کون تھا جو اپنے حواس بجا رکھتا ؟ کسی فوجی جوان کے لیے میدانِ جنگ میں دشمن سے لڑ کر مرنا سعادت ہوتی ہے ۔ اس طرح بے لبسی سے قضائیہ کے ہاتھوں اپنی موت کا نظارہ ان پر دیوانگی نہیں تو کیا فرزانگی طاری کرتا ؟

مَیں نے اپنی آنکھوں سے کئی جوانوں کو غصّے سے ہونٹ کاٹتے دیکھا. وہ مورچوں میں سر دیے اپنی مٹھیاں بھینچ بھینچ کر کنکریٹ کی دیواروں پر مارنے لگتے۔ ان کے جبڑے شدت برداشت سے اتنے بھینچ جاتے کہ ہڈیاں اُبھر کر نمایاں ہونے لگتیں ۔ ان کی آنکھیں شعلے برساتیں ۔ لیکن وہ کچھ نہ کر پاتے ۔ اس جنگ سے متعلق لکھی کوئی کتاب، خواہ وہ دشمن کی لکھی ہو یا اپنی یہ نہیں بتاتی کہ جب غنیم ڈھاکہ کی دیواروں

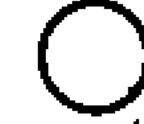
پر دستک دے رہا تھا تو ہم نے کومیلا، جیسور، کھلنا، راجشاہی، ہلی یا دوسرے ضلاعی ہیڈکوارٹر ان کے حوالے کر کے انھیں آگے آنے دیا ہو؟

دشمن اپنے پہلو میں آتش و آہن کا سیلاب لیے۔ پرے باندھ باندھ کر ہم پر حملہ آور ہوتا۔ پانیوں، فضاؤں اور زمین سے اس کی قہرناکیاں اپنی انتہا کو پہنچ جاتیں لیکن اسے سوائے سر پھوڑنے کے اور کچھ نصیب نہ ہوا۔

اس بات کا احساس بھارتی جرنیلوں کو بخوبی ہو گیا تھا کہ وہ ہمارے دفاعی قلعوں میں کبھی شگاف نہیں ڈال سکتے۔ ہزاروں کی تعداد میں اپنے جوان مروانے اور کروڑوں اربوں روپے کا گولہ بارود پھونکنے کے بعد بالآخر دشمن نے اپنی حکمت عملی بدلی اور وہ ہمارے پہلوؤں سے گزر کر آگے بڑھنے لگا۔

قلیل تعداد کے پیشِ نظر ہمارے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ پھیل کر اپنے پہلوؤں کو بھی بچا لیتے یا محفوظ رکھتے۔ ہم کسی کھلے میدان میں بھی نہیں لڑ رہے تھے یہاں لڑنے والی بیشتر افواج ایسی تھیں جن کے جوانوں نے اس سے پہلے صرف مشرقی پاکستان کا نام سنا تھا —— یہ علاقہ، اس کا موسم اور قدم قدم پر منہ پھاڑے، ندیاں، نالے، دلدل، دریا، جنگل اور کیڑے مکوڑے ان کے لیے بالکل اجنبی تھے۔

یہ انسانی قوتِ برداشت کی انتہا تھی کہ وہ پچھلے آٹھ دس مہینوں سے ان نامساعد اور خطرناک حالات کے خلاف نبرد آزما تھے۔



۳ر دسمبر کے بعد سے جس شدت کے ساتھ ہم پر فضائی حملے خصوصاً ڈھاکہ میں ہو رہے تھے، اس کے بعد کسی جوان کے لیے ایک پل کو آنکھ جھپکنا بھی ناممکن تھا۔ وہ مسلسل بیدار تھے۔ ان کے اعصاب تڑخ رہے تھے۔ جسم ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ لیکن ان کے ارادے قائم دائم تھے۔ وہ مشین کی طرح اپنے کاموں میں جتے رہے اور



آخری لمحات تک انھوں نے اپنی سپاہیانہ آن بان میں کوئی کمی نہ آنے دی۔

دشمن کی پیرا ٹروپر لینڈنگ کی اطلاع ملتے ہی ہم لوگ حرکت میں آ گئے۔ پہلے میجر صاحب نے دو جوانوں کو آگے "ریکی" کرنے کے لیے بھیجا جن کی زبانی علم ہوا کہ دشمن کے کم از کم چار سے پانچ سو تک سپاہیوں نے درمیانی اسلحے کے ساتھ پیرا ٹروپر لینڈنگ کی ہے اور اب وہ صف بندی کر کے اس علاقے میں پہلے ہی سے موجود فوج اور مکتی باہنی کے ساتھ مل کر ہم پر حملہ آور ہونے کی فکر کر رہا ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ اتنے کثیر تعداد فوجیوں پر تیس چالیس کمانڈوز ہلکے پھلکے ہتھیاروں کے ساتھ حملہ تو نہیں کر سکتے تھے کیونکہ یہاں ہمیں کچھ زیادہ قدرتی آڑ میسر نہیں تھی نہ ہی ہماری مدد کے لیے کوئی توپ خانہ موجود تھا۔ اس لیے فوراً تازہ صورتِ حال کی اطلاع ایسٹرن ہیڈکوارٹر کو دی گئی۔ جس نے ہمیں وہیں رک کر حملہ روکنے کا حکم دیا اور اپنے محدود ترین وسائل میں سے دو مارٹر گنز اور ایک میڈیم گن روانہ کرنے کی یقین دہانی کی۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہی ہم لوگ تین توپوں اور اپنے روایتی اسلحے کے ساتھ دشمن کے بے تابی سے منتظر تھے۔ جو مزید آدھ گھنٹہ گزرنے کے بعد آخر وہاں پہنچ گیا۔

وہ ۱۵ر دسمبر کی سہ پہر تھی!

جیسے ہی اگلی صفیں بڑھتے ہوئے وہیکلز ہماری زد پر آئے ان پر موت برسنے لگی۔ دشمن فوراً پیچھے ہٹ گیا اور صف بندی کر کے ہم پر حملہ آور ہوا ہمیں یہ ایڈوانٹیج حاصل تھا کہ ہم مورچہ بند تھے جب کہ دشمن "ایڈوانس" کر رہا تھا۔ اس کے اگلے تین چار حملوں کا بھی یہی حال ہوا۔

قریباً گھنٹہ بھر یہ آنکھ مچولی جاری رہی۔ اس کے بعد شام ڈھلنے لگی تو اچانک دشمن کی جانب سے ایک سفید جھنڈا بردار باہر نکلا۔ ہم نے دوربین سے جائزہ لیا:

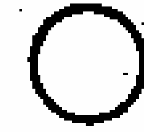
وہ کوئی بنگالی تھی! میجر صاحب نے اسے نزدیک آنے دیا ـــــ یہ مکتی باہنی کا کوئی غدّار تھا جو دشمن کا دلاّل بن کر اس طرف آرہا تھا۔ اس نے حملہ آور فوج کے کرنل کا ایک مکتوب ہمارے میجر صاحب کو پیش کیا جس میں لکھا تھا:

"تمہاری ایسٹرن کمانڈ ہتھیار ڈالنے پر رضامند ہو گئی ہے! تم کیوں خواہ مخواہ اپنی جانوں سے کھیلتے ہو۔ ہم بھی تمہاری طرح فوجی ہیں اور تمہارا احترام کریں گے۔ خیریت اسی میں ہے کہ ہتھیار ڈال دو اور مورچوں سے باہر نکل آؤ۔ ورنہ میں ائرفورس کے ذریعے تم سب کو مروا ڈالوں گا۔

رات ڈھلنے والی ہے۔ صبح تک اگر تم لوگوں نے میری بات پر عمل نہ کیا تو نتائج کی ذمے داری صرف اور صرف تمہارے کمانڈر پر عائد ہوگی!"

جن جوانوں تک اس خط کا متن پہنچا وہ تو اس دلاّل کو مارنے پر تلے ہوئے تھے لیکن پھر اسے دشمن کا قاصد سمجھ کر معاف کر دیا ـــــ میجر صاحب نے جواب میں صرف ایک گولی کاغذ میں لپیٹ کر اور زبانی یہ پیغام دے کر اسے رخصت کیا:

"کرنل۔ کل صبح کا سورج تمھیں ہمارے فیصلے سے آگاہ کر دے گا!"



اُس رات اس مورچے میں بیٹھ کر میجر صاحب، میں اور توپ خانے کے کیپٹن صاحب صلاح مشورہ کرتے رہے۔ یہ کیپٹن بھی کسی شیرنی کا جنا تھا۔ کیا مجال جو اس نے ذرا بھی کمزوری دکھائی ہو۔ وہ شیر جوان تو اسی وقت دشمن کا منہ "توڑنے" کا ارادہ رکھتا تھا لیکن میجر صاحب کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔

اس دوران ان تک یہ مصدقہ اطلاع پہنچ چکی تھی کہ ہماری ایسٹرن کمانڈ دشمن کے ساتھ کسی سمجھوتے پر پہنچ گئی ہے۔ جب انھوں نے اس بات کا ذکر ضمناً توپ خانے کے کیپٹن صاحب سے کیا تو انھوں نے بڑی عجیب سی نظروں سے ان کی طرف دیکھ



کر کہا: "سمجھوتہ؟ سر! یہ سمجھوتہ کیا چیز ہے؟ مسلمان معاف کرتا ہے یا بدلہ لیتا ہے۔ سمجھوتہ نہیں کرتا سر!"

"میرے دوست ہم سب ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں!" میجر صاحب نے اس کی پیٹھ تھپک کر کہا۔

اس رات دشمن نے تین مرتبہ ہماری پوزیشنوں کے درمیان کوئی خلا پیدا کر کے ڈھاکہ میں داخل ہونا چاہا لیکن ہر دفعہ منہ کی کھا کر واپس لوٹ گیا۔ صبح تک اس کے ہوش ٹھکانے آچکے تھے مگر اس کے وسائل پہلے سے کم از کم دس گنا بڑھ چکے تھے۔

علی الصباح میجر صاحب نے مورچے ہی میں نماز ادا کی۔ ہمارے ساتھ اس وقت کیپٹن صاحب موجود تھے ہم ساری رات جاگتے رہے تھے۔ میرے زخموں کا حال خدا کی ذات جانتی تھی یا پھر میں! لیکن ایک مجھ ہی پر کیا موقوف یہاں سب اس حالت کو پہنچ چکے تھے۔ اکثر جوان زخمی تھے لیکن کیا مجال جو وہ اپنے ساتھی کو بھی اپنے زخم کا علم ہونے دیتے۔

ہم تینوں نے رات رات میں منصوبہ بندی کر لی تھی اور صبح نماز کے بعد اس پر عمل پیرا ہونے کا ارادہ تھا! دعا سے فراغت پاتے ہی کیپٹن صاحب کو ہم نے گرمجوشی سے الوداع کہا۔ اس لمحے جب وہ ہم سے جدا ہو رہے تھے، کوئی ان دیکھی طاقت بار بار مجھے کہہ رہی تھی۔ "یہ ہماری آخری ملاقات ہے!" واقعی وہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد میں نے اس بخت آور کو دوبارہ نہ دیکھا۔ اس کی شہادت کا قصّہ ضرور سننے کو ملا۔ اس نے جس ادا سے جان دی تھی بھارتی فوج نے بھی اس پر رشک کیا۔

ہم دونوں ـــــ میں اور میجر صاحب، ایک دوسرے کے نزدیک ہی موجود تھے۔

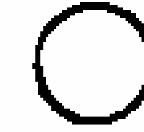
ہمارے حملے کے آغاز کا اندازہ شاید دشمن نے ہماری نقل و حرکت سے کر لیا تھا۔ وہ کبھی کبھی وقفے سے ہم پر ہلکے ہتھیاروں سے فائرنگ کر کے اپنی طاقت کی نمائش ضرور کر دیتا تھا لیکن جواب دینے میں ہم نے بھی کبھی بخل سے کام نہ لیا۔

جب میجر صاحب حملے سے پہلے کے احکامات جاری کر رہے تھے، عین اسی لمحے فضا کو چیرتی لاؤڈ سپیکر پر ایک آواز ہم تک پہنچی:

"اپنی جانوں سے مت کھیلو۔ جنرل نیازی ہتھیار پھینک چکا ہے۔ مورچوں سے باہر نکل آؤ۔ تمھارے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے گا۔ ہم مکتی باہنی سے تمھاری حفاظت کریں گے۔"

ابھی یہ بیان جاری تھا کہ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر ایک مورچے میں موجود میرے ایک جوان نے اپنی گن سے اس سمت فائرنگ کر کے دشمن کی بات کا جواب دے دیا۔

——ایسی گھٹیا باتیں سننا بھی ان کے شایانِ شان نہیں تھا۔



حملے کا آغاز توپ خانے کی طرف سے ہوا: کیپٹن نے ان کی پوزیشنوں کا جائزہ کسی حد تک لے لیا تھا۔ میرا یہی خیال تھا لیکن واقعات اس کے برعکس پیش آئے۔ اصل میں شہید ہم سے الگ ہو کر مختلف آڑ لیتا دشمن کے نزدیک پہنچ چکا تھا اور اب وہ "دیدبان" (م۔و) کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس نے عین نشانے پر نپی تلی فائرنگ کروا کے دشمن کو بوکھلا دیا تھا۔ انھیں یقین ہو گیا کہ ضرور توپخانے کا (م و) ان کے قریب ہی کہیں موجود ہے۔ بعد میں دشمن کے لشکر کے عین درمیان جب کیپٹن صاحب ان کی نظر میں آ گئے تو انھوں نے اس جگہ کو گھیرے میں لے کر انھیں ہتھیار پھینکنے اور باہر نکل آنے کا حکم دیا۔



اصل میں دشمن کا واسطہ کیونکہ اس سے پہلے کچھ ہتھیار ڈالنے والوں سے پڑ چکا تھا اس لیے وہ کچھ زیادہ ہی خوش فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔ انھوں نے یہ بالکل نہ سوچا کہ ہتھیار ڈالنے والے اس طرح دو تین ہلکی سی توپیں لے کر دشمن کی پیشقدمی کرتے بریگیڈ کے سامنے نہیں ٹھہرا کرتے۔ یہاں تو کچھ اور ہی طے پا چکا تھا۔ یہ اللہ کے سپاہی ہتھیار ڈالنے نہیں شہادت مانگنے آئے تھے اور جب انھیں اپنی منزل سامنے نظر آئی تو انھوں نے بڑھ چڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔

وارننگ کا جواب جب دشمن کو اسٹین گن کے برسٹ کی صورت میں ملا جس سے اس کے چار سورمے زمین چاٹنے لگے تھے تو انھوں نے تلملا کر کیپٹن صاحب پر جہنم کا دہانہ کھول دیا اور یوں ہمارا وہ بانکا سجیلا کیپٹن اپنی مراد کو پہنچا۔

جنگی حکمتِ عملی کے تحت فوجوں کو آگے بھی بڑھایا جاتا ہے پیچھے بھی ہٹایا جاتا ہے لیکن ہماری فطرت کچھ ایسی بن چکی تھی کہ ہمارے لیے میدان جنگ سے ہٹ جانا یا دشمن کی بات مان لینا ناممکن تھا۔ دشمن کو جب یقین ہو گیا کہ اس کا مقابلہ "دیوانوں" سے ہے تو اس نے پوری شدت سے ہم پر حملہ کر دیا۔ ہمارے جی دار بڑھ چڑھ کر موت کی صدا پر "لبیک، لبیک" کہہ رہے تھے۔ جب اچانک میرے پیچھے بیٹھے حوالدار نے ریڈیو سیٹ پر ایسٹرن ہیڈکوارٹر سے کسی پیغام کی اطلاع دی۔

میجر صاحب نے سیٹ پر جھکتے ہوئے میرے ساتھ ہی "ہتھیار ڈالنے" کا پیغام سنا تھا!

"نہیں"۔ وہ تن کر کھڑے ہو گئے۔

ریڈیو آپریٹر کی آنکھیں بھی خون اگل رہی تھیں۔ میرے سر نے دایاں ہاتھ میرے کندھے پر رکھا۔

"بولئے؟" وہ خاموش میری آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔

"نو سر" مَیں نے نفی میں سر کو جنبش دی۔

میجر صاحب نے پاؤں کی ٹھوکر ریڈیو کو ماری اور دشمن کی بالادستی کا لوحسہ الاپتی صدا کو موت آ گئی۔

"محاصرے سے نکل کر حملہ" میرے "سر" نے آرمی کی وہ اصطلاح استعمال کی جو غیرت مندوں کا آخری داؤ ہوتا ہے۔ چند منٹ بعد ہی ہمارے گرد اگرد پندرہ جوان موجود تھے۔ وہ سب اپنے "غازی مرد" کی اطاعت میں جانیں نچھاور کرنے کے مژدہ پر "آمنا صدقنا" کہہ رہے تھے۔

"چارج": بدر کے مسافر کا نعرۂ مستانہ بلند ہوا اور "برکن ہیڈ ڈرل" شروع ہو گئی۔

"ہتھیار ڈال دو۔ تمھاری ایسٹرن کمانڈ کا سمجھوتہ ..... " دشمن کے اسپیکر کی آواز وہیں گھٹ کر رہ گئی۔

"یا علیؓ": بائیں ہاتھ مورچے سے نائیک رنگ علی للکارا۔

اس نے اپنی گن کو بوسہ دیا اور باہر کودا۔ رنگ علی میری بٹالین کا مانا ہوا پہلوان تھا۔ آج تک "کھڑی مالی" کوئی مائی کا لال اس سے نہ چھین سکا۔ اب وہ کیسے "اکھاڑہ ہارتا" وہ جس طرح نعرہ مار کر اکھاڑے میں اترتا تھا۔ میدانِ جنگ میں بھی اس کے جھپٹنے کی شان برقرار رہی۔

رنگ علی نے شاید ان سپاہیوں کو دیکھ لیا تھا جو گولہ باری کی آڑ میں اس کے مورچے کی سمت رینگتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ وہ زمین کی چھاتی ٹھونکتا ان کی طرف جھپٹا پہلے اس کے دائیں ہاتھ میں حرکت ہوئی اور ہینڈ گرنیڈ ایڈوانس کرتے دشمن کے عین درمیان پھٹا۔ بزدلوں کی چیخیں رنگ علی کی اسٹین گن کی "ریٹ ٹٹ" میں دب کر رہ گئیں۔ وہ بھاگتا ہوا ان پر فائرنگ کر رہا تھا۔ اچانک وہ جھکا، جھکا تن کر



کھڑا ہو گیا ___ شاید سامنے سے پورا برسٹ اس کے سینے میں لگا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کھل گئے۔ دائیں ہاتھ میں پکڑی گن پر اس کی گرفت نہیں ٹوٹی تھی۔ چند ثانیے، وہ لمحے جو انسانی ادراک کے احاطے سے باہر ہوتے ہیں۔ امر لمحے، رنگ علی چھتنار درخت کی طرح کھڑا رہا۔ پھر وہ آگے کو جھکنے کی بجائے پیچھے کی طرف اُلٹ گیا۔ اس نے مرتے مرتے بھی دشمن کی اطاعت قبول نہ کی تھی۔

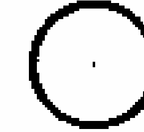
"حیدرؓ۔ حیدرؓ"۔ یہ ہمارے پہلو میں حوالدار حکمداد تھا۔

حکم داد ٹائیگر تھا۔ ٹائیگر! اس نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اپنی سروس کا آغاز کمانڈو بٹالین سے کیا۔ اور پہلی ہی جنگ میں اس کے سینے پر تمغوں کی قطار سج گئی۔ وہ اپنی کمپنی میں کمانڈو کی نسبت سے "چیتا" کہلاتا تھا۔ پیرا ٹروپر لینڈنگ کرتے ہوئے اس نے ایسے ایسے کمالات دکھائے تھے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی۔

ٹائیگر اپنی بھچار سے نکل کر ایڈوانس کرتے بھارتی فوجیوں پر لپکا۔ چشم فلک نے یہ نظارہ کب دیکھا ہوگا؟ اس کی لپک، جھپٹ پر فرشتوں نے "مرحبا"۔ "مرحبا" پکارا۔ یہ جنگ نہیں تھی۔ اس طرح جنگیں نہیں لڑی جاتیں۔ یہ تو بڑھ کر موت کو اپنانے کی ادائیں تھیں۔

یہ بدر و حنین کے جانباز، یہ صف شکن جیالے، یہ کوہ شگاف ارادوں والے "پُراسرار بندے" دشمن سے لڑ نہیں رہے تھے۔ وہ تو اسے بتانے چلے تھے کہ انھیں بہادروں کی طرح، غیرت مندوں کی طرح مرنا آتا ہے۔ وہ یہاں ہتھیار پھینکنے نہیں آئے تھے۔ سپاہی کا ہتھیار اس کی عزت ہے۔ وہ اپنی عزت دشمن کے قدموں میں نہیں ڈالا کرتا۔ نہ جیتے جی کوئی اس کی عزت پر ہاتھ ڈال سکتا ہے۔

حکم داد چنگھاڑتا ہوا جھپٹا اور پہلے ہی ریلے میں درجنوں کو نگل گیا۔ اسے بھی بمشکل ایک ڈیڑھ منٹ کی مہلت ملی تھی، لیکن دل کے سارے ارمان نکال کر وہ بھی مُراد مند ٹھہرا۔



ایک ایک کر کے ہمارے پیارے اپنی جانیں نچھاور کر رہے تھے۔ موت کے حسن کو مزید رعنائی عطا کرنے کے لیے اچانک میجر صاحب میری طرف مڑے۔

"کم آن ۔ چارج۔"

"چارج ۔ چارج۔"

"اللہ اکبر۔ یا علیؓ، حیدرؓ، حیدرؓ۔"

شیر اپنی کچھاروں سے باہر کی طرف لپکے۔ مَیں نے میجر صاحب کے دائیں بازو کو سنبھالا تھا اور میرے اشارے پر میرے نائب صوبے دار نے بایاں بازو۔ ہمارا "سر" ہم سے پہلے موت کی راہ پر کیوں گامزن ہو؟ مَیں چاہتا تھا کہ انھیں خود سے پہلے ہرگز نہ مرنے دوں۔ میرے بچے کھچے سارے ہی جوانوں نے اپنے "سر" کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ وہ بظاہر اپنے جسموں کی دیواریں بنائے اپنے "دولہا" کو جلو میں لیے آگے بڑھ رہے تھے۔

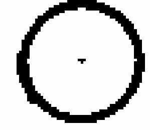
فضاؤں نے، آسمانوں نے اور ہمارے سامنے کھڑے دشمن نے حیرت سے یہ نظارا دیکھا۔ ان کی دانست میں یہ سوائے خودکشی کے اور کچھ نہیں تھا۔ اپنی تربیت کے مطابق ان کی سوچ بالکل بجا تھی۔ ہم مل کر، سنبھل کر، موت کو سینے سے لگانے کے لیے بانہیں پھیلائے اسے خوش آمدید کر رہے تھے۔

"شیرو۔ آج سارے ارمان نکال لو۔" میرے پیچھے سے دفعدار عالم میاں پکار رہے۔ عالم میاں یوپی کے مہاجر تھے۔ ان کا قریباً سارا کنبہ ہی بلوائیوں نے مار ڈالا تھا۔ وہ خود بمشکل دس بارہ سال کے تھے جب پاکستان پہنچے۔ انھوں نے خود سے عہد کیا تھا کہ قاتلوں سے ضرور انتقام لیں گے۔ یہی عزم لے کر وہ کمانڈو بنے تھے۔

رسمِ شبیری ادا ہونے لگی۔!

غازیوں کے نعروں سے فضاؤں کا کلیجہ چھلنی ہو گیا۔ آسمانوں سے ان پر انوار کی بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ وہ بڑھ بڑھ کر موت کو گلے لگا رہے تھے۔ مقدس فرشتے انھیں اپنے پروں پر اڑائے جنت کی طرف لے جا رہے تھے۔ حوریں دیدہ دل وا کیے ان کی منتظر تھیں۔ زمین سے جنّت تک ان کے لیے قالین بچھے تھے۔ وہ ارجمندیوں کا جھولا جھولتے وہاں تک پہنچ رہے تھے۔





مَیں بھی دیوانہ وار لائٹ مشین گن سے دشمن پہ آگ اگل رہا تھا لیکن میری نظریں بار بار میجر صاحب کا جائزہ لینے لگتیں جو چلا چلا کر اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ صوبیدار صاحب ان سے چمٹے ہوئے فائرنگ کر رہے تھے۔ جب ایک گولی نے انھیں مشن مکمل ہونے کا "مژدہ" سنا دیا۔

میجر صاحب نے انکی گن سنبھال لی! مَیں اپنی گن سمیت جست لگا کر ان تک پہنچ گیا۔ ابھی بمشکل دو منٹ ہی گزرے تھے جب ایک راکٹ ہمارے نزدیک پھٹا۔ کسی نادیدہ طاقت نے مجھے پہلے فضا میں اُچھالا اور پھر زمین پر پٹخ دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دایاں پہلو چھِنے لگا۔ میری ٹانگ میں اذیت ناک ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ اپنی جگہ سے حرکت کرنا ناممکن دکھائی دیتا تھا۔

میرے نزدیک میجر صاحب زمین پر بے سدھ لیٹے تھے۔ کسی نہ کسی طرح میں گھسٹتا ہوا ان کے نزدیک پہنچا۔ وہ نیم بے ہوش تھے۔

"سر۔ سر۔" مَیں نے انھیں جھنجھوڑا اپنی بوتل کھول کر ان کے منہ سے لگائی اور ان کا سر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا۔

ان کے سرخ و سپید چہرے پر تازہ خون کا دریا لہریں مار رہا تھا۔ ان کی ساری وردی خون میں لت پت تھی۔ مَیں نے کسی نہ کسی طرح ان کا ہیلمٹ اتار دیا۔ "سر" آہستہ آہستہ قرآنی آیات تلاوت کر رہے تھے۔ انھوں نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں کھول کر میری طرف

دیکھا، مسکرائے اور میری جان لے گئے۔!!

——ان کا خوبصورت چہرہ ایک طرف کو جھک گیا۔ میرا راہبر مر گیا تو مجھے اپنے یتیم ہونے، اکیلے رہ جانے کا ادراک ہوا اور میں سسک پڑا۔ میری ساری محنتیں رائیگاں گئیں۔ میرے "صاحب" مجھ سے چھن گئے اور میں زندہ رہ گیا۔

میرے اردگرد گولیاں چل رہی تھیں۔ گولے پھٹ رہے تھے لیکن میرا جسم جنبش کے قابل ہی نہیں رہ گیا تھا۔ میں سارے ماحول سے، اپنے گردوپیش سے یکسر بے خبر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے سردار کو دیکھتا رہا۔ میں ابھی تک خود کو یہ سمجھانے میں ناکام رہا تھا کہ میرے "سر" مر چکے ہیں اور میں زندہ ہوں۔

آہستہ آہستہ سارا ہنگامہ فرو ہونے لگا اور بمشکل پانچ منٹ بعد ہر طرف سناٹا طاری ہو گیا۔ اب کوئی مدافعت ہی باقی نہیں بچی تھی۔ ہمارے سارے جوان یا تو ایک ایک کر کے شہید ہو چکے تھے یا اتنے شدید زخمی تھے کہ فائرنگ کے قابل ہی نہ رہ گئے تھے۔

مجھے ہوش تب آیا جب میرے گرد اگرد بھارتی سپاہی عقیدت مندوں کی طرح گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ ان کی آمد پر میں نے سر اٹھایا تو چند قدموں کے فاصلے سے ایک لمبے تڑنگے کرنل کو اس طرف آتے دیکھا۔ کرنل کو آتے دیکھ کر اس کے ساتھی اس کے احترام میں ایک طرف ہٹ گئے۔ کرنل میرے نزدیک آ کر رک گیا۔ اس نے غالباً صورتِ حال کا اندازہ کر لیا تھا۔

میرے پانچ چھ زخمی ساتھی بھی تکلیف کی شدت سے ہونٹ کاٹ رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اب کچھ اور بھی کر گزریں۔

"یہ تمہارا کمانڈر تھا؟" کرنل نے مجھ سے دریافت کیا۔

میرے بجائے اس بات کا جواب میرے اس ساتھی نے دیا جو کسی نہ کسی طرح گھسٹتا ہوا میرے نزدیک آ گیا تھا۔

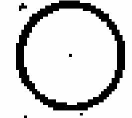


"یس سر" اس نے اونچی آواز سے اپنی خوش بختی پر صاد کیا۔

کرنل نے اپنی ٹوپی اتار لی۔ اس کی دیکھا دیکھی باقی بھارتی فوجیوں نے بھی یہی عمل دہرایا۔ بھارتی فوجی ہمارے "ہادی" کو نذرانۂ عقیدت پیش کر رہے تھے۔

"جنٹل مین!" اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "میری شدید خواہش تھی کہ تمہارا یہ جری افسر نہ مرتا۔ میں اسے خود شاباش دینا چاہتا تھا۔ یہ کسی شیر ہی کا جنا ہے۔ تم لوگ اسے دفن کر سکتے ہو۔ اپنی رسومات بھی ادا کر لو۔" اس نے میرے زخمی ساتھیوں سمیت ہمیں مخاطب کیا۔

میری ٹانگ نے چلنے سے بالکل معذوری ظاہر کر دی! زخمی ساتھیوں نے وہیں ایک طرف گڑھا کھود کر قبر تیار کی اور مٹی کی امانت مٹی کو لوٹا دی۔ بھارتی کرنل نے ان کے جسدِ خاکی کو قبر میں اترنے کے بعد سیلوٹ کیا —— مجھے اسٹریچر پر ڈال دیا گیا اور باقی ساتھی جو ابھی چلنے کے قابل تھے گرفتار کر لیے گئے۔



ہم نے جلد ہی اس تلخ حقیقت کا احساس کر لیا تھا کہ اب ہم جنگ ہار چکے ہیں لیکن ابھی تک ہم اس بات سے بہرحال مطمئن تھے کہ ہم نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ دشمن کے ایک فیلڈ اسپتال ہی میں ہمیں یہ خبر ایک روز مل گئی کہ پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔

میں نے چشمِ تصور سے اپنے جرنیلوں کو قطار در قطار فاتح کے حضور کھڑے دیکھا۔ ان کی عظمتوں اور محنتوں کے اعزازات ان کے کندھوں سے نوچے کھسوٹے جا رہے تھے —— میرے اردگرد موجود میرے زخمی ساتھیوں کے چہرے ڈھل کر سفید ہو رہے تھے۔

ہمارے دل ساکت اور نبضیں خاموش تھیں۔ ہمارے لہو کا خمیر بدلنے لگا۔ اپنی رگوں میں خون کے بجائے ہمیں ذلت و رسوائی کی چنگاریاں پھوٹتی محسوس ہو رہی

تھیں۔ یہ ذلّت کا احساس ہمیں نامرد بنا رہا تھا۔

ـــــ ہم سب زندہ درگور اپنی اپنی قبریں کھود رہے تھے۔

ـــــ تباہی، موت، بربادی اور ذلّت سے پہلے ہر انسان معجزوں کی امید کرتا ہے۔ اس لمحے ہمیں بھی یہی اُمید تھی کہ دشمن کی فاتحانہ نظروں کا سامنا کرنے سے پہلے رحم دل موت کا فرشتہ ہمیں اس اذیت سے نجات دلا دے گا۔

"سر!" میرے ساتھ والے پلنگ سے سسکاری سنائی دی میں نے بمشکل گردن اُس طرف گھمائی۔

"سر! ڈھاکہ لینن گراڈ کیوں نہیں بن گیا؟" میرا ایک ساتھی رو پڑا۔

میں خاموش رہا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ لینن گراڈ شہروں کو عوام بنایا کرتے ہیں۔

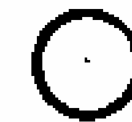
اور یہاں کے تو اینٹ پتھر ہمارے دشمن تھے۔ ذرہ ذرہ ہمارے خون کا پیاسا تھا۔

اگر پاکستانی فوج ڈھاکہ کی گلیوں میں پھیل جاتی تو وہ مکتی باہنی کے لیے سب سے اچھا شکار بنتی۔

بہرحال یہ سوچنا مورخ کا کام ہے سیاسی جھمیلوں میں اُلجھنے کے بعد عسکری روایات رکھنے والی اقوام ہمیشہ سانحات کا شکار ہوتی ہیں ـــــ

خدا کا شکر ہے کہ ہم ان اذیت ناک لمحوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے سے محروم رہے جو جری مردوں کو نامرد بنا دیتے ہیں۔

ـــــ میں نے فیلڈ اسپتالوں سے بھارتی افواج کے بڑے آرمی اسپتالوں تک کا سفر عالم مدہوشی ہی میں طے کیا۔



ذلّت اور رسوائی کی قطار اندر قطار لہریں اٹھتیں اور ہمیں اپنے ساتھ ساتھ بہائے لیے چلی جاتیں۔ میری ٹانگ کاٹ کر دشمن نے مجھے "مرنے سے بچا لیا!" کنپٹی



کے نیچے والے زخم نے پھیل کر میری گردن تک کا احاطہ کر لیا۔ شاید قدرت نے مجھے کچھ انعام دینے کے لیے منتخب کیا تھا کہ مجھے کبھی خاردار تاروں کے پیچھے نہ دھکیلا گیا۔ اسپتال ہی سے مجھے پاکستان پہنچا دیا گیا۔

میرا زخم کچھ زیادہ ہی گہرا تھا ورنہ شاید ٹانگ نہ کاٹنی پڑتی جب آہنسا کے پجاریوں نے اپنی امن پسندی اور عالمی اصولوں کے احترام کا ڈھول پیٹ پیٹ کر آسمان سر پر اٹھا لیا اور عالمی ریڈ کراس کے ذریعے ہمارے اقرباء کے پیغامات اور تحائف ہم تک پہنچنے لگے تو میرے پہلے خط کے جواب میں والد صاحب نے میرا حوصلہ بڑھایا اور ساتھ ہی یہ "اطلاع" بھی دے دی کہ رجو کی شادی ہو گئی ہے۔ چونکہ رجو میری بچپن کی ساتھی تھی اور ممکن ہے آئندہ سے شادی کے بعد میں اس کے متعلق کچھ خلش محسوس کر رہا ہوں۔ اس لیے میرے والدین اور دوسرے پیارے یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا فوجی کسی ذہنی اذیت کا شکار ہو کر قید کاٹے، انھوں نے مجھے مبارکباد دیتے ہوئے لکھا تھا کہ رجو کی شادی قریبی گاؤں میں ہو گئی ہے۔!

میں تو پتھر بن ہی چکا تھا۔ خاموش رہا کہ موسمی تغیر و تبدل پتھروں پر اثر انداز نہیں ہوا کرتے۔

پھر ایک روز ـــــ!

چانکیہ کے چیلے چانٹوں نے دنیا بھر کے پریس کا ہجوم اکٹھا کیا۔ ان کے سامنے اپنی امن پسندی کی رٹ دہرائی اور کیمرے کی فلیش لائیٹوں کے ساتھ مجھے اسٹریچر پر لاد کر سرحد پار کروا دی۔

سرحد کے پار میرے بوڑھے والدین اپنے ہارے ہوئے سپاہی کے خیر مقدم کو موجود تھے۔ مجھے آرمی اسپتال پہنچا دیا گیا اور ایک روز جب میں اپنی بیساکھیوں کے سہارے گاؤں کے اسٹیشن پہ اُترا تو میرا باپ اپنے مفلوج بازو کے ساتھ میرا منتظر تھا اسی

اسٹیشن پر اسی طرح ایک روز گاؤں کے لوگوں نے میرے افسر بن کر لوٹنے پر میرا استقبال کیا اور میرے باپ کو مبارکباد دی تھی۔ آج بھی وہی ہجوم تھا۔

لیکن یہ لوگ اپنے ہارے ہوئے سپاہی کو "جی آیاں نوں" کہنے آئے تھے۔

میں بیساکھیوں کے سہارے چلتا اپنی ماں تک پہنچا تو جیسے ساری محرومیاں حلق میں اٹک گئیں پھر یہ غبار چھٹا اور میں ماں کے سینے سے لگ کر سسکیاں لینے لگا۔

"بیٹے!" میری ماں کی شفقت اُس کے لفظوں میں سمٹ گئی۔ "ندامت کے آنسو شکست کا مداوا نہیں بن سکتے۔ کمانڈو بنو میرے لال! حوصلہ کرو اور خدا کا شکر گزارو کہ تمہیں دُشمن کی پہچان کا شعور تو آگیا"۔ گاؤں کا ایک ایک فرد مجھ سے بغل گیر ہو رہا تھا۔ وہ سب آنسو بہا رہے تھے۔ ہم سب رو رہے تھے۔!

پورا پاکستان رو رہا تھا۔!

غرناطہ رو رہا تھا۔!

یروشلم رو رہا تھا۔!

جب میں بیساکھیوں کے سہارے اپنے گاؤں کی پگڈنڈیوں پر گھسٹ رہا تھا تو فصلوں کی ہریالی کے پس منظر سے رنگ علی زمین کی چھاتی ٹھونکتا بیدار ہوا۔

"اللہ اکبر۔ یا علیؓ۔ حیدرؓ! حیدرؓ!"

میرے "سر" کی للکار گونجی! چارج!

"چارج! چارج!" میرے غازی قطار اندر قطار شہادت کو لبیک رہے تھے۔

پروقار موت کی سمت پاکستانی کمانڈوز کا سفر جاری تھا۔!

پروقار موت کی سمت پاکستانی کمانڈوز کا سفر جاری رہے گا!

جون ۸۳ء

لاہور